کشف المحجوب
از
حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ
www.maktabah.org

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اقدس عقب میں قدیم مسجد اور زیر تعمیر مسجد کا مینار نمایاں ہیں۔

"مَرکزِ تجلّیات"
جہاں اللہ کی رحمتوں کے خزانے دن رات لُٹتے ہیں۔

حضرتِ ہجویر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف کے سامنے خواجۂ اجمیر رحمۃ اللہ علیہ کا حجرۂ اعتکاف۔
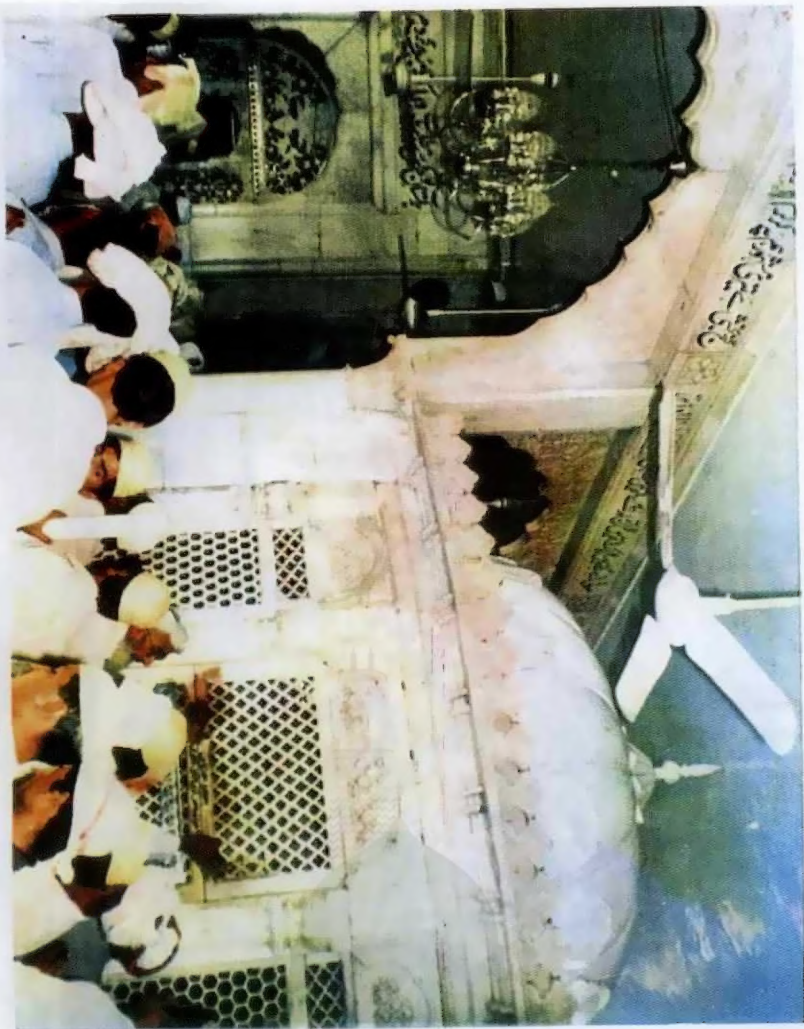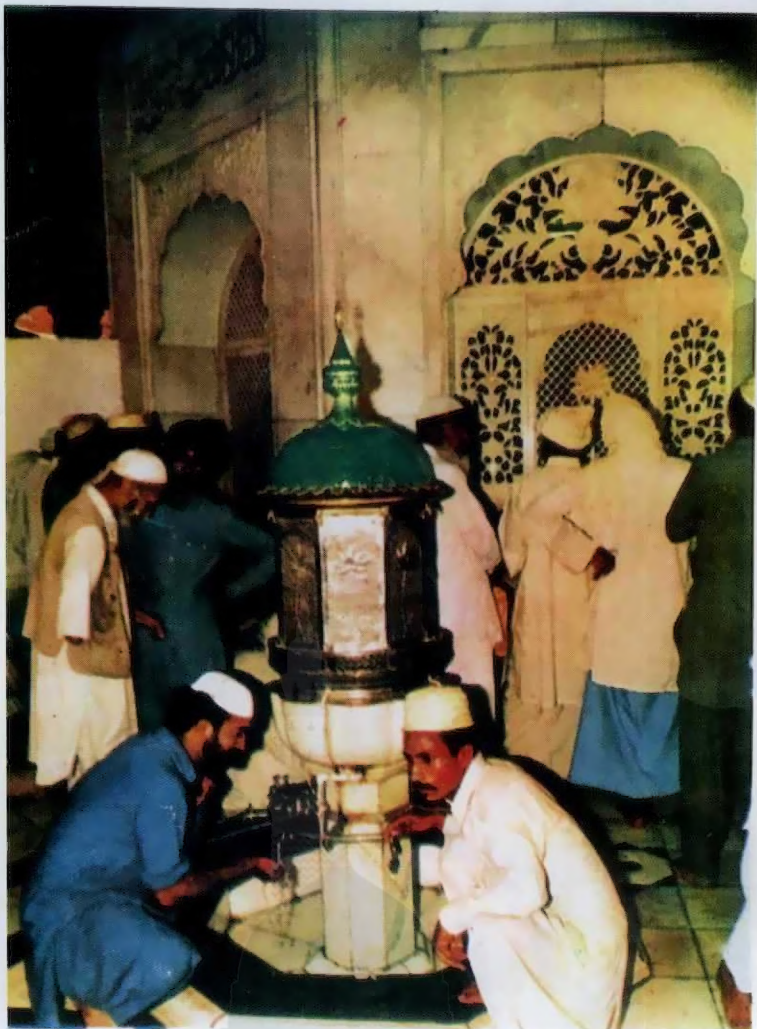
حضرت سیّد علی ہجویریؒ کے مزار شریف کے قریب چشمۂ فیض ۔
یہ کنواں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد تیّار کرنے کے بعد خود تعمیر کرایا تھا ۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں کی طرف "باب زریں"

زیرِ تعمیر مسجد کا ڈیزائن، جس کی تعمیر پر ۸ کروڑ روپے سے زائد رقم صرف ہوگی۔

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما
۱۹۸۳ء

مصنف

حضرت سید علی بن عثمان ہجویری داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

مقدمہ

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجم

علامہ فضل الدین گوہر

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی - پاکستان

نام کتاب	کشف المحجوب
مصنف	قطب زماں سید علی بن عثمان الجلابی الہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ
مترجم	حضرت علامہ فضل الدین گوہر
مقدمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
نظر ثانی	جناب الحاج بشیر حسین ناظم
زیر نگرانی	قاری اشفاق احمد خان
تاریخ اشاعت	جون 2010ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپیوٹر کوڈ	TF1
قیمت	-/250 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔042-37225085-37247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:021-32212011-32630411۔فیکس:۔021-32210212

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

اللھم لک الحمد علی کبریاءک ولک الشکر علی حسن توفیقک وجزیل عطائک والصلوۃ والسلام علی طور التجلیات الاحسانیۃ ومھبط الاسرار الرحمانیۃ سیدنا ومولنا محمد و علی آلہ واصحابہ واحباءہ الی یوم الدین۔

ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز نے قلیل عرصہ میں جو شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ محض مولا کریم کا لطف و احسان ہے۔ اس ادارہ کے ایثار پیشہ مخلص اراکین، فرض شناس اور محنتی کارکنوں کی مساعی کو علیم و حکیم خدا نے شرف قبول ارزانی فرمایا ہے اور اس کی توفیق و دستگیری سے یہ ادارہ اپنی منزل رفیع کی طرف رواں دواں ہے۔

قلیل مدت میں تفسیر ضیاء القرآن کی پانچ ضخیم جلدوں کی معیاری کتابت، دیدہ زیب طباعت، خوبصورت جلد اور عوام و خاص میں اس تفسیر کی بے پناہ پذیرائی کے باعث اس کی بار بار اشاعت کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ فتنہ انکار سنت کے رد میں اس فقیر کی تحقیقی کتاب ''سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام'' کی اشاعت اور کئی دیگر علمی اہمیت کی حامل کتب کی طباعت و اشاعت، بجز توفیق الٰہی کیونکر ممکن تھی۔

اب یہی ادارہ ملت اسلامیہ کے نوجوانوں اور حق و صداقت کے متلاشیوں کی خدمت میں ایک عظیم تحفہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے اور وہ ہے مخدوم امم سید علی بن عثمان الجلابی (المعروف داتا گنج بخش) قدس سرہ العزیز کی زندہ جاوید اور مایہ ناز تصنیف ''کشف المحجوب'' کا اردو ترجمہ۔ اگر چہ اس صحیفہ رشد و ہدایت کو روز اول سے قبول عام نصیب ہوا اور اس کے متعدد فارسی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی، جرمنی اور دیگر مغربی زبانوں میں اہل علم و فضل نے اس کے ترجمے کئے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو زبان

میں بھی بڑے بڑے اہل قلم نے اس کا ترجمہ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے تاکہ خاص وعام اس چشمہ شیریں سے اپنی روحانی اور قلبی پیاس بجھا سکیں۔ لیکن کشف المحجوب کا جو ترجمہ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے قارئین اس کے مطالعے کے بعد خود یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ جس طرح علم تصوف میں فارسی زبان میں لکھی ہوئی کشف المحجوب کا کوئی جواب نہیں اسی طرح حضرت علامہ فضل الدین گوہر صاحب کا یہ اردو ترجمہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کے دیباچہ میں تصوف کی حقیقت اور اس کے مفہوم کو اس طرح بیان کیا جائے کہ ایک عام قاری بھی اس کو بآسانی سمجھ سکے۔ اسی طرح ان اعتراضات کا بھی بے لاگ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے جو آج کل فیشن کے طور پر بڑی بے باکی، بلکہ بڑی بے رحمی سے صوفیائے کرام اور ان کے مسلک پر کئے جاتے ہیں تاکہ شکوک وشبہات کا غبار چھٹ جائے اور حقیقت کا رخ زیبا بے نقاب ہو جائے۔ اس کے بعد ہم حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت طیبہ کا اختصار سے ذکر کریں گے اور ساتھ ہی آپ کی اس مایہ ناز تصنیف کشف المحجوب کی چند خصوصیات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائیں گے۔

سب سے پہلے ہم لفظ صوفی پر بحث کریں گے کہ اس کا ماخذ اشتقاق کیا ہے اور اس فن سے وابستہ لوگ اس کو کس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

ابو ریحان البیرونی (۹۷۳ھ تا ۱۰۴۸ھ) کا نام محتاج تعارف نہیں۔ یہ بیک وقت ریاضی، طب، فلک، تقادیم اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی سال ہندوستان میں بسر کئے، سنسکرت میں مہارت حاصل کی اور یہاں کے تمدن اور مذہبی افکار واعمال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''صوفی'' کا ماخذ سوف ہے جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔ سوف کا معنی ''حکمت'' ہے۔ اسی لئے حکیم اور دانشور کو فیلسوف کہتے ہیں۔ فیلا کا معنی محب اور سوف کا معنی حکمت یعنی

دانش و حکمت سے محبت کرنے والا، سوف کے لفظ کو جب عربی میں ڈھالا گیا تو تحریف کے بعد صوفی ہو گیا کیونکہ یونان میں حکماء کا ایک ایسا گروہ تھا جن کا نظریہ یہ تھا کہ وجود حقیقی صرف علت اولیٰ کے لئے ہے کیونکہ وہی ماسویٰ سے مستغنی ہے۔ باقی سب اس کے محتاج ہیں اس لئے موجود حقیقی صرف وہی علت اولیٰ ہو گی باقی اشیاء کا وجود حقیقی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں بھی بعض حضرات کا عقیدہ بظاہر ان سے قریب ہے، اسی مناسبت سے انہیں بھی صوفی کہا گیا۔''

لیکن البیرونی کی یہ رائے قابل اعتنا نہیں چونکہ یونانی کتب کے عربی تراجم کا سلسلہ تیسری صدی ہجری کے نصف کے لگ بھگ شروع ہوا اور اہل عرب کے ہاں صوفی کا لفظ اس سے بہت پہلے مستعمل ہوتا تھا۔ جو صاحب سب سے پہلے صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ ابوالہاشم الکوفی تھے جن کی وفات 150ھ میں ہوئی تھی یعنی ترجمہ کے دور سے تقریباً ایک سو سال پہلے۔ اس لئے البیرونی کی رائے میں کوئی وزن نہیں۔ البیرونی، اپنے اس رویہ پر اس لئے مصر ہیں کہ اگر اس کے علاوہ صوفی کا کوئی اور مادہ اشتقاق مانا جائے تو اس میں حکمت و معرفت کی نسبت مفقود ہو جائے گی اور یہ لفظ سطحی قسم کا ہو جائے گا۔ البیرونی نے صوفی کے لفظ کی تقدیس کو تو برقرار رکھا، لیکن انہیں یہ خیال نہ آیا کہ اس طرح وہ اسلامی تصوف کو یونانی علوم کا ریزہ چین ثابت کر رہے ہیں اور اس کی انفرادیت کو ختم کر رہے ہیں، جو واقعہ کے بھی خلاف ہے اور تصوف کے مقام سے بھی فروتر۔ اس لئے البیرونی کے اس قول کو تمام مسلم محققین نے رد کر دیا، البتہ یورپ کے مستشرقین میں سے انہیں کئی لوگ اپنے ہمنوا مل گئے۔ لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے جس سے قارئین واقف ہیں۔

بعض کے نزدیک صوفی، صفا سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ لوگ ظاہر اور باطن دونوں کی صفائی اور پاکیزگی کا بیحد اہتمام فرماتے تھے، اس لئے ان کو صوفی کہا جانے لگا۔ لیکن صرف کے قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر صفا کی طرف نسبت کو ملحوظ رکھنا ہوتا تو انہیں صوفی کے بجائے صفوی کہا جاتا۔ اشتقاق لغوی کے قواعد کو نظر انداز کرنا درست نہیں۔

بعض علماء نے صف کو صوفی کا ماخذ قرار دیا ہے کیونکہ جہاد اصغر ہو یا جہاد اکبر، یہ لوگ ہمیشہ صف اول میں ظاہری اور باطنی دشمنوں کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں لیکن قواعد اشتقاق اس قول کی بھی تغلیط کرتے ہیں۔ صف کی نسبت سے انہیں صفی کہلانا چاہئے تھا نہ کہ صوفی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصحاب صفہ کی نسبت سے انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرات دنیا کے علائق سے اپنے آپ کو آزاد کر کے دن رات ذکر الٰہی اور اطاعت رسالت پناہی میں سرگرم رہتے تھے اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرنے والے لوگوں نے بھی دنیا کی لذتوں، آسائشوں اور دلچسپیوں کو طلاق دے دی ہے اور صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لئے شب و روز سرگرداں رہتے ہیں اس لئے انہیں اصحاب صفہ سے خصوصی نسبت ہے اسی وجہ سے انہیں صوفی کہا گیا۔ بظاہر تو یہ وجہ بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن قواعد اشتقاق اس کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ اگر انہیں صفہ سے نسبت ہوتی تو صفوی کہا جاتا۔

بعض محققین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ یہ لوگ صوف کا لباس پہنتے تھے اس سے صوفی کا لفظ بنا ہے۔ قواعد کے لحاظ سے تو یہ نسبت درست ہے، لیکن ضروری نہیں کہ ہر صوف کا لباس پہنے۔ بڑے بڑے جلیل القدر اصفیاء ایسے گزرے ہیں جو صوف کا لباس نہیں پہنتے تھے۔

امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ مختلف آراء نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"لایشهد هذا الاسم اشتقاق من جهة العربية و القياس و الظاهر أنه لقب"

"صوفی کے لفظ کا ماخذ اشتقاق عربیت کے لحاظ سے اور قواعد و صرف کی رو سے معلوم نہیں ہوتا۔ سیدھی صاف بات یہ ہے کہ یہ اس فن کا لقب ہے۔"

علامہ ابن خلدون نے بھی امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے کو پسند کیا۔

صوفی کے لفظ کی لغوی تحقیق کے بعد اب ہم اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ تصوف کا مفہوم کیا ہے؟ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں علم التصوف کے باب میں اس

کی توضیح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

أصل التصوف العكوف على العبادة والانقطاع إلى الله تعالىٰ والإعراض عن زخرف الدنيا وزينتها والزهد فيما يقبل إليه الجمهور من لذة ومال وجاه...... وكان ذالک عاما فی الصحابة والسلف۔

''تصوف کا معنی ہے عبادت پر ہمیشہ پابندی کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا۔ دنیا کے زیب وزینت کی طرف سے روگردانی کرنا۔ لذت مال اور جاہ جس کی طرف عام لوگ متوجہ ہیں اس سے کنارہ کش ہونا۔ یہ طریقہ صحابہ کرام اور سلف الصالحین میں عام مروج تھا۔''

اکثر حضرات تصوف کی تعریف میں اخلاقی پہلو کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور یہ نظریہ حلقہ صوفیاء میں بھی مقبول ہے۔ اس نظریہ کے مطابق جن حضرات نے تصوف کی تعریف کی ہے، ان میں سے چند نمونے پیش خدمت ہیں:

ابوبکر الکتانی (المتوفی ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

التصوف خلق ومن زاد عليک فی الخلق فقد زاد عليک فی الصفاء

''تصوف خلق کا نام ہے جو خلق میں تجھ سے برتر ہوگا وہ صفائی میں بھی تجھ سے بڑھا ہوا ہوگا۔''

ابومحمد الجریری (المتوفی ۳۱۱ھ) سے کسی نے تصوف کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا:

الدخول فی كل خلق سنی والخروج من كل خلق دنی

''ہر اعلیٰ اور عمدہ خلق میں داخل ہونا اور ہر رذیل عادت سے باہر نکلنا تصوف ہے۔''

ابوالحسین النوری تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ليس التصوف رسما و علما ولكنه خلق

''تصوف نہ رسم ہے، نہ علم بلکہ یہ خلق کا نام ہے۔''

دوسرے مقام پر انہی کا ارشاد ہے:

التصوف: الحرية والكرم وترك التكلف والسخاء

"تصوف، حریت، کرم، بے تکلفی اور سخاوت کا دوسرا نام ہے۔"

اگر چہ اخلاقی نقطہ نظر سے تصوف کی یہ تعریف شرق وغرب میں مشہور بھی ہے اور مقبول بھی۔ لیکن اسے تصوف کی صحیح تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے لوگ جو مکارم اخلاق میں اپنی نظیر نہیں رکھتے انہیں صوفی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات مسلم ہے کہ تصوف کی بنیاد اخلاق کریمہ پر ہے اور صوفی کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ مکارم اخلاق سے متصف ہو، لیکن اسے تصوف کا حقیقی مفہوم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تصوف کی تعریف میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کا معنی زہد ہے یعنی دنیا اور دنیا کی زیب وزینت اور لذات سے کلیۃ کنارہ کشی، یہ بجا کہ صوفی کا دل دنیا سے بیزار ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ زہد وتقشف اور چیز ہے اور تصوف اور چیز ہے بعض لوگوں نے عبادت گزار کو صوفی کہا ہے، لیکن ان کا یہ قول بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ ایک شخص عبادت میں سرگرم ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے صوفی نہیں کہا جاتا۔

ابن سینا نے اپنی کتاب "الاشارات" میں بڑی وضاحت سے زاہد، عابد اور صوفی میں جو فرق ہے، اسے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جو شخص دنیا اور اس کی لذتوں سے منہ موڑ لے اسے زاہد کہتے ہیں۔ جو شخص ہر لمحہ عبادت میں مصروف رہے اسے عابد کہتے ہیں

"والمنصرف بفكره إلى القدس الجبروت مستديما لشروق نور الحق فی سره يخص باسم العارف"

"اور جو شخص ہمیشہ اپنی فکر کو قدس جبروت کی طرف متوجہ رکھتا ہے اور ہر لحظہ اپنے باطن میں نور حق کی تابانی کا آرزومند ہوتا ہے اسے عارف کہتے ہیں"۔

گویا ابن سینا کے نزدیک عارف ہی صوفی کہلانے کا مستحق ہے۔

زاہد اور عابد، زہد و عبادت کو اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ انہیں دوزخ سے نجات ملے اور نعیم جنت کی سرمدی مسرتیں انہیں نصیب ہوں۔ صوفی بھی دنیا کی زینتوں اور لذتوں سے دامن کش رہتا ہے اور ہمہ وقت مصروف عبادت رہتا ہے، لیکن اس کے پیش نظر کوئی خوف یا طمع نہیں ہوتا وہ فقط اس لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے کہ وہ اس کا محبوب و مطلوب ہے اور ہر قسم کی عبادت و نیازمندی کا مستحق ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک روز انہوں نے بارگاہ الٰہی میں یوں عرض کیا:

اللھم إن کنت أعبدک خوفا من نارک فألقنی فیھا

"اے اللہ! اگر میں تیری عبادت آتش دوزخ کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے اس میں جھونک دے"۔

وإن کنت أعبدک طمعا فی جنتک فأحرمنیھا

"اور اگر میں جنت کے لالچ کے لئے تیری جناب میں سربسجود رہتی ہوں تو مجھے اس جنت سے محروم کردے"۔

وإن کنت أعبدک لوجھک الکریم فلا تحرمنی من رؤیتہ

"اور اگر میں صرف تیری ذات کے لئے تیری عبادت کرتی ہوں تو اے میرے محبوب! مجھے اپنے شرف دیدار سے محروم نہ رکھیو"

معلوم ہوا کہ تصوف نہ صرف اخلاق حسنہ کا نام ہے، نہ صرف دنیا کی لذتوں اور مسرتوں سے کنارہ کشی کا نام ہے اور نہ صرف شب و روز مصروف عبادت رہنے کا نام ہے، اگرچہ وہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے لیکن وہ ان کے ماسوا کوئی اور چیز ہے۔

اس لئے ابھی ہمیں تصوف کی ایسی تعریف کی ضرورت ہے جس سے اس کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جائے۔

ابوسعید الخزاز رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۶۸ھ) سے "صوفی" کے بارے میں پوچھا

گیا۔آپ نے فرمایا:

من صفی ربه قلبه فامتلأ قلبه نورا و من دخل فی عین اللذة بذکر اللّٰه

''یعنی جس کے دل کو اس کا رب پاک صاف کر دے اور اس کا دل نور الٰہی سے لبریز ہو جائے اور جو شخص ذکر الٰہی شروع کرتے ہی لذت و سرور میں کھو جائے''۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

التصوف: هو أن یمیت الحق عنک و یحییک به

''تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے تیری ذات سے فنا کر دے اور اپنی ذات کے ساتھ تجھے زندہ کر دے۔''

ابوبکر الکتانی کی تعریف ایجاز اور جامعیت کا شاہکار ہے، وہ فرماتے ہیں:

التصوف: صفاء و مشاهدة

''تصوف صفاء یعنی تزکیہ اور مشاہدہ کا نام ہے''۔

ان دو میں سے پہلی بات (صفا) سبب ہے اور دوسری بات (مشاہدہ) غایت اور مدعا ہے۔ یہ تعریف بڑی جامع ہے۔ اس میں سالک کی منزل کا بھی ذکر ہے اور اس راستہ کا بھی جو سالک کو اس منزل تک لے جاتا ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس حقیقت کو ذرا تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

الطریق: تقدیم المجاهدة ومحو الصفات المذمومة وقطع العلائق کلها والإقبال بکل الهمة علی اللّٰه تعالیٰ ومهما حصل ذالک کان اللّٰه المتولی لقلب عبده المتکفل له بتنویره بأنوار العلم

''اس منزل کا راستہ یہ ہے کہ پہلے مجاہدہ کرے۔ صفات مذمومہ کو مٹائے۔ تمام تعلقات کو توڑ ڈالے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جب یہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل کا متولی بن جاتا ہے اور علم کے

انوار سے اس کو منور کرنے کا ذمہ دار بن جاتا ہے''۔

یہ ہے تصوف کا وہ مفہوم جس کو اولیائے اللہ اپنا مقصد حیات بناتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی صفا اور تزکیہ کے کٹھن مرحلوں کو صدق دل سے طے کرنے کے لئے وقف رہتی ہے تاکہ آخر کار وہ مشاہدہ کی منزل میں خیمہ زن ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ اس طرح وہ انسانیت کے اس مقام رفیع کو پالیتے ہیں جہاں ''نفخت فیه من روحی'' کا سر نہاں عیاں ہوتا ہے اور وہ خلیفہ فی الارض کی مسند جلیل پر متمکن ہوتا ہے۔

اس تصوف پر جس کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کی تشریح آپ ابھی پڑھ چکے ہیں گزشتہ زمانہ میں بھی اور آج بھی، اپنوں نے بھی اور بیگانوں نے بھی، بدنیتی سے یا غلط فہمی کے باعث بڑی بے رحمی سے طعن و تشنیع کے تیروں کا مینہ برسایا ہے۔ اور آج اس تحریک میں مزید شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ عدل و تحقیق کا دامن بھی بسا اوقات ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس حالیہ شدت کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مادی لذتوں کی طرف رجحان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ تصوف کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو باعث رسوائی اسلاف ہیں یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آثار کو دیکھ کر ابلیسی قوتیں ہراساں ہیں اور وہ مسلمانوں کو اس چشمہ حیات سے بدظن اور متنفر کرنے کا قبل از وقت پروگرام بنا رہی ہیں تاکہ مسلمان اس بیداری سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، ہمیں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان اعتراضات کا جائزہ لینا چاہئے۔ انہوں نے اگر کسی واقعی خامی کی نشاندہی کی ہے تو اس کے ازالہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور اگر انہوں نے غلط اعتراضات کئے ہیں تو ان کا مسکت جواب دینا چاہئے۔

ایک بات میں ابتدا ہی میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ صوفیا کی صفوں میں ایسے لوگ بھی در آئے ہیں جو بظاہر عابد و زاہد نظر آتے ہیں لیکن دراصل اپنے زہد و عبادت کو حصول مال و جاہ کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں لیکن مجھے یہ تو بتایئے

انسانی زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں یہ کالی بھیڑیں موجود نہیں۔ علماء، اطباء، قضاۃ، تجار، صنعت کار، سب جگہوں پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے طبقہ کے لئے ننگ و عار کا باعث ہیں۔ لیکن اگر ان کے وجود سے صحیح اور راستباز لوگوں کی افادیت کم نہیں ہوئی تو جعلی صوفیوں کے ہتھکنڈوں سے بھی صوفیائے کرام کی عظمت پر حرف نہیں آسکتا، ہم جن صوفیا کے بارے میں کلام کریں گے وہ وہ لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اس لقب کے اہل ہیں۔

پہلا اعتراض

تصوف پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے کہ اس کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ نہیں، بلکہ یہ ایک اجنبی چیز ہے جسے اسلام میں زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے۔ لیکن جب ان معترضین سے اس اجنبی مصدر اور منبع کے بارے میں استفسار کیا جاتا ہے تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں اور انسان تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہے کہ تصوف کے کس معترض کی بات کو وقیع اور وزنی سمجھا جائے اور کسے لا یعنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ ان معترضین کا باہمی اختلاف اور کسی ایک منبع پر متحد نہ ہونا ہی ان کے اس قول کے بطلان کے لئے کافی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم تمام اقوال کا ایک ایک کر کے ذکر کرتے ہیں اور اس کا علمی تجزیہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، وہ خود ہی حق و باطل میں امتیاز کر لیں گے۔

معترضین کا ایک طبقہ جس میں مستشرقین کے جید علماء بھی شامل ہیں، یہ کہتا ہے کہ تصوف کا ماخذ ہندوؤں کے وید ہیں وہ بڑے وثوق سے دعویٰ کرتا ہے کہ تصوف میں چلہ کشی، ریاضت وغیرہ کے سارے طریقے ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس طبقہ کے سرخیل ہارٹن (Horton) بلوشیٹ (Blochet) اور میسی نان (Massignon) ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں اور بڑے محقق اور مدقق شمار ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ان صاحبان کو اس بے مقصد تکلف کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ مسلمان صوفیا کے ہادی و رہبر نبی کریم ﷺ نے غار حرا میں

چلہ کشی کی تھی اور ذکر الٰہی پر مداومت کے متعدد احکام قرآن کریم اور احادیث نبوی میں بصراحت موجود ہیں اور یہ سب اس وقت ان کو میسر تھا جبکہ ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے بارے میں جزیرۂ عرب کے باشندوں کو سطحی قسم کی معلومات بھی میسر نہ تھیں۔ اس لئے صوفیائے کرام کی ریاضتوں اور چلہ کشیوں کو ہندو جوگیوں کی طرف منسوب کرنا لغویت کی انتہا ہے۔ مزید برآں دونوں ریاضتوں کے مقاصد میں بعد المشرقین ہے۔

دوسرا طبقہ ان معترضین کا ہے جو مسلمانوں کے زہد و تبتل کو بدھ مت سے ماخوذ سمجھتے تھے۔ گولڈزیہر (Goldziher) اور اولیری (O'Leary) کے پایہ کے مستشرق بھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ صوفیا کا دنیا سے قطع تعلق درحقیقت گوتم بدھ کی تقلید ہے جس طرح اس نے تخت و تاج کو ترک کر کے فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کر لی تھی اسی طرح مسلمان صوفیا نے بھی اپنے گھروں کے راحت و آرام کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں آ کر بسیرا کیا۔ لیکن اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے ان حضرات نے یہ غور کرنے کی زحمت برداشت نہیں کی کہ گوتم بدھ خدا کے وجود کا منکر ہے۔ وہ نفس انسانی ہی کو سب کچھ خیال کرتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور یہ ریاضتیں مقصود بالذات نہیں، بلکہ بارگاہ الٰہی میں شرف باریابی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام کا تصوف دراصل ایرانی تصوف کا آئینہ دار ہے۔ عرب ہر لحاظ سے ایران سے فروتر تھے۔ انہوں نے ان سے ہی سب کچھ لیا ہے، ایرانیوں کو دینے کے لئے ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ اگر یہ لوگ اسلام سے پہلے کی بات کہہ رہے ہیں تو ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن ہم اس زمانہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، ہماری بحث اس تصوف سے ہے جو آفتاب اسلام کے طلوع ہونے کے بعد رونما ہوا۔ جب قرآن کریم کے فیضان سے عرب مسلمانوں کی جھولیاں علم و حکمت کے جواہرات سے بھر گئیں تو وہ اپنے گھروں سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور بڑی دریادلی اور فیاضی سے انہوں نے ان

جواہرات کولٹایا۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم یہ کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ اہل فارس نے عرب مسلمانوں کو دینی، تہذیبی اور علمی اعتبار سے متاثر کیا، بلکہ یہ وہ عرب تھے جنہوں نے اپنی ظاہری فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اہل ایران کے عقائد، نظریات وافکار اور تہذیب وتمدن کو یکسر بدل کرر کھ دیا۔ جب اسلام کی برکت سے اہل فارس آتش پرستی چھوڑ کر خداوند واحد و یکتا کے پرستار بن گئے۔ باقی اور کیا چیز تھی جس کیلئے مسلمان صوفی ان کے شکست خوردہ افکار سے دریوزہ گری کرتے۔ پروفیسر براؤن کا یہ کہنا سراسر خلاف حقیقت ہے کہ ایرانی افکار نے عربوں کو متاثر کیا اور اسی سے ان کا تصوف ماخوذ ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال اگر کہیں کچھ مشابہت پائی بھی جاتی ہے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ اسلامی تصوف اہل فارس کے نظریات سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اسلام کا تصوف صرف اسلام سے ماخوذ ہے اور وہ ہر اعتبار سے ایک الگ اور جداگانہ چیز ہے۔

معترضین کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اسلام کے تصوف پر نصرانی تصوف کا بہت بڑا اور گہرا اثر ہے۔ اس دعویٰ کی تائید کے لئے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عربوں اور عیسائیوں میں عہد قدیم سے باہمی روابط تھے۔ عرب ایک غیر متمدن اور جاہل قوم تھے جب کہ عیسائی دنیا علم وحکمت کے نور سے جگمگا رہی تھی۔ اس لئے لازمی طور پر مسلمان صوفیوں نے عیسائی راہبوں سے تصوف سیکھا اور اس کو اپنایا۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے کے بارے میں آپ کا یہ نظریہ درست ہوسکتا ہے، لیکن ہم اس زمانہ کی بات کررہے ہیں جب کہ عرب کے ظلمت کدہ کو وحی الٰہی کے نور تاباں نے رشک صد طور بنا دیا تھا اور ان ابجد نا شناسوں کو نہاں خانہ تقدیر کے اسرار ورموز سے آشنا کر دیا تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے خود اپنے ماننے والوں کو دنیا کی لذتوں میں کھو جانے سے سختی کے ساتھ روکا تھا۔ قرآن کریم کی صدہا آیات ایسی ہیں جو مسلمانوں کو زہد وتقویٰ کی تلقین کرتی ہیں اور دنیا کی بے ثباتی کا نقش لوح قلب پر ثبت کرتی ہیں۔ سورۃ الحدید کی ایک آیت ملاحظہ ہو:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّ زِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ

وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ (الحدید: ۲۰)

''تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو ولعب، زینت اور ایک دوسرے پر اترانے اور مال واولاد میں زیادتی پر فخر کرنے کا نام ہے۔ جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذاب شدید ہے۔ اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضا مندی بہت بہتر چیز ہے اور نہیں ہے دنیا مگر دھوکے کا سامان۔''

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی سماعت فرمائیے:

إِنَّ مِمَّا اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِيْ مَا يُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتِهَا۔ (صحیح بخاری، مسلم)

''اپنے بعد میں تم سے جس چیز کے بارے میں ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دنیا کی زینت اور کامیابی کے دروازے تم پر کھول دیئے جائیں گے۔''

خود سوچئے کہ جس قوم کے پاس ان کی کتاب مقدس میں زہد و پرہیز گاری کے اتنے مؤثر مواعظ موجود ہوں انہیں ان پریشان حال راہبوں کی تقلید کی کیا ضرورت ہے، جو خود بے یقینی کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ اسی طرح عبادت الٰہی کی تلقین وترغیب میں قرآن کریم کی بے شمار آیات موجود ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی اور واعظ کی ایک مومن کو کیوں ضرورت محسوس ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۲۰۵ (الاعراف)

''اپنے رب کو یاد کیا کرو، اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ زور کی آواز کی

نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام غافلوں میں سے مت ہو جانا۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ (الاحزاب)

"اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہا کرو"۔

قرآن کریم کی دوسری سورت کی یہ دل افروز اور روح افزا آیت بھی پڑھ لیجئے:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ (البقرہ)

"تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔ میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔"

جب ذکر الٰہی کے لئے ایسی آیات موجود ہوں تو ان کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا کسی غیر کی طرف متوجہ ہونا کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

مستشرقین جن کے غول کے غول اسلامی تصوف کو غیر اسلامی ثابت کرنے کے جنون میں جگہ جگہ ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں چند ایسی شخصیتیں بھی ہیں جنہوں نے پہلے تو اپنے پیشرووں کی تقلید کرتے ہوئے اسلامی تصوف کو غیر اسلامی افکار کا نتیجہ کہا لیکن مزید تحقیق کے بعد جب حقیقت ان کے سامنے واشگاف ہوگئی تو انہوں نے بڑی جرأت سے اپنے سابق افکار ونظریات سے رجوع کیا۔ یہی نکلسن جو پہلے تصوف کو عیسائیت کا عطیہ کہتے رہے بعد میں "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں تصوف کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ

"آج تک اسلامی تصوف کے آغاز اور نشو ونما کے بارے میں غلط اندازے لگائے گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ تصوف اسلام میں باہر سے آیا قطعاً قابل تسلیم نہیں۔ بلکہ روز اول ہی سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ تھا جو تلاوت قرآن اور مطالعہ حدیث میں مشغول رہتا تھا اور ان کے تمام افکار ونظریات کا منبع قرآن وسنت کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا"۔

اکابر صوفیا نے اپنی مستند کتب میں اس بات کو واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ صوفی کے لئے کتاب وسنت کے ارشادات پر عمل پیرا ہونا کامیابی کے لئے شرط اول ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہر قسم کے شک وشبہ کے بطلان کے لئے کافی ہے، فرماتے ہیں:

این راہ کس باید کہ کتاب بردست راست گرفتہ باشد وسنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بردست چپ ودر روشنائی این دو شمع میرود تانہ در مغاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت۔

''یہ راہ تو وہی شخص پاسکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن پاک ہو اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان دونوں شمعوں کی روشنی میں وہ قدم بڑھاتا جائے تاکہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرے اور نہ بدعت کے اندھیروں میں پھنسے''۔(1)

شیخ ابوبکر طمستانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الطریق واضح والکتاب والسنۃ قائم بین اظھرنا

''راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب وسنت ہمارے سامنے موجود ہے''۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

اے برادر! در تفاوت مراتب فقراء اگر امروز خواہی کہ دریابی بجانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیارست۔ عیار فقیر بر شریعت روشن میگردود۔

''اے بھائی! اگر تم فقراء کے مراتب کا پتا آج لگانا چاہو تو ان کے اتباع شریعت پر نظر کرو۔ شریعت معیار ہے، اس کسوٹی پر فقیر کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے''۔

صوفیائے کرام نے خود بھی کتاب وسنت پر عمل کیا اور اپنے حلقہ عقیدت میں داخل ہونے والوں کو بھی کتاب وسنت کی پیروی کی تاکید فرمائی۔ مندرجہ بالا تصریحات کے علاوہ آپ قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، فوائد الفواد وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ آپ کو ان کے ہر ہر صفحہ پر کتاب وسنت پر عمل کرنے کی تلقین ملے گی۔ اس

1۔ شیخ فرید الدین عطار، تذکرۃ الاولیاء

کے باوجود اگر کوئی شخص تصوف کو شریعت کے خلاف کہتا ہے تو اس کی اپنی مرضی۔

دوسرا اعتراض

معترضین یہ بھی کہتے ہیں کہ تصوف جاہلوں اور ناخواندہ لوگوں کا مسلک ہے۔ جو لوگ زیور علم سے آراستہ ہیں اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں یدطولیٰ رکھتے ہیں، وہ تصوف کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جو الزام لگانے والوں کی کم نظری اور لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ اکابر صوفیا اپنے اپنے زمانہ میں علم و فضل میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے وہ اپنے ہم عصر علماء و فضلاء پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے بلکہ تصوف کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے وہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت سیدنا غوث الاعظم حضرت خواجہ معین الحق والدین اجمیری، حضرت شہاب الدین سہروردی، غوث العالمین شیخ الاسلام حضرت بہاء الحق والدین زکریا ملتانی، حضرت بہاء الدین نقشبند، حضرت مجدد الف ثانی و امثالہم قدس اللہ اسرارہم نہ صرف اقلیم فقر و درویشی کے شہنشاہ تھے بلکہ کشور علم و فضل کے بھی تاجدار تھے۔ کون ہے جو ان حضرات اور ان کے جلیل القدر خلفاء پر جہالت کی تہمت لگا سکے۔ ان کی تصانیف آج بھی اہل علم و تحقیق سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"جاہل کبھی مسخر شیطان ہو جاتا ہے اس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ وہ دل کی بیماریوں کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج نہیں کر سکتا"۔

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت و حقیقت عالم باشد چوں ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع نفرمائید۔

"پیر ایسا ہونا چاہئے جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کا علم رکھتا ہو، اگر ایسا ہوگا تو وہ کسی ناجائز بات کے لئے نہ کہے گا۔"

1۔ امیر حسن سنجری، فوائد الفواد

حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال بھی تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو خلافت عطا نہیں فرماتے تھے جو عالم نہ ہو۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

اجتنب صحبة ثلاثة اصناف من الناس العلماء الغافلين والفقراء المداهنين والمتصوفة الجاهلين۔(1)

''تین قسم کے آدمیوں کی صحبت سے اجتناب کیا کرو۔ ایسے عالموں سے جو جاہل ہوں، ایسے فقیروں سے جو دھوکے باز ہوں اور ایسے صوفیوں سے جو جاہل ہوں''۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ، جو صوفیا پر تنقید کرنے میں مشہور عالم ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ:

وما كان المتقدمون فى التصوف الا رؤوسا فى القرآن والفقه والحديث والتفسير

''یعنی صوفیائے متقدمین علوم قرآن، فقہ، حدیث اور تفسیر میں امام ہوا کرتے تھے۔''

تیسرا اعتراض

صوفیاء نے عیسائی راہبوں کی طرح دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی تھیں، ان سے وہ لطف اندوز ہونے سے دست کش ہو گئے تھے۔ حالانکہ حدیث پاک میں موجود ہے:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔ ''اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں''۔

بیشک صوفیائے کرام ابتداء میں ہر قسم کے علائق سے دست کش ہو کر خلوت گزیں ہو جاتے ہیں اور اچھے کھانے، اچھے پہننے، رات کو آرام کرنے وغیرہ راحتوں کو ترک کر دیتے ہیں، لیکن یہ ان کا مقصد حیات نہیں ہوتا، بلکہ وقتی طور پر وہ تزکیہ قلب اور تربیت نفس کے لئے ان مجاہدات کو اختیار کرتے ہیں اور جب وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور

1۔ علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب

اللہ تعالیٰ کے نور عشق سے ان کے سینے منور ہو جاتے ہیں، مذموم عادات سے ان کی طبیعت پوری طرح متنفر ہو جاتی ہے اور محاسن اخلاق ان کی فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں تو پھر ستیزہ گاہ حیات میں اسلام کا پرچم تھامے ہوئے وہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ان کے تربیت یافتہ نفوس کے راستہ میں آلام ومصائب کی کوئی چٹان حائل نہیں ہوسکتی۔ ابلیس کی کوئی فسوں کاری ان کو متاثر نہیں کر سکتی۔ بلکہ وہ عزم وثبات کا پیکر بن کر تسلیم ورضا کے پرخار راستے پر خراماں خراماں گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ شخص جو اپنی زندگی اسلام کی سربلندی کے لئے وقف کرنا چاہتا ہو اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس پیغام حق کو پہنچانے کے لئے میدان میں نکلنا چاہتا ہو، اس کے لئے ناگزیر ہے کہ پہلے وہ تزکیہ قلب اور تربیت نفس کے کٹھن مرحلہ کو کامیابی سے طے کرلے۔ اگر اس میں ذرا بھی خامی باقی ہوگی تو اس کی ادنیٰ سی لغزش اسلام کے وقار کو سخت نقصان پہنچانے کا باعث بنے گی۔

آج جب کہ ہم تبلیغ اسلام کے لئے تحصیل علم کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور ریاضت ومجاہدہ کو غیر ضروری بلکہ خلاف اسلام چیز قرار دیتے ہیں تو ہماری تبلیغ کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ نہ کلام میں اثر ہے، نہ وعظ ونصیحت کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور ہماری اخلاقی کمزوریاں قدم قدم پر عیاں ہوتی ہیں اور اسلام کی تضحیک کا باعث بنتی ہیں۔ آپ یوں سمجھئے کہ کفار کے ساتھ گھمسان کی لڑائی شروع ہے۔ آپ سپاہی بھرتی کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں بھرتی کرنے کے بعد فوراً میدان جنگ کی طرف روانہ کریں گے یا میدان جنگ سے بہت دور ایک چھاؤنی میں بھیجیں گے جہاں وہ فوجی نظم وضبط کے علاوہ اسلحہ کے استعمال کے ڈھنگ سیکھیں گے اور جب وہ تربیت کے اس مرحلہ کو مکمل کرلیں گے، تب وہ اس قابل ہوں گے کہ انہیں میدان جنگ میں کسی محاذ پر متعین کیا جائے۔ اگر آپ عجلت میں سپاہیوں کو فوراً جنگ میں جھونک دیں گے تو وہ دشمن کے بجائے اپنے دوستوں کو نقصان پہنچائیں گے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ خود ہی اپنی گولی کا نشانہ بن جائیں۔

عیسائیوں کے نزدیک رہبانیت مقصد حیات ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے الگ

تھلگ زندگی بسر کرنے میں ہی سلامتی اور نجات سمجھتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے ہاں اس قسم کا قطعاً کوئی تصور نہیں۔ صوفیائے کرام کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے دنیا کو ترک کرنے کی تلقین نہیں کی بلکہ دنیا کے بے اعتدالانہ استعمال اور اس کی محبت میں کھو جانے سے منع کیا ہے۔ انہوں نے شادیاں کیں، ان کے اہل وعیال تھے، ان کے ذاتی مکانات اور مزروعہ اراضی تھیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں ان پر رہبانیت کا الزام کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ اور یہ قرآن کریم کا حکم ہے: اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی ان الفاظ میں ثنا گستری فرماتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: 37)

"یہ وہ مردان پاکباز ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے انہیں نہ تجارت غافل کر سکتی ہے اور نہ خرید وفروخت"۔

حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد بھی سماعت فرمائیے:

ترک دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوٹہ بہ بندد و بنشیند۔ ترک دنیا آں ست کہ لباس بپوشد، طعام بخورد و آنچہ می رسد روا بدارد و تجمیع او میل نکند و خاطر را متعلق چیزے ندارد۔ (1)

"ترک دنیا کا یہ معنیٰ نہیں کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو برہنہ کرے اور لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ ہمارے نزدیک ترک دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے، کھانا بھی کھائے اور حلال کی جو چیز دستیاب ہو اسے استعمال بھی کرے۔ لیکن دولت کو جمع کرنے کی خاطر راغب نہ ہو اور دل میں اس کو جگہ نہ دے۔"

چوتھا اعتراض: یہ اعتراض بڑے زور شور سے تصوف اور صوفیا پر کیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں تو اس اعتراض نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے اور ہر شخص جو چند سطریں لکھنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے، وہ اہل حق پر یہ اعتراض کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ آیئے پہلے

1۔ فوائد الفواد

معترضین کی بات سنیں اور اس کے بعد حقیقت کی کسوٹی پر اسے پرکھیں۔

معترضین حضرات کہتے ہیں کہ تصوف ایک افیون ہے اور صوفیاء نے ملت کے قوائے عمل کو مضحل بلکہ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کو اس بات پر اصرار ہے کہ ملت کو چاہئے کہ تصوف کی بنائی ہوئی ان روپہلی اور سنہری زنجیروں سے اپنے آپ کو رہا کرائیں اور تصوف کی پیدا کردہ خواب آلود فضا سے نکل کر حقائق کی تلخیوں سے دوچار ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔

بات یہی ہے لیکن معترضین نے اسے نئے نئے جاذب قلب ونظر اسالیب میں بیان کر کے بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔

ہم بڑی ذمہ داری اور وثوق کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان بزرگوں نے ملت کے عروق مردہ میں ہمیشہ نئی روح پھونکی ہے۔ ان کی فیض نگاہ سے حوصلوں میں بلندی، عزائم میں پختگی، ولولوں میں جولانی اور قوت عمل میں برق آسا سرعت اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ آپ ذرا تعصب کی پٹی اتار دیجئے اور تبلیغ اسلام کی تحریک کے جوانمرد علمبرداروں کے نقوش پا کو دیکھتے ہوئے ان میدانوں تک پہنچنے کی کوشش کیجئے جہاں حق نے باطل پر ابدی فتح حاصل کی۔ برصغیر پاک و ہند پر ذرا سرسری نظر ڈالیے۔ سجستان کا ایک درویش تبلیغ اسلام کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے وطن کو چھوڑتا ہے، اپنے اقارب واحباب کو الوداع کہتا ہے۔ اپنی منقولہ اور غیر منقولہ املاک سے دست کش ہوتا ہے اور تنہا بتکدۂ ہند کا رخ کرتا ہے۔ یہاں بھی کئی ایسے گوشے تھے جہاں اسلام نے اپنے قدم جما لئے تھے، لیکن اس کے حوصلے کی بلندی اور اس کے عزائم کی پختگی اور اس کے جوش کی جولانی اسے راجپوتانہ کے اس علاقہ میں لے جاتی ہے جہاں کفر کی کالی رات چھائی ہوئی ہے۔ ایک آمر مطلق راجہ وہاں کا حکمران ہے، وہ ظالم راجہ کی اس ریاست کے کسی دور افتادہ گوشہ کو اپنا مسکن نہیں بناتا، بلکہ اس کی راجدھانی میں جا کر اپنا مصلیٰ بچھا دیتا ہے۔ ساری آبادی بت پرست ہے اور اپنے ان مشرکانہ عقائد میں حد درجہ غلو رکھتی ہے۔ وہ اپنے ان معبودوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا تک نہیں کر سکتی۔ جگہ جگہ

مندر موجود ہیں۔ بڑے بڑے برہمن ان لوگوں کے عقائد اور نظریات کی حفاظت کے لئے ہر قسم کے علوم و فنون سے مسلح ہیں۔ مسند حکومت پر پرتھوی راج جیسا جابر، ظالم اور متعصب ہندو راجہ براجمان ہے۔ اس ناساز گار ماحول میں جو شخص حق کی دعوت دیتا ہے اور ہر قسم کے خطرات کے سامنے سینہ سپر ہوتا ہے اور پھر اسلام کے پرچم کو یوں لہراتا ہے کہ اسے صدیوں کے انقلابات بھی سرنگوں نہیں کر سکتے۔ وہ شخص کون ہے؟ وہ ایک صوفی ہے۔ تصوف کے رنگ میں اس کا ظاہر اور باطن، اس کا ذہن، اس کا دل، اس کی سوچ اور اس کا نطق سب رنگے ہوئے ہیں۔ کیا ایسے شخص کے بارے میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیمات قوائے عمل کو مفلوج کر دینے والی ہیں۔ وہ رزمگاہ حیات سے فرار کا راستہ بتاتا ہے۔ اگر آپ میں یہ جرأت ہے تو آپ کہئے اور کہتے رہئے۔ لیکن آپ کے غل مچانے سے حقیقت مسخ نہیں ہو سکتی۔ اس کی خانقاہ کے فیض یافتہ صوفی ہندوستان کے شرق و غرب میں پھیل جاتے ہیں اور کفر و شرک کا اندھیرا جو صدیوں سے یہاں خیمہ زن تھا اس کو اپنے نعرۂ قلندرانہ سے نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کاش اس قسم کے نفوس قدسیہ ملت کو ہمیشہ نصیب ہوتے!

شائد معترضین کے علم میں نہ ہو کہ جب چنگیری طوفان نے دنیائے اسلام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ ہزاروں آباد شہر ویران کر دیئے گئے تھے۔ لاکھوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ عروس البلاد بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ عقل و دانش کے پرستار اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے۔ معلوم ہے آپ کو کس نے ان سرکش طوفانوں کا رخ موڑا تھا، کس نے اسلام کے دشمنوں کو اسلام کی شمع کا پروانہ بنا دیا تھا۔ وہ انہی صوفیا کے گروہ کا فرد تھا جس کی ایک نظر نے ساری فضا کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک خراسانی بزرگ جو سلسلہ عالیہ قادریہ سے نسبت رکھتے تھے اشارۂ غیبی کے تحت ہلاکو خان کے بیٹے تگودار خان کو دعوت اسلام دینے کے لئے تشریف لائے۔ وہ شکار سے واپس آرہا تھا۔ اپنے محل کے دروازے پر ایک درویش کو دیکھ کر اس نے ازراہ تمسخر پوچھا:

"اے درویش! تمہاری داڑھی کے بال اچھے ہیں یا میرے کتے کی دم؟"

اس بیہودہ سوال پر آپ قطعاً برہم نہ ہوئے۔ بڑے تحمل سے فرمایا:

"اگر میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرلوں تو میری داڑھی کے بال اچھے ہیں ورنہ آپ کے کتے کی دم اچھی ہے جو آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور آپ کے لئے شکار کی خدمت انجام دیتا ہے"۔

تنگودار خان، اس غیر متوقع جواب سے بہت متاثر ہوا اور آپ کو مہمان کی حیثیت سے اپنے پاس ٹھہرایا اور آپ کی تبلیغ سے اس نے در پردہ اسلام قبول کر لیا، لیکن اپنی قوم کی مخالفت کے خوف سے اس کا اظہار نہ کیا۔ انہیں یہ کہہ کر رخصت کیا کہ سر دست آپ تشریف لے جائیں، میں اپنی قوم کو ذہنی طور پر اسلام قبول کرنے پر آمادہ کروں گا۔ چنانچہ آپ وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ تنگودار خان کے پاس جائے اور اسے اپنا وعدہ یاد دلائے۔ کچھ عرصہ بعد وہ تنگودار خان کے پاس پہنچے، اس سے اپنا تعارف کرایا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ اس نے کہا کہ دوسرے تمام سردار اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں، لیکن فلاں سردار ابھی اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ راہ راست پر آ جائے تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ آپ نے اسے بلا بھیجا اور تبلیغ کی۔ اس نے کہا میری ساری عمر میدان جنگ میں گزری ہے۔ میں علمی دلائل کو نہیں سمجھ سکتا۔ میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ یہ درویش میرے پہلوان سے مقابلہ کرے۔ اگر اسے یہ بچھاڑ دے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ تنگودار خان نے آپ کا نحیف و لاغر جسم دیکھ کر اس مطالبہ کو مسترد کرنا چاہا، لیکن آپ نے اس کا چیلنج منظور کر لیا۔ مقابلہ کے لئے تاریخ اور جگہ کا تعین ہو گیا۔ مقررہ دن بے شمار مخلوقات یہ عجیب و غریب دنگل دیکھنے کے لئے جمع ہو گئی۔ ایک طرف نحیف و کمزور پیر فرتوت اور دوسری طرف ایک پیل تن گرانڈیل نوجوان۔ تنگودار خان نے بڑی کوشش کی کہ یہ مقابلہ نہ ہو لیکن وہ درویش مقابلہ کرنے کے لئے مصر تھا۔ جب دونوں پہلوان اکھاڑے میں نکلے تو آپ نے اس زور سے اپنے حریف کو ایک طمانچہ مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ غش کھا کر زمین پر آ گرا۔ وہ سردار حسب وعدہ میدان میں نکل آیا۔

آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ تگودار خان نے بھی اپنے ایمان کا اظہار کر کے اپنا نام احمد رکھا۔

ہلاکو خان کا ایک چچازاد بھائی تھا جس کا نام برکہ تھا، اسے بھی حضرت شیخ شمس الدین باخوری رحمۃ اللہ علیہ نے مشرف باسلام کیا۔ اس طرح ان پاک نہاد صوفیا کی جرأت ایمانی اور دلآویز اسلوب تبلیغ کے طفیل پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔ فتح قسطنطنیہ، اسلامی فتوحات کی تاریخ کا ایک لافانی واقعہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بائیس سالہ سلطان محمد کو کس نے اس کٹھن مہم کو سر کرنے کے لئے برانگیختہ کیا۔ وہ ایک صوفی تھے۔ حضرت عاق شمس الدین جو سلطان محمد کے مرشد طریقت تھے۔ انہی کی ترغیب اور بشارت سے سلطان نے یہ بے نظیر کارنامہ انجام دیا۔

جن صوفیا کی مساعی جمیلہ کے صدقے دنیا میں اسلام پھیلا، قلعے اور شہر فتح ہوئے قوموں اور ملکوں کے مقدر سنور گئے، ان کے بارے میں اسی ملت کے افراد اگر یہ کہیں کہ تصوف ایک افیون ہے، یہ غور و فکر کی قوتوں کو شل کر دیتا ہے، قوائے عمل کو اپاہج بنا دیتا ہے تو اس زیادتی پر کس سے شکوہ کیا جائے؟

آیئے بیگانوں سے پوچھئے کہ وہ صوفیا کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"یورپ کے مستشرق جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا بلکہ بقول پروفیسر ہٹی (HITTI) اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبی اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ہالینڈ کے ایک فاضل لو کے گارد نے دبے انداز میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ گو اسلام کا سیاسی زوال تو بارہا ہوا، لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ (1)

1۔ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت

پروفیسر موصوف نے ایک مشہور مستشرق ایچ اے آر گب (GIBB) کی ایک تقریر کا حوالہ بھی دیا ہے جو انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی مجلس کے سامنے کی تھی۔ گب نے کہا:

''تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا، لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہوسکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیا کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔''

اسلام کے مخالف اور بدخواہ تو اس طوفانی قوت کا اندازہ کر کے لرزہ براندام ہیں جو تصوف کے چشمہ شیریں سے ملت کو حاصل ہوتی ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور شکوک وشبہات کے خس وخاشاک سے اس چشمہ صافی کو گدلا کرنے کے درپے ہیں۔

تحریک پاکستان میں صوفیائے کرام نے جو شاندار کردار انجام دیا ہے یہ تو کل کی بات ہے، اس کا کون انکار کرسکتا ہے۔

عصر حاضر مادیت گزیدہ ہے۔ ہر شخص مادی ثروت، مادی لذتوں اور مسرتوں اور مادی جاہ ومنصب کے حصول کے لئے دیوانہ وار مصروف عمل ہے۔ اس دور میں اسے اس کی قطعاً کوئی پروانہیں کہ پاکیزہ اخلاقی قدریں کس طرح پامال ہورہی ہیں۔ روحانیت کا رخ زیبا کیونکر مسخ ہورہا ہے اور دل کی دنیا طمع وحرص اور حسد وبغض کی آلائشوں سے کس قدر متعفن ہو رہی ہے۔ اگر یہ دیوانگی ہمیں کسی اچھے انجام سے دوچار کر دیتی ہے تو ہم قطعاً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرتے، لیکن ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم بڑی سرعت سے زوال وانحطاط کے گڑھے کے قریب ہوتے جارہے ہیں اور یہ ایسا گڑھا ہے جس میں جو قوم گری ہے پھر اسے ابھرنا نصیب نہیں ہوا۔ ملت کے بہی خواہوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی جملہ علمی، روحانی اور عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی ملت کو اس گڑھے میں گرنے سے بچائیں۔ اس کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ان پاکیزہ فطرت ہستیوں کی زندگی کا مرقع زیبا پیش کریں۔ جہاں للّٰہیت، خلوص، قناعت، استغناء، عالی حوصلگی، جرأت،

سخاوت اور ہر انسان سے بے پناہ ہمدردی کے انوار قلب ونظر کو روشنی بخش رہے ہوں۔ اور یہ ساری خوبیاں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ صوفیائے کرام کی سوانح حیات میں ہی دستیاب ہوسکتی ہیں۔

اسی فرض کی ادائیگی کے احساس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اپنے نوجوانوں کی خدمت میں اس یگانہ روزگار درویش، اس فقید المثال مرد حق، سراپا نور وضیاء مرشد وہادی کی سیرت طیبہ کے چند دلنواز پہلو پیش کر کے ان وارفتگان حسن غیر کو یہ کہہ کر جھنجھوڑ سکوں ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی

حضرت کا اسم گرامی علی ہے اور آپ کی کنیت ابوالحسن ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت افغانستان کے ایک مردم خیز خطہ غزنی میں ہوئی جو غازی سلطان محمود بت شکن کا وطن ہے۔ غزنی کے دو محلے تھے: ایک کا نام جلاب اور دوسرے کا نام ہجویر تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک محلہ میں آپ کے ددھال اور دوسرے محلہ میں آپ کے ننھال سکونت پذیر تھے۔ آپ کی ابتدائی زندگی کا کچھ عرصہ محلہ جلاب میں بسر ہوا اور کچھ عرصہ محلہ ہجویر میں سکونت رہی۔ اسی لئے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ یہ دونوں نسبتیں مذکور ہوتی ہیں۔ کشف المحجوب میں آپ نے خود اپنا اسم مبارک یوں رقم فرمایا ہے: علی بن عثمان بن علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویری۔

سلسلہ نسب

آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا ہے:

حضرت علی ہجویری بن عثمان بن علی بن عبدالرحمٰن بن شجاع بن ابی الحسن علی بن حسن اصغر بن زید بن حضرت امام حسن بن امام الاولیا والاصفیا سیدنا علی المرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم ورضی اللہ تعالیٰ عنہ وعن آلہ الکریم۔

اس سے معلوم ہوا آپ ہاشمی سید ہیں اور حسنی ہیں۔

خاندان

غزنی میں آپ کا خاندان وہاں کے عوام وخواص کی عقیدت کا مرکز تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی عابدہ، زاہدہ، خدا رسیدہ خاتون تھیں۔ آپ حسینی سادات سے تھیں۔ گویا حسنی جمال اور حسینی جلال کی جملہ رعنائیاں اور دلفریبیاں سمٹ کر آپ کی ذات بابرکات میں مجتمع ہوگئی تھیں۔ آپ کے ماموں تاج الاولیا کے معزز لقب سے مشہور تھے۔ داراشکوہ جب اپنے والد شاہجہان کے ہمراہ افغانستان کی سیر کے لئے گیا تو اس نے تاج الاولیا کے مزار پرانوار

پر بھی حاضری دی اور روحانی فیوض و برکات سے اپنا دامن معمور کیا۔ حضرت تاج الاولیا کے مزار پرانوار کے ساتھ ہی ان کی ہمشیرہ یعنی حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ کی مرقد مبارک بھی ہے۔

ولادت

تذکرہ نگاروں نے آپ کے ذاتی اور خاندانی حالات کے بارے میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔ اس لئے تفصیلات کی جستجو کرنے والوں کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے سال ولادت کے بارے میں بھی آپ کے تذکرہ نگاروں میں اتفاق رائے نہیں۔ اندازہ کے طور پر ہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا سال ولادت ۴۰۰ ہجری ہے۔ یہ دور سلطنت غزنی کے عروج کا دور تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی حکومت کے آخری ایام تھے یا سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ آپ تحریر فرمادیتے تو پھر بحث وتکرار کی گنجائش نہ رہتی۔ عجز وانکسار اولیاء اللہ کا شعار ہے۔ آپ نے بھی شاید ازراہ تواضع اپنی تاریخ پیدائش کو کوئی اہم تاریخی واقعہ قرار نہ دیتے ہوئے اس کی تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی۔

حالات زندگی

ہمارے نزدیک آپ کے حالات زندگی کا سب سے باوثوق مرجع آپ کی تصنیف کشف المحجوب ہے۔ اسی کے مطالعہ سے آپ کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں آپ نے جگہ جگہ اشارے کئے ہیں کہ آپ کو بچپن سے ہی حصول علم کا شوق بے چین رکھتا تھا اور آپ نے اپنے زمانہ کے جلیل القدر علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اکتساب فیض کیا۔ آپ نے صرف اپنے علاقہ کے علماء ہی سے تحصیل علم پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ شام، عراق، بغداد، مدائن، فارس، کوہستان، آذر بائیجان، طبرستان، خوزستان، خراسان اور ماوراء النہر کے اسلامی صوبوں میں مشہور علماء وفضلاء سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حصول علم کے لئے سفر کی صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ علوم و معارف کے سمندر پی

جانے کے باوجود شوق علم کی بے تابیاں کم نہ ہوئیں۔آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

''فقط خراسان میں تین سو مشائخ کی خدمت میں حاضری دی''۔

اور ان کے علم و حکمت کے پر بہار گلستانوں سے گل چینی کر کے اپنا دامن بھرتے رہے۔آپ کے بیشمار اساتذہ میں سے دو اساتذہ کا ذکر آپ نے کشف المحجوب میں انتہائی ادب واحترام سے کیا ہے۔ایک کا اسم گرامی شیخ ابو العباس احمد بن محمد الاشقانی ہے، دوسرے کا نام نامی شیخ ابو القاسم علی گرگانی رحمۃ اللہ علیہما ہے۔پروفیسر نکلسن جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے استاد رہے ہیں اور جنہیں کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ آپ کے شوق علم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ نے اسلامی مملکت کے دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کیا۔شام سے ترکستان تک، سندھ سے بحر کیسپین تک کا علاقہ چھان مارا(1)۔''

تحصیل علم کے بعد مرشد کامل کی تلاش میں آپ نے بڑے طویل سفر کئے۔آپ کی طلب صادق پر اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور آپ کی رسائی اس شیخ کامل تک ہوئی جن کے حسن تربیت اور فیض نظر کے باعث آپ سپہر معرفت پر آفتاب عالمتاب بن کر طلوع ہوئے اور اب تک دنیا ان کی ضوفشانیوں سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

ہم جب اولیائے کاملین کی سیرتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک قدر مشترک ہمیں ہر جگہ نظر آتی ہے کہ یہ نفوس قدسیہ پہلے ظاہری علوم میں مہارت و کمال حاصل کرتے اور اس کے بعد جادۂ عشق و محبت الٰہی پر قدم رکھتے اور اس وقت تک مصروف جہاد رہتے جب تک شاہد حقیقی ان کے شوق کی بے تابیوں پر رحم فرماتے ہوئے حریم ذات کے دروازے ان کے لئے نہ کھول دیتا ؎

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

آپ کے شیخ کامل کا اسم گرامی شیخ ابو الفضل بن حسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ ہے جو سلسلہ

1۔ نکلسن، مقدمہ انگریزی ترجمہ کشف المحجوب

جنیدیہ کے شیخ کامل تھے۔ سلسلہ بیعت یوں ہے:

"حضرت شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی ان کے شیخ کا اسم گرامی شیخ ابوالحسن حصری ہے ان کے شیخ کا اسم گرامی شیخ ابوبکر شبلی ہے جو مرید تھے حضرت جنید بغدادی کے وہ مرید تھے حضرت شیخ سری سقطی کے۔ ان کی بیعت حضرت معروف کرخی سے تھی وہ حضرت داؤد طائی کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ حضرت داؤد طائی کی بیعت حضرت حبیب عجمی سے تھی اور وہ مرید تھے حضرت خواجہ حسن بصری کے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جنہیں فیضان طریقت ارزانی ہوا تھا حضرت امیر المومنین علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے جن کی پرورش آغوش نبوت میں ہوئی جو فیضان رسالت سے فیضیاب ہوئے۔ سرور کائنات فخر موجودات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"۔

شیخ ابوالفضل ختلی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ جن بزرگوں سے آپ نے فیضان حاصل کیا، ان میں سے حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ اور رسالہ قشیریہ کے منصف امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اپنے شیخ ختلی کے بارے میں حضرت داتا صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں:

> "وہ صوفیائے متاخرین میں زینت اوتاد اور شیخ عباد ہیں۔ طریقت میں میری بیعت انہی سے ہے، تصوف میں حضرت جنید کا مذہب رکھتے ہیں اور حضرت شیخ حصری کے رازدار مرید تھے۔"(1)

آپ سال ہا سال مرشد کامل کی خدمت میں شب و روز مصروف رہے حتیٰ کہ حضرت ابوالفضل ختلی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا تو ان کا سر مبارک حضرت علی ہجویری قدس سرہ کی گود میں تھا۔ اس سے اس قرب اور محبت کا بھی پتا چلتا ہے جو مرشد کامل کو اپنے نور نظر روحانی شاگرد سے تھی۔

فقہی مذہب

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

1۔ کشف المحجوب

کے مقلد تھے اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ کشف المحجوب میں جہاں بھی حضرت امام اعظم کا ذکر خیر آیا ہے آپ نے بڑے معزز القاب سے ان کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اس احترام وعقیدت کا پتا چلتا ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ کے بارے میں آپ کے دل میں تھا۔ کہیں ان کو امام اماماں، مقتدائے سنیاں کہا ہے اور کہیں شرف فقہاء اعز علماء کے الفاظ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ازدواجی زندگی

آپ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی کسی تذکرہ میں تفصیلات دستیاب نہیں، البتہ کشف المحجوب کے ایک حوالہ سے اس قدر پتا چلتا ہے کہ آپ نے شادی کی لیکن کچھ مدت کے بعد مفارقت ہوگئی۔ پھر آپ نے تازیست دوسری شادی نہیں کی۔

لاہور میں ورود مسعود

اپنے مرشد کامل کے وصال کے بعد آپ نے اپنے وطن غزنی کو خیر باد کہا اور تبلیغ اسلام کا شوق آپ کو کشاں کشاں بت کدۂ ہند میں لے آیا۔ آپ کے ہمراہ آپ کے دو دوست شیخ احمد سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابوسعید ہجویری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ اسلام کے یہ پرجوش مبلغ اگرچہ تعداد میں قلیل تھے لیکن ماحول کی اجنبیت، ساز وسامان کے فقدان اور مخالفین کے تشدد وتعصب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرنے کے لئے لاہور کی طرف روانہ ہوئے اور یہ راستے میں جہاں جہاں ٹھہرے، کفر وظلمت کے اندھیروں میں توحید کی شمعیں فروزاں کرتے آئے۔ جب سرزمین لاہور ان نفوس قدسیہ کی قدم بوسی سے مشرف ہوئی اس وقت لاہور میں سلطان محمود غزنوی کا لڑکا سلطان مسعود غزنوی سریر آرائے مملکت تھا۔

اس کا عہد حکومت ۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ ہجری ہے۔ لیکن لاہور میں آپ کی آمد کے سال کا تعین مشکل ہے۔ اگر آپ کا سال وصال ۴۶۵ھ تسلیم کیا جائے تو لاہور میں آپ کے قیام کی مدت ۳۰ سال سے زائد بنتی ہے۔ اس عرصہ میں آپ شب و روز اسلام کی تبلیغ میں

مصروف رہے۔آپ کی بے داغ اور دلکش سیرت، پرنور شخصیت، آپ کے پرخلوص دل سے نکلے ہوئے اور دلوں میں اتر جانے والے مواعظ حسنہ لوگوں کو کفر و ضلالت کی دلدل سے نکال کر صراط مستقیم پر گامزن کرتے رہے۔

جن خوش نصیب لوگوں نے آپ کے دست ہدایت پر اسلام کی بیعت کی اور آپ کے فیض نگاہ کی برکت سے ان کے لوح قلب پر کلمہ توحید یوں نقش ہوا کہ صرف وہی تادم واپسیں اس کی لذت سے سرشار نہیں رہے بلکہ ساڑھے نو صدیاں گزرنے کے باوجود ان کی نسلیں بھی اسی ذوق وشوق کے ساتھ اسی کلمہ توحید کا ورد کر رہی ہیں۔اور جب بھی وقت آتا ہے تو پرچم توحید کو بلند کرنے کے لئے بلا تامل بصد مسرت اپنے سروں کے نذرانے پیش کر دیتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے بندوں کی یہی خصوصیت ہے کہ ان کا پڑھایا ہوا سبق فراموش نہیں ہوتا بلکہ گردش لیل ونہار اور حوادثات دہر کے باوجود اس کی سرمستیاں بڑھتی رہتی ہیں، اس کی آب وتاب میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ایک درویش جس کے پاس نہ خزانہ ہے، نہ لشکر اور نہ دنیوی وسائل ہیں اور نہ جاہ وحشمت، اپنے مصلے پر بیٹھا ہے، اپنے معبود برحق کی یاد میں ہمہ وقت مصروف ہے۔اللہ تعالیٰ کے انوار وتجلیات کے نزول کے باعث اسے وہ شان دلربائی عطا کر دی جاتی ہے کہ لوگ اس کے رخ زیبا کو دیکھتے ہی اپنے زنار توڑ دیتے ہیں۔ اپنے آبائی عقیدوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔کل تک جن بتوں کی وہ پرستش کر رہے تھے، آج اپنے ہاتھوں سے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس خداوند قدوس کی بارگاہ بیکس پناہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان سجدہ ریزیوں میں انہیں جو لطف، جو سرور، جو کیف میسر ہوتا ہے اس پر وہ اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

غزنوی خاندان کے باہمت فاتحین نے ممالک فتح کئے، قلعے سر کئے اور شاہی محلات پر اپنے پرچم لہرائے، لیکن ہجویر سے آئے ہوئے اس غریب الدیار درویش نے قلوب کی اقالیم کو مسخر کیا اور تعصب اور ہٹ دھرمی کے قلعوں کو پیوند خاک کیا اور جہالت وگمراہی کے پردوں کو سرکا کر حقیقت کے رخ زیبا کو یوں بے نقاب کیا کہ ہر صاحب قلب سلیم دیوانہ وار

اس پر سو جان سے نثار ہونے لگا۔

وصال

آپ کی تاریخ وصال کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ پروفیسر نکلسن نے آپ کے وصال کے بارے میں لکھا ہے کہ ۴۵۶ تا ۴۶۵ھ کا کوئی درمیانی سال آپ کا سال وفات ہے۔ لیکن جامی لاہوری کا کتبہ جو پہلے آستانہ عالیہ کے دروازہ پر نصب تھا اس میں وفات کی تاریخ لفظ "سردار" سے نکالی گئی ہے اس طرح سال وصال ۴۶۵ھ بنتا ہے۔

خانقاہ علی ہجویری ست خاک جاروب از درش بردار
طوطیا کن بدیدہ حق بیں تاشوئی واقف دراسرار
چونکہ سردار ملک معنی بود سال وصلش برآیداز سردار

تصانیف

آپ ایک بلند پایہ عالم، بالغ نظر محقق اور معقول و منقول کے جامع تھے اور اس کے ساتھ آپ کا باطن نور عرفاں سے جگمگا رہا تھا۔ آپ نے مختلف اہم موضوعات پر متعدد کتب تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ دیوان، جو آپ کے اشعار کا مجموعہ تھا ۲۔ کتاب فنا و بقا
۳۔ اسرار الخلق والمؤنات ۴۔ کتاب البیان لاہل العیان
۵۔ بحر القلوب ۶۔ الرعایہ لحقوق اللہ
۷۔ منہاج الدین ۸۔ شرح کلام منصور الحلاج

لیکن بصد افسوس یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان گراں مایہ تصنیفات میں سے کوئی کتاب بھی اس وقت موجود نہیں۔ بعض کتابیں لوگوں نے سرقہ کر لیں اور انہیں اپنی طرف منسوب کر دیا۔ اس کا ذکر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حسرت و تاسف کے ساتھ کشف المحجوب میں کیا ہے اور دوسری کتب ویسے ناپید ہو گئیں۔ اس وقت آپ کی تصنیفات میں سے صرف ایک نادر روزگار کتاب موجود ہے جس کا نام "کشف المحجوب" ہے۔

کچھ کشف المحجوب کے بارے میں

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تصنیف کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے مصنف سے لگایا جاتا ہے۔ جس کتاب کا مصنف اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ، عارف کامل، عالم ربانی حضرت ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری الجلابی رحمۃ اللہ علیہ جیسی فقید المثال ہستی ہو، اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ہر زمانہ کے اہل علم اور ارباب طریقت و حقیقت نے اس کتاب کی عظمت اور افادیت کا اعتراف کیا ہے، انہی میں سے چند ایک کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت مولانا جامی قدس سرہ اپنی مشہور عالم کتاب ''نفحات الانس'' میں حضرت گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> عالم و عارف بود و صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است، صاحب کتاب کشف المحجوب است کہ از کتب معتبرہ مشہورہ دریں فن است و لطائف و حقائق بسیار درآں کتاب جمع کردہ است۔

> ''آپ عالم بھی تھے اور رموز و حقائق کے عارف بھی تھے۔ کثیر التعداد مشائخ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور آپ کشف المحجوب کے مصنف ہیں اور یہ کتاب فن تصوف کی معتبر اور مشہور کتب میں سے ہے۔ آپ نے اس کتاب میں بے شمار لطائف و حقائق کو جمع کر دیا ہے۔''

مفتی غلام سرور لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جو ایک بلند پایہ مصنف ہیں اور اپنے عصر میں ان کا شمار محققین میں ہوتا تھا تصوف اور صوفیا کے بارے میں ان کی ذات ایک گراں قدر منبع و ماخذ تھی۔ آپ ''خزینۃ الاصفیا'' میں لکھتے ہیں:

> شیخ علی ہجویری را تصانیف بسیار است۔ اما کشف المحجوب از مشہور و معروف ترین

کتب وے است و ہیچ کس را بروئے جائے سخن نے بلکہ پیش ازیں کتب تصوف، ہیچ کتابے بزبان فارسی تصنیف شدہ بود۔

"حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی تصانیف ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف کتاب کشف المحجوب ہے۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ اس پر کوئی اعتراض کر سکے یا تنقید کر سکے۔ علم تصوف میں یہ پہلی تصنیف ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے"۔

سب سے زیادہ گرانقدر اور صحیح رائے وہ ہے جو سلطان المشائخ نظام الحق والدین حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ فوائد الفواد میں لکھا ہے، آپ نے فرمایا:

"جس کا کوئی مرشد نہ ہو اسے اس کتاب کے مطالعہ کی برکت سے مرشد مل جائے گا"۔

کشف المحجوب کے زندہ جاوید ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ لوگوں کا رجحان مادہ پرستی کی طرف ہے، اپنے اور بیگانے آج بھی اس کتاب کی تحقیق اور اس کی معیاری طباعت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم مستشرقین اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کر رہے ہیں۔ انگریز مستشرقین میں سے پروفیسر نکلسن جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر تھے، نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے اور ترجمہ کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسی طرح اشترا کی روس کے مستشرق پروفیسر "زوکوفسکی، نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے کشف المحجوب کے ایک قدیم نسخہ کی تصحیح کے لئے اپنی زندگی کے کئی قیمتی سال صرف کئے اور فارسی زبان میں ایک محققانہ مقدمہ لکھ کر اسے لینن گراڈ سے شائع کیا۔ وہ خطہ جو خدا کے وجود کا ہی منکر ہے، دین اور روحانیت کو لغو اور فضول سمجھتا ہے، اس کے ایک فاضل نے بھی اس کتاب کی تحقیق، تصحیح اور تشریح میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور ایک محققانہ مقدمہ کا اضافہ کر کے اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کو خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوا۔

اردو میں بھی بے شمار اہل علم و فضل نے کشف المحجوب کے تراجم کئے ہیں، لیکن جو ترجمہ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے عقیدت مندوں، اسلامی تصوف کے قدر دانوں اور نقادوں کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے، اس کے مطالعہ کے بعد قارئین خود اس کی انفرادیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

گنج بخش کا لقب

حضرت کی ذات والا صفات اپنے نام سے زیادہ اس معزز لقب سے اکناف عالم میں مشہور و معروف ہے۔ اہل تحقیق نے اس لقب کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت سلطان الہند خواجہ خواجگان معین الحق والدین اجمیری قدس سرہ العزیز آنجناب کے مزار پر انوار پر حاضر ہوئے اور ایک حجرہ میں چالیس دن تک مصروف عبادت و ریاضت رہے۔ اس عرصہ میں حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ پر اپنے لطف و عنایت کی وہ بارش کی جس کا اندازہ حضرت غریب نواز ہی لگا سکتے ہیں۔ آپ نے جب آستانہ عالیہ سے رخصت ہونے کا ارادہ فرمایا تو بے ساختہ آپ کی زبان پر حضرت علی ہجویری کی مدح میں یہ شعر جاری ہو گیا ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

مرد خدا کی زبان سے نکلا ہوا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ یوں آپ گنج بخش کے معزز لقب سے معروف ہوئے۔

آپ کے بعد ہر زمانہ میں اولیائے کاملین اور علمائے ربانیین آپ کے در اقدس پر حاضر ہوتے رہے اور آپ کے دستر خوان جود و کرم سے جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ اولیائے کرام کے مزارات مقدسہ پر حاضری کو بدعت و شرک ثابت کرنے کی ایک تند و تیز مہم جاری ہے، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی ذات انور کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ رات دن طالبان حق کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، بارش ہو یا دھوپ، دن ہو یا رات کوئی لمحہ ایسا نہیں جب بندگان خدا کا ہجوم اللہ تعالیٰ کے اس محبوب

اور برگزیدہ بندے کے آستانہ عالیہ پر حاضری کا شرف حاصل نہ کر رہا ہو۔ وہاں پہنچ کر ہی اس آیت کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (بقرہ:152)

''اے میرے بندو! تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، تم میری پیہم نعمتوں اور احسانات کا شکریہ ادا کرتے رہو اور ناشکری کا انداز مت اختیار کرو''۔

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات مستعار میں اپنے رب کو یاد رکھا اور اب اللہ تعالیٰ تا ابد اپنے اس بندے کی یاد کو تازہ رکھے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو وعدہ فرماتا ہے وہ پورا کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (آل عمران)

سید ہجویر مخدوم امم — مرقد او پیر سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گیخت — در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروق از جمالش تازہ شد — حق زحرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب — از نگاہش خانہ باطل خراب
خاک پنجاب ازدم او زندہ گشت — صبح ما از مہر او تابندہ گشت
عاشق وہم قاصد طیار عشق — از جبینش آشکار اسرار عشق[1]

خاک راہ صاحبدلاں

اسلام آباد ۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ — محمد کرم شاہ

مطابق ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء — زیب سجادہ آستانہ عالیہ بھیرہ شریف

ضلع سرگودھا

جسٹس شریعت اپیلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان

اسلام آباد

1۔ اقبال: اسرار خودی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔ الحمد لله الذی کشف لأولائه بواطن ملکوته وقشع لأصفيائه سرائر جبروته وأراق دم المحبين بسيف جلاله واذاق سر العارفين روح وصاله هو المحي الموات القلوب بأنوار إدراكه والمنعش لها براحة روح المعرفة بنشر أسمائه والصّلوة والسّلام علی رسوله محمد وعلی آله وأصحابه و أزواجه

''اے ہمارے پروردگار! ہم پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرما اور ہمارے اعمال کو نیکیوں سے آراستہ کر۔ تمام تعریف اس ذات پاک کے لئے ہے جس نے اپنے اولیاء کے لئے عالم ملکوت کے راز کھولے اور اپنے برگزیدہ بندوں کو اسرار جبروت سے آشنا کیا اپنے محبت کرنے والوں کا خون جلال کی شمشیر سے بہایا۔ اپنے پہچاننے والوں کو وصال کی مسرتوں سے نوازا۔ وہی اپنی بلندی اور بے نیازی کے نور سے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے وہی اپنی معرفت اور اپنے اسمائے بلند کی خوشبو سے قلوب کو گرماتا ہے۔ خدا کی رحمت اور سلام ہو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر، آپ کی آل، آپ کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات پر''۔

علی بن عثمان بن ابی علی جلابی غزنوی ہجویری کہتا ہے:

کہ اے طالب صادق! باری تعالیٰ تجھے سعادت نصیب کرے میں نے استخارہ کیا اور دل میں نمودار ہونے والی ہر غرض سے منہ پھیرا اور تیری استدعا پر (اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت بنائے) تیار ہو کر تیری مراد کے مطابق اس کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا اور اس کا نام ''کشف المحجوب'' رکھا۔ تیرا مقصد ظاہر ہوا اور تیرے مطلب کی بات اس کتاب کو مقسوم ہوئی۔ میں باری تعالیٰ سے اس کی تکمیل کے لئے مدد اور توفیق کا طالب ہوں اور گفتار و کردار میں اپنی طاقت اور بساط سے برات کا اظہار کرتا ہوں۔ سب توفیق اللہ تعالیٰ ہی کی طرف

سے ہے۔

فصل: نام ذکر کرنے کی وجہ

میں نے کتاب کے شروع میں اپنا نام تحریر کیا ہے اس سے دو چیزیں مراد ہیں: ایک خاص لوگوں سے متعلق ہے اور دوسری عوام سے۔ عوام سے متعلق تو یہ ہے کہ جب علم سے بے بہرہ لوگ دیکھتے ہیں کہ کسی کتاب پر مصنف کا نام ثبت نہیں تو افتراء پردازی سے کام لے کر وہ اسے اپنی تصنیف ظاہر کرتے ہیں اس طرح اصلی مصنف کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جمع تالیف اور تصنیف سے مراد یہی ہوتی ہے کہ مصنف کا نام زندہ رہے۔ پڑھنے والے اور علم کا ذوق رکھنے والے اسے دعائے خیر سے یاد کریں۔ یہ حادثہ مجھے دو بار پیش آیا۔ ایک بار تو میرے اشعار کا دیوان کسی نے مانگا اور لے گیا، اس کے سوا میرے پاس کوئی اور نسخہ نہ تھا۔ اس نے دیوان کو بالکل بدل دیا میرا نام اس پر سے مٹا دیا اور میری تمام محنت کو برباد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے۔ دوسری بار میں نے ایک کتاب طریق تصوف پر ''منہاج الدین'' تصنیف کی (اللہ تبارک وتعالیٰ اسے رواج دے) ایک مدعی نااہل نے جس کا نام میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا میرا نام اس پر سے مٹایا اور لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ اس کی تصنیف ہے۔ خاص لوگوں نے، جو اس کی قابلیت اور علمی بے بضاعتی سے واقف تھے، اس کی جسارت کا مذاق اڑایا۔ باری تعالیٰ نے اس پر نحوست طاری کی اور اس کا نام طالبان حق کی فہرست سے مٹا دیا۔

اور جہاں تک خاص لوگوں کی بات ہے تو ان سے متعلق یہ ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کتاب کا مصنف اس علم اور اس فن کا عالم اور محقق ہے تو وہ اس کے حقوق کی پوری رعایت رکھتے ہیں اور کتاب کا مطالعہ کرنے اور اسے یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کتاب لکھنے والے کا مقصد بطریق احسن پورا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے۔

فصل: کام سے پہلے استخارہ ضروری ہے

میں نے استخارہ کا ذکر کیا تھا اس کا مطلب آداب خداوند تعالیٰ کو ملحوظ رکھنا ہے۔ باری

تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ اور آپ کی امت کے لئے فرمایا:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾ (النحل)

''قرآن پڑھتے وقت اللہ تعالیٰ کی جناب سے شیطان مردود کے وسوسوں سے پناہ مانگو''۔

استعاذت، استخارت اور استعانت کا مطلب مدد مانگنا، اپنے کاموں کو سپرد خدا کرنا اور مختلف مصائب سے نجات حاصل کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ استخارہ کی ترغیب فرماتے جیسے مذکورہ آیت میں استعاذہ کی تاکید آئی ہے۔ انسان جانتا ہے کہ کسی چیز کی کامیابی اس کی اپنی تدابیر اور بساط پر منحصر نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی ذات پاک اس کی بہتری جانتی ہے۔ نیکی اور بدی سب اسی کے تابع فرمان ہے اور ہر چیز پہلے ہی مقدر ہو چکی ہے اس لئے ہر چیز کو اسی ذات کے سپرد کر دینا چاہئے۔ یہ لازم ہے کہ اسی کی استعانت طلب کی جائے اور اسی کی رضا پر سر تسلیم خم کیا جائے تاکہ اس کا فضل و کرم نفس کی رعونت اور شر کو نابود کر دے اور ہر کام میں کامیابی اور کامرانی شامل حال رہے۔ ہر کام کے آغاز میں استخارہ ضروری ہے تاکہ باری تعالیٰ آفات و خطرات سے اور فساد و لغزش سے محفوظ رکھے۔ وباللہ التوفیق

فصل: کام نفسانی غرض سے پاک ہو

اور یہ جو میں نے کہا کہ دل میں نمودار ہونیوالی ہر غرض سے میں نے منہ پھیرا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں بھی کوئی نفسانی غرض کارفرما ہو اس میں برکت نہیں رہتی اور دل راہ مستقیم سے بھٹک کر دنیا کے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں: یا نفس کی غرض پوری ہو جاتی ہے یا نہیں ہوتی اگر غرض پوری ہو جائے تو یہ چیز اس کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے کیونکہ دوزخ کی چابی نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اگر غرض پوری نہ ہو تو اس کا بوجھ بہت حد تک اس کے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی نجات ہے۔ درحقیقت نفسانی اغراض کو ختم کر دینا ہی بہشت کے دروازے کی چابی ہے۔ باری

تعالیٰ نے فرمایا:

وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ (النازعات)

''جس نے نفسانی خواہشات کو روکا ضرور جنت اس کی جائے رہائش ہوگی''۔

نفسانی خواہشات کی کارفرمائی یہ ہے کہ کسی کام میں باری تعالیٰ کی رضا مدنظر نہ ہو اور نہ ہی اپنے نفس کو عذاب سے بچانے کی خواہش ہو۔ رعونت نفسانی کی کوئی حد نہ رہے اور درماندگی نفس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کتاب میں مناسب جگہ پر اس بارے میں علیحدہ باب آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

فصل: ابتدا میں نیت ضروری ہے

اور میں نے جو یہ بات کہی کہ تیری استدعا پر تیار ہو کر تیری مراد کے مطابق اس کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ تو نے مجھے سوال کا جواب بہم پہنچانے کے قابل سمجھ کر اپنا سوال پوچھا اور اس کتاب کیلئے استدعا کی۔ تو مستفید ہونا چاہتا تھا اس لئے مجھ پر واجب ہوا کہ تیرے سوال کا کماحقہ جواب مہیا کروں۔ تیرے سوال کی پوری گہرائی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پورے عزم اور نیت کی ضرورت ہے تاکہ جواب حسب سوال مرتب ہو سکے۔ ابتدائے کار میں بندہ کا ارادہ نیت سے وابستہ ہوتا ہے۔ دوران کار اگر کوئی خلل واقع ہو تو بندہ معذور ہوتا ہے اس لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ(1)

''مومن کے لئے (ابتدا کی) نیت خیر عمل (بے نیت) سے بہتر ہے''۔

نیت کا انسانی امور میں بہت دخل ہے اور اس کی بین دلیل یہ ہے کہ انسان بوجہ نیت اکثر ڈگمگا جاتا ہے گو بظاہر کوئی اثر نظر نہ آئے۔ اگر کوئی شخص بغیر نیت روزہ عرصہ تک بھوکا رہے تو کسی ثواب کا مستحق نہیں۔ اگر روزہ کی نیت ہو تو بغیر کسی ظاہری اثر کے مقرب حق ہوگا

1۔ دیلمی: مسند الفردوس۔ طبرانی: المعجم الکبیر

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی شہر میں داخل ہو تو وہ شہر میں مقیم نہیں سمجھا جا سکتا جب تک نیت اقامت نہ کرے۔ اگر نیت اقامت ہو تو یقیناً مقیم سمجھا جائے گا۔ اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر کام کی ابتدا میں نیت خیر کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم

فصل: کتاب کی وجہ تسمیہ اور مقصد تالیف

اور یہ جو میں نے کہا کہ اس کتاب کا نام میں نے ''کشف المحجوب'' رکھا ہے مقصد یہ ہے کہ کتاب کے نام ہی سے اس کا مفہوم ظاہر ہو جائے اور اہل بصیرت جب نام سنیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ موضوع کتاب کیا ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ سوائے اولیائے کرام کے جو بارگاہ حق کے مقرب ہوتے ہیں، لوگ حقیقت آشنا نہیں ہوتے۔ چونکہ یہ کتاب راہ حقیقت کو نمایاں کرتی ہے، تحقیق امور کی شرح کرتی ہے اور بشریت کے پردوں کو اٹھاتی ہے۔ اس لیے اس کا نام ''کشف المحجوب'' ہی ہونا چاہئے تھا۔ اور حقیقت میں کشف، محجوب کی (چھپی ہوئی چیزوں کی) ہلاکت ہے(1)۔ جس طرح حجاب مکاشف کی (نمایاں چیزوں کی) نزدیکی کو دوری کی تاب نہیں ہوتی اور دوری کو نزدیکی کی طاقت نہیں۔ سرکہ میں جو جاندار پیدا ہو وہ سرکہ سے باہر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سرکہ کے باہر کا جاندار سرکہ میں مر جاتا ہے۔ اسرار و معانی کی تلاش بہت دشوار ہے بجز ان لوگوں کے جن کا مقصد حیات یہی ہو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کل میسرہ لما خلق لہ(2)

''باری تعالیٰ نے ہر کسی کو جس مقصد کیلئے پیدا کیا ہے اس کا سامان بہم پہنچایا ہے''۔

حجاب دو ہیں: ایک رینی، یہ کبھی دور نہیں ہوتا۔ دوسرا غینی، جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ کچھ لوگ بالطبع محجوب ہوتے ہیں اور وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کا حجاب وصفی یعنی عارضی ہوتا ہے وہ جویائے حق ہوتے ہیں اور باطل سے گریز

1۔ چھپی ہوئی چیزوں کا ظاہر ہونا اور ظاہر چیزوں کا چھپ جانا گویا ان کا ہلاک ہونا ہے۔
2۔ صحیح مسلم۔ سیوطی، الجامع الصغیر

کرتے ہیں۔ حجاب ذاتی یعنی رینی کبھی نہیں اٹھتا۔ رین، ختم اور طبع کے معنی ایک ہی ہیں۔
چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا۔

كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ (المطففین)

"بلکہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے۔"

پھر اس کا حکم اس طرح بیان فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ (البقرہ)

"جن لوگوں نے کفر کیا برابر ہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

پھر اس کی وجہ اس طرح بیان فرمائی:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (البقرہ:7)

"اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔"

اور یہ بھی فرمایا ہے۔

طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (التوبہ:93)

حجاب صفتی جسے غینی کہتے ہیں وہ کسی نہ کسی وقت دور ہو جاتا ہے۔ جبلت کا بدلنا یعنی ذاتی حجاب (رینی کا اٹھنا شاذ) بلکہ از روئے مشاہدہ ناممکن ہے لیکن صفتی عوارض بدل سکتے ہیں۔ مشائخ کرام نے رین اور غین کے معانی بیان کرنے میں نازک نکات بیان کئے ہیں چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الرین من جملة الوطنات و الغين من جمله الخطرات

"رین وطنات کی قبیل سے ہے اور غین خطرات کی قسم ہے۔"

وطن پائیدار ہوتا ہے اور خطر عارضی۔ پتھر سے شیشہ نہیں بنایا جا سکتا۔ چاہے دنیا بھر کے شیشہ گر جمع ہو جائیں، اس کے برعکس اگر آئینہ زنگ سے آلودہ ہو جائے تو صیقل سے صاف

ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلمت پتھر کی جبلت ہے اور روشنی آئینہ کی۔ آئینہ کی اصلیت قائم رہتی ہے اور اس کی عارضی صفت یعنی زنگ دور ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اس لئے لکھا کہ یہ ان دلوں کے زنگ کو دور کرے جو حجابات غینی میں مبتلا ہوں مگر نور حق کی جھلک ان کے اندر موجود ہو۔ اس کتاب کو پڑھنے کی برکت سے حجاب غینی اٹھ جائے اور حقیقت کی راہ روشن ہو جائے۔ جن لوگوں کی سرشت انکار حق اور اختیار باطل ہے وہ اس کی مدد سے راستہ نہیں پائیں گے اور ان کو مشاہدات حق نصیب نہیں ہوں گے۔ والحمد لله علی نعمة العرفان ''اور سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے عرفان کی نعمت عطا فرمائی''۔

فصل: جامع سوال، جامع جواب

اور یہ جو میں نے کہا کہ تیرا مقصد ظاہر ہوا اور تیرے مطلب کی بات اس کتاب کو مقسوم ہوئی اس سے مراد یہ تھی کہ جب تک سائل کا مقصد ظاہر نہ ہو کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ سوال اکثر مشتبہ ہوتے ہیں اور چونکہ جواب سے مشتبہ چیزیں حل نہیں ہوتیں اس لئے کوئی مفید مطلب چیز بھی حاصل نہیں ہوتی اور میں نے جو یہ بات کہی کہ تیرے مطلب کی بات اس کتاب کو مقسوم ہوئی اس سے مقصد یہ ہے کہ جامع سوال کا جواب بھی جامع ہوتا ہے اگر سائل اپنے سوال کے درجات سے کماحقہ واقف ہو۔ علاوہ ازیں مبتدی کے لئے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے اور اقسام و حدود کا بیان بھی لازمی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے سعادت نصیب کرے تیری غرض یہی تھی کہ میں جواب تفصیل سے بیان کروں اور بیان کو کتاب کی شکل دوں۔ وباللہ التوفیق

فصل: توفیق تائید ایزدی سے ملتی ہے

اور میں نے جو یہ کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے توفیق اور مدد مانگتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوائے خدا کی ذات کے بندے کا کوئی مددگار نہیں۔ وہی ہے جو اس کو نیک اعمال کی توفیق دیتا ہے۔ توفیق سے مراد نیک اعمال میں تائید ایزدی حاصل ہونا ہے۔ کتاب و سنت توفیق الٰہی کے وجود وصحت پر شاہد ہیں اور امت اس پر متفق، سوائے معتزلہ اور قدریہ جماعتوں کے جو

لفظ توفیق کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ اس طریقت کے مشائخ کے ایک گروہ کا قول ہے۔

التوفیق ھو القدرة علی الطاعة عند الاستعمال۔

''توفیق طاعت اور بندگی پر قادر ہونے کا نام ہے''۔

جب بندہ حکم خداوندی پر چلتا ہے تو اس کو باری تعالیٰ کی طرف سے قوت اور مدد عطا ہوتی ہے۔ وہ پہلے کی نسبت ترقی پاتا ہے ہر حال میں اور ساعت بساعت۔ انسان کی ہر حرکت اور سکون کا خالق خدائے تعالیٰ ہے جو طاقت اسے بندگی پر آمادہ کرتی ہے اسی کا نام توفیق ہے۔ یہ کتاب اس مسئلہ پر بحث کرنے کی چیز نہیں اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ میں بار دیگر تیرے مقصد کی بات چھیڑتا ہوں اور قبل اس کے کہ بیان شروع کروں تیرے سوال کو بعینہٖ تحریر کرتا ہوں اس کے بعد کتاب کا آغاز کروں گا۔ **وباللہ التوفیق**

سوال

سائل ابوسعید ہجویری نے کہا:

آپ بیان فرمائیں: طریق تصوف کی حقیقت، اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت، ان کے مختلف راستوں اور قوتوں کی توضیح اور نیز مطلع فرماویں ان کے اشارات اور رموز سے۔ خدائے تعالیٰ کی محبت کا حال اور دلوں میں اس کے ظہور کی کیفیت بھی واضح کریں۔

یہ بھی بیان فرماویں کہ عقل اس کی ماہیت سمجھنے سے کیوں قاصر ہے، نفس اس کی حقیقت معلوم کرنے سے کیوں نفور ہے، اور روح کو اس کی تعریف سے کیوں راحت ہے؟ یہ اور باقی تمام چیزیں جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

مسئول علی بن عثمان جلابی نے کہا:

ہمارے اس زمانے میں علم تصوف کی حقیقت کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے۔ بالخصوص اس دیار میں جہاں لوگ حرص و ہوس میں مبتلا ہیں اور تسلیم و رضا کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ علمائے زمانہ اور مدعیان وقت نے اس کی صورت مسخ کر رکھی ہے ایسے دور میں ہمت ایسی چیز کی کرنی چاہئے جسے زمانہ کے ہاتھ نے نہ چھوا ہو اور سوائے خاصان حق کے تمام اہل

ارادت اس سے منقطع ہوں اور تمام اہل معرفت کی معرفت اس سے خارج ہو۔ خاص و عام فقط لفظی عبارت پر اکتفا کرتے ہیں اور حقیقت کو حجاب درحجاب رکھنے کے دلدادہ ہیں۔ تحقیق سے روگرداں ہو کر تقلید کے پرستار ہیں۔ تحقیق ان کی دنیا سے مفقود ہے عوام اس صورت حال کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم حق شناس ہیں۔ خواص خوش ہیں کیونکہ اس صورتحال کی وہ دل میں تمنا رکھتے ہیں، نفس میں حاجت اور سینہ میں میلان، وہ اپنے اشغال کو شوق رویت باری اور سوز محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مدعی خود اپنے دعوے کے باعث پورے معانی سے محروم ہوتے ہیں۔ مریدوں نے مجاہدہ سے منہ پھیر لیا۔ بے کار وہم و خیال کا نام مشاہدہ رکھ دیا۔ میں نے اس سے پہلے کتب تصنیف کیں جو تمام ضائع ہو گئیں۔ جھوٹے دعویداروں نے ان میں سے بعض چیزیں لوگوں کو شکار کرنے کے لئے چن لیں اور باقی چیزوں کو ملیامیٹ کر دیا یہ اس لئے کہ صاحب طبع لوگ حسد و انکار کو بھی نعمت خداوندی سمجھتے ہیں۔ ایک دوسری جماعت کے لوگ بیٹھے مگر نہ پڑھ سکے اور نہ معنی سمجھ سکے صرف عبارت کو پسند کیا تاکہ اسے لکھیں، یاد کریں اور کہتے پھریں کہ ہم علم تصوف و معرفت بیان کر رہے ہیں۔ یہ ان کی عین بدبختی ہے۔ دراصل علم تصوف کے راز کبریت احمر کی طرح قابل قدر ہیں اور کبریت احمر جب حاصل ہو جائے تو کیمیا ہوتی ہے اور اس کی ایک چٹکی بہت سے تانبے اور کانسی کو زر خالص بنا دیتی ہے۔ الغرض ہر شخص وہ دوا طلب کرتا ہے جو اس کے درد کے موافق ہو اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں چاہئے چنانچہ کسی بزرگ نے کہا ہے:

فکل من فی فوادہ وجع لیطلب شیئا یوافق الوجعا

جس کے دل میں درد ہوتا ہے۔ وہ اپنے درد کے موافق دوا طلب کرتا ہے

جس کے مرض کا علاج حقیر سی چیز ہو اس کو مروارید اور مرجان کی ضرورت نہیں وہ شلیثہ اور دواء المسک میں ملا کر کھائے۔ یہ بات بہت زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ ہر شخص کا حصہ مقرر ہے آج سے قبل اس علم سے بے بہرہ جاہلوں نے مشائخ کرام کی کتابوں کے ساتھ کیا کیا؟ جب یہ اسرار کے خزانے ان کے ہاتھ لگے تو معانی ان کی سمجھ میں نہ آئے اور

انہوں نے وہ کتابیں ٹوپیاں سینے والے جہلا کے سامنے ڈال دیں تا کہ وہ ٹوپیوں کے استر بنائیں اور ناپاک جلد سازوں کو دے دیں تا کہ وہ شعر ابونواس اور ہزل جاحظ کے دیوانوں کی جلدیں کریں۔ لامحالہ جب بادشاہ کا شاہین کسی بڑھیا کی کٹیا کی دیوار پر جا بیٹھا تو اس کے بال و پر کٹ گئے۔ خداوند عزوجل نے ہمیں ایسے دور میں پیدا کیا ہے جس میں لوگ ہواؤ ہوس کو شریعت کہتے ہیں۔ طلب جاہ، طلب حکومت اور تکبر کو عزت اور علم جانتے ہیں۔ خلق خدا سے ریاکاری کو خوف خدا گردانتے ہیں اور کینہ کو دل میں چھپا رکھنے کو حلم و بردباری۔ لڑائی کرنے کو مناظرہ، جنگ اور حماقت کو عظمت، منافقت کو زہد۔ ہوس کو سلوک اور ہذیان طبع کو معرفت دل کی دھڑکن اور نفس کی تاویلات کو حجت، الحاد کو فقر، جحود انکار کو تزکیہ۔ زندقہ و بے دینی کو فنا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی شریعت چھوڑ دینے کو طریقت اور زمانے میں آفت پھیلانے کو معاملت سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارباب حقیقت مغلوب ہو کر رہ گئے اور وہ ہر طرف چھا گئے۔ جس طرح پہلے دور میں آں حضور ﷺ کے اہل بیت پر آل مروان غلبہ پا گئے تھے۔ کیا خوب کہا ہے ارباب حقائق کے بادشاہ اور تحقیق و دقائق کے سردار ابوبکر الواسطی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتلینا بزمان لیس فیه آداب الإسلام ولا أخلاق الجاهلية ولا أحكام ذوى المروة "ہماری آزمائش ایسے زمانے میں ہے جس میں نہ آداب اسلام ہیں نہ اخلاق جاہلیت اور نہ ارباب مروت کے احکام۔"

متنبی نے بھی عین اسی کے موافق کہا ؎

لحا الله ذی الدنیا منا خالراکب

فکل بعید الهم فیها معذب

تو سمجھ (خدا تجھے قوت عطا کرے) کہ میں نے اس عالم کو اسرار خداوندی کا مقام پایا۔ موجودات کو اس کی ودیعتوں کا امین سمجھا اور ثابت الوجود اشیاء کو اس کے دوستوں کے حق میں حامل لطائف دیکھا۔ جوہر، عرض، عناصر، اجرام، اجسام اور طبائع سب اسرار کے لئے حجاب ہیں اور مقام توحید میں ان چیزوں میں الجھنا شرک کے برابر ہے باری تعالیٰ نے اس

عالم کو حجاب در حجاب رکھا ہے۔ ہر طبیعت اپنی استطاعت کے مطابق طمانیت حاصل کرتی ہے اور اپنے اوپر توحید کی طرف سے پردہ گرا لیتی ہے اور ارواح اس دنیا میں مزاج زندگی کے مطابق برگشتہ ہو کر اس کے قرب کے باعث اپنے مقام نجات سے دور بھٹک جاتی ہیں۔ اسرار ربانی عقل و ادراک کے لئے مشکل ہو جاتے ہیں اور قرب حق کی لطافتیں روپوش ہو جاتی ہیں۔ آدمی اپنی غفلت کی تاریکیوں کی وجہ سے اپنی ہی ہستی میں الجھ جاتا ہے اور خصوصیت کے درجات کے معاملے میں اپنے حجابات میں کھو جاتا ہے چنانچہ باری تعالیٰ نے کہا:

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢ (العصر)

"قسم ہے وقت کی انسان یقیناً گھاٹے میں ہے"

اور نیز فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (الاحزاب)

"تحقیق آدمی بڑا ظالم اور جاہل ہے۔"

اور حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فِی الظُّلْمَةِ ثُمَّ اَلْقٰى عَلَیْهِ نُوْرًا(1)

"اللہ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اس پر نور ڈالا۔"

پس یہ حجاب اس کی جبلت میں ہے جو بمطابق طبع اور حسب تصرف عقل حائل ہوتا ہے۔ لامحالہ وہ جہالت پسند اپنے اس حجاب کا دلدادہ واقع ہوا ہے ایسا کہ جمال کشف سے بے خبر، تحقیق اسرار خداوندی سے روگرداں، چوپایوں کے مقام پر فروکش، اپنے مقام سے اکھڑا ہوا، خوشبوئے توحید سے نا آشنا، جمال احدیت سے محروم، ذوق توحید سے بے نصیب، تحقیق و مشاہدہ سے برگشتہ اور رضائے خداوندی چھوڑ کر دنیا کی مرض میں مبتلا۔ اس کے نفس حیوانی نے جو حیات حقیقی سے دور ہے، نفس ناطقہ کو مغلوب کر دیا اور اس کی جملہ

1۔ الجامع الصغیر

حرکت، طلب حیوانیت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، سوائے کھانے، سونے اور اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے اسے کسی چیز کی خبر نہیں۔ باری تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو ان تمام چیزوں سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَ يَتَمَتَّعُوا وَ يُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ (الحجر)

"اے پیغمبر! ان کو چھوڑ دیجئے۔ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور اپنی آرزوؤں کو طول دیں یہ عنقریب جان جائیں گے۔"

ان کی طبع کار فرمانے سر حق ان کی نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا۔ عنایت و توفیق کے بجائے ان کے نصیب میں ناامیدی اور خلفشار ہے وہ تمام نفس امارہ کے فرمانبردار ہیں اور نفس امارہ ایک بہت بڑا حجاب اور برائی اور بدی کا سرچشمہ ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (یوسف:53)

"تحقیق نفس امارہ برائی کو ترغیب دیتا ہے"۔

اب میں کتاب شروع کرتا ہوں اور مقامات وحجابات سے متعلق تیرے مقصد کو ظاہر کرتا ہوں اور بیان لطیف مرقوم کرتا ہوں۔ اہل علم وفن کی تحریروں کی تشریح لکھتا ہوں۔ مشائخ کرام کے کلام سے اس میں کچھ شامل کرتا ہوں۔ چند اچھی حکایات کی بھی مدد لیتا ہوں، تاکہ تیری مراد پوری ہو۔ اگر علمائے ظاہر وغیرہ بھی اس کو پڑھیں تو ان کو معلوم ہو کہ طریق تصوف کا درخت مضبوط ہے اور اس کی شاخیں پھل دار۔ تمام اہل تصوف صاحب علم ہوئے ہیں، اپنے مریدوں کو علم سے بہرہ ور کرتے رہے ہیں اور ان کو تحصیل علم پر مداومت کرنے کی تاکید فرماتے رہے ہیں۔ وہ کبھی حرص و ہوا اور لہو ولعب میں مبتلا نہیں ہوئے اور کبھی لغویت کے راستے پر نہیں چلے۔ مشائخ طریقت میں سے بہت سے علماء نے کتابیں تصنیف کی ہیں اور اپنی لطیف تحریروں سے اسرار ربانی پر دلائل سے روشنی ڈالی ہے۔ وباللہ التوفیق

پہلا باب

اثبات علم

خداوند تعالیٰ نے علماء کی تعریف میں فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (الفاطر: 28) ''تحقیق اس کے بندوں میں عالم لوگ ہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں''۔ اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا، طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ (سنن ابن ماجہ) ''طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔'' نیز حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اُطْلُبُوْا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ (بیہقی، شعب الایمان، سخاوی، المقاصد الحسنہ) ''علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ہو۔''

جاننا چاہئے کہ علم کا میدان بہت وسیع ہے اور عمر مختصر۔ اس لئے تمام علوم کا حاصل کرنا فرض نہیں مثلاً علم نجوم۔ علم طب۔ علم حساب اور عجائبات عالم کا علم وغیرہ صرف اتنا علم حاصل کرنا ضروری ہے جتنا شریعت سے متعلق ہو۔ مثلاً علم نجوم اتنا کہ رات کے عالم میں تعین اوقات ہو سکے۔ طب صرف اس قدر کہ صحت کی حفاظت ہو سکے اور حساب اتنا کہ علم فرائض کے لئے ضروری ہو یا مدت عدت کا تعین کرنے میں معاون ہو۔ مختصر یہ کہ علم وہی فرض ہے جس پر عمل ہو سکے۔ باری تعالیٰ نے ان لوگوں کی برائی بیان فرمائی ہے جو بے نفع علم کے لئے سرگرداں ہوں فرمایا: وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (البقرہ: 102) ''اور سیکھتے ہیں وہ چیز جو ان کو نقصان پہنچائے اور نہ نفع دے۔'' حضور ﷺ نے ہمیشہ چاہا اور فرمایا: اعوذبک من علم لا ینفع ''اے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے۔'' پس تھوڑے علم پر زیادہ عمل ہو سکتا ہے اور علم کو ہمیشہ عمل کے دوش بدوش ہونا چاہئے چنانچہ ارشاد فرمایا، اَلْعَبْدُ بِلَا فِقْهٍ كَالْحِمَارِ فِي الطَّاحُوْنَةِ (شوکانی، الفوائد المجموعہ) ''بے علم عبادت کرنیوالا خراس کے گدھے کی مانند ہے۔'' ہر چند وہ گھومتا ہے مگر اپنے مقام آغاز سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس سے کوئی راہ طے نہیں ہو پاتی۔ میں نے عوام کا ایک

گروہ ایسا دیکھا ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ ایسا ہے جو عمل کو علم پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ دونوں عقیدے باطل ہیں۔ کیونکہ عمل بغیر علم کسی طرح بھی عمل کہلانے کا مستحق نہیں۔ عمل وہی صحیح ہوتا ہے جو علم کی روشنی میں حاصل ہو اور ایسے ہی عمل سے بندہ ثواب کا حق دار ہوتا ہے۔ جیسے کہ نماز، نماز نہیں ہوتی جب تک نماز قائم کرنے والے کو ارکان طہارت کا علم، پانی کی پہچان، قبلہ کی واقفیت، نیت نماز کی کیفیت اور ارکان نماز کا علم نہ ہو۔ غرض جب عمل کی بنیاد ہی علم پر ہے تو ان دونوں میں تفریق محض جہالت ہے۔ اسی طرح علم کی عمل پر فضیلت سمجھنا بھی غلطی ہے۔ کیونکہ علم بے عمل کو علم نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا، نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ (البقرہ) ''اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ انہیں علم ہی نہیں۔'' عالم بے عمل کو علماء سے خارج گردانا اس لئے کہ علم کا سیکھنا، یاد رکھنا اور یاد کرنا بھی شامل عمل ہے اور اس سے آدمی ثواب حاصل کرتا ہے اور اگر عالم کا علم اس کے کام اور کسب میں ظاہر نہ ہوتا تو وہ کسی ثواب کا حق دار نہ ہوتا۔ یہ دو گروہوں کے اقوال ہیں: ایک وہ جو دنیوی جاہ و مرتبت کو علم سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ صحیح برتاؤ کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ درحقیقت علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں عمل کو علم سے جدا رکھتے ہیں۔ نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل۔ ایک کہتا ہے (علم) گفتار نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے دوسرا کہتا ہے علم چاہئے عمل کی ضرورت نہیں۔ ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ سے حکایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے راہ میں ایک پتھر دیکھا اس پر لکھا ہوا تھا کہ مجھے پلٹ کر پڑھو میں نے پلٹا تو اس پر لکھا تھا، لا تعمل بما تعلم فکیف تطلب ما لا تعلم ''تو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو پھر جس چیز کا تجھے علم نہیں وہ کیوں طلب کرتا ہے۔'' اس چیز پر کاربند ہو جس کا تجھے علم ہے تاکہ اس کی برکت سے تجھے وہ چیز بھی حاصل ہو جائے جس کا تجھے علم نہیں اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ھمۃ العلمآء الدرایۃ وھمۃ السفھآء الروایۃ ''علماء کی ہمت روایت یعنی عقل کے ذریعہ حاصل کرنا ہوتی ہے اور جاہلوں کی بضاعت

روایت یعنی محض نقل کرنا۔" کیونکہ اہل جہالت علماء سے دور ہوتے ہیں۔ جو علم سے دنیا کی عزت اور مرتبہ چاہتا ہے عالم نہیں ہوتا، کیونکہ دنیوی جاہ و مرتبت جہالت کے متعلقات سے ہے اور علم کے لئے یہ بلند ترین مقام ہے کہ اگر علم نہ ہو تو انسان پر لطائف خداوندی کا کوئی راز ظاہر نہیں ہوتا اور جب علم موجود ہو تو آدمی ہر مقام کے مشاہدے اور مرتبے کا سزاوار ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

فصل: علم الٰہی

معلوم ہونا چاہئے کہ علم دو ہیں: علم خداوندی اور علم بندہ۔ بندے کا علم خدا کے علم کے سامنے ہیچ ہے۔ خدا کا علم اس کی صفت ہے اس کی ذات سے قائم اور اس کے اوصاف کی کوئی انتہا نہیں۔ ہمارا علم ہماری صفت ہے۔ ہماری ذات پر منحصر، اور ہمارے اوصاف محدود ہیں۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ (الاسراء) "اور نہیں دیا گیا تم کو علم مگر تھوڑا"۔ الغرض علم صفات مدح سے ہے اور اس کی حد صرف معلومات کے دائرے اور تعینات کے حلقے تک ہے۔ علم کی حدود کا بہترین تصور یہ ہے کہ **العلم صفة يصير الجاهل بها عالما** "علم ایک ایسی صفت ہے جو جاہل کو عالم بناتی ہے۔" اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ (البقرہ) "اور اللہ کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے۔" اور یہ بھی فرمایا: وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ (بقرہ) "اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔" اللہ تعالیٰ کا علم ایک ہے جس سے وہ تمام موجودات، معدومات اور خلق کو جانتا ہے اس علم میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ یہ بٹ نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی ذات پاک سے جدا ہو سکتا ہے۔ ترتیب کائنات اس کے علم کی دلیل ہے کیونکہ فعل محکم فاعل کا مقتضی ہوتا ہے۔ اس کا علم اسرار کائنات پر حاوی ہے اور اظہار پر محیط۔ طالب حق کو چاہئے کہ اپنے ہر کام میں باری تعالیٰ کو شاہد و ناظر سمجھے۔

حکایت: کہتے ہیں بصرہ میں ایک رئیس تھا وہ اپنے باغ میں گیا۔ وہاں اس کی نظر اپنے ملازم کی بیوی پر پڑی۔ ملازم کو کسی کام کے بہانے باہر بھیج دیا اور عورت سے کہا دروازہ بند

کرو۔ عورت نے کہا میں نے سب دروازے بند کر دیئے ہیں مگر ایک ہے جو بند نہیں ہوسکتا۔ رئیس نے پوچھا وہ کونسا ہے؟ عورت نے جواب دیا جو ہمارے اور خدا کے درمیان ہے۔ رئیس بہت پشیمان ہوا اور توبہ کی۔

حاتم اصم رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے چار چیزوں کا علم حاصل کیا اور تمام دنیا کے علوم سے رہائی پائی ان سے پوچھا گیا، کونسی چار چیزوں کا علم ہے؟ کہا اول یہ کہ میں نے یہ جانا کہ میرا رزق مقدر ہے اور کم یا زیادہ نہیں ہوسکتا اس طرح طلب زیادت سے نجات پائی۔ دوم یہ کہ میں نے یہ جانا کہ خدا تعالیٰ کا مجھ پر حق ہے اور وہ میرے سوا کوئی ادا نہیں کر سکتا میں اس حق کو ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ سوم یہ کہ میں نے یہ جانا کہ میرا ایک طالب ہے یعنی موت جس سے مفر نہیں میں نے اس کو پہچان لیا۔ چہارم یہ کہ میں نے یہ جانا کہ میرا ایک خدا ہے میرے حال سے پوری طرح واقف میں اس سے شرمسار رہا اور ناشائستہ افعال سے بچا۔ جب بندہ کو علم ہو کہ خدائے پاک ناظر ہے تو اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس کے باعث روز قیامت شرمندہ ہونا پڑے۔

فصل: بندے کا علم

بندہ کا علم امور خدا اور اس کی معرفت سے متعلق ہونا چاہئے اور فرض وہ علم ہے جو وقت کے عین مطابق ہو اور وقت پر کام آئے۔ علم کو ظاہری اور باطنی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی اصول اور فروع۔ اصول کا ظاہر قول شہادت اور اس کا باطن تحقیق معرفت ہے اسی طرح فروع کا ظاہر درستی معاملات اور اس کا باطن درستی نیت ہے یہ سب ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں ہوسکتے۔ حقیقت باطن کے بغیر ظاہر منافقت ہے اور ظاہر کے بغیر باطن زندقہ ظاہر شریعت بغیر باطن کے ناقص ہے اور باطن بے ظاہر ہوس۔

علم حقیقت کے تین ارکان ہیں: اول، ذات خداوند تعالیٰ اور اس کی وحدانیت کا علم اور اس کے ساتھ کسی چیز کی مشابہت کی نفی۔ دوم، خدائے تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام کا علم اور سوم اس کے افعال اور ان کی حکمتوں کا علم۔ اسی طرح علم شریعت کے بھی تین ارکان

ہیں اول کتاب دوم سنت اور سوم اجماع امت۔

اور ذات وصفات اور افعال خداوندی کے علم کے ثبوت میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:
فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد:19) ''تو جان لو اللہ تعالیٰ ہی صرف لائق عبادت ہے۔''
نیز ارشاد فرمایا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ (الانفال:40) ''پس جان لو کہ اللہ تمہارا مالک ہے۔'' نیز فرمایا۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ (الفرقان:45) ''کیا تو نے نہیں دیکھا تیرے رب نے سائے کو کیسے دراز کیا۔'' نیز فرمایا: اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ (الغاشیہ) ''کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس انداز پر پیدا کیا گیا۔''
اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں افعال خداوندی پر غور کر کے صفت باری تعالیٰ کو سمجھنے پر زور دیا گیا ہے۔ نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ من علم ان اللہ تعالیٰ ربه وانی نبیه حرم اللہ تعالیٰ لحمه ودمه علی النار (المعجم الکبیر، ہیثمی، مجمع الزوائد) 'جس نے اللہ تعالیٰ کو رب جانا اور مجھے اس کا پیغمبر تسلیم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا گوشت اور خون دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا۔'' علم ذات خداوندی کی شرط یہ ہے کہ عاقل و بالغ یہ جانے کہ حق تعالیٰ کی ذات قدیم، بے حد اور بغیر حدود موجود ہے۔ نہ کسی جگہ اور نہ کسی جہت کے ساتھ مخصوص اس کی ذات باعث آفت نہیں۔ اس کی مخلوق میں کوئی اس جیسا نہیں۔ اس کی نہ بیوی ہے نہ اولاد اور جو کچھ تیرے وہم میں صورت پذیر ہو سکے یا خرد کے دائرہ اختیار میں سما سکے وہ اس کا خالق اور قائم رکھنے والا پروردگار ہے اس نے فرمایا لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۱۱﴾ (الشوریٰ) ''کوئی شے اس کے مثل نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے اس کی صفات کا علم یہ ہے کہ آدمی جان لے کہ اس کی صفات اس طرح اس کی ذات کے ساتھ موجود ہیں کہ یہ صفات نہ اس کی ذات ہیں اور نہ اس کی ذات کا جزو اور حصہ ہیں۔ وہ ان صفات کے ساتھ موجود اور قائم ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور یہ صفات ہیں جیسے علم قدرت، حیات وارادات، سمع۔ بصر کلام اور بقاء چنانچہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّهٗ

عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (الانفال) ''تحقیق وہ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا۔'' نیز ارشاد فرمایا: وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (البقرہ) ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' نیز فرمایا: وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (الشوریٰ) ''اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے''۔ نیز فرمایا: فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ (ہود) ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' نیز فرمایا: ھُوَ الۡحَیُّ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (الغافر:65) ''وہ زندہ اور قائم ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' نیز فرمایا: قَوۡلُہُ الۡحَقُّ ؕ وَلَہُ الۡمُلۡکُ (الانعام:73) ''اس کی بات سچی ہے اور سلطنت اسی کی ہے۔'' رہا اس کے افعال کے اثبات کا علم تو وہ یہ ہے کہ وہ مخلوقات اور ان کے افعال کا پیدا کرنے والا ہے۔ عدم اس کے حکم سے ہستی کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ وہ خیر و شر، نفع اور نقصان کا پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ (الزمر:62) ''اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔'' احکام شریعت کے اثبات پر دلیل یہ ہے کہ تو جانے کہ اللہ کی طرف سے خلاف عادت معجزوں کے ساتھ رسول آئے اور ہمارے محمد مصطفیٰ ﷺ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کے معجزات بہت ہیں جو کچھ انہوں نے غیب و شہود سے بیان فرمایا برحق ہے۔ شریعت کا پہلا رکن کتاب اللہ ہے جیسا کہ خدائے عزوجل نے فرمایا۔ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ (آل عمران:7) ''اس کتاب یعنی قرآن کریم میں محکم آیات ہیں وہ اصل کتاب ہیں۔'' دوسرا رکن سنت ہے جیسا کہ فرمایا: وَمَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ٭ وَمَا نَھٰىکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَھُوۡا (الحشر:7) ''تمہیں جو رسول کی طرف سے عطا ہوا ہے اسے لے لو اور جس چیز سے وہ منع کریں اسے چھوڑ دو۔'' تیسرا رکن اجماع امت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَا تَجۡتَمِعُ اُمَّتِیۡ عَلَی الضَّلَالَۃِ عَلَیۡکُمۡ بِالسَّوَادِ الۡاَعۡظَمِ (1) ''میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی تم بڑے گروہ کی پیروی کرو۔''

الغرض احکام حقیقت بہت زیادہ ہیں اور سب کو جمع کرنا کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ لطائف خداوندی لامحدود ہیں۔

1۔ عجلونی: کشف الخفا

فصل: سوفسطائی گروہ

جان لے کہ ملحدوں کا ایک گروہ (ان پر اللہ کی لعنت ہو) سوفسطائی کہلاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمیں کسی چیز کا صحیح علم نہیں اور علم خود کوئی چیز نہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا یہ خیال کہ کسی چیز کا علم درست نہیں، درست ہے یا غلط؟ اگر ان کا جواب ہو کہ درست ہے تو یہی علم اثبات ہے۔ اگر وہ کہیں کہ غلط ہے تو غلط چیز کی بناء پر معارضہ کرنا امر محال ہے اور ایسے آدمی کے ساتھ بات کرنا حماقت ہے۔ اور ملحدوں کا ایک گروہ جو اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اس بات کا دعویدار ہے کہ ہمارا علم کسی چیز پر درست نہیں اترتا اس لئے علم کا ترک کرنا اسے ثابت کرنے سے بہتر ہے۔ یہ ان کی حماقت اور جہالت ہے کیونکہ ترک علم صرف دو صورتوں میں ہوسکتا ہے، یا علم سے یا جہالت سے۔ علم تو علم کی نفی نہیں کرسکتا اور علم ترک علم سے ممکن نہیں باقی رہی صرف جہالت سو جہالت ہی علم کی نفی کرسکتی ہے اور جہالت ہی کی بناء پر علم کو ترک کیا جاسکتا ہے۔ جاہل قابل مذمت ہے اور جہالت کفر و باطل کی ایک صورت ہے۔ کیونکہ حق، جہالت سے بے تعلق ہے یہ نظریہ جملہ مشائخ کرام کے مسلک کے خلاف ہے۔ جب ملحدوں کا یہ قول عام لوگوں تک پہنچا تو انہوں نے اسے اپنایا اور پکار اٹھے کہ جملہ اہل تصوف اسی روش پر ہیں۔ ان کا اعتقاد ڈگمگا گیا اور وہ حق و باطل میں تمیز کرنے سے عاری ہو گئے۔ ہم اب ان سب کو سپرد خدا کرتے ہیں وہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے پھریں۔ اگر دین ان کا ساتھ دیتا تو شاید ان کو بہتر تصوف کی توفیق ہوتی۔ وہ راستبازی کے دامن کو نہ چھوڑتے۔ دوستان حق کو اس نظر سے نہ دیکھتے اور اپنے حق میں قدرے احتیاط سے کام لیتے۔ اگر کچھ ملحد اہل تصوف کا طریقہ اس خیال سے اختیار کرلیں کہ وہ ان کی بدولت اپنے ذاتی مصائب سے نجات پائیں اور ان کی عزت و توقیر کے سایہ عاطفت میں زندگی بسر کریں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب اہل تصوف کو اس رنگ میں رنگا ہوا سمجھا جائے اور ان کے معاملہ میں کھلم کھلا بحث و مباحثہ کرکے ان کی عزت و شان کو پاؤں تلے روندا جائے۔ مجھے ایک علم کے ایسے دعویدار سے مناظرہ کرنے کا اتفاق ہوا جس نے کلاہ تکبر کو عزت کا نام

دے رکھا تھا۔ ہوا و ہوس کی متابعت کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیطان کی ہم رکابی کو آئمہ کرام کی سیرت سمجھ رکھا تھا۔ دوران مناظرہ اس نے کہا ملحدوں کے بارہ گروہ ہیں اور ان بارہ میں سے ایک گروہ اہل تصوف کے اندر موجود ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایک اہل تصوف میں ہے تو باقی گیارہ گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ اہل تصوف ایک گروہ سے بخوبی بچ سکتے ہیں، تمہارے لئے باقی گیارہ گروہوں سے بچنا محال ہے۔

یہ تمام مصائب زمانہ کے افتراق سے پیدا ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس قوم کے درمیان اپنے اولیائے کرام کو مستور و پوشیدہ کر رکھا ہے اور مخلوق میں وہ قوم ان کے فیض سے محروم اور مہجور ہے۔ کیا خوب کہا ہے پیروں کے پیر اور مریدوں کے آفتاب علی بن بندار صیرفی رحمۃ اللہ علیہ نے: فساد القلوب علی حسب فساد الزمان و اهله ''دلوں کا فساد زمانہ اور اہل زمانہ کے فساد کے مطابق ہوتا ہے۔''

آگے چل کر ہم اس گروہ کے منکروں کی باتوں کا ذکر کریں گے تا کہ ان لوگوں کو اس سے تنبیہ ہو جن کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کی سچی عنایت شامل ہے۔ وباللہ التوفیق

فصل: علم کی اقسام

محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ نے فرمایا، العلوم ثلثة علم من الله و علم مع الله و علم بالله ''علم تین ہیں۔ ۱۔ علم من اللہ۔ ۲۔ علم مع اللہ۔ ۳۔ اور علم باللہ۔ علم باللہ علم معرفت ہے جس کے ذریعے سب انبیاء اور اولیاء نے باری تعالیٰ کو جانا جب تک اس علم کو مخصوص طریقوں سے سیکھا سکھایا نہ جائے اس وقت تک اس کے ذریعے خدا کو نہیں جانا جا سکتا کیونکہ اس علم کے بغیر خدا کو پانے کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں اور بندہ کا علم معرفت حق کے لئے علت اور سبب نہیں بلکہ اس کی معرفت بھی خدا ہی کی ہدایت اور توفیق سے ہے۔ اور علم من اللہ علم شریعت ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی طرف سے حکما دیا گیا اور اس کا مکلف بنایا گیا ہے اور علم مع اللہ مقامات طریق حق اور درجات اولیائے کرام کے بیان سے متعلق ہے۔ الغرض معرفت بغیر شریعت درست نہیں ہوتی اور شریعت کی کارفرمائی اظہار مقامات

کے بغیر صحیح نہیں اترتی۔ ابو علی ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، العلم حیاۃ القلب من الجھل و نور العین من الظلمۃ "علم دل کی حیات ہے مرگ جہالت سے اور آنکھ کا نور ایمان ہے کفر کی ظلمت و تاریکی سے۔" جس کو علم معرفت نہیں اس کا دل جہالت کے ہاتھوں مر چکا ہے اور جس کو علم شریعت نہیں اس کا دل نادانی کے مرض میں مبتلا ہے۔ کفار کا دل مردہ ہوتا ہے کیونکہ وہ معرفت خداوندی سے محروم ہیں۔ اہل غفلت کا دل بیمار ہوتا ہے کیونکہ وہ باری تعالیٰ کے احکام سے نابلد ہیں۔ ابو بکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من اکتفی بالکلام من العلم دون الزھد فقد تزندق و من اکتفی بالفقہ دون الورع فقد تفسق "جس نے علمی گفتگو کو بغیر زہد اختیار کئے کافی سمجھا وہ بے دین ہوا اور جس نے فقہ کو بغیر تقویٰ کے اپنایا فاسق ہوا۔" جو علم توحید کا زبانی علمبردار ہو اور اس کی ضد یعنی شرک وغیرہ سے دستبردار نہ ہو زندقہ کا مرتکب ہے اور جو علم شریعت و فقہ کو بغیر عمل حاصل کرے فاسق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل اور مجاہدہ کے بغیر محض توحید جبر ہے اور موحد قول کے اعتبار سے جبری اور فعل کی رو سے قدری ہوتا ہے تاکہ اس کی روش جبر اور قدر کے بین بین درست رہے۔ اس چیز کی حقیقت وہی ہے جو ان بزرگ (ابو بکر وراق ترمذی) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی کہ التوحید دون الجبر و فوق القدر "توحید جبر کے نیچے اور قدر سے اوپر ہے۔" جو کوئی علم توحید کو بغیر عمل محض زبانی پسند کرتا ہے اور اس کے مخالف افکار یعنی شرک وغیرہ سے منہ نہیں پھیرتا زندیق ہو جاتا ہے۔ فقہ کے لئے احتیاط اور تقویٰ ضروری ہے اور جو کوئی بغیر تقویٰ و پرہیز گاری صرف علم فقہ و شریعت کو کافی سمجھے اور رخصتوں، تاویلات اور شبہات کے تعلق میں ڈوب جائے یا بغیر کسی اصول کے محض اپنی سہولت کے لئے اجتہاد کرنے والوں کے گرد گھومنا شروع کر دے وہ بہت جلد فسق و بدکاری کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ صورت صرف غفلت سے پیدا ہوتی ہے اور شیخ المشائخ یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا: اجتنب صحبۃ ثلثۃ أصناف من الناس العلماء الغافلین و القراء المداھنین و المتصوفۃ الجاھلین "پرہیز کرو تین قسم کے لوگوں

سے، غافل علماء سے، خوشامدی قاریوں اور جاہل صوفیوں سے۔'' غافل علماء وہ ہوتے ہیں جو دنیا کو اپنا قبلہ دل بنا لیتے ہیں اور شریعت سے راہ آسان تلاش کر کے بادشاہوں اور ظالموں کی پرستش شروع کر دیتے ہیں، ان کے دروازوں کی خاک چھانتے ہیں۔ لوگوں کی امارت کو اپنی سجدہ گاہ بناتے ہیں۔ اپنی عقل و دانش کے تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں، اپنے کلام کی باریکیوں پر شیفتہ اماموں اور استادوں پر زبان دراز، بزرگان دین پر برہم اور لاف زنی میں مشغول۔ اگر دونوں جہان ان کے ترازو کے پلڑے میں ڈال دیئے جائیں تو معلوم نہ ہوں۔ کینہ اور حسد ان کا مذہب ہے۔ یہ سب کچھ علم کے دائرہ سے باہر ہے۔ علم تو وہ صفت ہے کہ جس سے تمام جہالت ختم ہو جاتی ہے۔ قراء مداهنين وہ لوگ ہوتے ہیں کہ اگر کوئی کام ان کی ہوس کے مطابق ہو تو وہ اس کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں اور اگر مخالف ہو تو اس کی مذمت شروع کر دیتے ہیں، چاہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہو۔ اپنی کارگزاری کا جاہ و حشمت کی صورت میں صلہ چاہتے ہیں اور برے کاموں پر بھی لوگوں کی تعریف کرتے ہیں۔ جاہل صوفی وہ ہوتا ہے جو صحبت پیر سے محروم ہو اور اس نے کسی بزرگ سے کسب ادب نہ کیا ہو۔ لوگوں کے درمیان اچھل پڑا ہو۔ بغیر زمانہ کی سختی برداشت کیے سبز پوش بن گیا ہو اپنی کور چشمی سے وہ اہل تصوف کی مجلس میں سما جاتا ہے اور پاس حرمت چھوڑ کر مسرت و انبساط میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے سب کو اپنے جیسا خیال کرتا ہے اور اس طرح حق و باطل کی تمیز کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ پس یہ تین گروہ ہیں جن کو انہوں نے صاحب توفیق لوگوں کے لئے بیان کیا اور اپنے مریدوں کو ان کی صحبت سے منع فرمایا۔ اس لئے کہ وہ سب کے سب اپنے دعووں میں جھوٹے اور اپنے رویہ میں ناقص ہیں اور ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، عملت فی المجاهدة ثلثين سنة فما وجدت شيئا أشد علي من العلم ومتابعته ''میں نے تیس سال مجاہدہ کیا مگر مجھے کوئی مشقت علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے سے زیادہ سخت نہ معلوم ہوئی۔'' الغرض آگ پر چلنا آسان ہے مگر علم کے مطابق عمل کرنا مشکل۔ جاہل کے لئے ہزار بار پل

صراط کو طے کرنا ایک علمی مسئلہ کو سیکھنے سے زیادہ آسان ہے۔ فاسق کے لئے ایک مسئلہ کو عملی جامہ پہنانا جہنم میں قیام کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔

المختصر تجھے علم سیکھنا چاہئے اور اس میں کمال حاصل کرنا چاہئے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ انسانی علم کا کمال علم خداوندی کے سامنے جہالت ہے پس اس قدر جان کہ تو کچھ نہیں جانتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بندگی کے علم سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور بندگی و عاجزی بندہ اور خداوند کے درمیان ایک عظیم پردہ ہے اسی موضوع پر کسی نے کہا ۔

العجز عن درک الادراک ادراک

والواقف فی طرق الاخیار شراک

''اس کی حقیقت پوری طرح معلوم کر لینے سے عاجزی ہی درحقیقت ادراک یعنی اس کا معلوم کر لینا ہے لیکن اسے بالکل نہ معلوم کرنا اور نیکوں کے راستے میں جستجو نہ کرنا اور رک جانا شرک ہے''۔

جو علم حاصل نہیں کرتا اور اپنی جہالت پر اڑا رہتا ہے مشرک ہوتا ہے اور جو سیکھتا ہے اور اپنے کمال علم میں معنی کا ظہور دیکھتا ہے اور اس کا غرور علم ٹوٹ جاتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ اس کا علم اس کی عاقبت کے علم میں عاجزی کے سوا کچھ نہیں اور باری تعالیٰ کی جناب میں نام کی کوئی حقیقت نہیں۔ حصول علم کے بعد یہ عجز وانکساری تحصیل علم کا حاصل ہے۔

دوسرا باب

اثبات فقر

معلوم ہونا چاہئے کہ خدا کی راہ میں درویشی کا مقام بہت بلند ہے اور درویشوں کی بڑی عزت و توقیر آئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (البقرہ:273) ”(خیرات) ان درویشوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں محصور اور بند ہوں زمین میں گھومنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ جاہل و ناواقف لوگ ان کی بے نیازی کے باعث انہیں دولت مند سمجھتے ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (النحل:75) ”اللہ نے ایک مثال دی کہ مثلاً ایک غلام ہے جو کسی کی ملکیت میں ہے اسے اپنی کسی کسب کی ہوئی چیز پر قدرت نہیں۔“ نیز ارشاد فرمایا۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (السجدہ:14) ”ان کے پہلو بستر استراحت سے دور رہتے ہیں وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں امید و بیم کے عالم میں۔“

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقر اختیار کیا اور فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنَ (1) ”اے خدا مجھے مسکین کی زندگی عطا کر مسکین کی موت دے اور حشر کے دن مسکینوں کی جماعت میں اٹھا۔“ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حشر کے دن باری تعالیٰ فرمائیں گے، اُدْنُوْا مِنِّيْ اَحِبَّائِيْ فَيَقُوْلُ الْمَلٰئِكَةُ مَنْ اَحِبَّاءُكَ يَقُوْلُ اللّٰهُ الْفُقَرَاءُ الْمَسَاكِيْنُ (2) ”مجھ سے میرے محبت کرنے والوں کو قریب کرو۔ پس فرشتے پوچھیں گے تجھ سے محبت کرنے والے کون ہیں؟ پس اللہ کا ارشاد ہوگا فقراء مساکین۔“

1۔ سنن ابن ماجہ 2۔ زبیدی، اتحاف السادۃ المتقین

اس موضوع پر متعدد آیات و احادیث موجود ہیں اور اتنی مشہور ہیں کہ ازراہ ثبوت دہرانے کی ضرورت نہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں مہاجر درویش تھے جو حق تعالیٰ کے آداب بندگی اور پیغمبر ﷺ کی صحیح پیروی حاصل کرنے کے لئے مسجد نبوی میں بیٹھے رہتے تھے۔ یہ لوگ تمام مشاغل سے کنارہ کش تھے ہر مباحثہ سے روگرداں تھے اور اپنی روزی کے لئے رازق مطلق کو کفیل سمجھتے تھے اور اسی پر توکل کرتے تھے۔ حضور ﷺ ان سے مصاحبت کرنے پر مامور تھے اور ان کے قیام کا انتظام فرماتے۔ چنانچہ خدائے عزوجل نے فرمایا۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الانعام:52) ''اور دور نہ رکھئے ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اسی کی خوشنودی کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' اور نیز فرمایا، وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف:28) ''اور اپنی آنکھیں ان کی طرف سے نہ پھیر لیجئے کیا آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں۔'' حضور ﷺ جہاں کہیں بھی ان میں سے کسی کو دیکھتے تو فرماتے: میرے ماں باپ ان پر نثار کہ باری تعالیٰ نے ان کی وجہ سے مجھ پر عتاب فرمایا۔

الغرض باری تعالیٰ نے فقراء کو بہت بلند مقام عطا فرمایا ہے اور بہت بڑے درجہ سے نوازا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اسباب ظاہری و باطنی سے دستبردار ہو کر بجان و دل حقیقی مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرتے ہیں فقر ان کے لئے باعث فخر ہوتا ہے۔ فقر جانے پر نہ وہ آہ زاری کرتے ہیں اور نہ اس کی موجودگی پر خوش ہوتے ہیں۔ وہ فقر کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ہر چیز کو حقیر سمجھتے ہیں۔ مگر یاد رہے فقر کا ایک ظاہری طریق ہے اور اس طریق کی اساس مفلسی اور بے چارگی ہے۔ دوسرا پہلو حقیقت کا ہے جو اقبال و اختیار پر مبنی ہے۔ جس نے ظاہری طریق پر اکتفا کیا اسے کوئی نفع نہ ملا اور بالآخر اس نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اور جس نے حقیقت حاصل کر لی وہ موجودات سے روگراں ہوا اور تمام ماسوا کی نفی کرتا ہوا دیدار کلی سے سرفراز ہوا۔ من لم یعرف سوی رسمہ لم یسمع سوی اسمہ ''جس نے فقر کو رسم تک محدود سمجھا اس نے فقر کے نام کے سوا کچھ نہ سنا۔''

فقیر دراصل وہی ہے جس کی ملکیت میں کوئی شے نہ ہو اور کسی شے کے حاصل ہونے سے اسے کوئی فرق نہ پڑے۔ نہ متاع دنیا کی موجودگی پر وہ اپنے آپ کو غنی محسوس کرے اور نہ ہی متاع دنیا کے فقدان پر اپنے آپ کو محتاج سمجھے۔ اس کی نگاہ فقر میں متاع دنیا کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو۔ تہی دستی کے عالم میں اسے زیادہ مسرت ہوتی ہے۔ کیونکہ بقول مشائخ تنگ دستی سے دل کو زیادہ فراغت نصیب ہوتی ہے۔ مال و متاع فقیر کے لئے شوم ہوتا ہے، اسی لئے درویش کسی چیز کو اپنی ملکیت میں نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی چیز کی محبت میں خود کو گرفتار ہونے دیتا ہے۔ دوستان حق کی زندگی باری تعالیٰ کی عنایات ظاہری و باطنی پر منحصر ہوتی ہے اس غدار اور فاجر دنیا کے سروسامان پر نہیں۔ دنیا کا مال و متاع راہ تسلیم و رضا میں رکاوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ حکایت ہے کہ ایک بادشاہ کو کسی درویش سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ بادشاہ نے کہا مجھ سے کچھ طلب کرو۔ درویش نے جواب دیا میں اپنے غلاموں کے غلام سے کچھ طلب نہیں کرنا چاہتا۔ بادشاہ نے کہا یہ کیسے؟ درویش نے کہا میرے دو غلام ہیں جو تیرے مالک ہیں: حرص اور آرزو اور پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا: الفقر عز لاهله (المقاصد الحسنہ) ''فقر فقراء کے لئے باعث عزت ہے۔'' جو چیز اہل کے لئے باعث عزت ہوتی ہے وہ نااہل کیلئے بلاوجہ ذلت ہوتی ہے۔ اہل فقر کی عزت اسی میں ہے کہ اپنے ظاہر کو لغزش سے اور باطن کو خرابی سے محفوظ رکھے۔ نہ اس کا جسم معصیت اور لغزش سے ملوث ہو اور نہ اس کی قلبی کیفیت میں خلل اور آفت رونما ہو۔ کیونکہ اس کا ظاہر ظاہری نعمتوں سے مالا مال ہوتا ہے اور اس کا باطن باطنی نعمتوں کا سرچشمہ۔ اس کا جسم روحانی اور دل ربانی ہوتا ہے۔ خلقت سے بے نیاز اور آدمیوں سے بے تعلق۔ کیونکہ تمام خلقت اور انسان اس کی نظر میں خود محتاج ہیں۔ نہ اس عالم میں اس عالم کی دولت سے وہ غنی ہوتا ہے اور نہ اس عالم کی دولت سے اور دونوں جہان اس کی ترازو میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوتے۔ اس کا ایک سانس دونوں عالم میں نہیں سما سکتا۔

فصل: فقر و غنا

مشائخ رحمہم اللہ میں فقر و غنا کے درمیان افضلیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات پاک غنی ہے اور وہ سب اوصاف میں کامل ہے۔ یحییٰ بن معاذ رازی، احمد بن ابی حواری حارث محاسبی، ابو العباس بن عطا، رویم بن محمد اور ابو الحسن بن شمعون اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد میہنی رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ غنا کو فقر پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات پاک غنی ہے اور فقر شان ایزدی سے بہت بعید ہے۔ جس دوست میں دوست کی صفت موجود ہو وہ زیادہ کامل ہوتا ہے بمقابلہ اس دوست کے جو دوست کی صفت سے عاری ہو۔ مگر یہ صفتی اشتراک فقط اسمی ہے معنوی نہیں۔ کیونکہ معنوی شرکت کا مطلب مشابہت ہے۔ باری تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور انسانی صفات حادث اس لئے یہ دلیل باطل ہوئی۔

میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ غنی کا لفظ صرف باری تعالیٰ کی ذات کو شایان ہے۔ خلقت اس لفظ کے قابل نہیں ان کے لئے لفظ فقر درست ہے اور اس لفظ کو باری تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔ جیسے آدمی کو ہم لوگ مجازاً غنی کہتے ہیں وہ درحقیقت غنی نہیں ہوتا کیونکہ اس کا غنا اسباب کی موجودگی پر منحصر ہے۔ اسباب قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسبب الاسباب کا محتاج ہے اور مسبب الاسباب صرف خدا کی ذات پاک ہے جس کے غنا کے لئے سبب کی ضرورت نہیں۔ اس صفت میں انسانی شرکت باطل ہے۔ جس طرح باری تعالیٰ کی عین ذات میں شرکت روا نہیں، اس کی کسی صفت میں بھی شرکت روا نہیں ہے اور جب کسی صفت میں بھی شرکت روا نہیں تو اسم یا نام میں بھی روا نہیں۔ ہاں رہ گیا تسمیہ یعنی نام دینے کی بات تو یہ صرف خدا اور مخلوق کے درمیان نشاندہی کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا غنا یہ ہے کہ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کے ارادوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اس کی قدرت کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ عیاں چیزوں کو بدلنے اور مختلف الفطرت اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔ یہ صفت اس کی ازلی ہے اور ابد الآباد تک رہے گی۔

بخلاف اس کے مخلوق کا غنا یہ ہے کہ اسباب معیشت مہیا ہوں، مسرت میں بسر ہو رہی ہو، کسی آفت کا سایہ نہ ہو اور اطمینان نظر کا سامان موجود ہو یہ سب چیزیں حدث کے تحت آتی ہیں یعنی ان کا اول و آخر فنا ہے اور تغیر ان کی فطرت ہے۔ یہ طلب اور حسرت کا سرمایہ ہیں اور عجز و ذلت ان کا انجام ہے، غرض یہ کہ انسان کے لئے یہ نام (غنا) مجازی ہے اور باری تعالیٰ کے لئے حقیقی۔ خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ (الفاطر) ''اے لوگو تم فقیر ہو اللہ کے روبرو اور اللہ غنی اور قابل توصیف ہے'' اور نیز فرمایا، وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد:38) ''اللہ غنی ہے اور تم فقیر ہو۔''

نیز عوام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم صاحب دولت کو ایک درویش سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ باری تعالیٰ نے اسے دونوں جہان میں صاحب نصیب پیدا کیا ہے اور مال و دولت کے ساتھ اس پر احسان کیا ہے۔ اس گروہ نے غنا سے کثرت مال، حصول مراد اور خواہشات نفسانی کی تکمیل مراد لی ہے اور اس پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غنا پر شکر کرنے کا حکم دیا اور فقر پر صبر کرنے کا اور ظاہر ہے کہ صبر مصیبت پر ہوتا ہے اور شکر نعمتوں پر اور نعمتیں بہر حال مصیبت سے بہتر ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا نے نعمت پر شکر کا حکم دیا اور شکر کو نعمت کی زیادتی کا سبب قرار دیا۔ پھر فقر پر صبر کا حکم فرمایا اور صبر کو قرب کی زیادتی کا ذریعہ گردانا اور فرمایا، لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم:7) ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دونگا'' اور یہ بھی فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ (البقرہ) ''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' ہر وہ شخص جو ایسی نعمت پر شکر کرے جس کی بنیاد غفلت پر ہو ہم اس کی غفلت پر غفلت زیادہ کریں گے۔ اور ہر وہ شخص جو ہر ایسے فقر پر صبر کرے جس کی بنیاد آزمائش پر ہے ہم اس کے قرب پر قرب زیادہ کریں گے۔ رہا وہ غنا جسے مشائخ فقر سے بہتر سمجھتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وہ نہیں جسے عوام غنا کہتے ہیں اس لئے کہ عوام کے نزدیک نعمت پالینا غنا ہے جب کہ مشائخ کے نزدیک نعمتیں دینے والے کو پالینا غنا ہے اور ظاہر ہے کہ وصل کا حاصل ہونا ایک چیز ہے اور غفلت کا پالینا ایک دوسری چیز اور شیخ المشائخ

ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، الفقر هو الغناء باللہ ''فقر ہر معاملے میں اللہ ہی کو کافی سمجھنے کا نام ہے''۔ اس سے مراد مشاہدۂ حق کا کشف ابدی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مکاشف کے لئے امکان حجاب ہے اگر اس صفت یعنی غنا کے باوجود صاحب مشاہدہ محجوب ہو جائے تو کیا وہ مشاہدہ کا محتاج ہوگا یا نہیں؟ اگر یہ کہو کہ نہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جب احتیاج ہو گئی تو لفظ غنا ساقط ہو گیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی ذات میں غنا اسی شخص کے لئے ممکن ہے جو قائم الصفت اور ثابت المراد (غیر فانی) ہو اور اس کا مقصود نا قابل تغیر ہو۔ حرف مقصود کا قیام اور اوصاف آدمیت کا اثبات غنا کے لئے درست نہیں اور انسان بالذات غنا کے قابل نہیں۔ اس لئے کہ بشریت عین نیاز مندی ہے اور احتیاج ناپائیداری کی علامت ہوتی ہے۔ لہٰذا باقی الصفت (جس کی صفات ہمیشہ باقی رہیں) یعنی خدا غنی ہے اور فانی الصفت (جس کی صفات فانی ہوں) یعنی انسان کسی نام کے لائق نہیں۔ پس الغنی من اعناه اللہ ''غنی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے غنی کیا''۔ اس لئے کہ غنی باللہ فاعل ہے اور اغنا اللہ مفعول اور فاعل بذات خود قائم ہوتا ہے جب کہ مفعول اپنے فاعل کا محتاج ہوتا ہے۔ پس اپنے ساتھ اقامت صفت بشریت ہے اور اقامت بفیض حق صفت بشریت کی فنا اور میں (علی بن عثمان جلابی رضی اللہ عنہ) کہتا ہوں کہ حقیقی غنا کو اقامت صفات سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ انسانی صفات کی نسبت یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ مذموم اور زوال پذیر ہوتی ہیں۔ مزید برآں ان صفات کی فنا پر بھی یہ لفظ عائد نہیں ہوتا کیونکہ فنا پذیر چیز کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور جس چیز کی صفات فنا ہو جائیں اس پر نہ فقر کا نام بولا جا سکتا ہے نہ غنا کا۔

جملہ مشائخ اور اکثر عوام فقر کو غنا پر فضیلت دیتے ہیں کیونکہ قرآن و حدیث میں فقر کی فضیلت آئی ہے اور اسی پر اکثر امت کا اتفاق ہے اور میں نے حکایات میں دیکھا کہ ایک موقع پر حضرت جنید اور حضرت ابن عطار رحمۃ اللہ علیہما کے درمیان اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ ابن عطا دلیل بیان فرما رہے تھے کہ غنی لوگ زیادہ فضیلت والے ہیں کہ قیامت کے دن ان کو اپنی دولت کا حساب دینا ہوگا اور حساب کے دوران میں وہ خطاب حق سے بلا

واسطہ فیض یاب ہوں گے۔ اگر عتاب ہوگا تو محبوب کی طرف سے اہل محبت کو عتاب ہوتا ہے۔ حضرت جنید نے فرمایا: جہاں اغنیاء سے حساب طلب ہوگا وہاں فقراء سے عذر طلب ہوگا اور ظاہر ہے کہ عذر حساب سے بہت اونچا مقام رکھتا ہے اس میں ایک عجیب نکتہ ہے۔ حقیقی محبت میں عذر بیگانہ پن ظاہر کرتا ہے اور عتاب یگانگت کے خلاف ہوتا ہے۔ اہل محبت دونوں چیزوں کو موجب آفت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عذر محبوب کے حکم کی بجا آوری میں کوتاہی کے سلسلے میں ہوتا ہے کہ جب وہ اپنا حق طلب کرے یہ عذر پیش کرے اور عتاب اس کو کوتاہی کی بناء پر ہوتا ہے جو فرمان دوستؔ میں ہو۔ اس وقت وہ دوست اس کو کوتاہی پر اسے عتاب کرتا ہے اور یہ دونوں محال ہیں۔ جملہ امور میں فقراء صبر اور صاحب دولت شکر کرتے ہیں اور حقیقی دوستی میں دوست نہ تو دوست سے کوئی چیز طلب کرتا ہے اور نہ دوست فرمان دوستِ کو ٹالتا ہے، ظلم من سمی ابن ادم امیرا وقد سماہ ربہ فقیرا ''ظلم کیا اس نے جس نے ابن آدم کو امیر کہا حالانکہ باری تعالیٰ نے اس کا نام فقیر رکھا ہے۔'' جس کا نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقیر ہے وہ امیر بھی ہو تو فقیر ہے۔ ہلاک ہو وہ شخص جس نے تخت و تاج کے بل بوتے پر اپنے آپ کو امیر سمجھا۔ امیر لوگ صاحب صدقہ ہوتے ہیں اور فقیر لوگ صاحب صدق اور ہرگز صاحب صدق، صاحب صدقہ کی طرح نہیں ہوتا۔ درحقیقت سلمان رضی اللہ عنہ کا فقر سلیمان علیہ السلام کے غنا سے کم نہیں۔ ایوب علیہ السلام کو عالم صبر میں اللہ نے فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ (ص:44) ''وہ اچھا بندہ ہے'' اور سلیمان علیہ السلام کو استحکام سلطنت میں بھی یہی فرمایا۔ نِعْمَ الْعَبْدُ (ص:44) ''وہ اچھا بندہ ہے۔'' جب خدائے رحمٰن کی رضا حاصل ہوگئی تو فقر سلمان رضی اللہ عنہ، غنا سلیمان علیہ السلام ہی طرح ہو گیا۔

حکایت: میں نے استاد ابوالقاسم قشیری کو کہتے سنا کہ لوگ فقر و غنا میں بحث و تمحیص کرتے ہیں اور اپنے لئے ایک چیز اختیار کر لیتے ہیں۔ میں وہ چیز اختیار کرتا ہوں جو باری تعالیٰ کو پسند ہو اور وہ مجھے اس پر استقامت دے۔ اگر وہ مجھے صاحب دولت بنائے تو میرے قدم نہ ڈگمگا جائیں اور اگر وہ مجھے فقیر رکھے تو میں حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر اس کے راستہ سے نہ

ہٹ جاؤں۔ فقر اور تونگری دونوں ہی خدا کی نعمتیں ہیں۔ تونگری غفلت کے باعث آفت ہو جاتی ہے اور فقر لالچ اور حرص کے باعث۔ گو قولاً دونوں عمدہ چیزیں ہیں لیکن عملاً مختلف ہیں۔ فقر ماسوائے دل کے فارغ ہونے کا نام ہے اور غنا غیر کے ساتھ مشغولیت دل کا۔ اگر فراغت دل میسر ہو تو نہ فقر غنا سے بہتر ہے اور نہ غنا فقر سے۔ غنا کثرت متاع کا نام اور فقر قلت متاع کا نام ہے اور تمام متاع کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے جب طالب ملکیت کو ترک کر دے تو وہ شرک سے محفوظ ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ناموں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

فصل: مشائخ طریقت کی آراء

مشائخ طریقت کے اس موضوع پر بہت سے اقوال ہیں اور میں اس کتاب میں بقدر گنجائش نقل کرتا ہوں۔

متاخرین میں سے ایک نے کہا، **لیس الفقیر من خلا من الزاد انما الفقیر من خلا من المراد** ''فقیر تہی دست کو نہیں کہتے کہ اس کے پاس متاع اور زاد نہ ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل خواہشات سے خالی ہو''۔ مثلاً اگر خدا کسی کو دولت عطا کرے اور وہ اس کی حفاظت کا ارادہ کرے تو وہ غنی ہے اور اگر وہ اس دولت کو ترک کرنے کا ارادہ کرے تو بھی غنی ہے کیونکہ ان دو میں سے ہر ایک ملک غیر میں تصرف ہے اور فقر ترک حفاظت و ترک تصرف کا نام ہے۔ یحییٰ بن معاذ رازی نے فرمایا، **علامة الفقر خوف الفقر** ''فقر کی نشانی فقر زائل ہونے کا خوف ہے۔'' فقر صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمال ولایت، قیام مشاہدہ اور فنائے صفت و بے خودی کے باوجود ڈرتا رہے۔ زوال فقر سے ڈرتا رہے۔ کمال فقر یہ ہے کہ آدمی ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اسے انقطاع عن اللہ کا ڈر نہ رہے۔'' اور رویم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **من نعت الفقیر حفظ سرہ وصیانة نفسه وأداء فرائضه** ''ایک فقیر کی خصوصیات میں سے ہے اس کے باطن کی نگہداشت اس کے نفس کی حفاظت اور اس کے فرائض کی ادائیگی۔''

فقیر کی شان یہ ہے کہ اس کا باطن دنیاوی اغراض سے محفوظ ہو، اس کا نفس آفت و شر

سے بچا ہوا ہو اور فرض احکام اس پر جاری ہوں جو کچھ اس کے قلب پر گزرے زبان اس کے اظہار میں مخل نہ ہو اور جو کچھ زبان پر ظاہر ہو اپنے قلب کو اس میں زیادہ مشغول نہ کرے اور اس کا اتنا زیادہ غلبہ ہو کہ کسی شے کے گذارنے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے اور یہ بشری تقاضوں کے زائل ہونے کی علامت ہے کہ بندہ سری اور جہری طور پر راجع بحق ہو گیا ہے۔

بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، **افضل المقامات اعتقاد الصبر علی الفقر إلی القبر** ''زندگی بھر صبر پر قائم رہنا افضل مقامات میں سے ہے۔'' درویشی پر مداومت، صبر کا اعتقاد اور یہ صبر کرنا اور اعتقاد کرنا منجملہ بندہ کے مقامات سے ہے اور فقر فنائے مقامات ہے۔ اس لئے فقر پر صبر کا مطلب اعمال و افعال کی بے مائیگی اور انسانی اوصاف کی بیخ کنی ہے۔ ظاہری معنی اس قول کے فقر کا غنا پر افضل ہونا اور اس کا اعتقاد کرنا ہے کہ میں فقر کے طریقہ سے ہرگز روگردانی نہ کروں گا۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، **الفقیر من لا یستغنی بشیء دون اللہ** ''فقیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے غنا نہیں طلب کرتا۔'' فقیر بجز خدا کے کسی چیز سے راحت نہیں پاتا۔ کیونکہ اس کا کوئی اور مقصد حیات نہیں ہوتا۔ لفظی مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کی ذات کے بغیر غنی نہیں ہو سکتا اور اس کو پالینا ہی غنا ہے۔ ہمارا وجود خدا سے جدا ہے۔ جدائی کو دور کئے بغیر اسے پایا نہیں جا سکتا۔ یعنی غنا حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارا وجود ہی پردۂ حائل ہے۔ اس کو دور کیا جائے تو غنا حاصل ہو۔ اہل حقیقت کے نزدیک یہ نکتہ بہت باریک اور دقیق ہے اور اس معنی کی حقیقت یہ ہے کہ **الفقیر لا یستغنی عنه** ''فقیر کبھی فقر سے مستغنی نہیں ہوتا'' یعنی فقیر وہ ہے کہ اسے ہرگز غنا نہیں ہوتا اور وہی بات ہے جو اس بزرگ نے کہی یعنی خواجہ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہمارا غم و اندوہ دائمی ہے۔ ہماری آرزو کبھی منزل آشنا نہیں ہوتی اور ہماری کلیت اس دنیا آخرت میں اختتام پذیر نہیں ہوتی۔ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے ہم جنسیت ضروری ہے اور خدا جنس سے بالاتر ہے۔ اس کی ذات سے روگردانی کے لئے غفلت کی ضرورت ہے اور غفلت درویش سے بعید ہے تو کتنا کٹھن

کام ہے اور راہی کے لئے کیسی مشکل دوستی اس کی کوشش ہے جس کے دیدار کی راہ نہ کھلے اور جس کا وصال مخلوق کے دائرہ امکان سے باہر ہو۔ فنا کی تبدیلی صورت میں نہیں اور بقا کو تغیر روا نہیں۔ فانی کبھی باقی نہیں ہوتا کہ تیرا وصل ہو جائے نہ باقی فانی ہوتا ہے کہ تیرا قرب ہو جائے۔ اس کی محبت کرنے والوں کا کام مسلسل محنت ہے۔ انہوں نے اپنی دل کی تسلی کے لئے خوبصورت الفاظ وضع کر لئے ہیں اور آرام جاں کے لئے مقامات، منزلیں اور راستے مقرر کر لئے ہیں۔ مگر ان کے الفاظ ان کی ذات تک محدود رہتے ہیں اور ان کے مقامات ان کی جنس تک اور حق تعالیٰ مخلوق کے اوصاف واحوال سے منزہ اور پاک ہے اور ابو الحسین نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، نعت الفقیر السکون عند العدم والبذل عند الوجود وقال ایضاً الاضطراب عند الوجود ''فقیر کی صفت یہ ہے کہ کچھ نہ ہو تو یہ آرام میں رہے، کچھ موجود ہو تو خوب خرچ کرے، نیز فرمایا کہ اگر اس کے پاس کچھ موجود ہو تو بے چین اور مضطرب رہے۔'' جب نہ ملے خاموش رہے۔ جب ملے تو دوسرے کو اپنے سے زیادہ مستحق جانے اور اس پر خرچ کرے مثلاً اگر طعام کی خواہش ہو اور نہ ملے تو دل کو سکون رہے جب ملے تو اپنے سے بہتر حق دار کی نذر کر دے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں: اول یہ کہ کسی چیز کی عدم موجودگی میں دل کا سکون رضا ہے اور موجودگی میں اس کو تقسیم کر دینا محبت۔ راضی برضا ہونا قابل خلعت بناتا ہے اور خلعت قربت کا نشان ہے اور صاحب محبت خلعت سے دستبردار رہتا ہے کیونکہ خلعت میں نشان فرقت وجدائی بھی ہے۔ دوم یہ کہ کچھ نہ ملنے پر دل کا سکون اس امید پر ہوتا ہے کہ کچھ ملے گا۔ جب کچھ مل جاتا ہے تو ملنے والی چیز ذات باری تعالیٰ سے جدگانہ ہوتی ہے اور کوئی چیز ماسوئی ذات باری اس کی تسلی کا باعث نہیں بن سکتی اور وہ اس سے درست بردار ہو جاتا ہے اور یہ وہی مفہوم ہے جسے شیخ المشائخ ابو القاسم جنید بن محمد بن جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول میں اس طرح ادا فرمایا، الفقر خلو القلب عن الاشکال ''فقر دل کو ہر شکل سے خالی کرنے کا نام ہے۔'' جب دل ہر شکل سے خالی ہو اور وجود شکل غیر اللہ ہو تو پھر دست بردار ہونے کے سوا

کیا چارہ ہے۔ شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ الفقر بحر البلاء وبلاء ہ کل عز ''فقر دریائے بلا ہے اور اس کی جملہ بلائیں اور آزمائشیں عزت ہیں۔'' عزت مقسوم غیر ہے کیونکہ جو عین بلا میں مبتلا ہو اسے عزت کی کیا خبر۔ جب تک وہ بلا کو فراموش نہ کرے اور اپنے خالق کی طرف رجوع نہ کرے یہ ہو تو بلا سراسر عزت میں بدل جاتی ہے۔ اس کی عزت کامل وقت اور اس کا وقت کامل محبت اور اس کی محبت کامل مشاہدہ یہاں تک کہ طالب کا دماغ غلبہ خیال کے باعث کامل محل دیدار الٰہی بن جاتا ہے اور وہ بغیر آنکھ دیکھنے والا بن جاتا ہے اور بغیر کان کے سننے والا بن جاتا ہے۔ تو کیا شان ہے محبوب کی دی ہوئی صعوبت کو برداشت کرنے کی۔ فی الحقیقت یہ صعوبت عزو شرف ہے اور اس کے مقابلے میں نعمت ایک ذلت ہے کیونکہ عزت اس چیز میں ہے جو بندہ کو حضور حق میں لے جائے اور ذلت اس میں جو اسے دور لے جائے۔ فقر کی صعوبت نشان حضوری ہے اور غنا کی راحت علامت بے حضوری، جسے حق تعالیٰ کی حضوری حاصل ہے وہ عزت والا ہے اور جسے بے حضوری ہے وہ ذلیل ہے۔ ہر وہ صعوبت جو مشاہدے اور قربت حق کا باعث ہو قابل قبول ہے اور جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، یا معشر الفقراء إنكم إنما تعرفون باللّٰه وتكرمون للّٰه فانظروا كيف تكونون مع اللّٰه إذا خلوتم به ''اے گروہ درویشاں! لوگ تمہیں باخدا سمجھتے ہیں اور خدا کے نام پر تمہاری عزت کرتے ہیں دیکھو خلوت کی حالت میں تم اس سے کس کیفیت میں ہوتے ہو۔'' یعنی جب خلقت تمہیں درویش سمجھتی ہے اور تمہیں حق پرست جانتی ہے تو تم حق درویشی کس طرح ادا کرتے ہو۔ اگر لوگ تمہیں تمہارے دعویٰ کے خلاف کسی اور نام سے پکاریں تو تمہیں برا نہیں ماننا چاہئے کیونکہ تم بھی اپنے دعویٰ کی صداقت کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ کمترین درجہ کا آدمی وہ ہے جسے لوگ سچا درویش تصور کریں اور وہ درویش نہ ہو۔ اچھا وہ ہے جسے خلق صاحب فقر سمجھے اور وہ صاحب فقر ہو اور عزیز انسان وہ ہے جسے خلقت درویش نہ سمجھے اور وہ حقیقت میں درویش ہو۔ اس شخص کی مثال جو درویش نہ ہو اور لوگ اسے درویش خیال کریں اس آدمی کی سی ہے جسے طبیب

ہونے کا دعویٰ ہو۔ بیماروں کو دوا دے اور جب خود بیمار ہو تو کسی اور طبیب کا محتاج ہو۔ وہ آدمی جسے خلقت درویش سمجھے اور وہ درویش ہو اس طبیب کی مثل ہے جو طبیب ہونے کا دعویدار ہو لوگوں کو دوا دے اور جب خود بیمار ہو تو اس کو کسی اور طبیب کی ضرورت نہ ہو اور وہ اپنا علاج خود کر سکے وہ شخص جسے لوگ درویش نہ سمجھتے ہوں اور فی الحقیقت درویش ہو اس طبیب کی طرح ہے جسے لوگ طبیب نہ مانتے ہوں اور وہ لوگوں سے بے نیاز ہو کر اچھی غذا، مفرح شربت اور معتدل ہوا اپنی صحت کو برقرار رکھنے پر وقت صرف کرتا ہو تا کہ بیمار نہ ہو۔ لوگوں کی نظروں سے وہ اوجھل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ الفقر عدم بلا وجود "فقر عدم بلا وجود ہے۔" اس قول کی تشریح ناممکن ہے کیونکہ معدوم چیز کا وجود ہی نہیں ہوتا اور تشریح اسی چیز کی ہو سکتی ہے جس کا وجود ہو۔ بظاہر اس قول کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصلیت کا انکار مدنظر نہیں بلکہ انکار اس آفت کا ہے جو اصلیت کو مسخ کر دے۔ تمام انسانی صفات باعث آفت ہیں جب آفت کو دور کیا جائے تو نتیجہ فنائے صفات ہو گا جو مقصود کو حاصل کرنے یا اس سے دستبردار ہونے کے ذرائع کو ختم کر دیتی ہے۔ اصلیت تک پہنچنے کا راستہ مسدود ہو تو اصلیت کی فنا نظر آتی ہے اور آدمی قعر مذلت میں گر جاتا ہے۔

مجھے فلسفیوں کے ایک گروہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس قول کے معانی سمجھے بغیر خندہ برلب تھے اور اسے غلط تصور کرتے تھے۔ ایک اور جماعت ایسے جھوٹے دعویداروں کی بھی تھی جو اس احمقانہ اس قول کی صداقت پر یقین رکھتے تھے اور اصل حقیقت سے بے خبر تھے۔ دونوں گروہ برخود غلط تھے ایک لاعلمی کی وجہ سے منکر دوسرا احماقت کی وجہ سے سرگرداں۔ دراصل اہل تصوف کے لئے "عدم" اور "فنا" سے مراد آلات مذموم کو ختم کر دینا اور کسی عمدہ صفت کو حاصل کرنے کی کوشش میں برے نشانات کو مٹا دینا ہے۔ سامان طلب کے وجود میں فنا ہو جانا نہیں۔

درویشی اپنے تمام معانی میں عارضی فقر ہے اور تمام آلات واسباب سے بے گانہ، تاہم

درویش گذرگاہ اسرار ربانی ہے۔ جب تک وہ خود اور کو حاصل کرتا ہے ہر امر اس کا اپنا فعل ہوتا ہے اور معانی کو اس کی ذات سے نسبت ہوتی ہے جب وہ تحصیل حاصل سے رہا ہو جائے تو اس کا کوئی فعل اس کی ذات سے منسوب نہیں ہوتا۔ پھر وہ راہرو نہیں رہتا رہگذر ہو جاتا ہے یعنی اس پر جو کچھ گذرتا ہے وہ ازخود کسی سمت نہیں چلتا۔ نہ کسی چیز کو اپنی طرف جذب کرتا ہے۔ نہ کسی چیز کو اپنی ذات سے دور پھینکتا ہے۔ صرف اصلیت اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔

میں نے بعض برخود غلط ارباب تصوف کو دیکھا جنہیں مدعیان ارباب اللسان کہنا چاہئے۔ وہ اپنی خام خیالی میں اصل فقر کے منکر تھے اور ان کی حقیقت سے روگردانی انہیں اوصاف فقر کی تردید پر آمادہ کرتی تھی۔ وہ صداقت اور اصلیت کی تلاش سے قاصر تھے اور اپنی اس برائی کو فقر اور صفا کا نام دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوائے اپنے بے بنیاد خیالات کے ہر چیز کو غلط قرار دینے پر تلے ہوئے تھے۔ ان میں ہر ایک کم وبیش فقر سے بے بہرہ تھا۔ دراصل اس بات یعنی فقر کا پندار آدمی کے لئے کمال ولایت کا نشان ہوتا ہے اور اس کی آرزو اور اس بات کی تہمت بھی آخری مطمح نظر، تاہم عین حقیقت کے مطابق معنی کی آرزو کرنا مقام کمال ہے۔ طالبان حق کی راہ پر چلنا، ان کے مقامات کا طے کرنا اور ان کی عبارات کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ مجلس خواص میں کوئی عامی اور جاہل نہ رہ جائے۔ عام اصولوں سے بےخبر آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ فروعات سے ناآشنا آدمی کم ازکم اصولوں کا سہارا ہوتا ہے۔ اصول سے بےخبر کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ میں نے یہ سب کچھ ازراہ حوصلہ افزائی بیان کیا تاکہ تم روحانی سفر اختیار کرسکو اور آداب سفر کو کسی جگہ نظر انداز نہ کرو۔

اب میں تصوف کے باب میں اہل تصوف کے کچھ اصول، رموز اور اشارات بیان کروں گا۔ پھر اہل حق کے حالات پھر مشائخ متصوفہ کے مختلف مذاہب کا ذکر کروں گا۔ آگے چل کر میں تصوف کی اقسام، علم اور قوانین سے متعلق کچھ لکھوں گا اور پھر حتی المقدور اہل تصوف کے آداب و رموز بیان کروں گا تاکہ پڑھنے والوں پر حقیقت کا انکشاف ہو۔

وباللہ التوفیق

تیسرا باب

تصوف

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا، وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان) ''اور اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے کلام کریں تو وہ سلام کر کے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا يُؤْمِنُ عَلٰى دُعَائِهِمْ كُتِبَ عِنْدَاللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِيْنَ ''جس نے اہل تصوف کی آواز سنی اور اسے نہ مانا بارگاہ حق میں وہ غافلوں میں شمار ہوا۔'' لوگوں نے لفظ تصوف کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوفی کو اس لئے صوفی کہا جاتا ہے کہ وہ صوف یعنی پشم وغیرہ کا لباس پہنتا ہے۔ دوسری جماعت کہتی ہے صوفی صف اول میں ہوتا ہے اس لئے صوفی کے نام سے موسوم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صوفیاء نے اصحاب صفہ کی محبت اختیار کی اس لئے صوفی کہلائے۔ بعض دیگر لوگوں کا خیال ہے لفظ صوفی صفا سے مشتق ہے اور ہر کسی کے طریقت کی تحقیق اور ان معانی میں بیشتر لطائف ہیں۔ یہ تشریحات لفظ صوفی کی لغوی صورت کو روشن کرنے سے قاصر ہیں۔ گو ہر ایک تشریح کے ساتھ دقیق استدلال موجود ہے۔

''صفا'' مسلمہ طور پر قابل قدر ہے اور اس کا الٹ ''کدر'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْيَا وَبَقِيَ كَدِرُهَا(1) ''دنیا کی صفائی جاتی رہی اور میل باقی رہ گیا۔'' اشیاء کے لطیف حصے کا نام ''صفا'' ہے اور کثیف کو ''کدر'' کہتے ہیں۔ چونکہ اہل تصوف اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف رکھتے ہیں اور قلبی آفات سے بری ہوتے ہیں اس لئے صوفی کہلاتے ہیں۔ اس فرقہ کے لئے یہ لفظ ''اسم علم'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

1۔ امام نسائی نے اس کا شاہد ذکر کیا ہے: ''ذھب صفو امتی''

صوفیائے کرام کا عز و وقار اس سے بلند ہے کہ ان کے معاملات میں کوئی چھپی ہوئی چیز ہو کہ ان کے اسم کو کسی لفظ سے مشتق ہونے کی ضرورت ہو لیکن اس زمانے میں اللہ تبارک تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کو تصوف اور اہل تصوف سے محجوب اور دور کر رکھا ہے اور اسرار تصوف ان کے دلوں سے چھپا رکھے ہیں۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے تصوف صرف ظاہری زہد و اتقاء تک محدود ہے بغیر کسی باطنی کیفیت کے۔ بعض کہتے ہیں کہ تصوف ایک ظاہر داری کا طریق ہے اور اس کی اصل اور بنیاد کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اہل ہزل اور علمائے ظاہر کا نقطہ نظر قبول کر لیا ہے جو صرف ظاہر کو مدنظر رکھتے ہیں اور تصوف کی اصل حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اسے قابل طعن گردانتے ہیں۔ عوام الناس نے ان کی اندھادھند تقلید کرتے ہوئے تزکیہ قلب سے روگردانی اختیار کی اور اپنے سلف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احکام کو پس پشت ڈال دیا ؎

ان الصفا صفوۃ الصدیق إن أردت صوفیا علی التحقیق

"اگر تو کامل صوفی دیکھنا چاہتا ہے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھ کہ اصل صفا ان میں تھی"۔

صفا کی اصل بھی ہے اور فرع بھی۔ اصل یہ ہے کہ دل اغیار سے خالی ہو اور فرع یہ ہے کہ دل اس فریب دینے والی دنیا سے منقطع ہو۔ یہ دونوں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفتیں ہیں۔ ابوبکر عبداللہ بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ کہ وہ اہل طریقت کے امام ہیں۔ ان کا دل اغیار سے اس قدر تہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شکستہ دل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شمشیر نکالی اور اعلان کیا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت یہ کہے گا کہ وہ وفات پا گئے اس کا سر قلم کر دوں گا۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باہر آئے اور بآواز بلند کہا، اَلَا مَنْ عَبَدَ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْمَاتَ وَمَنْ عَبَدَ رَبَّ مُحَمَّدٍ فَاِنَّهٗ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ (1) "متنبہ رہو کہ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بندگی کی تو وہ رحلت

1۔ دیکھیے کتب سیرت

فرما گئے اور جس نے محمد ﷺ کے رب کی بندگی کی تو وہ زندہ ہے اور اس کو موت نہیں۔"
پھر یہ آیت پڑھی، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ (آل عمران:144) "اور نہیں ہیں محمد ﷺ مگر رسول اور ان سے پہلے بھی رسول ہو گذرے ہیں تو یہ اگر رحلت فرما جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے قدم لوٹ جاؤ گے۔"

جو فانی اشیاء کا دلدادہ ہوتا ہے فانی فنا ہو جاتا ہے اور اس کی جملہ محنت اکارت جاتی ہے اور جو خدائے باقی کے حضور میں رہے وہ باقی بہ بقا ہوتا ہے۔ جس نے محمد ﷺ کو بشریت کی نظر سے دیکھا اس کی دل سے تعظیم وہ ان کی رحلت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی اور جس نے حضور ﷺ کو بچشم حقیقت دیکھا اس کے لئے ان کی موجودگی اور رحلت یکساں تھی کیونکہ دونوں حالتیں باری تعالیٰ کی ذات سے منسوب ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حالات سے منہ پھیر کر حالات کے خالق کو سامنے رکھا فی الحقیقت حالات، خالق حالات کے حکم سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی تعظیم آپ کی شایان شان کی، اپنا دل بجز خدا کسی چیز سے وابستہ نہ کیا اپنی نظر کو خلقت سے بچایا بقول کسے من نظر إلی الخلق هلک ومن رجع إلی الحق ملک "جس نے مخلوق کو دیکھا ہلاک ہوا اور جس نے حق کو دیکھا مالک ہوا۔" کہ مخلوق کی طرف دیکھنا نشان ہلاکت ہے اور حق کی طرف دیکھنا نشان بادشاہت۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا متاع دنیا سے انقطاع یہ تھا کہ انہوں نے اپنا تمام مال و منال راہ خدا میں دے دیا اور خود ایک کمبل اوڑھ کر حضور رسالت پناہ ﷺ میں آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، مَا خَلَفْتَ لِعَيَالِکَ(1) "اپنے بال بچوں کے لئے کیا چھوڑا؟"۔ فقال اللّٰه و رسوله "کہا اللہ اور اللہ کا رسول۔" یعنی دو خزانے بے انتہا اور نہ ختم ہونے والے۔ پوچھا گیا: عرض کی خدا کی محبت اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی۔ جب دل صفات دنیا سے خالی ہو گیا، میں

1۔ دیکھیے کتب سیرت

نے اس کی کثافت سے بھی ہاتھ دھو لئے۔ یہ صوفی صادق کی علامات ہیں۔ اس چیز کا انکار حقیقت سے منکر ہونے کے برابر ہے اور ایک صریح کج بحثی ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا کہ صفا، کدر کی ضد ہے۔ کدر صفات انسانی میں شامل ہے۔ صحیح معنوں میں وہ صوفی ہے جو کدر یعنی کثافت سے دست بردار ہو جائے۔ زنان مصر پر استغراق مشاہدہ یوسف علیہ السلام اور آپ کے نظارۂ جمال کے دوران بشریت غالب آگئی اور وہ مادیت سے ہٹ کر روحانیت میں محو ہو گئیں۔ جب یہ غلبہ انتہا کو پہنچا تو غلبہ سفلی سے آگے نکل گئیں اور ان کی نظر حضرت یوسف علیہ السلام سے ہٹ کر فنائے انسانیت کی طرف گئی اور وہ پکار اٹھیں: مَا هٰذَا بَشَرًا (یوسف:31) "یہ انسان نہیں ہے۔" ان کا اشارہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف تھا اور درحقیقت بیان اپنی کیفیت کا تھا اور اسی لئے مشائخ طریقت رحمہم اللہ نے فرمایا۔ لیس الصفاء من صفات البشر لأن البشر مدر والمدر لا یخلو من الکدر "صفا انسانی صفات سے نہیں کیونکہ انسان مٹی کا پتلا ہے اور مٹی کثافت سے خالی نہیں۔" مطلب یہ کہ صفا کی نسبت افعال سے نہیں اور از روئے مشاہدہ نہ بشریت کو زوال ہے کہ وہ بالکل ختم ہو جائے اور صفا کو افعال واحوال سے تعلق نہیں اور یہ نام والقاب سے بالاتر ہے الصفاء صفة الاحباب وھم شموس بلا سحاب "صفا دوستان حق کی صفت ہے جو ایسے خورشید کی مانند ہیں جس پر ابر نہ ہو۔" چونکہ صفا نشان محبت ہے اور محبت کرنے والے اپنی صفات کو نذر فنا کر کے صرف محبوب کی صفات پر جیتے ہیں۔ ارباب حال کی نظر میں ان کی مثال روشن آفتاب کی سی ہے۔ حبیب خدا محمد مصطفیٰ ﷺ سے جب حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ عبد نور اللہ قلبه بالایمان "وہ ایسا بندہ ہے جس کا دل اللہ نے نور ایمان سے روشن کیا ہے۔" اسی نور کے فیض سے اس کا چہرہ چاند کی طرح تابندہ ہے اور وہ نور ربانی کا پیکر ہے۔ بقول کسے ؎

ضیاء الشمس والقمر إذا اشترکا
نموذج من صفاء الحب والتوحید إذا اشتکا

''سورج اور چاند کا ملاپ توحید اور صفا کا اتحاد ہے۔''

یہ ٹھیک ہے کہ صفاو توحید خداوندی کے نور کے سامنے چاند اور سورج کی روشنی بے کار ہے اور دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا مگر دنیا میں چاند اور سورج سے زیادہ روشن کوئی چیز نہیں۔ آنکھ جلوۂ آفتاب و ماہتاب کی متحمل نہیں۔ جب آفتاب اور ماہتاب اوج کمال پر ہوں تو آنکھ آسمان کو دیکھتی ہے اور دل نور معرفت، توحید اور محبت کے ذریعے عرش کو دیکھتا ہے اور دوسرے عالم کے کوائف سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ تمام مشائخ اس پر متفق ہیں کہ جب بندہ مقامات کی قید سے رہائی حاصل کر لیتا ہے اور احوال کی کثافتوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور تغیر و تبدل کی دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور تمام پسندیدہ احوال کے ساتھ موصوف ہو جاتا ہے اور وہ جملہ اوصاف سے جدا ہو جاتا ہے یعنی اپنی کسی پسندیدہ صفت پر نظر کر کے اس کے ہاتھوں قید نہیں ہوتا اور اس کو نہیں دیکھتا اور اس پر مغرور نہیں ہوتا تو اس کا حال ادراک کی گرفت سے باہر ہو جاتا ہے اور اس کا وقت وسوسوں کے تصرف سے محفوظ ہو جاتا ہے، بارگاہ ایزدی میں اس کی حضوری نہ ختم ہونے والی ہوتی ہے اور اس کا وجود ظاہری اسباب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ **لأن الصفا حضور بلا ذهاب ووجود بلا اسباب** ''کیونکہ صفا نام ہے ایسی حضوری کا جو زائل نہ ہو اور ایسے وجود کا جو بلا اسباب ہو۔'' جہاں غنیمت رونما ہو وہاں حضور نہیں رہتا اور جب اسباب وجہ حصول مدعا ہوں تو آدمی صاحب حصول تو کہلائے گا واجد یعنی صاحب حال نہیں۔ جب یہ مقام نصیب ہو تو وہ دنیا اور عقبیٰ کے لئے فنا ہو کر فقدان بشریت کی بناء پر ربانی ہو جاتا ہے۔ سونا اور مٹی اس کی نگاہوں میں برابر ہو جاتا ہے اور وہ احکام جو اوروں کیلئے دشوار ہوں اس کے لئے آسان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كَيْفَ أَصْبَحْتَ يَا حَارِثَةُ قَالَ أَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا بِاللّٰهِ حَقًّا فَقَالَ انْظُرْ مَا تَقُوْلُ يَاحَارِثُ اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيْقَةً فَمَا حَقِيْقَةُ اِيْمَانِكَ فَقَالَ عَرَفْتُ نَفْسِيْ عَنِ الدُّنْيَا فَاسْتَوٰى عِنْدِيْ حَجَرُهَا وَذَهَبُهَا وَفِضَّتُهَا وَمَدَرُهَا فَاسْهَرْتُ لَيْلِيْ

وَاظْمَأْتُ نَهَارِیْ حَتّٰی صِرْتُ كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی عَرْشِ رَبِّیْ بَارِزًا وَ كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اَهْلِ الْجَنَّةِ یَتَزَ اَوْرُوْنَ فِیْهَا وَكَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اَهْلِ النَّارِ یَتَعَادُوْنَ وَ فِیْ رَوَایَةِ یَتَعَاوَذُوْنَ (1) ''تجھ پر صبح کا ظہور کیسے ہوا؟ اے حارثہ! انہوں نے جواب دیا میں صبح کو اللہ پر ایمان لایا اور سچا ایمان۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے حارثہ! اچھی طرح سمجھ لو کیا کہہ رہے ہو ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تیرے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے جواب دیا، میں نے دنیا سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو پہچانا۔ پس اس کا پتھر سونا، چاندی اور مٹی میری نظر میں برابر ہوا۔ میں رات بھر جاگا اور دن پیاس میں گذارا یہاں تک کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے رب کریم کا عرش دیکھ رہا ہوں اور نیز یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اہل بہشت ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور اہل جہنم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، عَرَفْتَ فَالْزَمْ قَالَهَا ثَلٰثًا 'اے حارثہ! تو نے پہچان لیا۔ اسی کو لازم پکڑ کہ حقیقت سوائے اس کے نہیں۔ آپ نے یہ تین بار فرمایا''۔

صوفی کا لفظ کامل اور محقق اولیائے کرام پر عائد ہوتا ہے۔ مشائخ میں سے کسی نے کہا ہے: **من صفاه الحب فهو صاف و من صفاه الحبيب فهو صوفی** ''جو محبت کے ساتھ مصفا ہو وہ صافی ہے اور جو دوست میں محو و مستغرق اور غیر دوست سے بری ہو وہ صوفی ہے۔'' لفظ صوفی کسی اور لفظ سے مشتق نہیں۔ کیونکہ تصوف کا مقام اس تکلف سے بالاتر ہے۔ اشتقاق کے لئے جنس کی ضرورت ہے۔ موجودات کی ہر چیز کثیف ہے اور صفا کی ضد ہے۔ کوئی چیز اپنی ضد سے مشتق نہیں ہوسکتی۔ صوفیائے کرام کے لئے تصوف کے معانی سورج سے زیادہ روشن ہیں اور کسی عبارت یا اشارت کے محتاج نہیں۔ **لان الصوفی ممنوع عن العبارة والإشارة** ''صوفی عبارت و اشارہ سے بری ہے۔'' چونکہ صوفی تشریح سے باہر ہے تمام لوگ اس کی شرح کرنیوالوں میں ہیں چاہے حصول معنی کے وقت اس لفظ کی عظمت کا ان کو علم ہو یا نہ ہو۔ ان میں جو اہل کمال ہوں ''صوفی'' کہلاتے ہیں اور

1۔ ہیثمی: مجمع الزوائد

ان کے متعلقین اور طالبوں کو ''متصوف'' کہتے ہیں۔ تصوف باب تفعل سے ہے اور تفعل میں تکلف واقع ہونے کا مفہوم مضمر ہے۔ یہ جڑ کی فرع ہے (شاخ) اور اس کا معنوی اور نحوی فرق صاف ظاہر ہے۔ الصفاء ولاية لها آية ورواية والتصوف حكاية للصفاء بلا شكاية ''صفا ولایت ہے جس کے نشانات وروایات ہیں اور تصوف اس صفا کی حکایت بے شکایت ہے۔'' صفا کے معنی روشن اور ظاہر ہیں تصوف اسی کی حکایت ہے۔ اہل صفا تین جماعتوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں: ا۔ صوفی، ۲۔ متصوف، ۳۔ مستصوف۔ صوفی کی انا فنا ہو جاتی ہے۔ حق اس کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ آلات بشریت سے آزاد ہوتا ہے اور صحیح معنوں میں حقیقت وحقائق سے واقف ہوتا ہے۔ متصوف وہ ہے جو اس مقام کو مجاہدہ سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کوشش میں صوفیا کی مثال سامنے رکھ کر اپنے آپ کو درست کرنے میں مصروف ہو۔ مستصوف وہ ہے جو روپے پیسے، طاقت اور دنیوی جاہ حاصل کرنے کے لئے صوفیا کی نقالی کر رہا ہو اور پہلی دونوں صورتوں سے بے خبر ہو۔ چنانچہ کہا گیا ہے: المستصوف عند الصوفية كالذباب وعند غيرهم كالذئاب ''مستصوف صوفیا کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور عام لوگوں کے لئے بھیڑیئے کی طرح۔'' الغرض صوفی صاحب وصول، متصوف صاحب اصول اور مستصوف صاحب فضول ہوتا ہے جسے وصل نصیب ہو اس نے اپنے مقصود کو حاصل کرنے میں تمام دیگر مقاصد سے ہاتھ دھو لئے جو اصل کے قابل تھا وہ راہ طریقت کے احوال پر ثابت قدم رہا اور اس کے لطائف سے بہرہ اندوز ہو کر مستحکم ہوا۔ جسے فصل یعنی جدائی مقدر تھی ہر شائستہ چیز سے نامراد رہا۔ ظاہر داری میں کھو گیا حقیقت سے محجوب رہا اور اسی حجاب نے اسے وصل اور اصل سے محروم کر دیا۔ مشائخ طریقت نے اس بارے میں بہت سے لطیف اور دقیق نکات پیدا کئے ہیں۔ سب کو معرض بیان میں لانا محال ہے۔ البتہ چند ایک انشاء اللہ بیان کروں گا تا کہ پڑھنے والے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ وباللہ التوفیق

۔ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الصوفی إذا نطق بان نطقه من

الحقائق وإن سکت نطقت عنه الجوارح بقطع العلائق ''صوفی وہ ہے کہ جب گفتگو کرے تو اس کی گفتگو سراسر بیان حقائق ہو اور جب خاموش ہو تو اس کا عمل اور فعل شارح حال ہو اور اس کے منقطع العلائق یعنی ماسوئی اللہ سے کٹا ہوا ہونے پر صادر ہو۔'' یعنی وہ کوئی ایسی چیز نہیں کہتا جو اس میں خود موجود نہ ہو۔ اس کا سب کلام اصل کے مطابق ہوتا ہے اور سب کے سب افعال قطع علائق کا مرقع ہوتے ہیں۔ کلام حق اور افعال فقر۔

اور جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، **التصوف نعت أقیم العبد فیه قیل نعت للعبد ام للحق فقال نعت للحق حقیقة ونعت لعبد رسم** ''تصوف ایک وصف ہے جس میں آدمی کا قیام ہے لوگوں نے کہا وصف خدا کا یا انسان کا؟ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا اصل تو خدا کا وصف ہے ظاہری قیام وصف انسانی ہے۔ مطلب یہ کہ تصوف کا اصل انسانی صفات کی فنا ہے جو باری تعالیٰ کی صفات کے دوام سے واقع ہوتی ہے اور اس لئے تصوف وصف خدا تعالیٰ ہے۔ رسمی طور پر تصوف آدمی سے مستقل مجاہدۂ نفس طلب کرتا ہے اور یہ استقلال مجاہدہ انسانی وصف ہے۔ اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی توحید میں انسانی صفات کا کلی فقدان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مستقل نہیں ہوتے اور ان کا ہونا محض رسمی ہوتا ہے ان کو دوام نہیں کیونکہ باری تعالیٰ ان کا خالق ہے اور وہی ان کا مالک ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ مثلاً حق تعالیٰ نے بندہ کو روزہ کا حکم دیا اور روزہ دار کو صائم کا نام دیا۔ رسماً اگرچہ روزہ انسان کا ہے مگر حقیقتاً خدا کا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا، اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ(1) ''روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔'' اس کی تمام مخلوق اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کے ساتھ کسی چیز کی نسبت رسمی ہوتی ہے۔ حقیقی نہیں۔

ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، **التصوف ترک کل حظ النفس** ''تصوف ہر قسم کے حظ نفس سے دستبرداری کا نام ہے۔'' یہ دو طرح ہے رسماً اور حقیقتاً مثلاً اگر کوئی ترک!

1۔ صحیح مسلم

حظ کرے اور وہ ترک میں بھی حظ محسوس کرے یہ رسم ہے اگر حظ خدا سے ترک کردے تو یہ حظ کی فنا در عین مشاہدہ ہے۔ ترک حظ انسان کا فعل ہے اور فنائے حظ خدائے تعالیٰ کا۔

انسانی فعل رسم ہے اور خدائے مطلق کا فعل حقیقت۔ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول جنید رحمۃ اللہ علیہ کے محولا بالا قول کی تشریح کرتا ہے۔ ابوالحسن نوری نے یہ بھی کہا، **الصوفية هم الذين صفت ارواحهم فصاروا فى الصف الأول بين يدى الحق** "صوفی وہ ہیں جن کی روحیں بشریت کی کثافت سے پاک اور آفت سے پاک اور آفت انسانی سے صاف ہوں جو ہوا و ہوس سے آزاد ہوں اور صف اول میں اور درجہ اعلیٰ پر حق آرمیدہ اور از خلق رمیدہ ہوں۔ اور نوری نے نیز کہا، **الصوفى الذى لا يملك ولا يملك** "صوفی وہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور کوئی چیز اس کی مالک نہ ہو۔ اس کا مطلب عین فنا ہے۔ فانی صفت والا نہ مالک ہے نہ مملوک۔ کیونکہ ملکیت کا اطلاق موجودات پر ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ صوفی متاع دنیا اور زینت عقبیٰ کی کسی چیز کو قبضہ اختیار میں نہیں لیتا اور خود کو اپنے نفس کی ملکیت اور محکوم نہیں سمجھتا۔ وہ دوسروں پر حکمرانی نہیں کرتا تا کہ کوئی دوسرا اسے محکوم نہ سمجھے۔ صوفیا کے اس قول میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے جسے فنائے کلی کہتے ہیں۔ ہم اس سے متعلق انشاء اللہ آئندہ کچھ تحریر کریں گے تا کہ یہ چیز واضح ہو جائے کہ اس میں کیا غلطی سرزد ہوئی ہے۔

ابن جلاء کہتے ہیں، **التصوف حقيقة لا رسم له** "تصوف حقیقت ہے اور اس میں کوئی رسم نہیں۔" کیونکہ رسم انسانی وصف ہے اور انسانی معاملات سے متعلق ہے اور حقیقت باری تعالیٰ کے لئے ہے۔ چونکہ تصوف انسانی دنیا سے منہ پھیرنے کا نام ہے اس میں رسم کو دخل نہیں۔ ابو عمر دمشقی کہتے ہیں، **التصوف رؤية الكون بعين النقص بل غض الطرف عن الكون** "تصوف کارگاہ حیات کو ناقص دیکھنا ہی نہیں بلکہ کارگاہ حیات سے آنکھیں پھیر لینے کا نام ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی اوصاف فنا ہو جاتے ہیں کیونکہ آنکھیں اشیائے عالم کو دیکھتی ہیں اور جب اشیائے عالم سے منہ پھیر لیا تو گویا

آنکھیں اور قوت بینائی کا وصف بھی غائب ہو گیا۔ جب ظاہر سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو روحانی بصارت قائم رہتی ہے۔ اپنی ذات کو نظر انداز کرنے والا نگاہ حق سے دیکھتا ہے۔ عالم ظاہر کا نظارہ کرنے والا دراصل اپنی ذات کی تلاش کرتا ہے۔ اس کا فعل اپنا ہوتا ہے اور محض اپنی کارکردگی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی اپنی ذات سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اپنی خامی تو نظر آتی ہے مگر وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور نہیں دیکھتا۔ بہر کیف آنکھ ایک پردہ ہے اور نظر اسے محجوب رکھتی ہے۔ برخلاف اس کے عالم ظاہر کو نہ دیکھنے والا دیکھتا تو نہیں مگر حجاب میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک اہل طریقت اور ارباب معانی کا مسلمہ اصول ہے مگر یہاں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

ابوبکر شبلی فرماتے ہیں، **التصوف شرک لأنه صیانة القلب عن رؤیة الغیر ولا غیر** "تصوف شرک ہے کیونکہ یہ غیر کو دیکھنے سے دل کو بچانے کا نام ہے اور غیر اللہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔" بالفاظ دیگر اثبات توحید غیر کا تخیل شرک ہے۔ غیر اللہ کا تصور دل میں کوئی وقعت نہیں رکھتا اور جب یہ صورت ہے تو غیر کے تخیل سے دل کو محفوظ رکھنے کی کوشش بے معنی ہے۔

حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، **التصوف صفاء السر من کدورۃ المخالفة** "تصوف دل اور سر حق کو مخالفت کی کدورت سے محفوظ رکھنے کا نام ہے۔" مطلب یہ ہے کہ دل کو مخالفت حق سے بچائے کیونکہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت ضد مخالفت ہے۔ دوست اس عالم میں ہمیشہ فرمان دوست کے تابع ہوتا ہے جب ہم آہنگی ہو تو مخالفت کا کیا کام۔

محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم نے فرمایا، **التصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی الصوف۔**

"تصوف نیک خوئی و خوش اخلاقی ہے جو زیادہ نیک خو ہو وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے۔" نیک خوئی کی دو صورتیں ہیں: خدا کے ساتھ اور بندوں کے ساتھ۔ خدا کے ساتھ نیک خوئی اس کے احکام کی پابندی ہے۔ بندوں کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ صرف خدا کے لئے ان

سے میل جول برقرار رکھا جائے۔ یہ دونوں صورتیں طالب سے متعلق ہیں۔ کیونکہ باری تعالیٰ کی ذات اقدس انسانی فرمانبرداریوں یا انسانی برگشتگی سے نیاز ہے اور دونوں کا انحصار توحید خداوندی کے عرفان پر ہے۔

مرتعش رحمۃ اللہ کہتے ہیں، الصوفی لا یسبق همته خطوته البتة ''صوفی وہ ہے جس کی فکر اس کے قدم کے ساتھ لامحالہ برابر ہو۔'' مطلب یہ کہ ہر چیز حاضر ہو۔ جہاں تن ہو وہیں دل ہو اور جہاں دل ہو وہیں تن ہو۔ جہاں قول ہو وہیں پر قدم ہو اور جہاں قدم ہو وہیں پر قول ہو۔ یہ حضوری بلا غنیمت ہے۔ اس کے برعکس بعض کہتے ہیں کہ صوفی اپنی ذات سے غائب اور حضور حق میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ وہ اپنی ذات میں بھی حاضر ہوتا ہے اور حضور حق میں بھی ویسے اس قول کا مطلب جمع الجمع یعنی مکمل وصل ہے کیونکہ جب تک اپنا احساس موجود ہو اپنی ذات سے غائب ہونا ناممکن ہے اپنا احساس مٹ جائے تو حضور حق حاصل ہوتا ہے۔ ان معنوں میں یہ قول خصوصیت سے شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے ملتا ہے جنہوں نے کہا، الصوفی لایری فی الدارین مع الله غیر الله ''صوفی وہ جو دو جہان میں بجز ذات خدا کسی چیز کو نہ دیکھے۔'' مختصر یہ کہ انسان کی ہستی غیر ہے اور جب وہ کسی غیر کو نہیں دیکھتا تو گویا اپنی ذات کو نہیں دیکھتا اور اس کا احساس بالکل خالی ہو جاتا ہے چاہے اس کی نفی کی جائے یا اثبات۔

اور جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، التصوف مبنی علی ثمان خصال: (۱) السخاء (۲) والرضاء (۳) والصبر (۴) والاشارة (۵) والغربة (۶) ولبس الصوف (۷) والسیاحة (۸) والفقر أما السخاء فلإبراهيم وأما الرضاء فلإسمٰعيل وأما الصبر فلأيوب وأما الإشارة فلزكريا وأما الغربة فليحيى وأما لبس الصوف فلموسىٰ وأما السياحة فلعيسىٰ وأما الفقر فلمحمد صلى اللّٰه عليه وعليهم أجمعين ''تصوف کی بناء آٹھ خصائل پر ہے (جو آٹھ پیغمبروں کی اقتداء ہے۔) سخاوت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ انہوں نے اپنے

بیٹے کو فدا کیا۔ رضا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کہ انہوں نے برضائے خداوندی اپنی جان عزیز کو پیش کیا۔ صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام کہ انہوں نے غیرت خداوندی پر صبر کیا اور کیڑوں کی مصیبت برداشت کی۔ اشارات میں حضرت زکریا علیہ السلام کہ جن کے لئے باری تعالیٰ نے فرمایا: اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (آل عمران: 41) ''تین دن لوگوں سے بات مت کرو مگر اشارے سے۔'' اور نیز فرمایا، اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ (مریم) ''جب اس نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا۔'' غربت میں یحییٰ علیہ السلام کہ وہ اپنے وطن میں بھی اپنوں سے بے گانہ تھے۔ صوف پوشی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ ان کا تمام لباس اون کا تھا۔ سیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہ وہ راہ خدا میں اتنے مجرد اور تنہا تھے کہ سامان زندگی میں سے صرف پیالہ اور کنگھی رکھتے تھے اور جب دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھ سے پانی پی رہا ہے تو پیالہ پھینک دیا اور جب دیکھا کہ ایک شخص انگلیوں سے بال درست کر رہا ہے تو کنگھی بھی پھینک دی۔ فقر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ اللہ جل شانہ نے روئے زمین کے سب خزانوں کی چابیاں عطا فرمائیں اور حکم دیا کہ محنت و مشقت چھوڑ کر شان و شوکت سے بسر کرو مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی باری تعالیٰ میں خزانے نہیں چاہتا۔ مجھے ایک روز سیر ہو کر کھانے کو دے اور دوسرے روز بھوکا رکھ۔ یہ اصول راہ طریقت میں بہترین ہیں۔

حصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، الصوفی لا یوجد بعد عدمه ولا یعدم بعد وجوده ''صوفی وہ ہے جس کی فنا کو ہست نہیں اور جس کی ہست کو فنا نہیں۔'' یعنی جو اسے حاصل ہو وہ اسے کھوتا نہیں اور جو اس کو کھو جائے اسے حاصل نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر اس کی یافت نایافت نہیں ہوتی اور نایافت کبھی یافت نہیں بنتی۔ یا اثبات بلا نفی ہوگی یا نفی بلا اثبات۔

ان تمام اقوال کا لب لباب یہ ہے کہ صوفی تمام عوارضات انسانی سے بری ہوتا ہے اس کے جسمانی احساس ختم ہو جاتے ہیں اس کے تعلقات ہر چیز سے منقطع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ راز بشریت نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کی اصلیت ذات میں مجتمع ہو جاتی ہے اور وہ اپنی ذات میں اپنے آپ قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال دو پیغمبروں میں نمایاں نظر آتی

ہے۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی حضوری میں کبھی انقطاع نہیں آیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا، رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ﴿۲۵﴾ (طٰہٰ) ''اے اللہ! میرے سینے کو فراخ فرما۔'' دوسرے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی توحید میں ذرہ برابر کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان سے کہا گیا، اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿۱﴾ (الم نشرح) ''کیا ہم نے آپ کے سینے کو فراخ نہیں کیا۔'' ایک طرف آرائش وزینت طلب کی گئی۔ دوسری طرف بلا درخواست آراستگی عطا فرمائی گئی۔

علی بن بندار صیرفی نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، التصوف إسقاط الروية للحق ظاهرا وباطنا ''صوفی وہ ہے جو ہر ظاہر و باطن سے بے نیاز ہمیشہ چشم بحق ہو۔'' چنانچہ اگر تو ظاہر کو دیکھے تو رحمت حق کے آثار تو نظر آئیں گے مگر جملہ آثار رحمت حق کے سامنے مچھر کے پر کے برابر بھی معلوم نہیں ہوں گے اور لامحالہ تو ظاہر سے روگرداں ہو جائے گا۔ اس طرح اگر تو باطن پر نظر کرے تو امداد حق کے نشانات تو نظر آئیں گے۔ مگر امداد حق کے مقابل یہ نشانات ایک دانے کے برابر قیمت نہیں رکھتے لامحالہ تو باطن سے بھی منہ پھیرے گا اور تجھ پر روشن ہو جائے گا کہ ہر چیز کی مالک حق تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور یہ ادراک ثابت کر دے گا کہ تو خود کچھ بھی نہیں۔

محمد بن احمد مقری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، التصوف اقامة الأحوال مع الحق ''تصوف باری تعالیٰ کے ساتھ اقامت احوال کا نام ہے۔'' یعنی حالات صوفی کو اس کے حال سے برگشتہ نہیں کر سکتے اور غلط راستے پر نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ جس کا دل خالق حالات سے وابستہ ہو اسے حالات مقام استقامت سے نہیں ہٹا سکتے اور وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتا۔ وباللہ التوفيق الأعلى

فصل: معاملات

معاملات سے متعلق اقوال میں ابوحفص حداد نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ التصوف كله آداب لكل وقت أدب ولكل مقام أدب ولكل حال ادب فمن لزم أداب الأوقات بلغ مبلغ الرجال ومن ضيع الأداب فهو بعيد من

حیث یظن القرب ومردود من حیث یظن القبول ''تصوف مکمل ادب ہے۔ ہر وقت مقام اور حال کے لئے ادب ہے جو کوئی اوقات کے ادب کو مدنظر رکھے وہ مقام آدمیت پر سرفراز ہوتا ہے اور جو ادب کو ضائع کرے وہ نزدیکی اور قبولیت سے دور جا پڑتا ہے اور مردود ہو جاتا ہے۔'' یہ قول ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے قریب ہے کہ انہوں نے کہا: لیس التصوف رسوما ولا علوما ولکنہ اخلاق۔ ''تصوف رسوم و علوم نہیں بلکہ اخلاق ہے۔'' اگر رسوم میں داخل ہوتا تو مجاہدہ سے حاصل ہو جاتا اگر علوم کا حصہ ہوتا تو تعلیم سے میسر آ جاتا۔ سو فی الحقیقت اخلاق میں شامل ہے۔ جب تک تو اپنے اندر تلاش نہ کرے جب تک اس کے معاملات کو تو خود ٹھیک نہ کرے اور خود اس میں انصاف نہ کرے ہرگز دستیاب نہیں ہو سکتا۔ رسوم اور اخلاق میں فرق یہ ہے کہ رسم ظاہرداری کا عمل ہوتا ہے جو کسی مقصد کے پیش نظر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ حقیقت سے خالی ہوتا ہے اور اس کی صورت اور اصلیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اخلاق میں وہ عمل شامل ہیں جو قابل تعریف ہوتے ہیں اور ان میں کوئی ظاہرداری مقصد یا فریب نہیں ہوتا۔ ان کی صورت اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

مرتعش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ التصوف حسن الخلق ''تصوف نیک خلق کا نام ہے۔'' یہ تین طرح کا ہے۔ پہلے یہ کہ احکام خداوندی کو بغیر ریا اور نمائش کے پورا کرے۔ دوسرے خلقت میں بڑوں کی عزت کرے۔ چھوٹوں کے ساتھ محبت سے پیش آئے اور برابر کے لوگوں سے انصاف برتے اور کسی سے عوض و معاوضہ کی توقع نہ رکھے۔ تیسرے خود ہواؤ ہوس اور شیطانی رجحانات سے پرہیز کرے۔ یہ تینوں امور درست ہو جائیں تو انسان نیک خو ہے۔ یہ جو کچھ بیان ہوا وہی ہے کہ کسی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ اخلاق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا قرآن پڑھو۔ خدا نے اس میں فرمایا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِينَ ﴿۱۹۹﴾ (الاعراف) ''معاف کرنے کی خصلت اختیار کریں۔ اچھی بات کا حکم

دین اور جاہلوں سے کنارہ کش رہیں۔“ مرتعش رحمۃ اللہ علیہ نے نیز فرمایا: هذا مذهب كله جد فلا تخلطوه بشيء من الهزل ”یہ کوشش اور سوچ و بچار کا راستہ ہے اس میں ہزل اور مسخرے پن کو شامل نہ کرو۔“ ظاہر پرستوں کے پیچھے نہ لگو اور ان کی کورانہ تقلید کرنیوالوں سے پرہیز کرو۔ جب عام لوگ ان ظاہر پرستوں کو ناچتے گاتے دیکھتے ہیں یا جب وہ ان عوام کو درباروں میں نوازشات اور طعام کے نوالوں پر پڑتے نظر آتے ہیں تو عوام تمام اولیائے کرام سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں، سب کو مورد الزام قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ ہے تصوف اور یہ ہیں تصوف کے اصول۔ پہلے زمانے کے صوفیائے کرام بھی اسی قسم کے ہوں گے کہنے والوں نے یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ وقت فتنہ ہے اور زمانہ آفات کا گھر۔ حرص بادشاہ کو ظلم پر آمادہ کر دیتا ہے۔ طمع ایک عالم کو بدکاری و زنا میں ڈال دیتا ہے۔ ریا زاہد کو منافقت کی راہ دکھاتی ہے۔ اسی طرح ہوس و ہوا صوفیا کو رقص و سرور میں ڈال دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اہل طریقت برباد ہو جاتے ہیں۔ طریقت برباد نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ ہزلیات کو پاک و صاف چیزوں میں شامل کر دیں تو پاک و صاف چیزیں ہزل ہو کر نہیں رہ جاتیں۔

ابو علی قزوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: التصوف هو الاخلاق الرضية ”تصوف اخلاق پسندیدہ کا نام ہے“۔ پسندیدہ کار انسان وہ ہے جو ہر حال میں حق تعالیٰ کی پسند پر گامزن ہو اسی کو راضی برضا کہتے ہیں۔

ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: التصوف هو الحرية والفتوة وترك التكلف والسخاء وبذل الدنيا ”تصوف آزادی کا نام ہے اور آزادی ہوس کی قید سے ہوتی ہے۔ فتوت یا جواں مردی یہ ہے کہ انسان قطع علائق کرے۔ ترک تکلف یہ ہے کہ اپنے متعلقات اور حصے کے لئے کوشاں نہ ہو اور سخاوت یہ ہے کہ دنیا کو اہل دنیا کے لئے چھوڑ دے“۔

ابو الحسن بوشنجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: التصوف اليوم إسم ولا حقيقة وقد كان حقيقة ولا اسم ”تصوف آج کا نام ہے۔ بغیر حقیقت کے اور اصل میں یہ حقیقت

ہے بغیر نام کے۔'' صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اور سلف رحمہم اللہ کے زمانے میں یہ نام نہیں تھا ایک حقیقت تھی سب پر ساری و طاری آج کل صرف نام ہے بے حقیقت۔ یعنی پہلے معاملہ معروف تھا اور ظاہر داری مجہول۔ اب معاملہ مجہول ہے اور ظاہر داری معروف۔

یہ سب کچھ مشائخ کے اقوال سے تحقیق اسباب تصوف کے متعلق بیان ہوا تا کہ خدا تجھے سعادت دے اور راہ طریقت تیرے لئے کھل جائے اور تو منکران طریقت سے پوچھ سکے کہ انکار تصوف سے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر صرف اسم سے انکار ہے تو خیر اور اگر معنی سے انکار ہے تو اس کا مطلب مکمل شریعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام اخلاق ستودہ کا انکار ہے۔ تجھے خدا وہ سعادت نصیب کرے جو اولیائے کرام کے حصے میں آتی ہے میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ان خیالات کی کماحقہ، پاسداری کر شرط انصاف پوری کر۔ مکر و ریا سے پرہیز کر اور صوفیائے کرام پر اعتقاد صاف رکھ۔ وباللہ التوفیق

چوتھا باب

خرقہ پوشی

جان لے کہ خرقہ پوشی اہل تصوف کا شعار ہے اور خرقہ پوشی سنت ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بِلُبْسِ لِبَاسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (1) ''لباسوں میں تمہارے لئے لباس صوف ہے تا کہ تم دلوں میں ایمان کی حلاوت محسوس کرو۔'' نیز صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ایک صحابی نے کہا، كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ الصُّوْفَ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ ''نبی کریم ﷺ لباس صوف پہنتے اور گدھے کو سواری کے لئے کام میں لاتے۔'' رسول ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا، لَا تُضَيِّعِيْ الثَّوْبَ حَتّٰى تُرَقِّعِيْهِ (2) ''کپڑا ردنہ کر جب تک اس پر پیوند نہ لگ چکے ہوں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس خرقہ تھا جس میں تیس پیوند لگے ہوئے تھے اور نیز فرماتے تھے: اچھا کپڑا وہ ہے جس کا معاوضہ کم ہو۔ ان کے متعلق ہی مشہور ہے کہ ان کے پیراہن کی آستینیں انگلیوں کے برابر تھیں۔ اگر کبھی بڑا پیراہن پہننے کا اتفاق ہوتا تھا تو آستینوں کے سرے پھاڑ کر انگلیوں کے برابر کر لیتے تھے۔ رسول کریم علیہ السلام کو خدائے عزوجل کا حکم آیا، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر:4) أي فقصر ''اپنا لباس پاک کر یعنی مختصر کر۔''

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے ستر یاران بدر کو دیکھا کہ خرقہ صوف پہنتے تھے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلوت میں خرقہ صوف پہنتے تھے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو کمبل پہنے ہوئے دیکھا جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ، امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ہرم بن

1۔ شوکانی: الفوائد المجموعہ 2۔ ابن الجوزی، العلل المتناہیہ

حیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو خرقہ پشمین میں دیکھا جس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ حسن بصری مالک دینار اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سب خرقہ پوش تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے اور یہ روایت محمد بن علی حکیم ترمذی کی کتاب ''تاریخ المشائخ'' میں درج ہے کہ ابتداء میں خرقہ صوف پہنتے تھے اور عزلت گزیں تھے۔ اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا: تجھے عوام میں مل کر رہنا چاہئے۔ کیونکہ تیرے ذمہ احیائے سنت کا فریضہ ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے گوشہ نشینی کو ترک کر دیا۔ مگر کبھی بیش قیمت لباس زیب تن نہیں کیا۔ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جو محقق صوفی گذرے ہیں، خرقہ صوف پہنتے تھے۔ ابراہیم ادہم، امام اعظم رحمہما اللہ کے پاس پیوندار خرقہ صوف پہن کر آئے۔ اہل محفل نے حقارت اور بے قدری کی نظر سے دیکھا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ ہمارا سردار ابراہیم ادہم ہے۔ حاضرین نے کہا آپ کبھی مذاق نہیں کرتے ابراہیم کو سرداری کس طرح ملی؟ حضرت امام نے فرمایا: مستقل بندگی سے۔ وہ ہمیشہ بندگی حق میں مصروف رہا اور ہم بندگی نفس میں یہاں تک کہ وہ ہمارا سردار ہو گیا۔

اگر اس زمانے میں کچھ لوگ خرقہ پہنتے ہیں اور اپنی عادت میں پاکیزہ نظر آتے ہیں مگر ان کا مقصد صرف جاہ طلبی اور شہرت پسندی ہے۔ ان کا باطن مختلف ہے تو ممکن ہے انبوہ کثیر میں مرد حق بھی ہو۔ ہر جماعت میں صحیح مقتدی کم ہی ہوا کرتے ہیں اور عام لوگوں کی نظر میں تو ہر وہ شخص صوفی ہو جاتا ہے جس میں کوئی ایک علامت بھی صوفی ہونے کی موجود ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، من تشبه بقوم فهو منهم(1) ''جو کسی قوم سے مشابہت رکھے وہ اسی قوم میں شامل سمجھا جاتا ہے۔'' مگر کچھ لوگ صرف رسوم ظاہری پر نظر رکھتے ہیں اور کچھ صفائے باطن کو پرکھتے ہیں۔

تصوف کے طالب چار گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔

1۔ سنن ابی داؤد، مسند احمد

۱۔ وہ لوگ جو صوفیا کے صفائے باطن، لطافت طبع، اعتدال مزاج اور خوبی کردار سے متاثر ہو کر ان میں شامل ہوتے ہیں۔ محقق اہل تصوف کا قرب اور ان کے مدارج دیکھتے ہیں اور یہ امید لے کر بڑھتے ہیں کہ ان کو بھی مقام نصیب ہو۔ ان کی ابتداء کشف احوال، ترک خواہشات اور مجاہدۂ نفس سے ہوتی ہے۔

۲۔ وہ لوگ جن کی درستی تن، سکون قلب اور صحت دل انہیں اہل تصوف کے حالات ظاہر کو دیکھنے کی توفیق عطا کرے اور وہ دیکھیں کہ صوفیا پابند شریعت ہیں۔ آداب اسلام کے پابند ہیں اور خوبی معاملات سے آراستہ ہیں۔ ان کے دل میں اقتدار کا شوق پیدا نہ ہو اور وہ راہ حق اختیار کریں ان کی ابتداء مجاہدہ اور خوبی عادات سے ہوتی ہے۔

۳۔ وہ لوگ، جو انسانیت، اخلاق حسنہ اور سلامتی طبع کے زیر اثر صوفیائے کرام کے افعال کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے بڑوں کا ادب کرتے ہیں۔ چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں اور برابر کے لوگوں کو دوست سمجھتے ہیں۔ نیز وہ کس طرح دنیوی منفعت کے خیالات سے کوئی تاثر نہیں لیتے اور ہمیشہ اس چیز سے مطمئن رہتے ہیں جو ان کو میسر ہو۔ یہ لوگ صوفیا کی انجمن میں باریابی حاصل کرتے ہیں اور دنیا کی تمناؤں کے سنگلاخ راستوں کی دشواریاں آسان کرتے ہوئے اخیار اور نیکو کاروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

۴۔ وہ لوگ، جن کی حماقت اور روحانی کمزوری کی حب مرتبہ بغیر استطاعت کے اور خواہش عظمت بغیر علم کے ان کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ صوفیائے کرام کا ظاہر ہی سب کچھ ہے جب کبھی وہ صوفیا کی انجمن میں آتے ہیں تو انہیں مدارات اور رواداری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ صوفیا کو علم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حق نا آشنا ہیں اور کبھی سالک طریقت ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ عام لوگ ان کی توقیر کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ فی الحقیقت اولیائے اللہ ہیں۔ دراصل ان کا مقصد صوفیا کا لباس پہن کر اپنی کج اندامی کو چھپانا ہوتا ہے۔ ان کی مثال کتابوں سے لدے ہوئے گدھے کی سی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الجمعہ)

آج کل ایسے لوگوں کی کثرت ہے۔ لازم یہ ہے کہ جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے پرہیز کیا جائے قبول طریقت کی ہزار کوشش کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ طریقت تجھے قبول کر لے کیونکہ اس کے لئے سوز دروں کی ضرورت ہے خرقہ پوشی کی نہیں۔ راز آشنا کے لئے قبائے درویشی عبا کے برابر ہے۔ جسے طریقت اپنا لیتی ہے اس کی قبا گویا عبا ہے۔ بیگانہ راز کے لئے خرقہ صوف بدبختی کا فرمان اور روز قیامت کی شقاوت کا اعلان ہوتا ہے۔ ایک پیر بزرگ سے پوچھا، لم لا تلبس المرقعة؟ قال من النفاق أن تلبس لباس الفتيان ولا تدخل فی حمل اثقال الفتوة "آپ خرقہ کیوں نہیں پہنتے؟ انہوں نے جواب دیا، یہ فریب کاری ہے کہ صوفیا کا لباس تو پہن لیا جائے مگر تصوف کا بوجھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔" پس اگر اس لباس کا مقصد یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے سامنے کوئی خاصان حق میں شمار ہو تو یہ کج فہمی ہے۔ کیونکہ اس کی ذات پاک لباس کی قید کے بغیر بھی سب کچھ جانتی ہے۔ اگر لوگوں میں نمائش مدنظر ہے تو سچے ہونے کی صورت میں ریا کاری ہے اور جھوٹے ہونے کی صورت میں منافقت۔ یہ راہ بڑی دشوار اور پر خطر ہے۔ معرفت حق کا مقام لباس ظاہری سے بہت اونچا ہے۔ الصفا من اللّٰہ تعالیٰ إنعام وإكرام والصوف لباس الأنعام "صفا انعام و اکرام خداوندی ہے اور اونی کپڑا چوپایوں کا لباس ہے۔" پس لباس فریب کاروں کے لئے فریب ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ لوگ صوفیا کی قربت تلاش کرتے ہیں اور بظاہر ان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ دنیا ان کو صوفیائے کرام میں شامل سمجھے۔ مشائخ طریقت اپنے مریدوں کو خرقہ پوشی کی تلقین کرتے رہے ہیں اور خود خرقہ پوشی اختیار کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ مخلوق میں ممتاز رہیں اور لوگ ان کی پاسبانی کریں۔ اگر ان کا ایک قدم بھی خلاف اٹھے تو ہر طرف سے طعن و ملامت شروع ہو جائے۔ اگر وہ اپنے لباس میں رہ کر گناہ کرنا چاہیں تو لوگوں کی شرم کے باعث نہ کر سکیں۔ الغرض خرقہ اولیائے حق کے لئے زینت ہے۔ عوام اس سے عزت حاصل کرتے ہیں اور خواص

ذلت۔ عوام کی عزت یہ ہے کہ جب وہ خرقہ پوش ہوں تو لوگ ان کی عزت کریں۔ خواص کی ذلت یہ ہے کہ لوگ انہیں خرقہ پوش دیکھ کر عوام کی طرح خیال کریں اور انہیں قابل ملامت سمجھیں۔ پس عوام کے لئے خرقہ نعمت ہے اور خواص کے لئے مصائب کے خلاف جوشن یعنی زر بکتر ہے۔ عوام میں سے اکثر مضطرب ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ہاتھ کسی اور چیز پر نہیں پڑتا اور نہ کوئی جاہ و مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے وہ لباس صوف کو دولت جمع کرنے کا آلہ بنا لیتے ہیں۔ خواص ترک ریاست کرتے ہیں ذلت کو عزت پر ترجیح دیتے ہیں اور بلا کو نعمت کے مقابلہ میں اختیار کرتے ہیں۔ المرقعة قميص الوفاء لأهل الصفاء وسربال السرور لأهل الغرور "خرقہ لباس وفا ہے اہل صفا کے لئے اور جامہ سرور ہے اہل غرور کے لئے۔" اہل صفا لباس صوف پہن کر دو جہان سے علیحدہ اور سامان جہاں سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ اہل غرور اس طرح حق سے محجوب اور نیکی سے دور ہو جاتے ہیں۔ الغرض ہر ایک کے لئے نیکی کی ایک جہت اور کامیابی کا ایک سبب ہے اور ان کی مراد اس سے ایک خاص شے ہے جو ایک کے لئے صفا اور پاکیزگی ہے، دوسرے کے لئے عطا اور بخشش خداوندی اور تیسرے کے لئے غطا اور پردۂ حجاب، درویشوں کو امید ہوتی ہے کہ باہمی حسن صحبت اور محبت سے تمام کی نجات ہو گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ(1) "جو کسی گروہ سے محبت کرے وہ اسی گروہ میں شمار ہوتا ہے۔" کسی جماعت سے محبت کرنے والے قیامت کے دن اسی جماعت میں ہوں گے۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ دل سے طلب حق کرے اور رسوم ظاہری سے دور رہے کیونکہ جو ظاہر میں الجھ کر رہ جاتا ہے کبھی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔ آدمیت کا وجود ربوبیت کا حجاب ہے اور حجاب حال و مقام کے حصول کے بغیر ختم نہیں ہوتا۔ حجاب ختم ہونے کا نام ہی صفا ہے۔ فانی صفت کے لئے کوئی لباس اختیار کرنا محال ہے اور اپنے آپ کو بہ تکلف آراستہ کرنا ناممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب صفت فنا پیدا ہو جائے اور اندرونی آفات سے نجات

1۔ سخاوی المقاصد الحسنہ

مل جائے تو صوفی کہلانا یا نہ کہلانا برابر ہے۔

خرقہ یا پیوند والے لباس کی شرط یہ ہے کہ اس کا مقصد صرف سہولت اور ہلکا پن ہو۔ جہاں کہیں سے کپڑا پھٹ جائے وہاں پیوند لگائے۔ مشائخ رضی اللہ عنہم کے اس بارے میں دو قول ہیں: ایک گروہ کا خیال ہے کہ پیوند لگانے میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں۔ جہاں سے سوئی گذرے پیوند لگا لینا چاہئے اور اس میں تکلف نہیں کرنا چاہئے۔ دوسرے گروہ کے مطابق پیوند لگانے میں ترتیب اور قاعدہ کی شرط ہے۔ ترتیب کو مدنظر رکھنا اور صحیح انداز میں تکلف کرنا معاملات فقر میں شامل ہے اور معاملے کی درستی اصل درستی کی دلیل ہے اور میں نے طوس میں حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ درویش کے لئے کم از کم کس چیز کی ضرورت ہے۔ جس کے باعث لفظ فقر کے لئے اسے سزاوار سمجھا جائے۔ فرمایا، تین چیزیں جس میں کمی نہیں ہو سکتی۔ اول یہ کہ اسے معلوم ہو کہ صحیح پیوند کس طرح لگایا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ صحیح بات کو کیسے جانا جاتا ہے۔ سوم یہ کہ صحیح قدم کس طرح اٹھایا جاتا ہے۔ جب یہ بات ہو رہی تھی تو درویشوں کا ایک گروہ میرے ساتھ موجود تھا۔ جب اٹھ کر باہر آئے تو ہر شخص بجائے خود گرگانی کے قول میں تصرف کر رہا تھا۔ جہلاء کی ایک جماعت کو یہ تشریح پسند آئی کہ فقر صرف اس قدر ہے کہ پیوند لگانے میں مہارت ہو۔ زمین پر سیدھا پاؤں مارنے کی مشق ہو اور یہ گمان ہو کہ صاحب فقر حقائق طریقت کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ مجھے اس سردار یعنی گرگانی سے قلبی تعلق تھا اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی کہی ہوئی بات کی بے قدری ہو۔ میں نے کہا آؤ مل کر اس معاملے پر بات چیت کریں اور ہر شخص اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ صحیح پیوند وہ ہوتا ہے جو فقر کے لئے لگایا جائے زینت کے لئے نہیں جو پیوند فقر کے لئے لگایا جاتا ہے وہ سیدھا ہوتا ہے چاہے سیدھا معلوم نہ ہو۔ صحیح بات وہ ہوتی ہے جو خلوص دل سے کی جائے نہ کہ وہ جو اکراہ و جبر سے ہو۔ اس پر طیب خاطر سے عمل کیا جائے نہ سبک سری سے اور اسے دل و جان سے سمجھا جائے نہ استدلال سے۔ صحیح قدم وہ ہے جو عالم وجد میں اٹھایا جائے اور اس میں کھیل تماشے کا شائبہ

نہ ہو۔ بعض لوگوں نے یہ بات گرگانی تک پہنچائی انہوں نے فرمایا، أصاب علی خَیَّرہ اللہ ''اللہ علی کو نیکی دے اس نے صحیح بات کی۔''

اہل تصوف خرقہ پوشی کو دنیا کے بوجھ کم کرنے اور فقر میں خلوص پیدا کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ صحیح روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے تو وہ خرقہ صوف پہنے ہوئے تھے۔ ایک شیخ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا خرقہ صوف زیب تن تھا جس کے ہر پیوند سے نور نمایاں تھا۔ میں نے پوچھا یہ نور کیسا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی عنایات کا نور ہے میں نے ہر پیوند از راہ ضرورت لگایا تھا۔ باری تعالیٰ نے ہر اس ایذا کے عوض جو میرے دل کو پہنچی، مجھے نور عطا فرمایا۔ میں نے ماوراء النہر میں اہل ملامت میں سے ایک بزرگ کو دیکھا جو کوئی ایسی چیز کھاتا پیتا نہیں تھا جو عام طور پر لوگوں کو میسر تھی۔ اس کی خوراک وہ چیزیں تھیں جو عام لوگ پھینک دیتے ہیں۔ مثلاً ساگ پات، کڑوا کدو، گلی سڑی گاجریں وغیرہ۔ اس کی پوشاک ان چیتھڑوں پر مشتمل تھی جو وہ ادھر ادھر سے جمع کر کے پاک کر لیتا تھا اور گدڑی بنا لیتا تھا۔ مرو الزود میں متاخرین میں سے ایک بزرگ صاحب حال و کردار تھے۔ ان کے مصلے اور ٹوپی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے اور ان کے اندر بچھوؤں نے بچے دے رکھے تھے۔ میرے پیر طریقت نے چھپن برس تک ایک ہی لباس زیب تن رکھا اور اس پر ہر بار پیوند لگاتے رہے ہیں۔ اہل عراق کی حکایات میں ہے کہ دو درویش تھے ایک صاحب مشاہدہ دوسرے صاحب مجاہدہ۔ ایک صرف وہ چیتھڑے پہنتے تھے جو حالت وجد میں درویشیوں کے جسم سے علیحدہ ہو جاتے تھے دوسرے فقط وہ پیوند پہنتے تھے جو عالم استغفار میں درویشوں کے لباس سے پھٹ کر گر جاتے تھے۔ اس طرح ان کی ظاہری حالت ان کی باطنی کیفیت کے دوش بدوش تھی۔ اسے کہتے ہیں ناموس حال کی پاسداری، شیخ محمد حنیف رضی اللہ عنہ نے بیس برس تک سخت ٹاٹ پہنا اور ہر سال چار مرتبہ چلہ کشی کرتے تھے اور ہر چلے کے دوران روزانہ علمی باریکیوں پر تصنیف کا کام سرانجام دیتے تھے۔ ان کے زمانے

میں موضع پارس میں محمد بن زکریا نامی ایک محقق عالم حقیقت وطریقت تھے جو خرقہ نہیں پہنتے تھے۔ شیخ محمد سے کسی نے دریافت کیا کہ خرقہ پوشی کی شرط کیا ہے اور یہ کام کسے زیب دیتا ہے؟ شیخ نے فرمایا خرقہ پوشی کی شرط وہی ہے جو محمد بن زکریا سفید لباس میں بجالاتا ہے اور یہ لباس اسی کو زیبا ہے۔

فصل: مقصود اور شرائط

صوفیا کے لئے اپنی روش کو ترک کرنا خلاف طریقت ہوا کرتا ہے۔ اگر اس دور میں اہل تصوف لباس صوف کم پہنتے ہیں تو اس کی دو وجوہ ہیں: ایک تو یہ کہ اون ٹھیک نہیں رہی۔ کیونکہ اون والے جانور حملہ آوروں کی دستبرد کی نذر ہو گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لباس صوف بدعت پسند لوگوں نے اختیار کر لیا ہے اور اہل بدعت کے خلاف چلنا بہتر ہوتا ہے۔ چاہے بظاہر طریقہ اسلاف کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

صوفی لوگ پیوند لگانے میں تکلف برتنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا وقار دنیا میں بلند ہو چکا ہے۔ ہر کس و ناکس ان کی نقالی پر اتر آیا ہے اور خرقہ پوشی کو اپنا شعار بنا لیا ہے وہ برے افعال کے مرتکب ہوتے ہیں اور صوفیا کو ان کی نسبت سے شرمندگی ہوتی ہے اس لئے وہ اس انداز سے پیوند دوزی کرتے ہیں کہ لوگ ان کی نقل نہ کر سکیں اور وہ ایک دوسرے کو اسی انداز پیوند دوزی سے شناخت کر سکیں۔ یہ امر صوفیا شعار ہو گیا اس حد تک کہ ایک درویش کسی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کی گدڑی میں پیوند لگاتے وقت بخیہ بہت چوڑا رکھا گیا تھا۔ شیخ نے اس سے کنارہ کر لیا۔ مراد یہ تھی کہ صفا کی بنیاد نزاکت طبع اور لطافت قلب پر ہے۔ طبیعت کی کجی کسی حالت میں بھی اہل صفا کو قابل قبول نہیں ہوتی۔ ان کے لئے غلط کام اتنا ہی بار خاطر ہوتا ہے جتنا کہ ایک برا شعر۔

بعض لوگوں نے لباس کے معاملے میں تکلف کو مدنظر نہیں رکھا۔ باری تعالیٰ نے خرقہ صوف دیا تو قبول کیا۔ قباطی تو بخوشی پہن لی۔ ننگا رہنا پڑا تو گلہ نہ کیا اور میں کہ علی بن عثمان جلابی اسی مسلک پر کاربند ہوں اور لباس کے معاملے میں اسی چیز کو مدنظر رکھتا ہوں اور

حکایات میں ہے کہ احمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ جب ابو یزید رحمۃ اللہ کی زیارت کو آئے تو قبا زیب تن تھی۔ ابن شجاع جب ابو حفص رحمہ اللہ سے ملنے آئے تو قبا پہنے ہوئے تھے۔ یہ ان کا عام لباس نہیں تھا۔ اکثر خرقہ بھی پہنتے تھے کبھی جامہ نشین یا پیراہن سفید بھی زیب تن فرماتے تھے۔ انسانی طبیعت کو بسا اوقات بعض چیزوں سے لگاؤ ہو جاتا ہے اور انسان رسوم و تکلفات کا دلدادہ ہے۔ جب اسے کسی چیز کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ عادت اس کی طبع ثانی بن جاتی ہے اور طبع ثانی حجاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی واسطے پیغمبر ﷺ نے فرمایا، خَيْرُ الصِّيَامِ صَوْمَ اَخِىْ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ (1) ''روزوں میں بہترین روزہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کس طرح فرمایا: ایک دن روزہ رکھتے دوسرے دن چھوڑ دیتے تاکہ نفس کو روزہ رکھنے یا کھولنے کی عادت نہ ہو جائے اور یہ عادت باعث حجاب نہ بن جائے۔ اس معاملے میں ابو حامد دوستان مروزی رحمۃ اللہ علیہ خوب تھے کہ ان کو جو کپڑا مرید پہنا دیتے تھے وہ پہن لیا کرتے تھے پھر جب کسی کو اس کپڑے کی ضرورت ہوتی تھی وہ اتار لیتا تھا نہ ہی وہ پہنانے والے سے کہتے کہ کیوں اتارا؟ ہمارے اس زمانے میں غزنیؔ (اللہ اس کی حفاظت کرے) میں بھی ایک بزرگ ملقب بہ موید ہیں۔ جن کے ہاں لباس کے بارے میں پسند، ناپسند کو کوئی دخل نہیں اور جس مقام پر وہ پہنچ چکے ہیں وہاں یہی صحیح ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ کپڑے زیادہ تر کبود یعنی نیلے رنگ کے کیوں ہوتے ہیں؟ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اہل تصوف نے اپنی طریقت کی بنیاد سیر و سیاحت پر رکھی ہے اور سفر میں سفید کپڑا اپنی حالت میں نہیں رہتا اور آسانی سے صاف نہیں ہو سکتا اور کپڑوں کے متعلق ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلا لباس غمزدہ مصیبت زدہ اور اندوہ گینوں کا شعار ہے اور یہ دنیا دار محن ہے، مصائب کا گھر ہے، آلام کا خیمہ ہے، غم کا غار ہے، مقام فراق

1۔ بخاری و مسلم میں شاہد مذکور ہے: إن أحب الصيام إلى الله صيام داؤد وأحب الصلوٰة إلى الله صلوٰة داؤد كان ينام نصف الليل ويقوم ثلثه و ينام سدسه و كان يصوم يوم و يفطر يوما (کتاب الصوم، کتاب التہجد)

اور گہوارۂ بلا ہے۔ مریدان طریقت نے یہ دیکھ کر کہ اس عالم میں مراد دل پوری نہیں ہوسکتی۔ نیلگوں لباس ماتم فراق خداوندی میں پہن لیا۔ اوروں نے بندگی کو خام، دل کو پراز اوہام اور زندگی کو محض تضییع اوقات پاکر نیلا لباس چن لیا۔ کیونکہ کسی چیز کا ضائع ہونا موت سے بدتر ہے۔ ایک دوست کی موت پر نیلا لباس پہن لیتا ہے دوسرا پروردہ امیدوں کی موت پر۔

ایک درویش سے پوچھا گیا کہ وہ نیلا لباس کیوں پہنتا ہے۔ جواب دیا، پیغمبر ﷺ تین چیزیں چھوڑ گئے تھے یعنی ایک فقر، دوسری علم اور تیسری تلوار۔ تلوار طاقتوروں کے ہاتھ لگی اور انہوں نے اس کو غلط استعمال کیا۔ علم علماء کو ملا اور انہوں نے صرف تعلیم وتدریس کو کافی خیال کیا۔ فقر درویشوں نے سنبھالا اور اسے دولت سمیٹنے کا ذریعہ بنالیا۔ میں ان تینوں جماعتوں کے ماتم میں نیلا لباس پہنے ہوئے ہوں۔

مرتعش بغداد کے کسی محلے میں گھوم رہے تھے پیاس لگی ایک دروازے پر پانی کی درخواست کی۔ ایک عورت نے پانی کا کوزہ دیا۔ پانی پیا۔ ساقی کے چہرے پر نظر پڑی فریفتہ ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ گھر کا مالک آیا۔ مرتعش نے کہا مجھے آپ کے گھر سے آب شیریں پلایا گیا اور میرا دل لوٹ لیا گیا۔ صاحب خانہ نے کہا وہ میری لڑکی تھی جسے میں رشتہ زوجیت میں دینے کو تیار ہوں۔ مرتعش کو گھر میں لے گئے صاحب خانہ دولت مند تھا۔ اس نے ہونے والے داماد کو حمام بھجوا دیا۔ اسے بیش قیمت لباس پہنایا گیا اور خرقہ صوف کی جگہ لبادہ شبینہ نے لے لی۔ رات ہوئی تو مرتعش نماز کے لئے کھڑے ہوئے تاکہ اوراد ووظائف پورے کریں۔ چنانچہ خلوت کے دوران پکار کر کہا، ھاتوا مر قعتی "میرا خرقہ لاؤ"۔ اہل خانہ نے پوچھا کیا تکلیف ہے؟ کہا میرے دل سے آواز آرہی ہے کہ اے مرتعش تیری ایک گستاخ نظر کی سزا یہ تھی کہ تیرے جسم سے تیرا خرقہ چھین لیا گیا۔ دوسری نظر کی سزا یہ ہوگی کہ تیرے باطن سے لباس آشنائی اتار لیا جائے گا۔

جو لباس رضائے خداوندی حاصل کرنے کے لئے پہنا جائے اور اس میں دوستان حق کا اتباع مدنظر ہو ہمیشہ مبارک ہوتا ہے۔ اگر اس انداز پر بسر ہوسکتی ہے تو کرو ورنہ اپنے دین

کی نگہداشت کر اور لباس اولیاء میں خیانت کا مرتکب نہ ہوتا کہ تو حقیقی مسلمان ہو جائے اور یہ جھوٹی ولائت کا دعویٰ کرنے سے بہتر ہے۔ خرقہ صوف دو جماعتوں کو راس آتا ہے۔ ایک تارک الدنیا لوگوں کو اور دوسرے عاشقان حق کو مشائخ رضی اللہ عنہم کا طریق کار یہ ہے کہ جب کوئی مرید ترک تعلقات پر آمادہ ہو کر ان کے پاس آتا ہے تو وہ تین سال تک تین مختلف صورتوں میں تدریس ادب کرتے ہیں۔ اگر مرید استقامت کرے تو خیر ورنہ کہہ دیتے ہیں کہ طریقت میں اس کے لئے قبولیت کا دروازہ نہیں کھلا۔ ایک سال خدمت خلق۔ دوسرے سال خدمت حق اور تیسرے سال پاسداری دل۔ خدمت خلق کی یہ صورت ہے کہ اپنے آپ کو خادم سمجھے اور سب لوگوں کو آقا کا مقام دے یعنی سب کو بلا تفریق ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ سے بہتر سمجھے اور سب کی خدمت لازم خیال کرے۔ خدمت یہ نہیں کہ اپنی ذات کو مخدوموں سے بہتر سمجھا جائے یہ سراسر نقصان ہے اور یہ حقیقت ایک حجاب ہے اور آفات زندگی میں شامل ہے۔ خدمت حق یہ ہے کہ اپنے آپ کو دنیا و عقبیٰ کی تمام لذتوں سے منقطع کرے اور محض باری تعالیٰ کی عبادت کرے صرف اس کی ذات کے لئے کیونکہ اگر اس کی عبادت کسی اور مقصد کے لئے کی جائے تو وہ اپنی ذات کی پرستش ہے اس کی نہیں۔ دل کی پاسداری یہ ہے کہ جمعیت خاطر موجود ہو۔ اوہام مفقود ہوں اور حضور حق میں کسی قسم کی غفلت اور لاپرواہی رونما نہ ہو۔ اگر یہ تینوں شرائط پوری ہو جائیں تو مرید بلا تقلید خرقہ صوف پہن سکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو خرقہ پہنائے وہ خود قائم الحال ہو۔ طریقت کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہو۔ ذوق حال میں کامیاب ہو۔ مشرب اعمال میں باریاب ہو۔ قہر جلال اور لطف جمال دیکھ چکا ہو۔ نیز وہ خبردار ہو کہ مرید کس مقام تک پہنچ سکتا ہے، پلٹ جائے گا، واقفوں میں سے ہو گا یا کاملوں میں سے ہو اگر لوٹ جانے کا احتمال ہو تو شروع ہی سے اسے مرید نہ بنائے۔ اگر رکاوٹ کا امکان ہو تو اس کا انتظام کر لے۔ اگر مرید منزل آشنا ہو جائے تو اس کی پرورش کرے۔ اہل طریقت دراصل دلوں کے طبیب ہوتے ہیں اگر طبیب بیمار کے مرض سے ناواقف ہو تو یقیناً مریض کو اپنے غلط علاج سے ہلاک کر دے گا۔ کیونکہ وہ اس کی

تیمارداری سے عاری ہوتا ہے اور اس کی خطرناک علامات کو سمجھنے سے معذور، وہ غلط غذا اور مشروبات تجویز کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ(1) ''شیخ طریقت کی حیثیت اپنی جماعت کے لئے وہی ہے جو نبی کی اپنی امت کے لئے۔'' انبیا نے لوگوں کو دعوت علم وقوف سے دی اور ہر شخص کو اس کے مقام پر رکھا۔ شیخ طریقت کو بھی یہی لائحہ عمل لازم ہے ہر شخص کو اس کی استطاعت کے مطابق روحانی غذا دینا چاہئے تاکہ مقصد دعوت پورا ہوتا رہے۔ بالغ نظر شیخ طریقت جسے کمال ولایت حاصل ہو تین سال مرید کو ریاضت میں تربیت دینے کے بعد اگر خرقہ پہنائے تو بجا ہے۔ خرقہ دراصل کفن کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی لذتوں سے رشتہ دل کٹ جائے۔ زندگی کی راحتوں سے بے نیازی میسر ہو۔ تمام عمر خدمت خلق کے لئے وقف ہو چکی ہو۔ اپنی خواہشات سے مکمل بیزاری ہو۔ اس حالت میں پیر طریقت خرقہ عطا کرتا ہے اور مرید کو اپنی نوازشات سے آبرو بخشتا ہے۔ مرید اپنی جگہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اپنی خواہشات کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔

خرقہ پوشی سے متعلق کئی استعارات ہیں۔ شیخ ابو معمر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اکثر اہل تصوف اس بارے میں مبالغہ کرتے ہیں مگر ہمارا مقصد اس کتاب میں اقوال نقل کرنا نہیں بلکہ مشکلات کو حل کرنا ہے۔ خرقہ پوشی پر بہترین استعارہ یہ ہے کہ خرقہ کا قبہ یا کالر ہے۔ دو آستینیں بیم و رجا۔ دو تیریزیں انقباض و انبساط کمرگاہ مخالفت نفس۔ کف درستی یقین اور سنجاف اخلاص۔ اس سے خوب تر یہ ہے کہ کالر فنا کا نشان ہے۔ دو آستینیں حفاظت و عصمت نفس ہیں۔ دو تیریز فقر و صفا ہیں۔ کمرگاہ اقامت مشاہدہ ہے۔ کرسی سکون حضور ہے اور سنجاف مقام وصل کا قرار ہے۔ جب باطن کے لئے ایسا لباس ہو تو ظاہر کے لئے بھی ہونا چاہئے۔ اس موضوع پر میری ایک کتاب ہے: ''اسرار الخرق والمؤنات'' اس کا نسخہ مرید کے پاس ہونا چاہئے۔

1۔ ابن حبان، کتاب الضعفاء

اگر مرید خرقہ پہننے کے بعد عالم حال میں یا قہر سلطان وقت کے تحت اپنا لباس چیر پھینکے تو معذور ہے اگر اپنے اختیار سے اور ہوش وحواس میں رہ کر پھاڑ ڈالے تو پھر اس کو خرقہ پہننا زیبا نہیں اور اگر دوبارہ پہن لے تو وہ بھی دنیا کے مکار خرقہ پوشوں میں شمار ہوگا جو صرف ظاہر داری کے لئے لباس صوف پسند کرتے ہیں۔ لباس کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ جب صوفی ایک مقام سے دوسرے مقام میں داخل ہوتا ہے تو اپنا لباس تبدیل کر لیتا ہے اور یہ ترقی درجات کے لئے اظہار شکر کا ایک انداز ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ معمولی لباس ایک مقام کے لئے ہوتا ہے مگر خرقہ فقر وصفا کے تمام مقامات کے لئے۔ اسے رد کرنا تمام طریقت کو رد کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے اس موضوع پر صرف تھوڑا سا اشارہ کیا ہے اور یہ جگہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے موزوں بھی نہیں۔ انشاء اللہ تشریح خرق اور کشف اسرار سماع کے باب میں زیادہ تفصیل سے بیان کروں گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خرقہ عطا کرنے والے میں اتنی قدرت ہونی چاہئے کہ وہ جس کو بھی نگاہ محبت سے دیکھے وہ دوست بن جائے اور جس گنہ گار کو بھی خرقہ پہنائے وہ ولی اللہ ہو جائے میں ایک دفعہ اپنے شیخ طریقت کے ساتھ آذر بائیجان کے دیار میں سفر کر رہا تھا۔ دو تین خرقہ پوش درویشوں کو دیکھا کہ ایک گندم کے کھلیان کے پاس کھڑے تھے اور اپنے دامن پھیلائے ہوئے تھے اس امید پر کہ کسان کچھ گندم ڈال دے۔ یہ منظر دیکھ کر شیخ نے فرمایا، أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾ (البقرہ) ”یہ ہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی پس ان کو تجارت نے کوئی نفع نہ دیا اور یہ ہدایت پانے والے نہ تھے۔“ میں نے پوچھا حضرت وہ کیوں اس بلا میں مبتلا ہوئے اور لوگوں کے لئے باعث ذلت بنے؟

فرمایا، ان کے پیروں کو مرید جمع کرنے کی ہوس تھی اور ان کو متاع دنیا جمع کرنے کی۔ ایک ہوس دوسری ہوس سے بالاتر نہیں ہوتی اور بے حقیقت دعویٰ ہوس پروری کا ذریعہ ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ باب الطاق میں انہوں نے ایک

ترسازادہ کو دیکھا جونہایت خوبصورت تھا دعا کی کہ باری تعالیٰ تیری کتنی حسین تخلیق ہے اسے میرے حلقہ میں شامل فرما۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ ترسازادہ آیا اور عرض کی یا شیخ مجھے کلمہ شہادت پڑھایئے وہ مسلمان ہو گیا اور اولیائے اللہ میں شامل ہوا۔

شیخ بوعلی سیاہ سے پوچھا گیا کہ خرقہ پوشی کسے زیبا ہے؟ فرمایا اس مرد درویش کو جسے باری تعالیٰ نے اتنا مشرف بہ حق کیا ہو کہ جملہ احکام احوال عالم کی اسے خبر ہو۔

خرقہ صالح اور نیک لوگوں کا نشان ہے اہل فقر و تصوف کا لباس ہے۔ فقر و تصوف سے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے اگر کوئی شخص لباس اولیا کو متاع دنیا جمع کرنے کا آلہ کار بنا لیتا ہے اور اپنی مصیبت کا سامان سمیٹتا ہے تو اہل حقیقت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اہل ہدایت کے لئے یہ جو کچھ بیان ہوا کافی ہے اس سے زیادہ تشریح اس کتاب کا مقصد نہیں۔ وباللّٰہ التوفیق الاعلیٰ

پانچواں باب

فقر وصفا

اہل تصوف میں فقر وصفا کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ فقر صفا سے زیادہ مستحکم ہے اور بعض اس بات پر مصر ہیں کہ صفا فقر سے زیادہ معتبر ہے۔ فقر کو افضل سمجھنے والے کہتے ہیں کہ فقر فنائے کلی ہے، جس میں ہر چیز کالعدم ہو جاتی ہے۔ صفا مقامات فقر میں ایک مقام ہے اور جب فنائے کلی حاصل ہو تو ہر مقام ختم ہو جاتا ہے۔ غایت اس کلام کی وہی ہے جو فقر و غنا کے باب میں بالتفصیل بیان ہو چکی ہے۔ جو لوگ صفا کو فقر پر فوقیت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فقر کا وجود ہے اور اسے نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس صفا ہر چیز سے معرا ہونے کو کہتے ہیں اور صفا عین فنا ہے اور فقر عین غنا۔ لہٰذا فقر ایک مقام کی حیثیت رکھتا ہے اور صفا کمال کا نام ہے۔ اس زمانہ میں یہ معاملہ شد و مد سے زیر بحث ہے اور ہر جماعت دور افتادہ استعارات اور نازک نکات نکالنے میں مصروف ہے۔ فقر وصفا کی تقدیم و تفضیل میں شدید اختلاف ہے۔ اتفاق رائے نہ فقر کے حق میں ہے نہ صفا کے حق میں۔ بحث کرنیوالے الفاظ میں الجھ کر حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں اور صداقت کو خارج از بحث کر جاتے ہیں۔ خواہش پوری نہ ہونے کو مکمل نفی اور اثبات مراد کو اثبات عین تصور کرتے ہیں۔ پس موجود و مقصود اور منفی و مثبت محض اپنی خواہش اور اپنے دل کی بات پر اڑے رہنے کے نشانات بن کر رہ گئے ہیں اور راہ سلوک اس جملہ افسانہ طرازی سے پاک ہے۔ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اس مقام پر متمکن ہوتے ہیں جہاں کوئی مقام نہیں ہوتا۔ تمام درجات و منازل مفقود ہو جاتے ہیں۔ گفتگو کا یارا نہیں رہتا۔ نہ مشرب باقی ہوتا ہے نہ ذوق، نہ سکوت نہ غلبہ، نہ ہوش نہ بے ہوشی۔ بحث کرنے والے ہر اس چیز کے لئے نام تلاش کرتے ہیں جس کی ماہیت ان کی سمجھ سے باہر ہو اور جس کی تعریف نہ ہو سکتی ہو وہ اپنی اپنی سمجھ کے

مطابق کوئی شاندار سا نام چن لیتے ہیں۔ دماغی طور پر ترجیح کا سوال پیدا نہیں ہوتا مگر جب خیالات کا نام دے دیا جائے تو ایک نام کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو لفظ فقر زیادہ موزوں اور قابل قدر نظر آیا۔ کیونکہ اس میں ترک و عجز کا پہلو ہے۔ کچھ اور لوگوں نے لفظ صفا کو ترجیح دی کیونکہ اس میں ترک ما کدر (میلی خراب چیز کو چھوڑنے) اور انقطاع متاع دنیا کے معانی مضمر ہیں۔ ان دو الفاظ کو منتخب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک نا قابل اظہار تصور کی نشان دہی کر سکیں اور باہم گفت و شنید کرتے وقت اپنا مفہوم پوری طرح بیان کر سکیں۔ اہل طریقت میں کوئی اختلاف نہیں۔ چاہے وہ لفظ فقر استعمال کریں یا لفظ صفا۔ اس کے برعکس اہل عبارت کے لئے جو اصل حقیقت سے بے خبر ہیں تمام مسئلہ لفظ آرائیوں کے سوا کچھ نہیں وہ ایک چیز پر متفق نہ ہو سکے اور ایک کو دوسرے پر مقدم کرتے رہے۔ اہل طریقت اصل حقیقت کے متلاشی ہوئے اور اہل عبارت ظلمت عبارت میں کھو گئے۔ الغرض جس نے اصل حقیقت کو پایا اور اسے اپنا قبلہ اول بنایا اسے چاہے فقیر کہو چاہے صوفی، دونوں نام اضطراری کیفیت رکھتے ہیں اس حقیقت سے متعلق جو معرض بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ اختلاف ابوالحسن سمنون رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے چلا آتا ہے جب وہ اس عالم کشف میں ہوتے تھے جس کا تعلق بقا سے ہے فقر کو صفا پر ترجیح دیتے تھے اور جب ایسے مقام پر ہوتے تھے جس کا تعلق فنا سے ہے، صفا کو فقر سے افضل سمجھتے تھے۔

ارباب معانی نے ان سے سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا مجھے فنا اور نگونساری میں وہی مشرب کامل حاصل ہے جو بقا میں۔ جب ایسے مقام پر ہوتا ہوں جس کا تعلق فنا سے ہے میں صفا کو فقر سے مقدم سمجھتا ہوں اور مقام بقا سے دوچار ہوتا ہوں تو فقر کو صفا سے بہتر کہتا ہوں کیونکہ فقر کا تعلق بقا سے ہے اور صفا کا فنا سے۔ آخر الذکر یعنی صفا کے مقام پر میں بقا کے تصور کو فنا کر دیتا ہوں اول الذکر یعنی فقر کے عالم میں فنا کے تصور کو فنا کر دیتا ہوں حتیٰ کہ فنا و بقا کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یہ محض عبارت آرائی ہے کیونکہ نہ فنا کو فنا ہے اور نہ بقا کو فنا ہے ہر باقی چیز جو فنا ہو جاتی ہے اپنے وجود کو ختم کر دیتی ہے اور ہر فنا شدہ چیز جو قائم ہو جاتی ہے

اپنے وجود میں قائم ہوتی ہے فنا کا لفظ از راہ مبالغہ استعمال نہیں ہوسکتا جب کوئی فنا کے فنا ہونے کا ذکر کرتا ہے تو وہ صرف مبالغہ آمیز الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ فنا کا تصور تک ختم ہو چکا ہے مگر جب تک بقا کا کوئی تصور بھی باقی ہے فنا رو بہکار نہیں آتی اور جب رو بہکار آ گئی تو پھر اس فنا کی فنا ایک خود ساختہ بے معنیٰ لفظ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ محض ارباب لسان کی افسانہ آرائی ہے عبارت پرستی کے شوق میں۔

لڑکپن کی تیزی طبع اور جوش طبیعت میں میں نے اس انداز میں ایک کتاب ''کتاب فنا وبقا'' کے نام سے تصنیف کی تھی مگر اس کتاب میں وہی چیز پوری احتیاط سے تحریر کروں گا۔ انشاء اللہ عزوجل

یہ فرق ہے صفا و فقر میں جہاں تک معنوی تصور کا تعلق ہے عملی طور پر یعنی ترک متاع دنیا اور انقطاع ہوائے دل کے معاملے میں صورت حال مختلف ہے۔ یہ چیز فقر و مسکنت تک پہنچتی ہے۔ بعض مشائخ کرام فقیر کو مسکین سے بہتر سمجھتے ہیں۔ جیسے باری تعالیٰ نے فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ (البقرہ:273) ''ان فقراء کے لئے جو اللہ کی راہ میں محصور ہیں اور روئے زمین پر چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔'' مساکین کے پاس سامان زیست ہوتا ہے مگر فقرا اسے ٹھکرا چکے ہوتے ہیں اس لئے فقر باعث عزت اور مسکینی وجہ ذلت ہوتی ہے۔ سامان زینت رکھنے والا طریقت میں ذلیل ہوتا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: تَعِسَ عَبْدُ الدَّارَهِمَ وَ تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَ تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِیْسَةِ وَ الْقَطِیْفَةِ (1) ''ہلاک ہوا بندہ درہم کا اور ہلاک ہوا بندہ دینار کا اور ہلاک ہوا بندہ لباس و کمخواب کا۔'' تارک سامان زینت عزیز ہوتا ہے کیونکہ صاحب سامان کا اعتماد سامان پر ہوتا ہے اور بے سروسامان کا خدائے بزرگ و برتر پر بوقت ضرورت صاحب سامان اپنے سامان کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور تارک سامان باری تعالیٰ کا۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ مسکین افضل ہوتا ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ

1۔ المقاصد الحسنہ

اَحْيِنِیْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنَ (1) ''اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکین کی موت عطا کر اور قیامت کے دن مسکین کی جماعت میں اٹھائیو۔'' مساکین کا ذکر کرتے ہوئے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ میری زندگی و موت مساکین میں ہو۔ لیکن جب فقر کا ذکر کیا تو فرمایا، كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا(2) ''قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے۔'' اس معنی کے اعتبار سے فقیر اسباب سے تعلق رکھتا ہے۔ مسکین وہ ہے جسے اسباب میسر ہی نہ ہوں۔

شریعت میں فقہا کی ایک جماعت کے نزدیک فقیر صاحب بلغہ ہوتا ہے اور مسکین مجرد۔ دوسرے گروہ کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اہل مقامات جو اول الذکر صورت سے اتفاق کرتے ہیں لفظ صوفی کو مساکین کے لئے مختص سمجھتے ہیں۔ اور یہ اختلاف فقہا رضی اللہ عنہم کے اختلاف کے دوش بدوش ہے۔ جن کے نزدیک فقیر بے وسیلہ اور مسکین کفایت شعار ہوتا ہے وہ فقر کو صفا سے افضل جانتے ہیں اور جن کے خیال میں مسکین بے وسیلہ اور فقیر کفایت شعار ہوتا ہے ان کے نزدیک صفا کو فقر پر فوقیت حاصل ہے۔ فقر و صفا کے اختلاف کی یہ مختصر سی کیفیت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

1۔ ابن ماجہ
2۔ زرکشی، التذکرہ

چھٹا باب

ملامت

مشائخ طریقت کی ایک جماعت نے راہ ملامت اختیار کی۔ ملامت خلوص محبت میں بہت تاثیر رکھتی ہے اور ذوق کامل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اہل حق لوگوں کی ملامت کا نشانہ رہے۔ خاص طور پر اس امت کے سر برآوردہ اکابر اور رسول اللہ ﷺ جو اہل حق کے رہنما اور امام ہیں اور اہل محبت کے پیشوا ہیں عام لوگوں کی نظر میں نہایت درجہ صاحب توقیر و آبرو تھے جب تک کشف حقیقت اور نزول وحی نہیں ہوا تھا۔ جب دوستی حق کا لباس عطا ہوا تو خلقت نے زبان ملامت دراز کی۔ کسی نے کہا کاہن ہے، کسی نے کہا شاعر ہے، کسی نے کہا دیوانہ ہے اور کسی نے کہا جھوٹا ہے وغیرہ۔ باری تعالیٰ نے اہل ایمان کا ذکر فرمایا تو کہا کہ وہ ملامت کرنیوالوں کی ملامت سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (المائدہ) ''وہ کسی کی ملامت سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو وہ جس کو چاہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔'' یہ قانون خداوندی ہے کہ اس کے شیدائی نشانہ ملامت بنتے ہیں مگر خدا ان کے دلوں کو ملامت سے پراگندہ ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ غیرت حق ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو نگاہ غیر سے بچاتا ہے تاکہ کسی کی نظر ان کی کیفیت کے حسن پر نہ پڑ سکے۔ وہ خود اپنی نظر سے بچے رہتے ہیں تاکہ اپنا حسن آپ ہی دیکھ کر عجب کی وجہ سے مصیبت و تکبر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ خلقت ان پر مامور ہے تاکہ زبان ملامت دراز کرے نفس لوامہ ان کا جزو طبیعت ہے تاکہ ہر کام پر ملامت کرتا رہے۔ اگر برائی سرزد ہو تو وہ اپنے آپ کو برائی کے لئے ملامت کرتے ہیں۔ اگر نیک کام کریں تو نیکی کرنے میں خامی کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدف ملامت بناتے ہیں۔ یہ ایک پختہ اصول طریقت ہے کیونکہ اس راہ میں خود پسندی سے

زیادہ خوفناک کوئی حجاب یا مصیبت پیش نہیں آتی۔ خود پسندی کے دو سبب ہوتے ہیں: ایک جاہ خلق اور ان کی ستائش یعنی بندہ کا کوئی کام خلقت کو پسند آ جاتا ہے اس کی تعریف ہوتی ہے اور وہ متکبر ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی اور کے کام کو پسند نہیں کرتا، صرف اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے یہ پندار و تکبر کا راستہ اپنے دوستوں پر بند کر رکھا ہے۔ ان کے معاملات کتنے بھی درست ہوں، عام لوگوں کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ ان کا مجاہدۂ نفس کتنا ہی عالی ہو وہ کبھی اسے اپنی قوت اور ہمت کا نتیجہ نہیں سمجھتے اور خود پسندی کے مرتکب نہیں ہوتے اور تکبر سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو پسندیدہ حق ہوتا ہے خلقت اسے پسند کرتی ہے اور جو اپنی تن پروری میں مشغول ہوتا ہے ذات حق اس کو منتخب نہیں کرتی۔ ابلیس کو خلق پسند نہیں کرتی تھی اور ملائکہ نے اسے قبول کر رکھا تھا۔ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو گیا کیونکہ پسندیدۂ حق نہیں تھا۔ اسے خود پسندی کا پھل لعنت ابدی کی صورت میں ملا۔ آدم کو ملائکہ نے ناپسند کیا اور کہا، اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (البقرہ:30) ''خدایا! کیا تو زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے۔'' آدم نے اپنے آپ کو پسند نہ کیا۔ چنانچہ اس نے کہا، رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (الاعراف:23) ''اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا۔'' چونکہ پسندیدہ حق تھا حکم ہوا۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ (طٰہٰ) ''آدم بھول گیا۔ ہم نے اسے اراداً بھٹکتے ہوئے نہیں پایا۔'' خلقت اور آدم کا اپنا عدم پسند رحمت کا پھل لایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ مقبول حق خلقت سے منقطع ہوتا ہے اور مقبول خلقت حق سے جدا۔ القصہ ملامت دوستان حق کی غذا ہے اور قبول کا نشان۔ یہ اولیاء کا مشرب ہے کیونکہ قربت حق کی علامت ہے۔ دنیا قبول خلق پر خوش ہوتی ہے اور وہ رد خلق پر۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ جبریل صلوٰت اللہ علیہ نے باری تعالیٰ کا پیغام دیا۔ اَوْلِيَائِىْ تَحْتَ قَبَائِىْ لَا يَعْرِفُهُمْ غَيْرِىْ اِلَّا اَوْلِيَائِىْ(1) ''میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں انہیں میرے دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ واللہ أعلم

1۔ غزالی، احیاء علوم الدین

فصل: ملامت کی صورتیں

ملامت کی تین صورتیں ہیں: ۱۔ راست روی، ۲۔ قصد کرنا، ۳۔ ترک کرنا۔

ملامت راست روی یہ ہے کہ آدمی اپنی روش پر چل رہا ہو۔ فرائض مذہب پورے کر رہا ہو۔ بندگی کی کسی شرط کو نظر انداز نہ کرتا ہو لوگ اسے ملامت کریں اور یہ سب سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو۔ ملامت قصد کی یہ صورت ہے کہ آدمی اپنے ہم جنسوں میں صاحب مرتبہ ہو۔ ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔ اس کے دل میں حب جاہ پیدا ہو جائے اور اپنی خواہشوں میں الجھ جائے اور پھر یک بیک وہ ان سے علیحدہ ہو جائے۔ مائل بحق ہونے کے لئے ملامت خلق برداشت کرے اور کوئی ایسی چیز کر گذرے جو شریعت کے خلاف تو نہ ہو مگر اس کی وجہ سے خلقت کو اس سے نفرت ہو جائے۔ یہ اس کا اپنا کام ہوتا ہے اور خلق کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ملامت ترک یہ ہے کہ کسی کو طبعی کفر و ضلالت گھیر لے اور ترک شریعت و ترک اتباع کی تلقین شروع کر دے اور یہ سمجھے کہ وہ راہ ملامت اختیار کر رہا ہے۔ یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔

ملامت راست روی میں آدمی مکر و فریب سے دور ہوتا ہے۔ نمائش سے بچتا ہے۔ عوام الناس کی ملامت کی پروا نہیں کرتا اور ہمیشہ اپنی روش پر قائم رہتا ہے۔ اسے کوئی کسی نام سے پکارے اس کے لئے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روایات مشائخ میں مرقوم ہے کہ ایک دن ابو طاہر حرمی رضی اللہ عنہ گدھے پر سوار ایک بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک مرید ہمرکاب تھا کسی نے پکار کر کہا، "وہ آئے پیر زندیق" مرید غضب ناک ہو کر پکارنے والے پر لپک پڑھا۔ بازار میں ہنگامہ ہو گیا۔ شیخ نے مرید سے کہا اگر تو خاموش رہے تو میں تجھے ایک ایسی چیز پڑھاؤں گا جو تجھے اس قسم کی مصیبت سے محفوظ رکھے۔ مرید خاموش ہو گیا۔ گھر پہنچ کر شیخ نے کہا میرا صندوقچہ اٹھاؤ۔ مرید اٹھا لایا۔ اس میں خطوط تھے۔ مرید سے کہا پڑھو جو خطوط مجھے آئے ہیں ان میں کسی نے مجھے شیخ الاسلام کہہ کر خطاب کیا ہے۔ کسی نے شیخ پاک کہا ہے۔ کسی نے شیخ زاہد لکھا ہے اور کسی نے شیخ الحرمین وغیرہ۔ یہ تمام القاب ہیں نام نہیں۔

میں کسی ایک کا اہل نہیں۔ ہر کسی نے اپنے اعتقاد کے مطابق کوئی لقب تراش لیا ہے۔ اگر اس شخص نے بھی اپنے اعتقاد کی بناء پر کسی لقب سے مجھے پکار لیا تو اس میں جھگڑنے کی کون سی بات تھی۔

جو آدمی جان بوجھ کر ملامت برداشت کرتا ہے (ملامت قصد) وہ بے جا توقیر سے دست بردار ہوتا ہے اور حکومت سے منہ پھیرتا ہے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح ہے کہ دوران خلافت وہ اپنے کھجوروں کے باغ سے آ رہے تھے اور لکڑیوں کا گٹھا ان کے سر پر تھا حالانکہ ان کے ۴۰۰ غلام تھے۔ لوگوں نے پوچھا یا امیر المومنین رضی اللہ عنہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ فرمایا، اُرِیْدُ اَنْ اُجَرِّبَ نَفْسِیْ ''میں اپنے نفس کو آزمانا چاہتا ہوں۔'' میرے پاس غلام ہیں جو یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں مگر مجھے اپنے نفس کی آزمائش مدنظر ہے تاکہ دنیا کی جاہ و مرتبت اسے کسی کام سے باز نہ رکھ سکے۔

یہ حکایت اثبات ملامت پر بالکل واضح ہے اسی موضوع پر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حکایت ہے جو مناسب موقع پر معرض تحریر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔ ابو بزید رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ سفر حجاز سے واپس آتے ہوئے شہر رے میں آئے تو ان کی خبر مشہور ہوگئی اور لوگ ان کے خیر مقدم کو نکل آئے تاکہ عزت و توقیر سے شہر میں لے جائیں ابو یزید ان لوگوں کی وجہ سے حضور حق سے بعید ہو کر پراگندہ دل ہو گئے۔ جب بازار میں پہنچے تو انہوں نے ایک روٹی نکال کر کھانا شروع کر دی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ تمام لوگ ان کو برافروختہ ہو کر تنہا چھوڑ گئے۔ ایک مرید ان کے ساتھ تھا اس سے کہا دیکھا میں نے شریعت کے ایک مسئلہ پر عمل کیا اور سب نے مجھے رد کر دیا۔ میں کہ علی بن عثمان جلابی رضی اللہ عنہ کہتا ہوں کہ اس زمانے میں قابل ملامت ہونے کے لئے کوئی غیر معمولی یا خلاف عادت کام کرنا ضروری تھا۔ آج کل اگر کوئی چاہے کہ لوگ اسے ملامت کریں تو اس سے کہہ دو کہ دو رکعت نماز نفل لمبی کر کے پڑھے یا دین کو مکمل طور پر طاری کرے تو تمام خلق فوراً فریب کاری اور منافقت کا الزام لگانے پر اتر آئے گی۔

ملامت ترک کی صورت یہ ہے کہ آدمی قانون شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور خلاف مذہب چیز کا مرتکب ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں راہ ملامت پر گامزن ہوں۔ دراصل وہ واضح گمراہی، صریح فتنہ اور پوری ہوس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ اسی قماش کے ہیں۔ ان کا مقصد رد خلق نہیں بلکہ قبول خلق ہوتا ہے۔ ورنہ رد خلق تلاش کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ قبولیت عام حاصل ہو اور اس کے بعد کوئی ایسا فعل سرزد ہو کہ لوگ اسے رد کر دیں۔ اس کے سوا رد خلق کی کوشش مقبول خلق ہونے کا بہانہ ہے۔

مجھے ایک موقع پر ایک جھوٹے مدعی کے ساتھ ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن وہ بحالت خراب نمودار ہوا اور ملامت طلبی کا بہانہ کیا۔ کسی نے اس سے کہا یہ لغو ہے۔ میں نے دیکھا وہ برافروختہ ہو گیا۔ میں نے کہا ارے بھائی! اگر تمہاری دعویٰ ملامت درست ہے تو اس آدمی کا اعتراض تمہارے طریق کار کی تائید ہے اور تائید پر تلملانے کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل تمہاری روش ملامت نہیں بلکہ فریب کاری سے قریب تر ہے۔ روشنی حق کی رہبری میں چلنے والے کو اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہئے اور ثبوت صرف اتباع سنت ہے۔ دعویدار ہو کر ترک فریضہ سے مرتکب ہونے سے تم دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔

فصل: حقیقت ملامت کے لطائف

معلوم ہونا چاہئے کہ میدان طریقت میں ملامت کو فروغ دینے والے اپنے زمانے کے شیخ ابوحمدون قصار رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ملامت کی حقیقت سے متعلق ان کے بہت سے لطائف ہیں ان کا قول ہے، الملامۃ ترک السلامۃ "ملامت سلامتی کو ترک کرنے کا نام ہے۔" جب کوئی اپنی سلامتی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، مصائب کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور اپنی محبوب چیزوں اور تعلقات کو ترک کرنے پر مائل ہوتا ہے اس امید پر کہ جلال خداوندی کا انکشاف ہو تو وہ جس قدر خلق سے منقطع ہوتا ہے اسی قدر قرب حق سے مستفید ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل ملامت دنیا والوں کی محبوب چیز یعنی سلامتی سے روگرداں ہوتے ہیں۔ ان کی ہمت عام لوگوں کی ہمت سے مختلف ہوتی ہے اور عام لوگوں کی ہمت ان کی ہمت

سے۔ ان کے اوصاف وجدانی ہوتے ہیں۔ احمد بن فاتک سے روایت ہے کہ حسین بن منصور سے پوچھا گیا۔ من الصوفی ''صوفی کون ہے؟'' اس نے جواب دیا وجدانی الذات ''جس کی طبیعت کی بنیاد وجدان ہو۔'' حمدون نے بھی ملامت سے متعلق کہا کہ عوام کے لئے یہ راستہ بہت سنگلاخ ہے میں اس بارے میں تھوڑی سی بات کہہ سکتا ہوں۔ رجاء المرجئۃ وخوف القدریۃ ''مرجیوں کی امید اور قدریوں کا خوف'' اس قول میں معانی پوشیدہ ہیں جن کا انکشاف ضروری ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ ہر دلعزیزی اس کے لئے راہ حق میں سب سے بڑا سنگ حائل ہو کر رہ جاتی ہے آدمی کو یہ چیز اتنی پسند خاطر ہوتی ہے کہ جو اس کی ذرا سی تعریف کر دے وہ اس کا گرویدہ ہوتا ہے اور حقیقت سے دور جا پڑتا ہے جسے یہ خطرہ پیش نظر ہو وہ ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں دو خطرناک صورتیں سامنے آتی ہیں: ایک حجاب حق کا خوف دوسرا یہ خوف کہ اس سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس سے لوگ بھٹک جائیں اور اس پر زبان ملامت دراز کریں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں میں مرتبت حاصل کر کے آسودہ ہو جائے اور نہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ لوگ بھٹک کر ملامت پر اتر آئیں۔ الغرض ملامتی کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے دنیا اور عقبیٰ کے جھگڑے خلقت سے صاف کرے اور پھر اپنے دل کی نجات کے لئے وہ کام کرے جو از روئے شریعت گناہ کبیرہ یا صغیرہ میں شمار نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ لوگ اس کو رد کریں۔ پس کردار کے معاملے میں اس کا خوف قدریوں کے خوف کی طرح ہو اور ملامت کرنے والوں کی نسبت اس کی امید مرجیوں کی مانند ہو۔

دوستی کے میدان میں ملامت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ دوست کی ملامت دوست کے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ دوست کا سوائے کوچہ یار کے کسی جگہ مقام نہیں ہوتا اور اغیار کا دل دوست میں گذر محال ہے، لان الملامۃ روضۃ العاشقین ونزھۃ المحبین وراحۃ المشتاقین وسرور المریدین ''اس لئے کہ ملامت عاشقوں کا چمن، محبت کرنیوالوں کی نزہت، مشتاقوں کی راحت اور مریدوں کا سرور ہے۔'' اہل ملامت سلامتی

دل کے لئے ملامت بدنی اختیار کرنے میں مخصوص ہیں۔ خدا کی مخلوق میں سے مقربین، فرشتوں یا روحانیوں کو یہ چیز میسر نہیں۔ پہلی امتوں میں جو زاہد، راہب اور طالب حق ہوئے تھے وہ اس سے معرا تھے۔ صرف اس امت کے لوگ جو انقطاع دل کے راستے پر گامزن ہیں اس کے علمبردار ہیں۔ میرے نزدیک طلب ملامت بالکل ریا ہے اور ریا بالکل منافقت، ریا کار تکلفا ایسا راستہ اختیار کرتا ہے کہ لوگ اسے قبولیت کی نظر سے دیکھیں ملامتی تکلفا ایسی راہ پر گامزن ہوتا ہے کہ لوگ اسے رد کردیں۔ یہ دو جماعتیں خلقت میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ ایک جماعت اس انداز سے نمایاں ہے اور دوسری اس انداز سے۔ درویش کے دل میں تو خلقت کا خیال تک بھی نہیں گذرتا اور جب خلقت سے بے تعلق ہو تو ریا یا ملامت کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ مجھے ماوراء النہر کے ایک ملامتی کے ساتھ ٹھہرنے کا اتفاق ہوا کچھ دنوں کے بعد میں نے پوچھا کہ بھائی! اس شوریدہ کاری سے تیرا مطلب کیا ہے؟ کہا، خلقت کو دور کرنا۔ میں نے کہا کہ خلقت کی تو انتہا نہیں۔ تیری عمر اور زبان و مکان اتنا وسیع نہیں کہ تمام خلقت کو دور کر سکے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان سے دور کر لے تا کہ اس جملہ تکلف سے بچ سکے۔ کچھ لوگ خود مشغول بہ خلقت ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خلقت ان کی طرف مشغول ہے تجھے کوئی نہیں دیکھتا تو اپنے آپ کو مت دیکھ۔ جب تیرے لئے ہر فتنہ تیری اپنی نظر کا نتیجہ ہے تو دوسروں سے کیا سروکار۔ اگر کسی کو شفا پرہیزی غذا سے ملتی ہو اور وہ کھانا طلب کرے تو یقیناً آدمیت سے خارج ہے۔ کچھ لوگ طریق ملامت پر از راہ ریاضت گامزن ہوتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کو نفرت کی نظر سے دیکھیں اور انہیں اپنی بے بسی کا احساس ہو بے کسی اور بے بسی ان کے لئے مسرت کا مقام ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا کبھی دنیا میں تمہاری کوئی دلی تمنا بھی پوری ہوئی ہے کہا ہاں۔ دو بار۔ ایک بار تو میں کشتی میں سوار تھا۔ کوئی مجھے پہچاننے والا موجود نہ تھا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بال بڑھے ہوئے۔ تمام

اہل کشتی میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ ایک مسخرہ تھا جو بار بار آ کر میرے بال نوچتا تھا اور ازراہ تفنن میری تحقیر کر رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بامراد محسوس کر رہا تھا اور اپنی اس ذلت نفس پر خوش ہو رہا تھا۔ اہل کشتی کی خوشی کی انتہا اس وقت ہوئی جب مسخرے نے اٹھ کر میرے اوپر پیشاب کر دیا۔ دوسری بار یہ ہوا کہ میں سخت بارش کے دوران ایک گاؤں میں پہنچا۔ سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا۔ میرا خرقہ شرابور تھا۔ میں ایک مسجد کے دروازے پر گیا مگر مجھے کسی نے اندر نہ آنے دیا۔ دوسری اور تیسری مسجد سے بھی اسی طرح ناکام لوٹا۔ سردی انتہا کو پہنچ چکی تھی میں ایک حمام کی بھٹی میں گھس گیا اور اپنا دامن آگ میں ڈال دیا۔ بھٹی کے دھوئیں میں میرا جسم اور لبادہ سیاہ ہو گئے اس رات بھی میری مراد پوری ہوئی تھی اور مجھے علی بن عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک بار ایک مشکل پیش آئی جو ہزار کوشش کے باوجود حل نہ ہو رہی تھی۔ اس سے قبل ایک ایسی ہی مشکل کے وقت میں ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جا بیٹھا تھا اور مشکل حل ہو گئی تھی۔ اس بار بھی یہی ارادہ کیا۔ تین مہینے تک مزار پر حاضری دی مگر میری مشکل حل نہ ہو سکی ہر روز تین بار غسل کرتا تھا اور تیس بار طہارت، اس کے باوجود مشکل حل ہونے کی امید بر نہ آئی۔ اٹھا اور خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔ اس ولایت میں ایک شب میں ایک گاؤں میں وارد ہوا۔ اس میں ایک خانقاہ تھی اور اس میں صوفیا کی ایک جماعت۔ میرا لباس ایک سخت قسم کی گدڑی تھی اور سوائے عصا اور کوزہ کے میرے پاس کوئی رسمی سامان نہیں تھا ان لوگوں کے سامنے میں بالکل حقیر تھا کوئی میرا واقف نہیں تھا۔ انہوں نے رسما کہا یہ آدمی ہماری جماعت کا نہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ میں ان کی جماعت میں شامل نہیں تھا۔ اور رات تو مجھے بسر کرنا ہی تھی مجھے ایک چھت پر بٹھا دیا اور خود ایک بلند تر چھت پر بیٹھ گئے۔ میرے سامنے وہ روٹی ڈال دی جو خشک اور سبز ہو چکی تھی۔ ان کے اپنے کھانے کی خوشبو میری طرف آ رہی تھی۔ وہ میرے متعلق طنزیہ باتیں کر رہے تھے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ خربوزہ کھانے لگے اور اپنی خوش وقتی اور میری تحقیر کے لئے خربوزے کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے رہے۔ میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ الٰہی! اگر میں نے تیری دوستی کا لباس پہنا

ہوا نہ ہوتا تو شاید میرے ساتھ یہ کچھ نہ ہوتا۔ وہ جس قدر میرا مذاق اڑاتے تھے میرا دل خوش ہو رہا تھا یہاں تک کہ اسی بوجھ کے تلے میری مشکل حل ہو گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مشائخ، جاہلوں کو اپنی مجالس میں کیوں جگہ دیتے ہیں اور ان کا بار کیوں اٹھاتے ہیں۔

یہ ہیں احکام ملامت جو میں نے توفیق خداوندی سے ظاہر کر دیئے۔ واللہ اعلم

ساتواں باب

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اب بیان کرتا ہوں کچھ حالات اہل تصوف کے اماموں کے اور صحابہ کرام کے جو بعد از انبیا علیہم السلام معاملات میں ان کے پیش رو انفاس میں ان کے سردار اور احوال میں ان کے رہنما ہو گذرے ہیں اور نیز مہاجر و انصار میں سے سابقین اولین کے تاکہ تیرا مقصود یقینی طور پر حاصل ہو ان شاء اللہ عز و جل

ان میں شیخ الاسلام، بعد از انبیا، خیر الانام خلیفہ، پیغمبر و امام، اہل تجرید کے سردار، ارباب تفرید کے شہنشاہ، انسانی آفات سے بعید امیر المومنین ابو بکر عبد اللہ بن عثمان صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کی کرامات مشہور ہیں اور حقائق و معاملات میں جن کے ارشادات و دلائل ظاہر ہیں۔ باب تصوف میں ان سے متعلق کچھ بیان ہو چکا ہے۔ مشائخ کرام ان کو ارباب مشاہدہ میں سب سے مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی جانب سے روایات و حکایات بہت ہی کم ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی سختی طبع اور علو ہمت کے باعث مجاہدہ میں مقدم جانتے ہیں۔ صحیح احادیث میں آیا ہے اور اہل علم میں مشہور ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز شب میں قرآن آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا، ابو بکر! رضی اللہ عنہ نماز شب میں قرآن آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: اَسْمَعُ مَنْ اُنَاجِیْ ''جس کے سامنے میں مناجات کرتا ہوں، وہ بہت زیادہ سننے والا ہے۔'' میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے دور نہیں۔ اس کے سامنے آہستہ یا بلند پڑھنا برابر ہے۔ یہی چیز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کی گئی تو انہوں نے عرض کیا، اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ اُیُ

النَّائِمَ وَاَطْرُدُ الشَّيْطَانَ(1) ''میں سونے والوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو دور کرتا ہوں۔'' یہ نشانِ مجاہدہ ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اشارہ مشاہدے کی طرف تھا اور مجاہدے کا مقام مشاہدے کے مقابل ایسا ہی ہے جیسا قطرہ سمندر کے مقابلہ میں اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: هَلْ اَنْتَ اِلَّا حَسَنَةٌ مِنْ حَسَنَاتِ اَبِیْ بَکْرٍ ''اے عمر! رضی اللہ تعالیٰ عنہ! تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔'' غور کرو جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ کیفیت ہو تو باقی اہل عالم کس شمار میں ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: دارنا فانية وأحوالنا عارية وأنفاسنا معدودة و كسلنا موجود ''ہمارا جہان فانی ہے ہمارے احوال عاری، ہمارے سانس محدود اور ہماری کاہلی نمایاں۔'' سرائے فانی کی تعمیر جہالت ہے۔ عاری احوال پر بھروسہ حماقت۔ گنتی کے چند سانس پر اعتبار غفلت اور کاہلی کو مذہب سمجھنا خیانت ہے۔ کیونکہ جو چیز عاریتاً ملی ہو واپس کرنا پڑے گی۔ جو چیز فانی ہے ایک دن نابود ہو جائے گی۔ جو چیز گنتی کی ہے ختم ہو جائے گی۔ کاہلی کا بجائے خود کوئی علاج نہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ دنیا و مافیہا میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کا دلدادہ ہوا جائے کیونکہ فانی اشیاء کی دلدادگی حجاب حق ہو جایا کرتی ہے۔ دنیا اور نفس امارہ طالب و مطلوب کے درمیان پردے کی طرح ہیں۔ دوستانِ حق ان سے پرہیز کرتے ہیں جو عاریتاً ملی ہو وہ کسی اور کی ملکیت ہوتی ہے اور اہل حق کسی اور چیز میں تصرف نہیں کرتے۔ یہ بھی روایت ہے کہ وہ مناجات میں کہا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ ابْسُطْ لِیَ الدُّنْيَا وَزَهِّدْنِیْ فِيْهَا ''اے اللہ! دنیا میرے اوپر فراخ کر اور اس میں مجھے زہد عنایت فرما یعنی اس کی آفات سے مجھے محفوظ فرما۔'' اس چیز میں ایک رمز ہے پہلے دنیا مانگی تاکہ شکر بجالائیں۔ پھر توفیق مانگی کہ صرف خدا کے لئے اس سے دست بردار ہو سکیں تاکہ مقام شکر و انفاق (خدا کی راہ میں خرچ کرنا) بھی حاصل ہو اور مقام صبر بھی اور فقر کی بنیاد اختیار پر ہو اور اضطرار کا اس میں دخل نہ ہو۔ یہ تردید ہے اس بزرگ کے قول کی جس نے کہا کہ

1۔ دیکھیے کتب سیرت

اضطراری فقر اختیاری فقر سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اضطراری از خود معرض وجود میں آتا ہے اور اختیاری فقر خود پیدا کیا جاتا ہے بہتر وہ فقر ہے جو بلا کوش و تکلف میسر آئے۔ ہم کہتے ہیں کہ خوشتر فقیر وہی ہوتا ہے جس کا شوق فقر حالت غنا میں اسکے دل پر غلبہ کرے اور وہ دنیا کی محبوب چیزوں اور اولاد سے اسے بے نیاز کر دے۔ یہ نہیں کہ عالم فقر میں غنا کی خواہش دل پر طاری ہو اور ایسی شدت اختیار کرے کہ فقیر درہم و دینار کی تلاش میں ظالموں اور حاکموں کے دروازوں کی خاک چھانتا پھرے۔ غنا سے فقر کے دائرے میں آنے والا قابل تعریف ہے فقر میں طلب ریاست کرنے والا نہیں۔ علاوہ ازیں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد از انبیا جملہ خلائق سے مقدم ہیں اور ان سے آگے قدم رکھنا ہرگز روا نہیں۔ انہوں نے فقر اختیاری کو فقر اضطراری سے مقدم سمجھا ہے اور تمام مشائخ کرام کا یہی مسلک ہے سوائے ایک بزرگ کے جس کا قول ہم نے بیان کیا اور اس کے استدلال کی تردید کی کیونکہ اس نے اپنے قول کی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابل اہمیت ظاہر کی تھی اور استدلال کیا تھا۔ زہری نے روایت کی ہے کہ جب لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر رہے تھے تو آپ نے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا، واللّٰہ ما کنت حریصًا علی الإمارة یومًا و لا لیلةً قط و لا کنت فیھا راغبًا و لا سألتھا اللّٰہ قط فی سرٍ و علانیة وما لی فی الإمارة من راحةٍ (1) ”بخدا مجھے امیر بننے کا لالچ نہیں اور نہ میں نے کسی دن یا رات امارت کی حرص کی ہے نہ مجھے اس سے رغبت ہے۔ نہ میں نے ظاہر یا پوشیدہ کبھی اللہ تعالیٰ سے اس کی خواہش کی اور نہ میرے لئے اس میں کوئی راحت ہے۔“ جب خدائے بزرگ کسی کو کمال صدق کا مقام عطا کرتا ہے اور محل تمکین سے نوازتا ہے تو وہ اشارۂ حق کا منتظر رہتا ہے جو اشارہ ہو اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ فقر ہو یا امارت، اس میں تصرف و اختیار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق نے از ابتدا تا انتہا بجز تسلیم کسی چیز کو نہیں اپنایا۔ اہل تصرف تجرید تمکین، خواہش فقر اور آرزوئے

1۔ دیکھیے کتب سیرت

ترک ریاست میں حضرت ابوبکر کے پیروکار ہیں اور وہی عام مسلمانوں اور خاص طور پر صوفیا کے امام دین وطریقت ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اور انہی میں سے اہل ایمان کے سردار، اہل احسان کے پیشوا، اہل تحقیق کے امام، بحر محبت میں غرق ابوحفص عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو کرامت وفراست میں مشہور ہیں اور جن کی دانش واستقلال کا شہرہ ہے۔ تصوف میں ان کے بہت لطیف ودقیق رموز ہیں۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلْحَقُّ يَنطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ (1) ''حق زبان عمر رضی اللہ عنہ پر گویا ہے۔'' نیز فرمایا، قَدْ كَانَ فِي الْاُمَمِ مُحَدِّثُوْنَ فَاِنْ يَكُ مِنْهُمْ فِي اُمَّتِيْ فَعُمَرُ رضی اللہ عنہ(2) ''پہلی امتوں میں محدث ہو گزرے ہیں اگر میری امت میں ان میں سے ہے تو عمر رضی اللہ عنہ ہے۔'' طریقت میں آپ کے بہت سے لطیف رموز ہیں جو اس کتاب میں تحریر نہیں ہو سکتے۔ آپ نے فرمایا، العزلة راحة من خلطاء السوء ''گوشہ نشینی بری صحبت کی نسبت باعث راحت ہے۔'' گوشہ نشینی کی دو صورتیں ہیں ایک خلقت سے پرہیز دوسری قطع تعلق پرہیز کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے لئے گوشہ تنہائی منتخب کرے۔ بظاہر ہم جنسوں کی صحبت سے دور ہے۔ عزلت میں اپنے عیوب پر نظر رکھے۔ لوگوں سے میل ملاپ قطع کرے اور کسی کو اپنے افعال سے گزند نہ پہنچائے۔ قطع تعلق دل سے منسوب ہے۔ جب کسی بیرونی چیز سے تعلق نہ ہو جب انسان قطع علائق کر لیتا ہے تو اس کو کسی مخلوق کا کوئی علم نہیں ہوتا اور کسی چیز کا خیال اس کے دماغ پر طاری نہیں ہوتا وہ لوگوں میں رہتا ہے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ یہ بہت بلند مقام ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس معاملے میں صحیح راستے پر تھے وہ بظاہر لوگوں میں خلیفہ اور حاکم کی حیثیت سے موجود تھے مگر ان کے قول سے بالکل واضح ہے کہ اہل حق اگرچہ لوگوں سے ملتے جلتے ہیں مگر ان کے دلوں کا لگاؤ باری تعالیٰ ہی سے ہوتا ہے اور ہر حال میں اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ جس قدر بھی صحبت خلق ان کو نصیب ہو وہ حکم باری تعالیٰ پر مبنی سمجھتے ہیں۔ تاہم یہ صحبت ان کو حق سے

1۔ امام ترمذی کے ہاں اس کی شاہد روایات ہیں۔ 2۔ دیکھیے کتب سیرت

روگرداں نہیں کر سکتی۔ کیونکہ دوستان حق کی نظر میں دنیا کسی صورت میں بھی آئینہ صفا نہیں ہوتی اور اس کے حالات کبھی قابل التفات نہیں ہوتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، دار أسست علی البلوی بلابلوی محال ''جس سرائے کی بنیاد بلا پر ہو وہ کبھی بلا سے خالی نہیں ہو سکتی۔'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خاص صحابی تھے اور ان کے جملہ کام مقبول تھے۔ جب وہ مشرف باسلام ہوئے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر کہا، یَا مُحَمَّدُ قَدْ اِسْتَبْشَرَ اَھْلُ السَّمَاءِ الْیَوْمَ بِاِسْلَامِ عُمَرَ (1) ''اے محمد! آج اہل آسمان عمر کے اسلام کی بشارت دیتے ہیں۔'' پس مشائخ طریقت خرقہ صوف پہننے اور دین کے بارے میں سختی کرنے میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جملہ دینی امور میں تمام مخلوق کے امام ہیں۔ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ

اور ان میں سے اور نیز صحابہ عظام میں گنجینہ حیا، اہل صفا کے سردار، درگاہ رضا کے مقبول، طریق مصطفیٰ ﷺ سے مزین ابو عمرو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے جن کے فضائل و مناقب بہر انداز روشن ہیں۔ عبداللہ بن رباح اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حرب الدار کے روز ہم امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس تھے جب شور و غوغا کرنے والے ان کی بارگاہ میں جمع ہوئے تو ان کے غلاموں نے ہتھیار سنبھال لئے آپ نے حکم دیا جو غلام ہتھیار نہ اٹھائے وہ آزاد ہے۔ ہم بسبب خوف باہر نکلے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملاقات ہوئی ہم پھر ساتھ ہو لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ بارگاہ خلافت میں پہنچ کر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سلام کیا۔ شور و غوغا پر اظہار تاسف کرتے ہوئے عرض کی امیر المومنین! آپ کے حکم کے بغیر ہم تلوار نہیں نکال سکتے۔ آپ سچے امام ہیں۔ اجازت دیجئے۔ ہم اس فتنہ کو دور کر دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ یا ابن أخی إرجع واجلس فی بیتک حتی یأتی اللّٰہ بأمرہ فلا حاجۃ لنا فی إھراق الدماء (2) ''اے میرے بھائی کے

1۔ دیکھیے کتب سیرت 2۔ ایضاً

بیٹے لوٹ جاؤ اور اپنے گھر میں بیٹھ یہاں تک کہ تقدیر خداوندی ظاہر ہو پس ہمیں مسلمانوں کا خون بہانا درکار نہیں۔'' یہ درد و بلا کے عالم میں تسلیم کا نشان ہے۔

جب نمرود ملعون نے آگ بھڑکا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں آگ کے اندر ڈالنے کے لئے رکھ دیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر کہا، هل لک من حاجة ''کیا تجھے کوئی ضرورت ہے؟'' فرمایا أما إليک فلا ''تجھ سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' جبریل نے کہا تو اللہ سے مانگیے فرمایا، حسبی من سؤالی علمه بحالی ''مجھے یہ کافی ہے کہ وہ میرے حال سے واقف ہے۔'' وہ میرا حال مجھ سے بہتر جانتا ہے اسے علم ہے کہ بہتری کس چیز میں ہے اس جگہ حضرت عثمان بجائے خلیل تھے۔ شور وغوغا بجائے آتش نمرود اور حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بجائے جبریل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نجات تھی، حضرت عثمان کے لئے شہادت۔ نجات کو بقا سے تعلق ہے اور شہادت کو فنا سے اس چیز کی نسبت قبل ازیں لکھا جا چکا ہے۔ اہل تصوف بذل مال و جان، تسلیم امور اور خلوص عبادت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پیروی کرتے ہیں وہ حقیقت اور شریعت میں بلاشبہ امام حق تھے۔ دوستی حق میں ان کا مرتبہ ظاہر ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور نیز ان میں برادر مصطفیٰ بحر بلا کے غواص، سوختہ آتش ولایت، تمام اولیا اور اصفیا کے پیشوا ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ جن کو تصوف میں شان عظیم اور مرتبہ بلند حاصل تھا۔ اصول حقیقت میں اس قدر باریک بین اور نکتہ رس تھے کہ حضرت جنید نے ان کی نسبت کہا: شیخنا فی الأصول والبلاء علی المرتضٰی رضی الله عنه ''اصول اور بلاکشی میں ہمارے پیر علی مرتضیٰ ہیں۔'' یعنی معاملت و علم میں علی ہمارے امام ہیں۔ علم تصوف کو اہل تصوف اصول کہتے ہیں اور معاملت تمام بلاکشی ہوتی ہے۔ کوئی شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی حضور مجھے کچھ وصیت فرمادیں۔ آپ نے فرمایا، لا تجعلن أکبر شغلک باهلک وولدک فان یکن أهلک وولدک من أولیاء الله تعالٰی فان الله لا یضیع أولیاء فإن کانوا اعداء الله

فما همک وشغلک لأعداء الله ”دیکھ زن وفرزند کے معاملے کو ہر کام سے زیادہ اہمیت نہ دے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کرتا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں تو تجھے اس کے دشمنوں سے کیا تعلق ہے۔“

اس مسئلہ کا تعلق غیر اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق سے ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جس طرح چاہتا ہے رکھتا ہے۔ یقین صادق ہونا چاہئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب کی بیٹی کو عالم مصیبت میں چھوڑ دیا اور باری تعالیٰ کے سپرد کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو لق ودق صحرا میں چھوڑ دیا اور خدا کے حوالے کیا۔ ان کو کسی کام سے بڑھ کر اہمیت نہیں دی اور اپنے دلوں کو حق تعالیٰ کی طرف لگالیا اور تسلیم امور سے دونوں جہان کی مرادیں پائیں۔ یہ وہی چیز ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس سائل سے کہی جس نے دریافت کیا کہ پاکیزہ ترین چیز کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا غنی کیا ہوا دل۔ جو دل اللہ تعالیٰ کی ذات کی عنایات سے غنی ہو، متاع دنیا کا فقدان اسے فقیر نہیں کرتا اور اس کی موجودگی مسرت کا باعث نہیں۔ یہ بات فقر وتصوف تک جاتی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اہل تصوف، حقائق عبارات، دقائق اشارات، تجرید دنیا وآخرت اور نظارہ تقدیر حق کے معاملے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے لطائف کلام لاتعداد ہیں اور ہمیں اس کتاب کو مختصر رکھنا ہے۔ واللہ اعلم۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آٹھواں باب

اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت تقدس ازلی میں مخصوص تھے اور ہر ایک کو تصوف میں کمال حاصل تھا اور سب اہل تصوف کے سردار تھے بلا تخصیص میں ان میں سے صرف چند کے متعلق تھوڑا سا بیان کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ان میں جگر بند مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ریحان دل مرتضیٰ، نور چشم زہراء رضی اللہ عنہا ابو محمد حسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ ان کو اس طریقت پر نظر غائر حاصل تھی اور اس موضوع پر ان کے دقیق نکات بکثرت ہیں۔ ازراہ وصیت انہوں نے فرمایا، علیکم بحفظ السرائر فان اللّٰہ مطلع علی الضمائر "تم اپنے دلوں کی حفاظت کرو۔ کیونکہ خدائے عزوجل تمہارے دلوں کے راز جاننے والا ہے۔" اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندے کو دل کی حفاظت کا حکم ہے جس طرح اظہار کی حفاظت کا۔ دل کی حفاظت یہ ہے کہ غیر اللہ کی طرف عدم التفات ہو۔ اظہار کی حفاظت یہ ہے کہ مخالفت خدائے جبار مفقود ہو۔ کہتے ہیں جب قدریوں کا زور ہوا اور معتزلہ کی تعلیم جہان میں عام ہوگئی تو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کو خط لکھا اور عرض کیا:

بسم اللّٰہ الرحمن الرّحیم۔ السّلام علیک یا بن رسول اللّٰہ وقرۃ عینیہ ورحمۃ اللّٰہ و برکاتہ أما بعد فإنکم معاشر بنی ھاشم کالفلک الجاریۃ فی بحر لجی ومصابیح الدجی وأعلام الھدیٰ وآئمۃ القادۃ الذین من تبعھم نجی کسفینۃ نوح المشحونۃ التی یؤل إلیھا المؤمنون وینجو فیھا المتمسکون فما قولک یا بن رسول اللّٰہ عند حیرتنا فی القدر واختلافنا فی الاستطاعۃ لتعلمنا بماتأکد علیہ رأیک فإنکم ذریعۃ بعضھا من بعض

بعلم الله علمتم وهو الشاهد عليكم وأنتم شهداء الله على الناس والسلام

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اے پیغمبر ﷺ کے فرزند اور نور چشم آپ پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی، رحمت اور برکت ہو۔ اما بعد واضح ہو کہ آپ بنو ہاشم ہیں۔ آپ کی مثال بحر زخار میں کشتیوں کی ہے اور ظلمتوں میں روشنی اور ہدایت کے نشانات کی۔ آپ وہ پیشوا ہیں کہ جو آپ کی پیروی کرے وہ نجات پائے۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کے ایماندار پیرو کاروں نے ان کی طرف توجہ کی اور کشتی کے ذریعے نجات پائی۔ کیا فرماتے ہیں آپ قدر کے پر پیچ مسئلہ پر اور اس بحث پر کہ آدمی محض مجبور ہے یا اسے افعال پر اختیار و استطاعت ہے۔ آپ فرزند پیغمبر ﷺ ہیں۔ اللہ نے آپ کو علم دیا ہے وہ آپ کا محافظ ہے اور آپ خلقت کے محافظ ہیں اور گواہ۔ والسلام''۔

جب حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط ملا تو انہوں نے جواب میں لکھا۔

بسم الله الرحمٰن الرحيم۔ أما بعد فقد انتهى إلى كتابك عند حيرتك وحيرة من زعمت من أمتنا والذى عليه رأيى أن من لم يؤمن القدر خيره وشره من الله تعالىٰ فقد كفر و من حمل المعاصى على الله فقد فجر إن الله لا يطاع باكراه ولا يعصى بغلبة ولا يهمل العباد فى ملكه لكنه المالك لما ملكهم والقادر على ماعليه قدرهم فإن ائتمروا بالطاعة لمى كن لهم صادا ولالهم عنها مشيعا وإن اتوا بالمعصية وشاء أن يمن عليهم فيحول بينهم وبينها فعل وإن لم يفعل فليس هو حملهم عليها إجبار إلاولا ألزمهم إكراها باحتجاجه عليهم إن عرفهم ومكنّهم وجعل لهم السبيل إلى أخذ ما دعاهم إليه وترك مانهم عنه ولله الحجة البالغة۔ والسلام

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اما بعد! آپ کا خط مجھے پہنچا جو لوگ قدر خیر وشر من اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو اپنے گناہوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں فاجر ہیں۔ قدریہ جماعت کا مذہب انکار تقدیر ہے اور جبریہ جماعت گناہوں کو حق تعالیٰ سے منسوب کرتی ہے بندہ خدائے عزوجل کی جانب سے ملی ہوئی استطاعت تک اپنے افعال پر مختار ہے اور ہمارا مذہب قدر و جبر کے بین بین ہے۔''

میرا مقصد صرف یہی ایک جملہ بیان کرنا تھا تمام عبارت اس لئے نقل کی کہ بات نہایت فصیح اور موزوں تھی اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا مقام علم حقائق و اصول میں اتنا بلند تھا کہ حسن بصری کو ان کی وسعت علم سے مستفید ہونے کی ضرورت پڑی۔

حکایات میں ہے کہ ایک بدوی صحرا سے آیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوفہ میں اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بدوی نے گالی دی اور آپ کے ماں باپ کو برا بھلا کہا۔ آپ اٹھے اور کہا، اے بدوی! تو بھوکا ہے یا پیاسا یا تجھے کوئی تکلیف ہے؟ اس نے پھر آپ کو اور آپ کے ماں باپ کو برا بھلا کہا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک غلام کو حکم دیا اور اس نے ایک تھیلی چاندی کے سکوں کی بدوی کے آگے ڈال دی۔ پھر آپ نے فرمایا: مجبور ہوں اس سے زیادہ میرے گھر میں موجود نہیں ورنہ دریغ نہ کرتا۔ جب بدوی نے یہ بات سنی تو پکار اٹھا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ تو رسول اللہ ﷺ کا فرزند ہے میں صرف حلم طبع کا امتحان لے رہا تھا۔'' یہ محقق اہل تصوف کی صفت ہے۔ وہ خلقت کی مدح و ذم سے متاثر نہیں ہوتے اور سخت کلامی ان کو متغیر نہیں کرتی۔

اور اس جماعت میں شامل ہیں چراغ خاندان مصطفوی، جملہ تعلقات سے مجرد، اپنے زمانے کے سردار ابو عبداللہ حسین بن علی ابی طالب رضی اللہ عنہم۔ محقق ولی اللہ، قبلہ اہل صفا و قتیل کربلا۔ اہل تصوف ان کی درستی حال پر متفق ہیں۔ جب تک حق ظاہر تھا آپ متابعت حق میں مصروف رہے اور جب حق مفقود ہوا تو شمشیر بدست میدان میں نکل آئے اور خدا

کی راہ میں سر قربان کیے بغیر آرام نہ لیا۔ پیغمبر ﷺ نے آپ کو متعدد نوازشات سے سرفراز کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن دیکھا کہ پیغمبر ﷺ اپنے گھٹنوں پر جھکے ہوئے چل رہے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی پشت مبارک پر سوار تھے۔ رسی کا ایک سرا ان کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پیغمبر ﷺ کے دہن مبارک میں تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "ابو عبداللہ! کیا عمدہ سواری پائی ہے۔" حضور ﷺ نے فرمایا۔ "یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔"

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ طریقت میں کلام لطیف فرماتے تھے۔ کئی بیش قیمت رموز اور ارشارات آپ سے مذکور ہیں۔ آپ کا قول ہے: اشفق الاخوان علیک دینک "تیرا سب سے زیادہ شفیق بھائی تیرا دین ہے۔" آدمی کی نجات دین کی متابعت میں ہے۔ دین کی مخالفت ہلاکت کا باعث ہے۔ دانائی یہ ہے کہ انسان شفیق بھائی کی مرضی پر چلے۔ اس کی شفقت کا احساس رکھے اور متابعت کرے۔ شفیق بھائی وہ ہے جو نصیحت کرے اور شفقت کا دروازہ کبھی بند نہ کرے۔ کہتے ہیں: ایک دن کوئی شخص حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں درویش ہوں۔ میرے اہل وعیال ہیں۔ آج رات کے لئے کھانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ میرا رزق آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت امیر معاویہ کی طرف سے پانچ تھیلیاں آئیں۔ ہر تھیلی میں ہزار دینار تھے۔ لانے والے نے عرض کی کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے معذرت کی ہے اور کہا ہے کہ ابھی یہ اپنے خدمت گزاروں پر خرچ کریں اور انتظام کیا جارہا ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے پانچوں تھیلیاں سائل کو اٹھا دیں اور فرمایا: تمہیں بہت زحمت ہوئی۔ بہت انتظار کرنا پڑی۔ یہی کچھ پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا اس قدر زحمت انتظار نہ دیتے۔ کیا کریں۔ ہم بتلائے بلا ہیں۔ دنیا کی راحتوں کو ترک کر چکے ہیں۔ اپنے مقاصد کو کھو چکے ہیں اور زندگی اوروں کی خاطر بسر کرنی چاہئے۔ آپ کے مناقب امت میں کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اور اسی جماعت میں وارث نبوت، چراغ امت، سید مظلوم، امام مرحوم، عابدوں کے سرتاج اور اوتاد کے رہنما ابوالحسن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ عنہم ہیں۔ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ مکرم اور عابد تھے۔ اظہار حقیقت اور دقیقہ گوئی میں مشہور تھے۔ لوگوں نے پوچھا، دنیا اور آخرت میں زیادہ سعادت کس کو نصیب ہے؟ فرمایا: **من إذا رضى لم يحمله رضاه على الباطل وإذا سخط لم يخرجه سخطه عن الحق** ''وہ شخص جو راضی ہو کر باطل کی طرف مائل نہ ہو اور ناراض ہو کر حق کو نہ چھوڑ جائے۔'' اور یہ اہل استقامت کا کمال ہے باطل کو برداشت کرنا باطل ہے اور ناراض ہو کر حق کو چھوڑ دینا بھی باطل ہے۔ مومن کبھی مبتلائے باطل نہیں ہوتا۔

مذکور ہے کہ جب میدان کربلا میں حسین بن علی رضی اللہ عنہ کو فرزندوں سمیت شہید کر دیا گیا تو سوائے حضرت زین العابدین کے مستورات کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ وہ بھی بیمار تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کو علی اصغر کہا کرتے تھے۔ جب مستورات کو اونٹوں برہنہ سر دمشق میں لے کر آئے۔ یزید بن معاویہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے کسی نے کہا، **كيف أصبحتم يا على ويا أهل بيت الرحمة قال أصبحنا من قومنا بمنزلة قوم موسىٰ من آل فرعون يذبحون آبائهم ويستحيون نساء هم فلا تدرى صباحنا من مساء نا وهذا من حقيقة بلاء نا** ''اے علی اور اے اہل بیت رحمت للعالمین! یہ کیسی صبح ہے؟ فرمایا ہماری صبح ہماری قوم کے ہاتھوں میں ایسی ہے جیسی قوم موسیٰ کی صبح فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں تھی۔ ان کے مردوں کو قتل کیا جاتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھا جاتا تھا۔ ہمارے لئے صبح وشام کی تفریق ختم ہو چکی ہے یہ ہماری مصیبت کی حقیقت ہے''۔

حکایات میں ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان ایک سال حج کو آیا۔ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ جب حجر اسود پر بوسہ دینے کا ارادہ کیا تو خلقت کے ہجوم کی وجہ سے اسے راستہ نہ ملا۔ وہ منبر پر چڑھا اور خطبہ پڑھنا شروع کیا اسی وقت حضرت زین العابدین

تشریف لائے چہرہ ماہ کامل کی طرح روشن، رخسار دمکتے ہوئے اور لباس خوشبو سے معطر۔ انہوں نے طواف کیا جب حجر اسود کے پاس آئے تو لوگ تعظیماً ایک طرف ہٹ گئے اور آپ نے بڑھ کر پتھر کو بوسہ دیا۔ ہشام بن عبدالمالک سے کسی نے کہا آپ امیر المومنین ہیں آپ کو حجر اسود تک بازیابی نہ ہوئی وہ جوان رعنا آیا تو سب لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور سنگ اسود اس کے لئے خالی کر دیا۔ ہشام نے کہا کہ میں اس کو نہیں جانتا۔ ہشام کا مطلب یہ تھا کہ اس کے لوگ حضرت زین العابدین کو پہچان کر ان کی طرفداری اختیار کر کے انہیں امیر بنانے کی کوشش نہ کریں۔ فرزدق شاعر موجود تھا اس نے کہا میں جانتا ہوں۔ لوگوں نے کہا تو بیان کر وہ کون ہے؟ اس کے چہرے سے کیا ہیبت ٹپک رہی ہے۔ فرزدق نے کہا سو میں اس کی صفات اور اس کا نسب بیان کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر فرزدق نے اشعار پڑھے:

۱۔ یہ وہ شخص ہے جس کے نقش قدم اہل مکہ پہچانتے ہیں جس کو خانہ کعبہ اور حرم جانتے ہیں۔

۲۔ یہ خلق خدا میں سب سے اچھے آدمی کا بیٹا ہے۔ یہ مشہور متقی و پرہیزگار ہے۔

۳۔ یہ فاطمہ الزہرا کا لال ہے تو جہالت سے اس کو نہیں جانتا۔ اس کے نانا پر نبوت ختم ہوئی۔

اسی طرح اس نے اور اشعار کہے اور اہل بیت کی تعریف کی۔

ہشام برافروختہ ہو گیا اور اس نے فرزدق کو مدینہ اور مکہ کے درمیان عسفان کے مقام پر قید کر دیا۔ جب یہ خبر حضرت زین العابدین کو ملی تو انہوں نے بارہ ہزار درہم فرزدق کو بھجوائے اور کہلا بھیجا، ہم مجبور ہیں اس سے زیادہ ہمارے پاس نہیں۔ فرزدق نے وہ روپیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اے فرزند پیغمبر! میں تمام عمر مال و زر کے لئے بادشاہوں اور امیر لوگوں کے قصائد لکھتا رہا ہوں اور ان کی تعریف میں جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ یہ اشعار میں نے اہل بیت کی تعریف میں از راہ کفارہ کہے ہیں۔ جب یہ پیغام امام زین العابدین کو ملا انہوں نے رقم واپس بھجوا دی اور کہا،

اے فرزدق! اگر تمہیں واقعی ہمارے ساتھ ارادت ہے تو یہ خیال نہ کرو کہ ہم جو کچھ دے چکے اسے واپس لے لیں۔ ہم اس کی ملکیت سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

حضرت زین العابدین کے مناقب اتنے ہیں کہ احاطہ تحریر میں نہیں آسکتے۔

اہل بیت میں سے معاملت کی دلیل غالب صاحبان مشاہدہ کی حجت ظاہرہ اولاد نبی ﷺ میں امام اور نسل علی رضی اللہ عنہ میں برگزیدہ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بن علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب ہیں آپ کو امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب باقر تھا۔ علمی باریکیاں اور کتاب حق میں لطیف اشارات آپ سے مخصوص ہیں۔ آپ کی کرامات مشہور، نشانات روشن اور دلائل واضح ہیں۔ کہتے ہیں ایک بادشاہ وقت نے آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور بلوا بھیجا۔ جب آپ تشریف لائے تو اس نے معذرت کی۔ تحائف دیئے اور بطریق احسن واپس کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا تو تو درپے قتل تھا یہ کیا ہوا؟ بادشاہ نے جواب دیا جب وہ میرے پاس آئے تو ان کے دائیں بائیں دو شیر تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں نے ہاتھ اٹھایا تو وہ مجھے چیر ڈالیں گے۔

روایت ہے کہ آپ نے فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ ''جس نے طاغوت کو چھوڑا اور اللہ پر ایمان لایا۔'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا، کل من شغلک عن مطالعۃ الحق فھو طاغوتک ''جو کام تجھے یاد الٰہی سے غافل کر دے وہ تیرا طاغوت ہے''۔ غور کر کہ تو کسی چیز سے محجوب ہے یعنی کونسی چیز ہے جو تجھے یاد الٰہی سے غافل رکھتی ہے اس کو ترک کرتا کہ تیرے لئے کشف اسرار ہو۔ علم باطن کا دروازہ کھل جائے اور راہ میں پردہ حائل نہ رہے کیونکہ جہاں پردہ باقی ہو وہاں قرب کا دعویٰ بیکار ہے۔

آپ کے خادموں میں سے ایک نے روایت کی ہے کہ کچھ رات گئے آپ اوراد سے فارغ ہو کر بلند آواز سے مناجات کرتے تھے۔ اے میرے اللہ تعالیٰ! میرے مولا! رات آ گئی۔ دنیا والوں کی بادشاہی ختم ہوئی۔ آسمان پر ستارے نکل آئے۔ خلقت خواب غفلت

میں کھو گئی۔ آنکھیں بند ہو گئیں آوازیں گم ہو گئیں۔ لوگ اہل دنیا کی بارگاہوں سے چل دیئے۔ بنوامیہ بستر استراحت میں چلے گئے۔ اپنی قیمتی اشیاء محفوظ کر لیں۔ اپنے دروازے بند کر لئے۔ نگہبان اور پہریدار مقرر ہو چکے۔ حاجت مندان کے دروازے چھوڑ کر جا چکے۔ باری تعالیٰ تو زندہ اور قائم ہے۔ دیکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ سونا اور اونگھنا تیری ذات پاک سے بعید ہے جو یہ نہیں سمجھتا ہے وہ کسی نعمت کے قابل نہیں۔ اے خدا! ایک چیز تجھے دوسری چیز سے غافل نہیں کرتی۔ تیری بقا شب و روز کے تغیر سے بالاتر ہے۔ جو دعا کرے تیرے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ تیری توصیف کرنے والے پر تیرے خزانے کھلتے ہیں۔ جو سوالی تیرے در پر آتا ہے کبھی خالی نہیں جاتا جو دعا کرتا ہے کبھی مایوس نہیں لوٹتا۔ اے خدا! جب مجھے موت اور قبر کے حساب کا خیال ہو تو کون سی مسرت مجھے اپنا سکتی ہے۔ جب ملک الموت میرے سامنے ہو تو میں دنیا کی کونسی منفعت کی آرزو کر سکتا ہوں۔ میں ہر چیز تیری ذات پاک سے مانگتا ہوں تو واحد و لاشریک ہے۔ تیری جناب میں دعا ہے کہ بوقت مرگ سکون بے عذاب عطا فرما اور یوم حساب راحت بے عذاب مرحمت فرما۔ آپ یہ دعائیں مانگتے اور روتے تھے۔ ایک رات خادم نے پوچھا: اے میرے اور میرے باپ دادا کے سردار! یہ اشک باری کب تک؟ فرمایا: اے دوست! حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک یوسف گم ہو گیا تھا وہ اس قدر روئے کہ بصارت جاتی رہی اور آنکھیں سفید ہو گئیں۔ میرے اٹھارہ آدمی میرا باپ یعنی حسین رضی اللہ عنہ اور قتیلان کربلا گم ہو گئے ہیں میں یعقوب علیہ السلام سے کم نہیں کہ اپنے اقارب کے فراق میں میری آنکھیں سفید نہ ہو جائیں۔ یہ مناجات عربی میں بہت فصیح ہیں ترک طوالت کے لئے مطالب فارسی میں لکھ دیئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی اور جگہ تحریر کروں گا۔

اسی جماعت میں شامل یوسف سنت، جمال طریقت، غواص معرفت اور زینت تصوف ابو محمد جعفر صادق بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین بلند حال اور نیک سیرت تھے۔ ان کا ظاہر آراستہ تھا اور باطن مرصع۔ جملہ علوم میں انہوں نے حسین

اشارات چھوڑے ہیں۔ مشائخ کرام میں دقیق کلام اور وقوف معانی کے لئے مشہور ہیں۔ تصوف پر ان کی متعدد معروف تصنیفات ہیں۔ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا، من عرف اللہ اعرض عما سواہ ''جس نے اللہ کو جانا اس نے ماسویٰ سے منہ پھیر لیا۔'' عارف غیر سے دور اور اسباب سے منقطع ہوتا ہے معرفت اس کے لئے عین نا آشنائی ہوتی ہے یعنی نا آشنائی معرفت کا جزء ہوتی ہے اور معرفت اس کی نا آشنائی کا حصہ۔ عارف خلق اور اس کی فطرت سے منقطع بھی ہوتا ہے اور خلق سے پیوستہ بھی۔ غیر کو اس کے دل میں اتنا گذر نہیں ہوتا کہ وہ اس کی طرف ملتفت ہو۔ غیر کا وجود اتنا اہم نہیں ہوتا کہ وہ اس کے خیال میں منہمک ہو جائے۔

یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا، لا یصح العبادۃ إلا بالتوبۃ لأن اللہ قدم التوبۃ علی العبادۃ قال اللہ تعالٰی التائبون العابدون ''عبادت صحیح نہیں ہوتی جب تک توبہ کے ساتھ نہ ہو۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے توبہ کو عبادت پر مقدم کیا ہے چنانچہ فرمایا: توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے۔'' عبادت بدون توبہ درست نہیں ہوتی کیونکہ توبہ مقام ابتدا ہے اور بندگی انتہا جب باری تعالیٰ نے گناہ گاروں کا ذکر کیا تو توبہ کا حکم فرمایا، وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا (النور:31) ''جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا تو عبودیت سے کیا فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ (النجم) ''اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کیا جو وحی کرنا تھا۔''

حکایات میں ہے کہ داؤد طائی امام صاحب کے پاس آئے اور کہا، اے فرزند رسول! ﷺ مجھے کوئی نصیحت فرما دیں۔ میرا دل سیاہ ہو گیا ہے۔ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا، آپ اپنے زمانے کے زاہد ہیں میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے۔ داؤد طائی نے کہا آپ فرزند پیغمبر ﷺ ہیں۔ باری تعالیٰ نے آپ کو سب پر فضیلت دی ہے سب کو نصیحت کرنا آپ کا منصب ہے۔ امام صاحب نے فرمایا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ حشر کے دن میرے دادا مجھے گرفت نہ کریں کہ میں نے حق متابعت ادا نہیں کیا۔ نسب سے

یہ چیز درست نہیں ہوتی اس کے لئے معاملت حسنہ کی ضرورت ہے۔ داؤد طائی رو پڑے اور بولے اے خدا! جس کی فطرت میں نبوت کا اثر ہو۔ جس کی طبیعت میں اصول دلائل ہوں جس کے دادا رسول اللہ ﷺ ہوں جس کی والدہ ماجدہ بتول ہوں اس کے سامنے داؤد کا کیا مقام کہ اپنے حسن معاملت پر نازاں ہو سکے۔ یہ بھی ان سے روایت ہے کہ ایک روز اپنے خادموں میں بیٹھے ہوئے تھے فرمایا آؤ ہم عہد کریں کہ روز قیامت جسے بھی نجات نصیب ہو وہ سب کی شفاعت کرے خادموں نے کہا حضور فرزند رسول ﷺ کو کس کی شفاعت کی ضرورت ہے آپ کے جدامجد تمام خلائق کے شفیع ہیں۔ فرمایا میں اپنے افعال پر شرمسار ہوں۔ اپنے جدامجد کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہ اپنے نفس کی عیب جوئی ہے اور صفوت کمال میں شامل ہے جملہ باریاب اہل حق، اولیائے کرام، انبیائے عظام اور رسولان حق اسی صفت سے آراستہ تھے۔ رسول ﷺ نے فرمایا، اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا بَصَّرَہٗ بِعُیُوبِ نَفْسِہٖ(1) ''جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ کسی بندہ پر احسان کا ہوتا ہے تو وہ اس کے ذاتی عیب اس پر نمایاں کر دیتا ہے۔'' جو صاحب نظر انسان عجز اور عبودیت سے سرنگوں ہو اللہ تعالیٰ اس کو ہر مراد میں کامرانی عطا کرتا ہے۔

اگر میں سب اہل بیت رضی اللہ عنہم کا ذکر کروں اور ہر ایک کے مناقب معرض تحریر میں لاؤں تو اس کتاب میں گنجائش ممکن نہیں۔ طریقت کے ماننے والے ہوں یا اس کا انکار کرنے والے، سب کے لئے اس قدر کافی ہے بشرطیکہ ان کی عقل کو ادراک کی توفیق حاصل ہو۔

اصحاب صفہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر ایجاز و اختصار سے کرتا ہوں اس سے قبل ایک کتاب ''منہاج الدین'' لکھ چکا ہوں اور اس میں اصحاب صفہ میں سے ہر ایک کے مناقب بالتفصیل لکھے ہیں۔ اب صرف ان کے نام اور القاب وغیرہ تحریر کرتا ہوں تاکہ خدا تجھے عزت دے اور تو کامیاب ہو۔ سب علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور سب توفیق اسی سے ہے۔

1۔ دیلمی، کتاب اللمع، احیاء علوم الدین

نواں باب

اہل صفہ

جملہ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں صحابہ رضی اللہ عنہ کی ایک جماعت سکونت پذیر تھی۔ عبادت پر آمادہ، تارک دنیا اور زندگی کے کاروبار سے منقطع۔ باری تعالیٰ نے ان کی خاطر عتاب کیا اور فرمایا، وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الانعام:52) ''دور مت کر ان لوگوں کو جو صبح شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں اور اس کے دیدار کے طلب گار ہیں۔'' کلام پاک میں ان لوگوں کی فضیلت کا بیان ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کئی حدیثیں ان کی فضیلت پر موجود ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں ہم نے تھوڑا بہت ذکر کیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ ''جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے قریب سے گزرے ان کو دیکھا ان کے فقر و ریاضت کو ملاحظہ فرمایا اور اس حالت میں خوش پایا اور فرمایا: اے اصحاب صفہ! تمہیں بشارت ہو۔ جو میری امت میں تمہاری اس صفت پر راضی ہوگا بہشت میں اس کا شمار میرے رفقاء میں ہوگا''۔

اصحاب صفہ میں ایک رب جبار کی منادی کرنے والے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برگزیدہ و مقرب حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ تھے۔ دوسرے رب بے نیاز کے دوست اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محرم ابو عبداللہ سلمان فارسی، تیسرے مہاجر و انصار کے سپاہی اور باری تعالیٰ کے رضا جو ابو عبیدہ بن عامر بن عبداللہ جراح، چوتھے برگزیدہ اصحاب اور زینت ارباب ابو الیقظان عمار بن یاسر، پانچویں گنج علم اور خزانہ حلم ابو مسعود عبداللہ بن مسعود ہذلی، چھٹے درگاہ حرمت کے معتکف، عیب و آفت سے معرا عتبہ بن مسعود برادر عبداللہ، ساتویں طریق حرمت کے سالک، عیب و ذلت سے پاک مقداد بن الاسود، آٹھویں مقام تقویٰ کے

رہبر، مصائب و تکالیف میں ثابت قدم خباب بن الارت، نویں درگاہ رضا کے قاصد، فنا میں بارگاہ بقا کے طالب صہیب بن سنان، دسویں درج سعادت اور بحر قناعت کے موتی عتبہ بن غزواں، گیارہویں فاروق اعظم کے بھائی دنیا و مافیہا سے بے نیاز زید بن خطاب، بارہویں طلب مشاہدہ میں مجاہدہ کے سردار ابو کبشہ مولیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عزیز و تائب اور تمام مخلوق سے روگرداں ہو کر باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ابو المرثد کنانہ بن حصین عدوی، چودھویں طریق تواضع کی زینت اور دلائل قاطع کا راستہ طے کرنے والے حذیفہ بن یمان، پندرہویں عذاب سے ڈرنے والے مخالفت کے راستے سے بچنے والے عکاشہ بن محصن، سولہویں زین مہاجر و انصار بن قار مسعود بن ربیع القاری، سترہویں زہد میں مثال عیسیٰ اور شوق الٰہی میں نشان موسیٰ ابو ذر جندب بن جنادۃ غفاری، اٹھارویں حافظ انفاس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخور خیرات برادر عبداللہ بن عمر، انیسویں استقامت میں قائم اور متابعت میں مستحکم صفوان بن بیضا، بیسویں صاحب ہمت تہمت سے پاک ابو درداء عویمر بن عامر، اکیسویں درگاہ رجا کے معتکف برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابولبابہ ابن عبدالمنذر، بائیسویں کیمیائے بحر شرف اور صدق در توکل عبداللہ بن بدر جہنی رضی اللہ عنہم۔

اگر تمام کا ذکر کیا جائے تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ شیخ ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی طریقت اور کلام مشائخ کے مؤرخ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں انہوں نے اہل صفہ کے مناقب و فضائل اور نام و القاب بیان کئے ہیں مگر انہوں نے مسطح بن اثاثہ بن عباد کو بھی اصحاب صفہ میں شامل کر دیا ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کی ابتداء اسی نے کی تھی۔

البتہ ابوہریرہ، ثوبان، معاذ بن حارث، سائب بن خلاد، ثابت بن ودیعہ، ابو عبیس عویم بن مساعد، سالم بن عمیر بن ثابت، ابو السیر کعب بن عمرو، حبیب بن معقل، عبداللہ بن انیس، حجاج بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ وہ کبھی کبھی کسب معیشت میں بھی مشغول ہو جاتے۔ مگر مرتبہ سب کا ایک ہے۔ فی الحقیقت صحابہ کرام رضی

اللہ عنہم کا زمانہ بہترین زمانہ تھا اور یہ لوگ بہترین وقت میں ہو گزرے ہیں اور تمام خلق میں بہترین تھے۔ کیونکہ باری تعالیٰ نے ان کو صحبت پیغمبر ﷺ سے نوازا تھا اور ان کے دلوں کو جملہ عیوب سے محفوظ رکھا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ (1) ''بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو اس کے قریب ہوئے پھر ان کا جو اس کے قریب ہوئے۔''

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (التوبہ:100)

''سبقت کرنے والے یعنی آگے بڑھنے والے پہلے مہاجر اور انصار اور پھر وہ لوگ جو نیکی میں ان کے تابع ہوں۔''

اب میں بعض تابعین کا ذکر کرتا ہوں تاکہ فائدہ تمام تر ہو اور زمانہ ایک دوسرے سے ملتا چلا جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح بخاری و مسلم

دسواں باب

تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ

خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ

آفتاب امت، چراغ دین وملت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ اہل تصوف کے عظیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں تھے مگر زیارت نہ کر سکے۔ غلبہ حال اور والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر باشی سدراہ رہی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ قرن میں اویس نامی ایک مرد حق ہے وہ میری امت کے لئے قیامت کے روز ربیعہ اور مضر کی بھیڑ بکریوں کی تعداد کے برابر لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ پھر حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے فرمایا تم اس مرد حق سے ملنا۔ پست قد ہے، اس کے بال لمبے ہیں، اس کے بائیں پہلو پر درہم کے برابر سفید نشان ہے، پھلبہری کا نہیں۔ ایسا ہی ایک نشان ہتھیلی پر ہے۔ جب اس سے ملو تو میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ میری امت کے حق میں دعا کرے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ معظمہ تشریف لائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ خطبہ کے دوران آپ نے فرمایا: اہل نجد کھڑے ہو جائیں۔ جب اہل نجد کھڑے ہو گئے تو آپ نے پوچھا کہ آپ لوگوں میں قبیلہ قرن کے کچھ لوگ ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا "ہاں۔" اور ایک جماعت کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اویس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ اویس نامی ایک دیوانہ ہے جو شہر میں نہیں آتا اور کسی کے پاس نہیں بیٹھتا جو چیزیں لوگ کھاتے ہیں وہ نہیں کھاتا۔ خوشی اور غم کی اس کو خبر نہیں۔ جب لوگ ہنستے ہیں وہ روتا ہے۔ جب لوگ روتے ہیں وہ ہنستا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا وہ صحرا میں ہمارے

اونٹوں کے پاس ہوتا ہے۔ دونوں حضرات اویس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔ وہ نماز میں مشغول تھے۔ بیٹھے رہے جب اویس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز سے فارغ ہوئے تو دونوں حضرات کو سلام کیا اور اپنی پسلی اور ہتھیلی کا نشان دکھایا۔ حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلام پہنچایا اور امت کے لئے دعا کرنے کا پیغام دیا۔ کچھ دیر ٹھہرے پھر اویس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ اب جائیے۔ قیامت قریب ہے۔ قیامت میں نہ ختم ہونے والی ملاقات ہوگی۔ اس وقت سفر آخرت کے لئے زادراہ بنانے میں مصروف ہوں۔

جب اہل قرن واپس ہوئے تو ان کے دلوں میں اویس کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ خواجہ اویس کوفہ کو کوچ کر گئے۔ ہرم بن حیان نے ان کو دیکھا پھر وہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ خانہ جنگی میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگ صفین کے دن شہید ہوئے۔ عاش حمیدا وفات شہیدا ''قابل تعریف زندگی گزاری اور شہید کی موت مرے''۔

اویس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے السلامة فی الواحدة ''سلامتی تنہائی میں ہے۔'' گوشہ خلوت میں رہنے والے کا دل غیر سے خالی ہوتا ہے۔ اس کو دنیا سے کوئی توقع نہیں ہوتی اور وہ آفات زندگی سے محفوظ ہوتا ہے۔ تاہم یہ خیال غلط ہے کہ صرف گوشہ خلوت ہی اختیار کر لینا کافی ہے۔ جب تک ابلیس کا دل پر غلبہ ہو، نفسانی خواہشات کا زور ہو اور دنیا و عقبیٰ کی کوئی آرزو یا بنی نوع انسان کو ستا رہی ہو تو خلوت در حقیقت خلوت نہیں کیونکہ کسی چیز یا اس کے تصور سے لطف اندوز ہونا برابر ہے۔ حقیقی خلوت یہ ہے کہ صاحب خلوت عین مجلس میں بھی خلوت سے دست بردار نہ ہو۔ اگر عزت گزین ہو تو عزت میں بھی فراغت محسوس نہ کرے۔ انسانوں سے قطع تعلق جذبہ عشق حق نہیں ہوتا اور جس کو عشق حق ہو اسے انسانوں کا ملاپ مضرت رساں نہیں ہوتا۔ البتہ انسانی موانست عشق حق کیلئے سنگ حائل ہوتی ہے اور گرفتار موانست حقیقت عشق سے بے خبر ہوتا ہے۔ إن الوحدة صفة عبد

صاف کیونکہ خلوت بندہ صاف کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان سنو! اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (الزمر:36) ''کیا وہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں۔''

ہرم بن حیان رحمۃ اللہ علیہ

شمع صفا اور معدن وفا ہرم بن حیان بزرگان طریقت میں ہوئے ہیں۔ صاحب معاملت تھے۔ صحابہ کرام کی صحبت پائی تھی۔ خواجہ اویس کی زیارت کے لئے قرن گئے مگر اویس وہاں سے جا چکے تھے۔ ناامید ہو کر مکہ معظمہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ اویس کوفہ میں مقیم ہیں۔ ہرم کوفہ تشریف لے گئے مگر اویس وہاں بھی نہ مل سکے۔ بصرہ کو واپس آ رہے تھے تو دیکھا کہ اویس نہر فرات پر وضو کر رہے ہیں۔ وضو سے فارغ ہو کر ریش مبارک میں کنگھی کرنے لگے۔ ہرم نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اویس نے ہرم رضی اللہ عنہ کا نام لے کر سلام کا جواب دیا۔ ہرم نے پوچھا: آپ نے مجھے کیسے جان لیا؟

اویس نے جواب دیا: ''میری روح آپ کی روح کو پہچانتی ہے۔'' کچھ دیر باہم بیٹھے پھر ہرم کو رخصت کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى الدُّنْيَا يُصِيْبُهَا وَامْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ (1)

''عمل کی جزا نیت پر موقوف ہے۔ ہر انسان کو وہی پھل ملتا ہے جس کی نیت ہو۔ جس شخص نے اللہ اور رسول کی خاطر ہجرت کی اس کو اس کا اجر ملے گا اور جس نے دنیا کی خاطر ہجرت کی یا عورت کے لئے ہجرت کی کہ اس سے نکاح کرے ایسے آدمی کی ہجرت انہی دنیاوی اشیاء کیلئے ہوگی''۔

پھر ہرم رضی اللہ عنہ کو فرمایا علیک بقلبک ''اپنے دل کی حفاظت کر۔'' اس کے دو

1۔ صحیح بخاری

معنی ہیں: ایک یہ کہ دل کو مجاہدہ سے تابع حق بنا۔ دوسرے یہ کہ اپنی ذات کو تابع دل کر۔ یہ دونوں صورتیں برحق ہیں۔ دل کو تابع حق کرنا اہل ارادت کا کام ہے تا کہ دل شہوات، حرص اور خواہشات سے پاک رہے اور جو چیز بھی ناموافق ہو دل اس سے منقطع ہو جائے۔ روحانی صحت حاصل ہو اور اتباع احکام کی توفیق میسر آئے۔ نظر آیات خداوندی پر رہے اور دل محبت کا مقام بن جائے۔ اپنی ذات کو تابع دل کرنا کاملوں کا کام ہے جن کے دل جمال حق سے منور ہو چکے ہوں اور وہ تمام اسباب و تعلقات سے کٹ چکے ہوں۔ جن کو خرقہ قربت عطا ہو چکا ہو جو اس کے انعامات سے سرفراز ہوں۔ جن کے قلوب مشاہدۂ حق سے تابناک ہوں۔ جو اس کے قریب ہوں اور جن کی دلی کیفیت، جسمانی لوازمات سے مختلف نہ ہو۔ اول الذکر صاحب قلب ہوتے ہیں اور آخر الذکر مغلوب القلب، صاحب قلب اپنے دلوں کے حاکم اور باقی رہنے والی صفات کے مالک ہوتے ہیں۔ مغلوب القلوب فانی الصفت ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ پھیل کر قول باری تعالیٰ تک پہنچا ہے کہ فرمایا،

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ (الحجر) اسے دو مختلف طریق سے پڑھا جاتا ہے: مخلصین بکسر لام اور مخلصین بفتح لام۔ مخلص کسر لام کے ساتھ فاعل ہے۔ باقی الصفت۔ مخلص لام کے ساتھ مفعول ہے فانی الصفت۔ اس چیز کو زیادہ کھول کر کسی اور جگہ بیان کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فی الحقیقت فانی الصفت کا مقام باقی الصفت سے ارفع تر ہے کیونکہ وہ جسم کو دل کے موافق ڈھالتے ہیں اور ان کے دل مشاہدہ حق سے ہمکنار رہتے ہیں۔ باقی الصفت کوشش اور تکلف سے اپنے دلوں کو اوامر کے تابع کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر اس مسئلے کا تعلق صحو، سکر، مشاہدے اور مجاہدے سے ہے۔ واللہ اعلم

خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

امام عصر، فرید دہر، ابوعلی الحسن بن ابی الحسین بصری اہل طریقت کے نزدیک بلند مرتبہ بزرگ ہوئے ہیں۔ بعض ان کی کنیت ابومحمد اور بعض ابوسعید بیان کرتے ہیں: علم اور

معاملت میں کئی لطیف اشارات ان سے منسوب ہیں۔ کہتے ہیں ایک اعرابی ان کے پاس آیا اور صبر کی تشریح چاہی فرمایا: ''دو صورتیں ہیں، ایک مصیبت اور بلا کے وقت صابر رہنا۔ دوسری ان چیزوں کے معاملے میں صبر کرنا جن سے منع کیا گیا ہو اور ان سے بچے رہنے کے احکام موجود ہوں''۔ اعرابی نے کہا، ''آپ زاہد ہیں اور میں نے آج تک آپ سے بڑا زاہد نہیں دیکھا۔'' خواجہ حسن بصری نے فرمایا، ''اے اعرابی! میرا زہد خواہشات تک محدود ہے اور میرا صبر استقلال کے فقدان کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' اعرابی نے گذارش کی: ''آپ نے میرے ذہن کو جھٹک دیا ہے ذرا تفصیل سے بات کریں۔'' خواجہ حسن بصری نے فرمایا: ''مصائب میں میرا صبر و تسلیم صرف آتش دوزخ سے خوف زدہ ہونے کی علامت ہے اور بے قراری کے مترادف ہے۔ اس دنیا میں میرا زہد دوسری دنیا کے حصول کیلئے ہے۔ قابل رشک وہ بندۂ حق ہے جو ذاتی مطلب سے دستبردار ہو۔ اس کا صبر حق تعالیٰ کیلئے ہو آتش دوزخ سے محفوظ رہنے کیلئے نہ ہو۔ اس کا زہد بھی اللہ کیلئے ہو اور محض حصول بہشت کیلئے نہ ہو۔ اسی کا نام صحت خلوص ہے۔''

خواجہ حسن سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا، ان صحبة الأشرار يورث سوء الظن بالأخيار ''بروں کی صحبت اچھوں کے متعلق بدگمانی پیدا کرتی ہے۔''

یہ بات نہایت دل نشین ہے خاص طور پر اس زمانے کے لوگوں کے لئے جو عام طور پر دوستان حق سے روگرداں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جھوٹے صوفیاء سے ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے نام نہاد صوفیوں کے افعال خیانت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی زبان جھوٹ اور غیبت میں ملوث ہوتی ہے۔ ان کے کان لغو اور واہیات ابیات سنتے ہیں۔ ان کی آنکھیں لہو و شہوات سے مطمئن ہوتی ہیں اور ان کی تمام تر کوشش مال حرام جمع کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ تمام صوفیاء اسی قسم کے ہوتے ہیں اور ان کا مسلک یہی ہوتا ہے حالانکہ صوفیائے کرام صرف احکام حق تعالیٰ پر کار بند ہوتے ہیں۔ ان کے لبوں پر صرف کلام حق ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں محبت حق اور کانوں میں صدائے حق ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں

مشاہدۂ حق سے سرفراز ہوتی ہیں۔ ان کے جملہ خیالات اسرار خداوندی پر مرکوز ہوتے ہیں۔ اگر ان کی جماعت میں کچھ بدکردار لوگ بھی موجود ہیں تو بدکرداری کی ذمہ داری صرف انہی پر عائد ہوتی ہے۔ بدلوگوں سے ملنے والا خود فطرتاً بد ہوتا ہے کیونکہ نیک فطرت صرف نیک لوگوں سے ملا کرتے ہیں۔ قابل ملامت بد انسان کی اپنی طبیعت ہے جو نالائق اور ناجنس لوگوں سے مجالست کی طرف مائل ہوتی ہے۔ نیک سیرت صوفیوں کے منکر لوگ خدائے عزوجل کے نزدیک شرپسند اور رذیل ہوتے ہیں کیونکہ شرپسندوں اور رذیلوں سے ملتے ہیں اور صوفیائے کرام کو اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر ان سے منکر ہو جاتے ہیں اور ان کی پیروی سے انحراف کرتے ہیں۔ جب اہل شر ہلاک ہوتے ہیں تو ان کو بھی ہلاکت نصیب ہوتی ہے بجز ان کے جو حقیقی صوفیائے کرام کو رضا و رغبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی مجالست کو جان دل سے خرید لیتے ہیں۔ دنیا میں ان کے طریق کو برگزیدہ سمجھتے ہیں۔ ان کی برکت سے مقصود دو جہاں حاصل کرتے ہیں اور ہر سمت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ بقول شاعر۔

فلا تحقرن نفسی وأنت حبیبها فکل إمرء یصبو إلی من یجانس

"میرے دل کو حقارت سے نہ دیکھ کیونکہ تو اس کا حبیب ہے اور ہر شخص اپنے ہم جنس کی طرف مائل ہوتا ہے۔"

سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ

رئیس العلماء، فقیہ الفقہا، سعید ابن المسیب عظیم الشان، رفیع القدر، عزیز القول اور حمید الصدر صاحب طریقت تھے۔ علوم و فنون، فقہ توحید، تفسیر، شعر، لغت وغیرہ میں ان کے بے شمار مناقب ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ ایک عیار نما پارسا تھے پارسا نما عیار نہ تھے۔ اور یہ طریق جملہ مشائخ کے نزدیک نہایت قابل تعریف ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا، ارض بالیسیر من الدنیا مع سلامة دینک کما رضی قوم بکثیر ها مع ذهاب دینهم "اگر تیرا دین سلامت رہے تو دنیا کے اموال کے تھوڑے سے حصے پر بھی خوش ہو۔ جس طرح زیادہ دنیا حاصل کرنے والے دین برباد کر کے خوش ہوتے ہیں۔"

فقر اور سلامتی دین غنا اور غفلت سے بہتر ہیں۔ جب فقیر اپنے دل پر نظر کرتا ہے تو اسے اور حصول دنیا کی ہوس نہیں ہوتی۔ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے تو اسے قناعت کی دولت نظر آتی ہے۔ صاحب غنا اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ ہوس کو جاگزیں پاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں دولت دنیا ہوتی ہے اور وہ بھی مشتبہ۔ رضائے دوستان حق بہتر ہے رضائے اہل غفلت سے جو دنیائے پر غرور و آفت و حسرت پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ندامت بہتر ہے ذلت وسیسہ کاری سے۔ جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے تو اہل غفلت کہتے ہیں، شکر ہے ہماری جان محفوظ رہی۔ دوستان حق کہتے ہیں شکر ہے ہمارا دین محفوظ رہا۔ دل میں دوست کا جلوہ ہو تو جسمانی مصیبت باعث راحت ہوتی ہے۔ دل غفلت میں مبتلا ہو تو جسم ہزار راحت کے باوجود راحت سے نا آشنا ہوتا ہے۔ فی الحقیقت مال و منال دنیا کی قلت پر راضی ہونا کثرت مال و منال کا باعث ہے اور کثرت کی ہوس قلت کا باعث۔ ان کی نسبت یہ بھی مشہور ہے کہ ایک بار مکہ معظمہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے حاضر ہو کر پوچھا کہ وہ کون سی حلال چیز ہے جس میں حرام نہیں اور وہ کون سی حرام چیز ہے جس میں حلال نہیں فرمایا،

ذکر اللہ حلال لیس فیه حرام و ذکر غیرہ حرام لیس فیه حلال

''ذکر باری تعالیٰ وہ حلال چیز ہے جس میں کوئی حرام کا پہلو نہیں اور ذکر غیر وہ حرام ہے جس میں کوئی حلال کا پہلو نہیں۔''

ذکر ذات حق میں نجات ہے اور ذکر غیر میں ہلاکت۔ وباللہ التوفیق

گیارہواں باب

تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ

حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ

طریقت کے بہادر، شریعت کے کان حبیب عجمی ایک بلند ہمت اور قابل قدر بزرگ تھے اہل زمانہ میں ان کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی۔ ان کی توبہ کی ابتدا خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر ہوئی۔ وہ پہلے سود کھاتے تھے اور فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ باری تعالیٰ نے ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی وہ راہ راست پر آئے اور علم و معاملت کا بیشتر حصہ خواجہ حسن بصری سے حاصل کیا۔ ان کی زبان فارسی تھی اور عربی سے نابلند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سی کرامات سے مخصوص کیا تھا۔ ایک روز خواجہ نماز مغرب کے وقت ان کے حجرہ کے پاس سے گزرے وہ تکبیر نماز کہہ کر نماز میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ حسن بصری اندر آئے مگر ان کے پیچھے نماز میں کھڑے نہ ہوئے کیونکہ وہ عربی زبان کو صحیح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب نے رات کو خواب میں ذات باری کو دیکھا اور پوچھا "بار خدایا! تیری رضا کس چیز میں ہے"۔ ارشاد ہوا: "اے حسن! تجھے میری رضا کا مقام ملا مگر تو مستفید نہ ہوسکا۔ اگر کل رات حبیب کے پیچھے نماز ادا کر لیتا تو اس کی صحت نیت تجھے عبادت کی حقیقت سے آشنا کر دیتی اور میں تجھ سے راضی ہو جاتا"۔

مشائخ طریقت میں مشہور ہے کہ جب خواجہ حسن بصری حجاج کی پکڑ دھکڑ سے بھاگ کر حبیب کے حجرے میں پناہ گزیں ہوئے تو حجاج کے سپاہیوں نے حبیب سے پوچھا: "کیا تو نے حسن بصری کو کہیں دیکھا ہے؟" حبیب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "دیکھا ہے اور وہ میرے حجرے میں بند ہے"۔ سپاہی حجرے میں گئے وہاں کسی کو نہ پایا اور سمجھے کہ حبیب رضی اللہ عنہ نے ان کا مذاق اڑایا ہے اس پر سختی کی۔ حبیب نے قسم کھائی: دوبارہ، سہ بارہ

حجرے کی تلاشی لی گئی مگر خواجہ حسن بصری کہیں نظر نہ آئے۔ جب سپاہی واپس چلے گئے تو خواجہ صاحب حجرہ سے باہر نکلے اور فرمایا: ”حبیب! تیری برکت سے میں کسی کو نظر نہیں آیا مگر تو نے ظالموں سے کیوں کہا کہ میں حجرے میں بند ہوں“۔ حبیب نے جواب دیا: ”یہ میری برکت نہ تھی۔ صرف میرے سچ بولنے کی برکت تھی۔ اگر میں جھوٹ بولتا تو شاید ہم دونوں رسوا ہوتے“۔ اس قسم کی ان کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔

ان سے پوچھا گیا اللہ کی رضا کس چیز میں ہے؟ فرمایا، فی قلب لیس فیہ غبار النفاق ”اس دل میں جس میں نفاق کا غبار نہ ہو۔“ نفاق ملاپ کا دشمن ہے۔ رضا ملاپ پر منحصر ہے۔ محبت کو نفاق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ محبت کا مقام رضا ہے۔ رضا دوستوں کی صفت ہے اور نفاق دشمنوں کی۔ یہ بڑی اہم بات ہے اور ان شاء اللہ کسی اور جگہ بیان ہوگی۔

مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ

نقیب اہل محبت، جن وانس کی زینت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ کے مصاحب تھے اور صوفیائے کرام میں بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی کرامات، ریاضات اور خصائل مشہور ہیں۔ جب پیدا ہوئے تو ان کے والد حالت غلامی میں تھے۔ ان کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک رات وہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں عیش وطرب میں مشغول تھے جب سو گئے تو ایک ساز سے آواز آئی اے مالک! تجھے کیا ہو گیا کیوں توبہ نہیں کرتا؟ مالک دینار رضی اللہ عنہ نے سب کچھ ترک کر دیا۔ خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور صدق دل سے توبہ کی۔ اللہ نے بہت بلند مقام عطا فرمایا۔ ایک موقع پر وہ کشتی میں سفر کر رہے تھے ان پر موتی چرا لینے کا الزام تراشا گیا۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آناً فاناً ہزاروں مچھلیاں پانی کی سطح پر آ گئیں ہر ایک کے منہ میں ایک موتی تھا۔ مالک رضی اللہ عنہ نے ایک مچھلی کے منہ سے موتی کا دانہ لے کر چوری کا الزام تراشنے والے کو دے دیا اور خود کشتی سے نکل کر پانی کی سطح پر چلتے ہوئے کنارے پر پہنچ گئے۔

ان کا قول ہے، أحب الأعمال إليَّ الإخلاص فى الأعمال ”میرے نزدیک

اعمال میں سب سے زیادہ پیارا عمل خلوص ہے۔'' کوئی عمل، عمل نہیں ہوتا جب تک اس میں خلوص نہ ہو۔ خلوص کو عمل کے ساتھ وہی نسبت ہے جو روح کو تن کے ساتھ۔ تن بغیر روح پتھر ہے اور عمل بغیر خلوص کھیل۔ خلوص عمل باطن ہے اور طاعت عمل ظاہر۔ ظاہر باطن سے پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے اور باطن کی قیمت ظاہر پر منحصر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی ہزار سال بھی خلوص دل کی پرورش کرے اور اس کے اعمال ظاہر میں خلوص نمایاں نہ ہو تو اس کا خلوص بے معنی ہے اور اسی طرح اگر کوئی ہزار سال عمل ظاہر میں مصروف رہے اور اس کا دل خلوص سے خالی ہو تو اس کے عمل کو شامل عبادت نہیں کر سکتے۔

ابو حلیم حبیب بن سلیم راعی رحمۃ اللہ علیہ

فقیر الفقراء، امیر الاولیاء ابو حلیم حبیب بن سلیم راعی رضی اللہ عنہ عظیم المرتبہ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی آیات و براہین بے شمار ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مصاحب تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: نية المؤمن خير من علمه ''مومن کی نیت اس کے عمل سے اچھی ہے۔''

حبیب رضی اللہ عنہ کے بکریوں کے ریوڑ تھے۔ فرات کے کنارے رہتے تھے اور گوشہ نشینی ان کا طریق تھا۔ روایت ہے کہ ایک شیخ ادھر سے گزرے تو دیکھا کہ بھیڑیا ان کی بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے اور وہ نماز میں مشغول ہیں۔ جی میں آئی کہ زیارت کریں کچھ دیر ٹھہرے۔ جب حبیب رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہوئے تو شیخ نے بڑھ کر سلام کیا۔ حبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بیٹا کیسے آئے؟'' عرض کی زیارت کے لئے۔ فرمایا: ''اللہ تجھے نیکی دے۔'' شیخ نے کہا: ''یہ کیا ماجرا ہے؟ بھیڑیا اور بھیڑ بکریوں کی رکھوالی'' فرمایا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بھیڑ بکریوں کا گڈریا حق تعالیٰ کا تابع فرمان ہے''۔ یہ کہا اور ایک لکڑی کا پیالہ پتھر کے نیچے رکھا۔ پتھر سے دو چشمے جاری ہوئے: ایک دودھ کا دوسرا شہد کا۔ شیخ نے پوچھا: ''یہ درجہ آپ کو کیسے حاصل ہوا؟'' فرمایا: ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت سے''۔ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان کی مخالفت کی پھر بھی سخت چٹان سے بنی اسرائیل کے لئے چشمے

جاری ہوئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت بلند ہے۔ کیا ان کی متابعت کرنے والے کے لئے دودھ اور شہد بھی جاری نہ ہو"۔

شیخ نے کہا: "مجھے کوئی نصیحت کیجئے"۔ فرمایا، لا تجعل قلبک صندوق الحرص وبطنک وعاء حرام "دل کو محل حرص اور پیٹ کو جائے حرام نہ بنا۔" خلقت کی ہلاکت حرص وحرام سے واقع ہوتی ہے۔ نجات ان دونوں چیزوں سے پرہیز کرنے میں ہے۔ میرے پیر طریقت کو حبیب رضی اللہ عنہ کے بہت سے واقعات یاد تھے۔ مگر اس وقت کچھ اور بیان کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ میری بیشتر کتابیں غزنی میں ہیں اور میں دیار ہند کے شہر (لاہور) میں ہوں جو ملتان کے نواح میں ہے صحبت ناجنس میں مبتلا ہوں۔ ہر خوشی اور تکلیف میں خدا کا شکر ہے۔

ابو حازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ

پیر صالح ابو حازم مدنی رضی اللہ عنہ بہت سے مشائخ کے پیشرو تھے۔ معاملت میں بلند مقام تھے۔ فقر میں ثابت قدم اور مجاہدہ میں کامل روش۔ عمرو بن عثمان مکی رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں رطب اللسان ہیں۔ ان سے روایت ہے کہ ابو حازم رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: مامالک قال: الرضا عن اللہ والغناء عن الناس "تیری دولت کیا ہے؟ کہا رضائے خدا اور بے نیازی خلق۔" جو بھی رضائے حق کا طالب ہوتا ہے وہ دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے اور اس کی سب سے بڑی دولت رضائے خداوندی ہوتی ہے۔ غنا سے مراد غنی باللہ ہونا ہے۔ غنی باللہ ہر غیر اللہ سے بے نیاز ہوتا ہے اس کا راستہ صرف اس کی بارگاہ تک جانے والا راستہ ہوتا ہے۔ خلوت وجلوت میں صرف اسی کو پکارتا ہے۔

مشائخ کرام میں سے کوئی شخص ان کو ملنے آیا وہ سو رہے تھے۔ اس نے انتظار کیا۔ جب وہ بیدار ہوئے تو فرمایا: "میں نے ابھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ تیرے واسطے حکم ہوا ہے کہ اپنی والدہ کے حقوق کی نگہداشت حج سے بہتر ہے۔ واپس جا اور اس کی دلداری کر"۔ وہ شخص واپس چلا گیا۔ حازم رضی اللہ عنہ سے متعلق اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں سنا۔

محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ

داعی اہل مجاہدہ، قائم بحل مشاہدہ محمد بن واسع رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے عدیم المثال بزرگ تھے۔ کئی تابعین سے مصاحبت کا شرف حاصل کیا اور بہت سے متقدمین سے ملے۔ طریقت کی دولت سے بہرہ یاب تھے۔ حقائق طریقت پر ان کے بہت سے بلند مرتبہ اشارات ہیں۔ فرمایا، مارأیت شیئاً إلا ورأیت اللّٰہ فیه ''میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس میں جلوۂ حق نہ پایا ہو۔'' یہ مشاہدہ کا مقام ہے جہاں غلبہ دوستی کے باعث ہر فعل میں صرف فاعل نظر آتا ہے۔ جس طرح تصویر کو دیکھ کر مصور۔ اس قول کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے کہ آفتاب، ماہتاب اور ستارہ کو دیکھ کر کہا ھذا ربی یہ غلبہ شوق تھا۔ جس کے باعث ہر چیز میں جلوۂ محبوب نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ جب دوست دیکھتے ہیں تو جہان کو اس کے قہر سے مقہور اور غلبہ سے مغلوب پاتے ہیں۔ وجود ہستی اس کی قدرت کے سامنے پراگندہ نظر آتا ہے اور تکوین عالم ناچیز۔ نگاہ شوق ہو تو مقہور نہیں قاہر، مفعول نہیں فاعل، مخلوق نہیں خالق نظر آتا ہے۔ یہ مقام مشاہدہ ہے اس کی تشریح کی جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بعض لوگ کہتے ہیں رایت اللّٰہ فیه ''میں نے اس میں اللہ کو دیکھا۔'' یہ قول مکان، جزو اور حلول کا مقتضی ہے اور محض کفر ہے کیونکہ مکان اور مکان پذیر ہم جنس ہوتے ہیں۔ اگر مکان مخلوق ہے تو مکان پذیر بھی مخلوق ہوگا۔ اگر مکان پذیر قدیم ہے تو مکان بھی قدیم ہونا چاہئے۔ اس میں دو غلط چیزیں ہیں یعنی مخلوق کو قدیم اور خالق کو محدث تصور کرنا۔ دونوں چیزیں کفر کے مترادف ہیں۔ اشیاء میں خالق کو دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے نشانات قدرت، دلائل اور براہین نظر آئیں۔ اس میں لطائف و رموز ہیں جو اپنی جگہ پر بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ

امام اماماں، مقتدائے اہل سنت، شرف فقہاء اور عزت علماء ابو حنیفہ نعمان بن ثابت خزار رضی اللہ عنہ مجاہدہ و عبادت میں ثابت قدم بزرگ تھے۔ اصول طریقت میں بڑی شان

کے مالک تھے۔ اول اول آپ نے گوشہ نشینی کا ارادہ کیا۔ خلق سے بیزاری کا اظہار کیا اور چاہا کہ دنیا سے دور ہٹ جائیں۔ کیونکہ ان کا دل اہل دنیا کے جاہ وجلال سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ پیغمبر ﷺ کے استخوان مبارک لحد سے جمع کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض کو چن رہے ہیں۔ خوف وہیبت کے عالم میں بیدار ہوئے اور اپنے ایک دوست محمد بن سیرین سے تعبیر پوچھی۔ انہوں نے فرمایا آپ کو پیغمبر ﷺ کی سنت کو محفوظ کرنے میں بہت بلند مقام حاصل ہوگا۔ آپ صاحب تصرف ہونے کی حیثیت سے صحیح کو غلط سے جدا فرمائیں گے۔ دوسری بار پھر حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوحنیفہ! تیری زندگی احیائے سنت کے لئے ہے گوشہ نشینی کا ارادہ ترک کردے۔''

آپ اکثر مشائخ کے استاد تھے۔ چنانچہ ابراہیم ادھم، فضیل بن عیاض، داؤد طائی اور بشر حافی وغیرہم نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ مذکور ہے کہ ابوجعفر منصور کے دور حکومت میں امور شرعیہ کے انتظام کے لئے قاضی کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے چار آدمی پیش نظر تھے امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری، مسعر بن کدام اور شریح رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ ہرکارہ بلانے کے لئے آیا۔ راستہ میں ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اپنی فراست کے مطابق اس معاملے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب نے کہا فرمائیے۔ آپ نے فرمایا میں کسی حیلہ سے اس مصیبت کو اپنے سے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ مسعر اپنے آپ کو دیوانہ ظاہر کرے۔ سفیان راہ فرار اختیار کرے اور شریح عہدہ قضا قبول کرلے۔

چنانچہ سفیان راستے میں فرار ہوگیا۔ ایک کشتی میں پناہ لی اور فرمایا مجھے بچاؤ میرا سر کاٹ رہے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ تھا: مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ (1) ''جو شخص قاضی بنا بغیر چھری کے ذبح ہوا۔'' کشتی کے ملاح نے اس کو چھپالیا۔ باقی تینوں ابومنصور کے پاس پہنچے۔ پہلے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی باری آئی۔ آپ

1۔ مسند احمد، سنن ابی ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ

نے فرمایا: میں عربی النسل نہیں ہوں۔ سادات عرب میری قضا پر راضی نہیں ہوں گے۔ ابو منصور نے کہا، قاضی کے عہدے کے لئے نسب کی ضرورت نہیں علم چاہئے اور تم علماء کے پیش رو ہو۔ میں نے کہا، میں اس کام کے لائق نہیں ہوں۔ اگر میں سچ کہتا ہوں تو معذور ہوں اور اگر جھوٹ بول رہا ہوں تو جھوٹا آدمی قاضی نہیں بنایا جاسکتا۔ آپ خلیفہ وقت ہیں۔ دروغ گو کو اپنا قاضی نہ بنائیں اور اپنی رعایا کا اعتماد، ان کے جان و مال اور عزت ناموس اس کے سپرد نہ کریں۔ آپ کی اس طرح نجات ہوئی۔ مسعر کو پیش کیا گیا۔ اس نے منصور کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھنے لگا کیسے ہو؟ تمہارے بچے کیسے ہیں؟ منصور نے حکم دیا: یہ دیوانہ ہے اسے باہر نکال دو۔ اس کے بعد شریح کو حکم ہوا کہ قاضی کا عہدہ سنبھال لے۔ انہوں نے کہا میں سوداوی مزاج آدمی ہوں، میرا دماغ بہت کمزور ہے۔ منصور نے کہا اپنا علاج کراؤ۔ مزاج کے مطابق مشروبات اور ادویات استعمال کرو۔ دماغ درست ہو جائے گا۔ چنانچہ قضا اس کے سپرد ہوئی۔ ابوحنیفہ رخصت ہوئے اور شریح سے بات تک بھی نہ کی۔

مندرجہ بالا واقعہ ابوحنیفہ کی شان کا بین نشان ہے۔ اول تو اپنی فراست سے سب کا میلان طبع سمجھ گئے۔ دوسرا اپنی ذات کو مصیبت سے محفوظ کر لیا۔ خلق سے دور رہنا اور دنیوی جاہ و جلال پر مغرور نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ صحت حال اور سلامتی اسی کنارہ کشی میں ہے۔

آج کل سب اہل علم اس کام یعنی قضا کو پسند کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہیں اور راہ حق سے نفور ہیں۔ امیروں کے دولت کدے ان کی قبلہ گاہ ہیں۔ ظالموں کے گھر ان کو آباد نظر آتے ہیں۔ جابروں کی بساط کو قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ (النجم) ”کے برابر سمجھتے ہیں اور ہر اس چیز کے منکر ہیں جو ان کے مزاج کے خلاف ہو۔

غزنی میں ایک بار کسی مدعی علم و امامت نے مجھ سے کہا کہ خرقہ پوشی بدعت ہے میں نے کہا کہ ریشم و اطلس جو مردوں کے لئے قطعاً حرام ہے جو ظالموں اور بدکاروں سے التجا کر کے مانگا جاتا ہے اور ظالم بھی وہ جن کا جملہ مال حرام ہوتا ہے وہ ریشم و اطلس تو پہن لیا جاتا ہے اسے بدعت نہیں سمجھا جاتا اس کے برعکس جامہ حلال کو جسے مال حلال کے عوض جائے

حلال سے خریدا گیا ہو بدعت کہا جاتا ہے۔ اگر تم رعونت طبع اور ضلالت عقل میں مبتلا نہ ہوتے تو تمہاری زبان سے اس سے بہتر بات نکلتی ریشمی کپڑا عورتوں کے لئے حلال ہے اور مردوں کے لئے حرام ہے۔ اگر یہ دونوں صورتیں تسلیم کرتے ہو تو ٹھیک ہے اور ہم عدم انصاف سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب نوفل بن حیان رضی اللہ عنہ وفات پا گئے میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت بپا ہے سب لوگ اپنے اعمال کا حساب دے رہے ہیں۔ حضور ﷺ حوض کوثر پر کھڑے ہیں ان کے دائیں بائیں مشائخ کرام کا ہجوم ہے ایک خوش شکل بزرگ جس کے سر کے بال سفید ہیں، حضور ﷺ کے برابر رخسار مبارک سے رخسار لگائے کھڑا ہے۔ اس کے بالکل برابر نوفل بن حیان کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھے اور سلام کیا۔ میں نے کہا مجھے پانی دیجئے۔ فرمایا، میں حضور ﷺ سے اجازت مانگتا ہوں حضور ﷺ نے انگشت مبارک سے اشارہ کیا۔ نوفل نے مجھے پانی کا پیالہ دیا اور دوستوں کو بھی پلایا۔ سب نے پیا مگر پیالے میں پانی کم نہ ہوا۔ میں نے پوچھا حضور ﷺ کے دائیں طرف کون بزرگ ہیں؟ فرمایا: حضرت ابراہیم خلیل اللہ۔ بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ میں اسی طرح پوچھتا گیا اور انگلیوں پر شمار کرتا گیا۔ سترہ آدمیوں سے متعلق پوچھا جب آنکھ کھلی تو انگلیوں پر سترہ تک گنتی کر چکا تھا۔ اسی طرح معاذ رازی فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا یارسول اللہ! ﷺ اَیْنَ اَطْلُبُکَ قَالَ عِنْدَ عِلْمِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ ''میں آپ کو کہاں طلب کروں تو فرمایا ابوحنیفہ کے علم میں۔''

پارسائی میں آپ کے بے شمار مناقب ہیں جو اس کتاب میں سما نہیں سکتے۔ میں ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ موذن رسول ﷺ کے مزار پر سو رہا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ مکہ معظمہ میں ہوں۔ حضور ﷺ باب شیبہ سے تشریف لائے اور ایک بوڑھے آدمی کو اس طرح گود میں لئے ہوئے تھے جیسے لوگ شفقت سے بچوں کو اٹھا لیتے ہیں۔ میں

نے آگے بڑھ کر قدم بوسی کی، حیران تھا کہ یہ پیرانہ سال آدمی کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے میرے دل کی بات سمجھ لی اور فرمایا: ''یہ تیرا امام اور تیرے اپنے دیار کا رہنے والا ابو حنیفہ ہے''۔ مجھے اس خواب سے بڑی تسلی ہوئی اور اپنے اہل شہر سے ارادت پیدا ہوئی۔ خواب سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے تھے جو اوصاف طبع میں فانی اور احکام شرع میں باقی و قائم ہو گذرے ہیں۔ یہ حقیقت اس امر سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ کو اٹھا کر لائے اگر وہ خود چل کر آتے تو باقی الصفت ہوتے۔ باقی الصفت لوگ منزل کو پا بھی سکتے ہیں اور منزل سے بھٹک بھی سکتے ہیں چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو اٹھایا ہوا تھا یقیناً ان کے ذاتی صفات فنا ہو چکے تھے اور وہ پیغمبر حق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صفات کے ساتھ صاحب بقا تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سہو و خطا سے بالاتر ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ جسے ان کا سہارا نصیب ہو وہ سہو و خطا کا مرتکب ہو سکے۔ یہ ایک رمز لطیف ہے۔

کہتے ہیں جب داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے علم حاصل کر لیا اور ان کو پیشوائی کا مقام مل گیا تو وہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا اب کیا کروں؟ فرمایا: ''عمل کی ضرورت ہے کیونکہ علم بلا عمل ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔'' علم بدون عمل صاف نہیں ہوتا اور خلوص سے خالی رہتا ہے جو صرف علم پر قناعت کرتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا۔ علم عمل کا تقاضا کرتا ہے جیسے ہدایت مجاہدے کا مشاہدہ بدون مجاہدہ ممکن نہیں۔ بعینہٖ علم بلا عمل کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ علم صرف عمل سے روبہ کار آتا ہے اسی سے ترقی پذیر ہو کر برکات کا باعث ہوتا ہے۔ دونوں کو جدا کرنا محال ہے۔ جیسے آفتاب کی روشنی کو آفتاب سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔

عبد اللہ بن مبارک مروزی رحمۃ اللہ علیہ

زاہدوں کے سردار اور اوتاد کے پیش رو عبد اللہ بن مبارک مروزی رضی اللہ عنہ اہل طریقت میں ایک شاندار مقام رکھتے تھے اور جملہ احوال و اقوال اور اسباب طریقت و شریعت کے عالم تھے اور اپنے وقت کے امام تھے۔ بزرگ مشائخ کرام سے ملاقات کر

چکے تھے۔ان کی کئی کرامات وتصانیف مشہور ہیں۔توبہ کی ابتدااس طرح ہوئی کہ وہ ایک کنیز پر عاشق ہو گئے ایک رات وہ رندوں کی صحبت سے اٹھے اور ایک ساتھی کو ہمراہ لے کر معشوقہ کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوئے وہ چھت پر آ گئی اور دونوں صبح تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔صبح کی اذان ہوئی تو عبداللہ سمجھے شاید عشاء کی اذان ہے۔جب سورج نکلتا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمام رات دیدار میں غرق رہے ہیں۔طبیعت کو بہت قلق ہوا۔جی ہی جی میں کہا،''اے مبارک! تجھے شرم آنی چاہیے۔ساری رات خواہش نفسانی میں کھڑا رہا۔کرامات کا بھی طالب ہے۔نماز میں اگر امام لمبی سورت پڑھے تو برافروختہ ہو جاتا ہے تیری ایمان داری کا دعویٰ کہاں ہے۔'' توبہ کی اور علم اور اس کی طلب میں مشغول ہو گئے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا مقام دیا ایک دفعہ ان کی والدہ نے دیکھا کہ وہ باغ میں سو رہے ہیں اور ایک بہت بڑا سانپ ریحان کی ایک شاخ منہ میں لئے مکھیاں اڑا رہا ہے۔اس کے بعد وہ مرو سے کوچ کر گئے اور بغداد میں جا کر مشائخ کی صحبت میں رہے۔پھر کچھ مدت مکہ شریف میں مجاور ہوئے اور اس کے بعد پھر مرو میں آ گئے۔سب لوگ ان کے دوست اور معاون تھے۔درس اور مجلس شروع کی۔ان دنوں مرو میں کچھ لوگ اہل حدیث تھے اور کچھ طریقت کے پیروکار۔عبداللہ کو رضی الفریقین کہا جاتا ہے کیونکہ آپ دونوں فریقوں سے موافقت رکھتے تھے اور دونوں فریق ان کو برابر اپناتے تھے۔انہوں نے دو کمرے بنا رکھے تھے۔ایک اہل حدیث کے لئے اور دوسرا اہل طریقت کے لئے آج تک یہ دونوں کمرے موجود ہیں۔اس کے بعد وہ حجاز آ کر کچھ عرصہ مجاور رہے ان سے پوچھا گیا آپ نے کونسی عجیب چیز دیکھی فرمایا:''میں نے ایک راہب کو دیکھا جو مجاہدہ سے لاغر اور خوف خدا سے کبڑا ہو چکا تھا میں نے اس سے پوچھا:''اے راہب! خدا کی راہ کونسی ہے؟'' اس نے جواب دیا:''اگر تو خدا کو جانتا تو اس کا راستہ بھی پہچانتا۔میں اس کی پرستش کرتا ہوں جس کو میں نہیں جانتا اور تو اس کی نافرمانی کرتا ہے جس کو تو پہچانتا ہے۔'' پھر کہا:''تو بے غم اور بے فکر نظر آتا ہے اور میں اپنے آپ کو خوف زدہ دیکھتا ہوں۔''

عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے عبرت حاصل ہوئی اور میں کئی برے کاموں سے محفوظ رہا ان سے روایت ہے: "اللہ کے دوستوں پر سکون دل حرام ہے۔" اہل حق دنیا میں طلب میں بے قرار ہوتے ہیں اور عقبیٰ میں عالم طرب میں بے چین۔ دنیا میں حق سے جدائی ان کا قرار چھین لیتی ہے اور عقبیٰ میں حضور حق اور تجلی حق ان کو بے قرار کر دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا ان کے لئے عقبیٰ اور عقبیٰ دنیا کی طرح ہوتی ہے۔ دل کے سکون کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے یا مقصود کو پالینا یا مقصود سے بالکل غافل ہو جانا۔ مقصود کا حاصل ہونا دنیا اور عقبیٰ میں روا نہیں۔ کیونکہ کامرانی سوز محبت کو ختم کر دیتی ہے اور غفلت دوستان حق پر حرام ہے کیونکہ دل غافل سعی طلب سے معذور ہوتا ہے یہ محققین طریقت کا صحیح قول ہے۔

ابو علی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ

اہل حضور اور درگاہ وصال کے بادشاہ ابو علی فضیل اہل طریقت میں بزرگ درویش تھے۔ معاملات اور حقائق سے بہرہ کامل رکھتے تھے۔ طریقت کے مشاہیر میں عزت و احترام سے یاد کئے جاتے تھے ان کی زندگی سچائی کا مرقع تھی۔ ابتدائی عمر میں عیار مشرب تھے اور مرو اور باورد کے درمیان رہزنی کرتے تھے مگر ہر وقت مائل بہ صلاحیت تھے۔ جوانمردی اور ہمت ان کی طبیعت میں موجود تھی۔ کسی قافلہ میں عورت پر دست برد نہیں کرتے تھے۔ کم سرمایہ والوں کو نہیں لوٹتے تھے اور سب کے لئے کچھ نہ کچھ حسب سرمایہ چھوڑ دیتے تھے۔ ایک سوداگر مرو سے جا رہا تھا لوگوں نے کہا بدرقہ ساتھ لے لو کیونکہ فضیل راہزن راستے میں ہے اس نے جواب دیا میں نے سنا ہے کہ وہ خدا ترس آدمی ہے۔ سوداگر نے ایک قاری کو ساتھ لے لیا وہ اونٹ پر بیٹھا ہوا دن رات قرآن پڑھتا رہا۔ جب قافلہ فضیل کی کمین گاہ کے قریب پہنچا تو قاری یہ پڑھ رہا تھا اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (الحدید:14) "کیا ایمان داروں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر حق سے خوفزدہ ہوں۔" فضیل پر رقت طاری ہوگئی۔ عنایت ازلی دل و جان پر چھا گئی۔ انہوں نے راہزنی ترک کر دی۔ اپنے تمام دشمنوں کو راضی کیا اور مکہ معظمہ چلے گئے۔ مدت تک وہاں

مجاور رہے اور اکثر اولیائے کرام سے ملے۔ پھر کوفہ واپس آئے اور ایک مدت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے مصاحبت کی۔ ان کی کئی بلند روایات ہیں۔ وہ اہل حدیث میں مقبول ہیں۔ حقائق تصوف و معرفت میں ان کا کلام بہت رفیع الدرجہ ہے۔ ان سے روایت ہے: من عرف الله حق معرفته عبده بكل طاقته ''جس نے اللہ کو کما حقہ پہچانا اس نے پوری طاقت سے اس کی عبادت اختیار کی۔'' اللہ تعالیٰ کو اس کے انعام، احسان، کرم اور رحمت سے پہچانا جاتا ہے۔ جب پہچان لیا تو اس کی دوستی کا دامن ہاتھ میں آ گیا۔ دوستی کے شکر میں عبادت اختیار کی۔ کیونکہ دوستوں کا فرمان بار خاطر نہیں ہوتا۔ جتنی دوستی زیادہ ہوگی اتنا ہی عبادت کا شوق زیادہ ہوگا۔ دوستی معرفت کی حقیقت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک رات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ میں تعاقب میں گئی دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں مصروف نماز ہیں اور بحالت قیام زاری فرما رہے ہیں حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز صبح ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ قدم مبارک سوجے ہوئے ہیں۔ پھٹی ہوئی انگلیوں سے زرد رنگ کا پانی نکل رہا ہے۔ میں رو پڑی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کی اول و آخر لغزشیں معاف ہو چکی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟ یہ تکلیف تو ان لوگوں کے لئے ہے جو عاقبت سے خوف زدہ ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری لغزشوں سے درگذر باری تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ أفلا أكون عبداً شكوراً(1)

''کیا مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہیں ہونا چاہئے۔'' رب العزت نے کرم کیا اور مجھے بخشش کی بشارت دی کیا مجھے بندگی نہیں کرنی چاہئے اور تا بہ مقدور شکر نعمت حق ادا نہیں کرنا چاہئے۔

روایت ہے کہ معراج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچاس نمازیں قبول فرمائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر بار بار واپس گئے۔ یہاں تک کہ پانچ نمازیں فرض رہ

1۔ ترمذی، الشمائل المحمدیہ

گئیں۔ ابتدا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس ہی قبول فرمالی تھیں کیونکہ طبع مبارک میں مخالفت قطعاً نہیں تھی۔ ''محبت موافقت کے قریب ہوتی ہے۔''

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''دنیا پاگل خانہ ہے۔ اہل دنیا پاگل ہیں اور طوق وزنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔'' نفسانی خواہش ہمارے گلے کا طوق اور معصیت ہماری زنجیر ہے۔

فضل بن ربیع سے روایت ہے کہ میں ہارون الرشید کے ہمراہ مکہ معظّمہ گیا۔ حج ادا کرنے کے بعد خلیفہ نے مجھ سے پوچھا کیا یہاں کوئی مردحق ہے؟ جس کی میں زیارت کرسکوں۔ میں نے کہا ہاں عبدالرزاق صنعانی یہاں پر موجود ہے۔ کہا مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر جب اٹھنے لگے تو ہارون الرشید نے اشارہ سے کہا: ''پوچھو ان پر کوئی قرض ہے؟'' معلوم ہوا قرض ہے۔ چنانچہ وہ چکا دیا گیا۔ باہر نکل کر خلیفہ نے کہا میرا دل ابھی تشنہ ہے کسی اور بڑے بزرگ کو ملنا چاہتا ہوں میں نے کہا سفیان بن عیینہ موجود ہیں۔ کہا ان کے پاس لے چلو۔ وہاں بھی کچھ دیر بیٹھے۔ چلتے وقت خلیفہ نے پھر قرض سے متعلق دریافت کیا۔ قرض نکلا اور وہ ادا کر دیا گیا۔ خلیفہ نے کہا میرا مقصود ابھی حاصل نہیں ہوا۔ میں نے کہا: فضیل بن عیاض بھی یہاں موجود ہیں۔ ہم وہاں گئے۔ وہ ایک غرفہ (کمرے) میں بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ آواز آئی کون ہے؟ میں نے کہا امیر المومنین تشریف لائے ہیں جواب ملا ہمیں امیر المومنین سے کیا مطلب؟ میں نے کہا سبحان اللہ! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں: ''کسی شخص کو طاعت حق میں ذلت طلب نہیں کرنی چاہئے۔ جواب ملا: ٹھیک ہے مگر رضائے حق دائمی شان و شوکت کا باعث ہے۔ تم مجھے ذلت میں دیکھتے ہو اور میں اپنے آپ کو رفیع المرتبہ پاتا ہوں''۔ یہ کہہ کر فضیل رضی اللہ عنہ نیچے اترے چراغ گل کر دیا اور خود ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ ہارون الرشید اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولتا رہا۔ آخرکار اس کا ہاتھ ان تک پہنچ گیا۔ فضیل رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ایسا نرم اور گداز ہاتھ میں نے کبھی نہیں دیکھا کیا عجب ہے کہ عذاب خداوندی سے بچ رہے۔'' ہارون الرشید رونے لگا اور اتنا رویا کہ بیہوش

ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو کہا مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ فرمایا تمہارے جدامجد حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے چچا تھے انہوں نے حضور ﷺ سے امارت طلب کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''دنیوی حکومت کی بجائے میں آپ کو قلبی حکومت دیتا ہوں۔ خدائے عزوجل کی بندگی میں گزرا ہوا ایک لمحہ خلقت پر ہزار سالہ حکومت سے بہتر ہے۔ امارت روز قیامت ندامت کا باعث ہوگی۔'' ہارون نے کہا کچھ اور فرمائیے۔ آپ نے فرمایا جب عمر بن عبدالعزیز کو خلافت تفویض ہوئی۔ انہوں نے سالم بن عبداللہ، رجاء بن حیا اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہم کو بلا کر کہا کوئی تدبیر کیجئے امارت مصیبت ہے اور میں مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ان میں سے ایک نے کہا اگر عذاب خداوندی سے نجات درکار ہے تو بوڑھوں کو باپ، جوانوں کو بھائی اور چھوٹوں کو فرزند تصور کرو اور ان سے وہ سلوک روا رکھو جو گھر میں باپ، بھائی اور بیٹے سے روا رکھا جاتا ہے۔ سب ولایت تیرا گھر ہے اور اس کے باشندے کنبہ، باپ کی زیارت کرو، بھائی پر احسان کرو اور فرزند سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔'' مجھے خوف ہے تیرا یہ خوبصورت جسم جہنم کی آگ کے سپرد نہ ہو۔ خدائے عزوجل سے ڈرو اور اس کے حقوق بطریق احسن پورے کرو۔ ہارون نے پوچھا۔ آپ پر کوئی قرض ہے؟ فرمایا ہاں خدا کی طاعت کا قرض ہے مجھے ڈر ہے اس کے لئے مجھے گرفت نہ ہو ہارون نے کہا میرا مطلب خلقت کا قرضہ ہے؟ فرمایا باری تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں جو اس کے بندوں سے بیان کروں۔ ہارون نے ہزار دینار کی ایک تھیلی ان کے سامنے پیش کی اور کہا اسے اپنے کام میں لائیے اور بوقت ضرورت خرچ کیجئے۔ فضیل نے فرمایا: افسوس ہے میری تمام نصیحت بیکار گئی۔ تو نے ظلم کا راستہ اختیار کیا اور مجھ پر ظلم روا رکھا۔ ہارون نے پوچھا میں نے کیا ظلم کیا۔ فرمایا میں تجھے راہ نجات دکھاتا ہوں تو مجھے ہلاکت میں ڈالتا ہے یہی ظلم ہوا کرتا ہے۔ ہارون روتا ہوا باہر نکل آیا اور کہا حقیقت میں فضیل بادشاہ ہیں۔ یہ ان کے مقام کی دلیل ہے جو اہل دنیا میں ان کو حاصل ہے۔ دنیا اور اس کی زینت ان کی نظر میں بے حقیقت ہے وہ دنیا داروں کی تواضع دنیا

کے واسطے نہیں کرتے۔ان کے فضائل بیشمار ہیں۔

ابوالفیض ذوالنون بن ابراہیم مصری رحمۃ اللہ علیہ

سفینہ تحقیق وکرامت اور شمشاد شرف ولایت حضرت ذوالنون رضی اللہ عنہ نوبی قبیلہ کے فرزند تھے ثوبان نام تھا۔اہل طریقت میں بہت بلند مقام کے مالک تھے۔طریق بلا اور راہ ملامت پر گامزن تھے۔تمام اہل مصران کی رفعت مقام سے ناآشنا تھے اوران کی بزرگی کے منکر۔مرتے دم تک ان کے حال وجمال سے کوئی واقف نہ تھا۔جس رات آپ نے دنیا سے کوچ کیا ستر آدمیوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا فرمارہے تھے کہ ہم خدا کے دوست ذوالنون کا خیر مقدم کرنے آئے ہیں۔مرنے کے بعد ذوالنون کی پیشانی پر یہ عبارت ثبت دیکھی گئی:هذا حبيب الله مات فى حب الله وقتيل الله "یہ اللہ کا حبیب ہے،اللہ کی محبت میں مرا،اللہ کا شہید ہے۔"جب جنازہ اٹھا تو پرندے جمع ہو گئے اوران کی میت پر اپنے پروں کا سایہ کیا۔اہل مصر پر بڑا اثر ہوا اور وہ اپنی جفا پر سخت پشیمان ہوئے۔تصوف میں ان کے بے شمار بیش قیمت اقوال ہیں چنانچہ فرمایا۔"عارف ہر روز زیادہ سے زیادہ انکسار پر مائل ہوتا ہے کیونکہ ہر لحہ وہ اپنے مالک حقیقی کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ہر قدم پر قادر مطلق کا جبروت اس کے دل ودماغ پر طاری ہوتا رہتا ہے اور ہر قدم پر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ سلطان مطلق سے کتنی دور ہے"۔موسیٰ علیہ السلام نے دوران کلام میں باری تعالیٰ سے پوچھا: أين أطلبک؟"میرے مولا! میں تجھے کہاں تلاش کروں؟"جواب ملا:عند المنكسرة قلوبهم "ٹوٹے ہوئے دلوں میں۔"عرض کی:"بارخدایا! کوئی دل میرے دل سے زیادہ ٹوٹا ہوا نہیں۔"ندا آئی:"تو پھر جہاں تو ہے وہاں میں ہوں۔"

جو کوئی بھی بغیر عجز وخوف عارف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جھوٹا اور ریاکار ہے۔صحیح عرفان کا نشان خلوص ارادت ہے۔خلوص تمام اسباب وتعلقات کو ختم کر دیتا ہے۔یہاں تک کہ سوائے ذات باری تعالیٰ کے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔جیسا کہ ذوالنون رضی اللہ عنہ نے فرمایا:الصدق سيف الله فى أرضه ما وضع على شىء إلا قطعه "صداقت

خدا کی تلوار ہے جس چیز پر پڑتی ہے اسے کاٹ دیتی ہے۔" صداقت مسبب پر نظر رکھنے کا نام ہے۔ اسباب کو ثابت کرنے کا نہیں۔ کیونکہ جب اسباب کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو صداقت مفقود ہو جاتی ہے۔

حکایات میں ہے کہ ایک روز ذوالنون رود نیل میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کشتی میں سوار تھے۔ دوسری جانب سے ایک اور کشتی آ رہی تھی۔ جس میں کچھ ارباب نشاط سوار تھے اور اخلاق سوز مشاغل میں مصروف تھے۔ ذوالنون کے مصاحبین کو سخت کوفت ہوئی۔ عرض کی آپ دعا کریں یہ سب غرق ہو جائیں تاکہ خلق کو ان کے شر سے نجات حاصل ہو۔ ذوالنون کھڑے ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ بار خدایا! ان لوگوں کو دنیا میں عیش و عشرت عطا کی ہے عاقبت میں بھی سکون و راحت ارزاں فرمانا۔ اس دعا پر ارادت مندوں کو سخت حیرت ہوئی۔ رفتہ رفتہ کشتی قریب آ گئی۔ جب ارباب نشاط نے ذوالنون کو دیکھا تو بے اختیار رونے لگے۔ معذرت کی چنگ و رباب توڑ کر پھینک دیئے۔ توبہ کی اور حق کی طرف رجوع کیا۔ ذوالنون نے فرمایا: دیکھا مقصد حاصل ہو گیا وہ بھی کامران ہیں تم بھی کامیاب ہو کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔

یہ ذوالنون کے قلب شفیق کی دلیل ہے آپ کو مسلمانوں سے نہایت درجہ ارادت تھی اور آپ سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کاربند تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی خفا نہیں ہوتے تھے اور فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (1) "باری تعالیٰ میری قوم کو ہدایت فرما وہ میرے حال سے آشنا نہیں ہیں۔"

یہ بھی مشہور ہے کہ آپ ایک بار بیت المقدس جا رہے تھے راہ میں ایک بڑھیا کو دیکھا۔ کوزہ ہاتھ میں تھا۔ عصا کے سہارے چل رہی تھی اور ریشم کا جبہ پہنا ہوا تھا۔ پوچھا "کہاں سے آ رہی ہو؟" بڑھیا نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ کے ہاں سے" پوچھا "کہاں جا رہی ہو؟" کہا "اللہ تعالیٰ کی طرف" ذوالنون کے پاس ایک دینار تھا اسے دینے کے لئے نکالا۔ بڑھیا

1۔ صحیح مسلم

نے ذوالنون کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا: "ذوالنون تو نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں خدائے عزوجل کی بندی ہوں بجز اس کے کسی سے کچھ طلب نہیں کرتی۔ اسی کی پرستش کرتی ہوں اور اسی کی استعانت چاہتی ہوں۔" بڑھیا یہ کہہ کر چلی گئی۔ اس حکایت میں ایک لطیف اشارہ ہے۔ "میں اس کی بندی ہوں۔" بڑھیا کی سچی محبت کا اقرار ہے۔ معاملت کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ انسان نیک کام کرے اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کر رہا ہوں۔ حالانکہ ہر کام اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے گو بظاہر اس میں کوئی نفسانی خواہش کارفرما نہ ہو۔ تاہم دل میں ثواب عاقبت کا خیال ضرور جاگزین رہتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا اور عقبیٰ کا خیال قطعاً موقوف ہو نہ دنیا کی عزت و توقیر کی ہوس ہو نہ عاقبت کی جزا و سزا پر نظر ہو۔ جو کام بھی ہو محض باری تعالیٰ کے احکام کی تعظیم کی خاطر ہو اور تعمیل احکام میں ہر ذاتی مقصد کو نظر انداز کیا جائے۔ اول الذکر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی ثواب آخرت کے لئے کرتے ہیں اللہ کے لئے کرتے ہیں اور یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ سالکان حق کو صرف طاعت کی ہوس ہوتی ہے اور اس اطاعت میں ان کے لئے وہ مسرت ہوتی ہے جو گنہ گار کو معصیت میں ہرگز میسر نہیں آسکتی۔ کیونکہ گناہ کی مسرت صرف چند لمحوں کے لئے ہوتی ہے اور طاعت دائمی مسرت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ انسانی طاعت و مجاہدہ سے بے نیاز ہے۔ ترک مجاہدہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر تمام عالم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صدق پر ہو تو اسے کیا فائدہ؟ اگر تمام خلق فرعون کا کذب اختیار کرے تو اسے کیا نقصان؟ بقول حق اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (الاسراء: 7) "اگر تم نیکوکار ہو تو اپنی ذات کے لئے اور اگر بدکار ہو تو اپنی جان کے لئے۔" اور نیز وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (العنکبوت: 6) "جو راہ حق پر جادہ پیما ہے اپنی منفعت کے لئے ہے خدا مخلوق سے بے نیاز ہے۔" وہ عاقبت کی حیات دوام کے طالب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم حق تعالیٰ کی طاعت میں مشغول ہیں۔ اس کے برعکس عشق حق کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔ عاشقان حق تعمیل احکام کو تعمیل محبوب سمجھتے ہیں اور ہر غیر چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی

موضوع پر کچھ اور باب اخلاص میں بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ عزوجل

ابو اسحاق ابراہیم بن ادھم بن منصور رحمۃ اللہ علیہ

امیر امراء، سالک طریق لقا ابو اسحاق ابراہیم بن ادھم رضی اللہ عنہ اپنے طریق میں یگانہ روزگار تھے اور اپنے ہم عصروں کے سردار، حضرت خضر علیہ السلام کے مرید تھے۔ کئی متقدمین سے ملاقات کی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملے اور ان سے علم حاصل کیا۔ ابتدا میں بلخ کے حکمران تھے۔ ایک روز شکار کھیلتے ہوئے ایک ہرن کے تعاقب میں لشکر سے دور نکل گئے۔ خدا نے ہرن کو زبان دی اور اس نے ابراہیم کو مخاطب کر کے کہا "کیا تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے، تمہیں یہ کچھ کرنے کا حکم ملا ہے؟" ابراہیم نے توبہ کی ہر طرف سے منہ پھیر لیا اور زہد و اتقاء کا راستہ اختیار کیا۔ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے ملے۔ ایک عرصہ ان کی مصاحبت میں رہے اور باقی ماندہ تمام عمر اپنی محنت سے کما کر روزی کھائی۔ طریقت میں ان کے اقوال بدیع اور لطائف نفیس مشہور ہیں بقول حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ: "ابراہیم تمام علوم کی چابی ہیں۔" آپ کا قول ہے: "خدا کی دوستی کا دامن پکڑو باقی ہر چیز سے منہ موڑو۔"

جب کوئی آدمی خلوص دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے وہ باقی تمام دنیا سے منہ پھیر لیتا ہے۔ کیونکہ دنیا اور اہل دنیا کا خدا کی محبت میں کوئی دخل نہیں۔ قرب خداوندی کی اصل یہ ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں محض خلوص اور بندگی ہو۔ عشق حق خواہشات نفسانی سے بیزار ہو کر حاصل ہوتا ہے جو نفسانی خواہشات کا شکار ہو وہ قرب حق سے محروم ہوتا ہے اور جو خواہشات سے بیزار ہو وہ اپنے خالق سے قریب تر ہوتا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تمام بنی نوع انسان کا خلاصہ ہے۔ اپنی ذات سے روگرداں ہونا نوع انسان سے روگرداں ہونے کے برابر ہے مگر خلقت سے منہ پھیر کر اپنی ذات میں منہمک ہو جانا ظلم ہے کیونکہ خلقت جس حال میں ہے تقدیر الٰہی سے ہے اور تیرا معاملہ تیرے ساتھ ہے۔ طالب حق کے ظاہر و باطن کی استقامت دو چیزوں پر ہے: شناخت یعنی علم پر اور عمل پر۔ از روئے علم ہر

خیر وشر میں تقدیر خداوندی کارفرما نظر آتی ہے۔ کیونکہ کوئی چیز ساکن یا متحرک نہیں ہوتی جب تک وہ سکون وحرکت روبہ کار نہ ہو جو باری تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ عمل تعمیل احکام خداوندی کا دوسرا نام ہے اور صحت معاملات اور حفظ تکلیف میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ تقدیر خداوندی نافرمانی کے لئے دلیل نہیں ہوسکتی۔ جب تک انسان اپنی ذات سے روگرداں نہ ہو خلق سے روگردانی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جب انسان اپنی ذات سے روگرداں ہو جائے تو وجود خلق اپنی جگہ خالق کی مصلحت کی تکمیل کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ جب سالک ذات حق کی طرف مشغول ہوتا ہے تو اس کا اپنا وجود تکمیل رضائے خداوندی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اگر بجز ذات خدا کسی چیز سے رغبت ہے تو اپنی ذات سے نہیں بلکہ کسی غیر سے ہونی چاہئے کیونکہ رغبت غیر رویت توحید ہے اور اپنی ذات کے ساتھ رغبت خالق اکبر کی تردید برملا ہے محل نظر شیخ ابوالحسن سالبہ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا اپنی ذات کے تابع فرمان ہونے سے یہ بہتر ہے کہ انسانی بلی کا تابع فرمان ہو جائے۔ غیر کی مصاحبت برائے خدا ہوتی ہے اپنی ذات کی مصاحبت صرف نفس پروری کے لئے کی جاتی ہے۔ اسی موضوع پر اس کتاب میں مناسب مقام پر کچھ اور بھی لکھا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز

حکایات میں ہے کہ ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ ایک صحرا میں جا رہے تھے کہ کسی بوڑھے سے ملاقات ہوئی اس نے کہا: ''اے ابراہیم! تجھے معلوم ہے یہ کیا جگہ ہے؟ بغیر زاد راہ سفر کر رہا ہے۔'' ابراہیم نے محسوس کیا کہ وہ ابلیس سے دوچار ہیں۔ ان کی جیب میں چار درہم تھے جو کوفہ میں اپنی زنبیل فروخت کر کے حاصل کئے تھے فوراً نکال کر پھینک دیئے اور عہد کیا کہ ہر میل کی مسافت کے بعد چار سو نفل ادا کریں گے۔ چار سال صحرا نوردی میں گزر گئے ہر روز وقت پر روزی ملتی رہی۔ اسی دوران حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ان سے اسم اعظم سیکھا اور اس کے بعد ان کا کلیتہً خیال غیر اللہ سے تہی ہو گیا۔ ان کے مناقب بیشمار ہیں۔ وباللہ التوفیق کلہ

بشر بن حارث حافی رحمۃ اللہ علیہ

سر یر معرفت، تاج اہل معاملت بشر بن حارث رضی اللہ عنہ مشاہدہ میں بڑی شان کے مالک اور معاملت میں بڑے صاحب کمال تھے۔ فضیل کا فیض مصاحبت پایا تھا اپنے خالو علی بن خشرم کے مرید تھے۔ اصول وفروغ کے عالم جید تھے۔ ان کی ابتدائے توبہ یوں ہوئی کہ عالم مستی میں کہیں جارہے تھے راستے میں ایک پرزۂ کاغذ زمین پر پڑا ہوا نظر آیا تعظیماً اسے اٹھایا۔ کاغذ پر بسم اللہ شریف لکھی ہوئی تھی۔ بشر رضی اللہ عنہ نے اس پرزۂ کاغذ پر عطر لگایا اور کسی پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اسی رات ہاتف غیب نے خواب میں کہا: طیبت إسمی فبعزتی لأطیبن إسمک فی الدنیا و الأخرۃ "خدا کے نام کو خوشبو لگانے والے! خدا نے تیرے نام کو دنیا اور عاقبت میں خوشبودار کیا۔" یہ خواب دیکھنے کے بعد بشر رضی اللہ عنہ نے توبہ کی اور زہد اختیار کیا۔ مشاہدہ حق نے غلبہ کیا تو ننگے پاؤں پھرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا زمین حق تعالیٰ کا فرش ہے اور میں نہیں چاہتا کہ جب چلوں تو میرے پاؤں اور حق تعالیٰ کے فرش کے درمیان کوئی چیز حائل ہو یہ ان کی معاملت کا عجیب وغریب پہلو ہے۔ ان کی نظر میں جوتا بھی اک حجاب تھا۔

روایت ہے کہ بشر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "جو شخص دنیا کی عزت اور عاقبت کی سرفرازی کا طالب ہے اس کے لئے یہ تین چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ غیر سے انعام کی ہوس نہ رکھے۔

۲۔ کسی کو برا نہ کہے۔

۳۔ کسی کی دعوت طعام قبول نہ کرے۔

سالک کبھی غیر اللہ کو منعم نہیں سمجھتا۔ منعم حقیقی خدا کی ذات پاک ہے۔ اپنے ہم جنسوں سے مانگنا ظلم ہے اسی طرح جو کسی کی برائی کرتا ہے دراصل خدا پر نکتہ چینی کرتا ہے کیونکہ ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ مخلوق کی عیب جوئی دراصل خالق کی عیب جوئی ہے۔ بجز کفار کے جن کو بحکم خداوندی برا کہا جاتا ہے۔ دعوت طعام سے پرہیز کا مقصد یہ ہے کہ رزاق مطلق باری تعالیٰ کی

ذات پاک ہے اگر کوئی بندہ روزی کا سبب بنے تو اس پر نہیں بلکہ رازق مطلق پر نظر ہونی چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ بھی وہ پیش کر رہا ہے وہ باری تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اگر دعوت طعام دینے والا یہ سمجھتا ہو کہ پیش کردہ طعام اس کا اپنا ہے اور وہ ازراہ احسان پیش کر رہا ہے تو قبول نہیں کرنا چاہئے کیونکہ روزی میں کسی کا احسان نہیں اور اہل سنت کے نزدیک روزی غذا ہے اور غذا صرف خدائے عزوجل کی عطا ہے اس کے برعکس معتزلہ سمجھتے ہیں کہ روزی ملکیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قول کا مطلب مجازاً کچھ اور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

فلک معرفت، ملک محبت ابو یزید طیفور بسطامی مشائخ کبار میں بہت بلند مقام رکھتے تھے حال میں اتنے رفیع اور شان میں اتنے بلند تھے کہ جنید نے فرمایا، ''ابو یزید ہمارے اندر وہ مقام رکھتے ہیں جو حضرت جبرئیل فرشتوں میں۔'' مجوسی قوم سے تھے اور ان کے والد بسطام کے ایک بزرگ تھے۔ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ان کی روایات بہت بلند اور قابل قدر ہیں۔ وہ اہل طریقت کے دس اماموں میں ایک تھے۔ ان سے قبل اس علم میں کسی کو اتنا تبحر نصیب نہیں ہوا۔ تمام احوال میں محبّ علم اور معظم شریعت تھے۔ گو کچھ لوگوں نے اپنے الحاد کی بناء پر بعض بے کار تعلیمات آپ سے منسوب کر دی ہیں۔ آپ کا قول ہے: ''میں نے تیس سال تک مجاہدہ کیا۔ علم اور اس کی متابعت سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں دیکھی۔ اگر علماء میں اختلاف نہ ہوتا تو میں کچھ بھی نہ کر سکتا۔ اختلاف علماء ایک رحمت ہے، بجز توحید و تجرید کے۔'' درحقیقت طبع انسانی مائل بہ جہالت ہوتی ہے اور بے علم بہت سے کام جہالت کے باعث بلا تکلف کر گزرتا ہے۔ صاحب علم کوئی چیز بے تکلف نہیں کر پاتا۔ شریعت کی راہ پل صراط سے زیادہ باریک و پرخطر ہے۔ سالک کے لئے ضروری ہے ہر حالت میں ایسی روش پر چلے کہ اگر اعلیٰ مقامات اور رفیع احوال میسر نہ آئیں اور وہ گرے تو دائرہ شریعت میں گرے۔ ہر چیز چھن جائے تو کم از کم شرعی اعمال اس سے نہ چھوٹیں کیونکہ شریعت کے احکام پر عمل چھوڑ دینا مرید کے لئے سب سے بڑا نقصان ہے۔ حالانکہ شریعت پر عامل

ہونے کا دعویٰ بے حقیقت ہوتا ہے اور دعویٰ کرنے والے کے بیان کی قلعی کھل جاتی ہے۔

آپ ہی نے فرمایا، اہل محبت کے نزدیک (خدا کی محبت کے مقابلے میں) بہشت کی کوئی اہمیت نہیں۔ محبت کے مدعی محبت کے پردوں میں محجوب ہوتے ہیں۔ بہشت اگرچہ بہت بڑی چیز ہے مگر مخلوق ہے اور خدا کی محبت خدا کی صفت نامخلوق ہے۔ جو کوئی نامخلوق (محبت خدا) کی بجائے مخلوق (بہشت) کی محبت میں گرفتار رہا اس نے اپنی اہمیت کھو دی۔ مخلوق دوستان حق کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دوستوں کیلئے دوستی ہی حجاب ہوتی ہے کیونکہ دوستی کے وجود سے خدا اور اپنے درمیان (دوئی) کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور دوئی توحید کے خلاف ہے۔ محبت کی راہ توحید سے توحید کی طرف ہوتی ہے۔ محبت کی راہ میں محبت ہی آفت اور بلا بن جاتی ہے۔ محبت میں مرید اور مراد کی ضرورت ہوتی ہے یا خدا مرید اور بندہ مراد ہو یا خدا مراد اور بندہ مرید ہو۔ اگر خدا مرید اور بندہ مراد ہو تو خدا کی نظر میں بندے کی ہستی ثابت ہو گئی اور اگر بندہ مرید ہو اور مراد طلب و ارادت خدا ہو تو آدمی کی اپنی ہستی سد راہ بن جاتی ہے پس محبّ (آدمی) کا محبوب کے لئے فنا ہونا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ محبت کیلئے فنا ہو۔

کہتے ہیں ابا یزید خانہ کعبہ گئے۔ ایک خالی گھر دیکھا۔ سوچا میرا حج نہیں ہوا کیونکہ ایسے پتھر تو میں بہت دیکھ چکا ہوں۔ دوسری بار گئے تو گھر بھی دیکھا اور گھر کے مالک کو بھی دیکھا۔ یہی سوچا کہ میرا حج نہیں ہوا کیونکہ یہ حقیقت توحید کے خلاف ہے۔ تیسری بار پھر گئے۔ صرف گھر کے مالک کو دیکھا گھر غائب تھا۔ دل نے آواز دی: ''اے ابو یزید! اگر اپنے آپ کو نہ دیکھتے تو مشرک نہ ہوتے چاہے سارے عالم پر تمہاری نظر ہوتی۔ تم مشرک ہو۔ کیونکہ تمہاری نظر اپنی ذات پر ہے گو سارے عالم کو نظر انداز کر رکھا ہے۔'' ابو یزید فرماتے ہیں: میں نے توبہ کی۔ توبہ سے بھی توبہ کی اور پھر اپنی ذات کو دیکھنے سے توبہ کی۔ یہ چیز ابو یزید کی صحت حال سے متعلق ایک لطیف نکتہ ہے اور صاحبان حال کے لئے ایک عمدہ دلیل۔

ابو عبد اللہ حارث بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ

ابو عبد اللہ، اصول و فروع کے عالم تھے اور اپنے زمانے میں اہل علم کے لئے مرجع

خاص تھے۔ اصول تصوف پر ان کی مشہور کتاب ''رغائب'' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ہر فن میں عالی حال اور بزرگ ہمت تھے۔ بغداد کے شیخ المشائخ تھے۔ ان کا قول ہے، **العلم بحركات القلوب في مطالعة الغيوب أشرف من العمل بحركات الجوارح** ''مطالعہ غیوب کے معاملے میں حرکات دل کا علم ہاتھ پاؤں کے عمل سے بہتر ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ علم محل کمال ہے اور جہل محل طلب۔ خدا کے ہاں علم جہالت سے بدرجہا بہتر ہے۔ علم انسان کو درجہ کمال پر پہنچاتا ہے اور جہل آستان کی باریابی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ علم کا مقام عمل سے بھی بلند تر ہے۔ کیونکہ خداوند عزوجل کو صرف علم سے پہچان سکتے ہیں۔ محض عمل سے نہیں پا سکتے۔ اگر عمل بدون علم کارگر ہوتا تو عیسائی اور رہبانیت کے علم بردار شدت مجاہدہ سے مقام مشاہدہ حاصل کر لیتے اور عاصی ایمان دار مبتلائے مغائبہ رہتے عمل بندہ کی صفت ہے اور علم خدا کی۔

بعض راویوں کو مغالطہ ہوا ہے وہ دونوں جگہ عمل پڑھتے ہیں: **العمل بحركات القلوب أشرف من العمل بحركات الجوارح** یہ محال ہے۔ عمل انسانی حرکات دل سے عبارت نہیں ہوتا۔ اگر مراد فکر و مراقبہ باطن سے ہے تو یہ کوئی جدت نہیں کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: **تفكر ساعة خير من عبادة سنة**(1) ''ایک لمحہ فکر یہ برسوں کی بندگی سے بہتر ہے۔'' فی الحقیقت روحانی عمل جسمانی عمل سے بلند تر ہوتا ہے اور اندرونی احساسات و اعمال کا اثر بیرونی اعمال سے کہیں زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے: **نوم العالم عبادة وسهر الجاهل معصية** ''صاحب دل کے قلب پر خدا کی حکمرانی ہوتی ہے چاہے وہ سو رہا ہو چاہے بیدار ہو اور جب دل محکوم حق ہو تو جسم از خود محکوم ہوتا ہے۔ غلبہ حق سے مغلوب دل حرکات ظاہر پر غالب نفس سے بہتر ہے''۔

مشہور ہے کہ آپ نے ایک درویش سے کہا کن للّٰہ والا فلا تکن ''یا خدا کا ہو کر رہ یا کچھ بھی نہ رہ'' یعنی یا باقی بالحق ہو یا اپنی ذات سے فنا ہو جا۔ یا صفوت سے جمعیت خاطر

1۔ الفوائد المجموعہ

حاصل کر یا فقر میں پرگندہ ہو جا۔ یا اس بات کا اہل بن کر رہ کہ باری تعالیٰ نے فرمایا، اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (البقرہ:34) ''اے فرشتو! آدم کو سجدہ کرو۔'' یا اس روش پر جی کہ باری تعالیٰ نے فرمایا، هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْــٴًـا مَّذْكُوْرًا۝۱ (الدہر) ''کیا انسان پر ایسا وقت نہیں گزرا جب وہ کسی قابل بھی نہیں تھا۔'' اگر برضا و رغبت اپنے آپ کو سپرد خدا کر دے تو روز قیامت تیرا حشر تیرے اپنے ہاتھ ہوگا ورنہ حاکم حشر کے ہاتھ۔ یہ نکتہ بہت نازک ہے۔ واللہ اعلم

ابوسلیمان داؤد بن نصیر طائی رحمۃ اللہ علیہ

مشائخ کبار اور اہل تصوف کے سرداروں میں سے تھے۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور طریقت میں حبیب راعی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ فضیل اور ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کے ہم عصر تھے۔ ہر علم وفن کے ماہر اور فقہ میں فقیہ الفقہاء تھے مگر گوشہ نشینی اختیار کی اور مال و دولت سے روگرداں ہو کر زہد و تقویٰ کا دامن تھام لیا۔ کہتے ہیں۔ آپ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا۔ إن اردت ألسلامة سلم علی الدنیا وإن اردت الکرامة کبر علی الآخرة ''خیریت درکار ہے تو دنیا کو خیر باد کہو۔ کرامت کی ضرورت ہے تو عقبیٰ سے دست بردار ہو جاؤ۔'' یہ دونوں مقامات حجاب ہیں۔ ہر فراغت کا راز اسی قول میں مضمر ہے۔ جسمانی راحت دنیا سے روگرداں ہونے میں ہے اور دل کا سکون عقبیٰ کی ہوس سے ہاتھ دھو لینے میں ہے۔ مشہور ہے کہ محمد بن حسن سے بے تکلف ملتے تھے مگر ابو یوسف قاضی سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا محمد بن حسن مال و دولت میں کھیلتا تھا اس نے علم دین حاصل کیا اور اس علم کی بدولت اس کی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ابو یوسف فقیر تھا۔ علم حاصل کیا اور اس کے طفیل جاہ و مرتبہ پایا۔

معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''میں نے داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر دنیا سے بیزار کسی کو نہیں پایا دنیا اور اہل دنیا ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ ان کو فقراء سے شکستہ

حالی کے باوجود بڑی ارادت تھی۔" داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب بے شمار ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ابوالحسن سری بن مغلس سقطی رحمۃ اللہ علیہ

جنید کے ماموں تھے۔ تمام علوم میں آپ کامل تھے اور تصوف میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ مقامات کے تعین اور باطنی احوال کی وسعت پر غور کرنے والوں میں آپ متقدمین میں شمار ہوتے تھے۔ عراق کے بہت سے مشائخ کبار آپ کے مرید تھے۔ انہوں نے حبیب راعی سے ملاقات کی اور ان کے مصاحب بھی رہے۔ معروف کرخی کے مرید تھے۔ بغداد کے بازار میں خوانچہ فروشی کا کام کرتے۔ کہتے ہیں: ایک بار بازار میں آگ لگ گئی لوگوں نے آکر اطلاع دی کہ آپ کی دکان بھی نذر آتش ہوگئی۔ فرمایا" خوب ہوا مجھے اس بار سے بھی نجات ملی۔" بعد میں معلوم ہوا کہ بازار جل کر راکھ ہوگیا ہے مگر آپ کی دکان محفوظ ہے۔ آپ نے تمام سامان غرباء میں تقسیم کر دیا اور خود درویشی اختیار کر لی۔ کسی نے پوچھا آپ کی طبیعت میں انقلاب کا آغاز کیسے ہوا؟ فرمایا" حبیب راعی ایک دن میری دکان کے سامنے سے گذرے میں نے ایک ٹکڑا روٹی کا ان کو دیا اور کہا کسی غریب کو دے دیں۔ انہوں نے کہا" خدا تمہیں اس کا اجر دے۔" اس دن کے بعد میرے دل میں دنیوی کاروبار کی فلاح اور بہبود کی کوئی آرزو نہ رہی۔

آپ کا قول ہے: اللهم مهما بنی بشیء فلا تعذبنی بذل الحجاب" اے خدا! جو عذاب بھی دے مجھے گوارا ہے مگر حجاب کے عذاب میں مبتلا نہ کرنا" کیونکہ حجاب نہیں تو ہر عذاب کو برداشت کرنا تیرے ذکر اور مشاہدہ سے آسان ہے اور اگر حجاب ہے تو تیرا کرم بھی عذاب سے کم نہیں جہنم کے عذاب کا شدید ترین پہلو یہی ہے کہ اہل جہنم دیدار خداوندی سے محروم ہوں گے اگر دیدار نصیب ہو تو اہل جہنم کبھی بہشت کی تمنا نہ کریں کیونکہ لذت دید شدت عذاب کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح بہشت کی کوئی مسرت کشف سے بڑھ کر دل نشین نہیں۔ ہزار در ہزار مسرت کے باوجود اگر رویت باری تعالیٰ نہ ہو تو اہل بہشت کے دل

ٹوٹ جائیں۔ یہ رسم خداوندی ہے کہ اس کے دوست اس کی جھلک کو دیکھتے ہیں اور ہر مصیبت کو برداشت کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لب پر یہی دعا ہوتی ہے: ''ہر عذاب تیرے حجاب کے مقابلے میں قبول ہے اگر تو سامنے ہے تو کسی مصیبت کا خوف نہیں۔'' واللہ اعلم بالصواب

ابو علی شفیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ

علوم شریعت، معاملت اور حقیقت کے ماہر تھے۔ تصوف کے کئی پہلوؤں پر ان کی تصانیف ہیں۔ ابراہیم ادھم اور کئی دیگر مشائخ کبار سے مصاحبت رکھتے تھے۔ آپ کا قول ہے: **جعل الله أهل طاعته أحيا في مماتهم وأهل المعاصي أمواتا في حياتهم** ''اہل طاعت مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور گناہگار زندگی میں بھی مردہ ہوتے ہیں۔'' طاعت گزار بعد از مرگ بھی زندہ ہوتے ہیں کیونکہ فرشتے ان پر حشر تک آفرین کہتے ہیں اور حشر میں بھی ان کو حیات جاوید کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ فنا ہو کر وہ دائمی جزا کے ساتھ زندہ و باقی رہتے ہیں۔

ایک مرد پیر آپ کے سامنے پیش ہوا اور عرض کی کہ میں بہت گنہ گار ہوں اور توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا تم بہت دیر سے آئے ہو۔ مرد پیر نے کہا یہ درست نہیں موت سے پہلے آ گیا ہوں ایسی کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی۔

کہتے ہیں آپ کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک سال بلخ میں سخت قحط پڑا۔ لوگ ایک دوسرے کو کھا رہے تھے اس عالم مصیبت و ابتلاء میں شقیق نے دیکھا کہ ایک نوجوان سر بازار ناچ کود رہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: ''تم کیوں ناچ رہے ہو؟ تمام خلقت مصیبت میں مبتلا ہے۔ تمہیں اپنی روش پر شرم آنی چاہئے۔'' نوجوان نے جواب دیا: ''مجھے کوئی غم نہیں۔ میرا مالک ایک پورے گاؤں کا مالک ہے اور وہ میری روزی کا کفیل ہے۔'' شقیق نے چلا کر کہا: ''خدایا! یہ نوجوان اس بات پر نازاں ہے کہ اس کا مالک پورے گاؤں کا مالک ہے تو تو شاہوں کا شہنشاہ ہے اور روزی کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ پھر ہم بدنصیب کیوں اپنے آپ

کورنج ومصیبت میں مبتلا سمجھتے ہیں۔" آپ نے راہ حقیقت اختیار کی اور اس کے بعد اپنی روزی کیلئے فکرمند نہ ہوئے آپ کہا کرتے تھے:"میں اس نوجوان کا مرید ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی سیکھا اسی سے سیکھا۔" یہ آپ کا انکسار تھا۔

ابوسلیمان بن عبدالرحمٰن بن عطیہ دارانی رحمۃ اللہ علیہ

اہل تصوف آپ کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ارادت سے "ریحان دل" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ آپ ریاضت ومجاہدہ میں بہت مشہور تھے۔ علم وقت اور معرفت آفات کے ماہر تھے اور ان کی مخفی کمین گاہوں پر نگاہ غائر رکھتے تھے۔ طاعت اور حفظ قلب واعضاء پر ان کے لطیف ارشادات ہیں۔ آپ کا قول ہے: اذا غلب الرجاء علی الخوف فسد الوقت "جب امید خوف پر غالب ہو تو وقت پراگندہ ہو جاتا ہے۔" کیونکہ وقت کا مقصد استقامت حال ہے اور استقامت برقرار رہتی ہے جب تک خوف برقرار ہو۔ اس کے برعکس اگر خوف امید پر غالب ہو تو نقصان توحید ہے کیونکہ غلبہ خوف ناامیدی کی علامت ہے اور باری تعالیٰ سے ناامیدی شرک ہے۔ الغرض توحید کا اثبات امید سے ہے اور وقت کا خوف سے۔ دونوں قائم رہتے ہیں جب خوف اور امید کا توازن قائم ہو۔ اثبات توحید مومن بناتی ہے اور اثبات وقت پرہیزگار۔ امید کی بنیاد مشاہدہ پر ہے اور اعتقاد راسخ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خوف کلیتہً مجاہدہ سے متعلق ہوتا ہے جو اضطراب سے خالی نہیں۔ مشاہدہ بھی مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر ہر امید ناامیدی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے اعمال میں بہبودی مستقبل سے ناامید ہو جاتا ہے تو اس کی ناامیدی راہ نجات کی مشعل بن جاتی ہے اور وہ بہبودی اور لطف خداوندی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ مسرتوں کے دروازے وا جاتے ہیں۔ خواہشات نفسانی ناپید ہو جاتی ہیں اور وہ انوار حقیقت سے روشناس ہو جاتا ہے۔

احمد بن ابی الحواری کہتے ہیں ایک رات مجھے خلوت میں نماز ادا کرتے ہوئے بیحد لذت محسوس ہوئی دوسرے دن ابوسلیمان سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا "بہت کمزور انسان ہو خلوت میں کچھ اور جلوت میں کچھ اور۔" کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو بندے اور خدا

کے درمیان حائل ہو سکے۔ دلہن کا پردہ اٹھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سب اس کو دیکھ لیں اور اس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہو۔ دلہن کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کی نظر بجز دولہا کے کسی اور کی طرف اٹھے۔ کیونکہ رویت غیر اس کے لئے ذلت کا باعث ہے۔ اگر زاہد کی شان پر سارے عالم کی نظر ہو تو حرج نہیں۔ لیکن وہ خود اپنی شان کو دیکھنے میں منہمک ہو جائے تو بھٹک جاتا ہے۔

ابو محفوظ معروف بن فیروز کرخی رحمۃ اللہ علیہ

کبار قدمائے مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ حلیمی طبع اور خلوص اطاعت کے لئے مشہور ہیں ترتیب کے لحاظ سے ان کا ذکر پہلے آنا چاہئے تھا مگر میں نے دو بزرگوں کی پیروی کی ہے جو مجھ سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ ان میں ایک صاحب نقل ہیں دوسرے صاحب تصرف یعنی شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی اور استاد امام ابو القاسم قشیری نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اسی ترتیب سے ذکر کیا ہے میں نے بھی اسی کا اتباع کیا۔ معروف سری سقطی کے استاد اور داؤد طائی رحمہم اللہ کے مرید تھے۔

ابتدا میں معروف غیر مسلم تھے۔ علی بن موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور ان کی نظر میں بڑی قدر و منزلت پائی۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: للفتیان ثلاث علامات، وفاء بلا خلاف، و مدح بلا جود و عطاء بلا سوال

"جوانمردی کے تین نشانات ہیں:

۱۔ وفائے بے خلاف، ۲۔ تعریف بے عطا، ۳۔ عطائے بے سوال

وفائے بے خلاف یہ ہے کہ عبودیت میں خلاف دوی اور کج روی اپنی ذات پر حرام سمجھی جائے۔ تعریف بے عطا یہ ہے کہ جس نے کوئی نیک سلوک نہ بھی کیا ہو اسے بھی نیکی سے یاد کیا جائے۔ عطائے بے سوال یہ ہے کہ جب عطا کی توفیق ہو تو تفریق نہ کرے اور کسی کا حال معلوم ہو تو اسے تکلیف سوال نہ دے یہ خلقت میں اخلاق باہمی کا طریق کار ہے تمام مخلوق میں یہ صفات مستعار ہیں۔ حقیقتاً خدائی صفات ہیں۔ خدائے عزوجل اپنے دوستوں

کے حق میں وفا میں خلاف نہیں کرتا چاہے بندے خلاف کرتے چلے جائیں۔ اس کے لطف و کرم میں کمی نہیں آتی۔ اس کی وفا یہ تھی کہ ازل کے دن انسان کو بغیر کسی خوبی کے نوازا اور وہ آج بھی اس کی بے راہ روی کے باوجود اس پر عتاب نہیں کرتا۔ تعریف بے عطا بھی صرف اسی کی صفت ہے کیونکہ وہ بندوں کے افعال سے بے نیاز ہے اور انسان کی تھوڑی سی نیک کرداری پر بھی اس کی تعریف کرتا ہے عطائے بے سوال اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ وہ کریم ہے۔ سب کا حال جانتا ہے اور سب کی مراد بغیر مانگے پوری کر دیتا ہے۔ جب باری تعالیٰ کسی کو توفیق عطا کرتا ہے اور اپنے انعامات سے اس کو عزت و سرفرازی دیتا ہے تو اس کے معاملات کو ان تینوں چیزوں سے آراستہ کر دیتا ہے اور انسان بجائے خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بقدر ہمت وہی سلوک روا رکھتا ہے۔ اس عالم میں وہ جوانمرد ہے اور جوانمردی میں ناموری کا مستحق ہے۔ یہ تینوں صفات حضرت ابراہیم اور پیغمبر ﷺ میں موجود تھیں اس کا ذکر مناسب جگہ پر ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

ابو عبدالرحمٰن بن علوان اصم رحمۃ اللہ علیہ

بلخ کے عظیم صاحبان اقبال اور خراسان کے قدیم مشائخ کبار میں سے تھے۔ شقیق رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور احمد بن خضرویہ کے استاد تھے۔ اوائل سے اواخر عمر تک ہر حال میں صدق پر ثابت قدم رہے۔ جنید نے فرمایا "حاتم اصم ہمارے زمانے کے صدیق ہیں۔" آپ کا کلام بلند پایہ ہے جس میں آفات نفس اور رعونت طبع کی تشخیص کے دقائق اور معاملات کی روایات مذکور ہیں آپ کا قول ہے: **الشهوة ثلاثة، شهوة فى الأكل و شهوة فى الكلام، و شهوة فى النظر فاحفظ الأكل بالثقة و اللسان بالصدق والنظر بالعبرة**

شہوت کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ شہوت طعام، ۲۔ شہوت کلام، ۳۔ شہوت نظر

طعام کی نگہداشت کرو اعتماد خداوندی سے، کلام کی صداقت سے اور نظر کی عبرت

سے‘‘۔ توکل شہوت طعام سے محفوظ رکھتا ہے۔ سچ بولنا شہوت کلام سے اور درست نظری شہوت نظر سے۔ توکل کی بنیاد علم کی درستی پر ہے جن کو اپنے خالق کا صحیح علم ہے وہ جانتے ہیں کہ روزی رساں صرف اسی کی ذات پاک ہے۔ وہ صحیح علم سے بولتے اور دیکھتے ہیں۔ ان کی خورد و نوش محبت، ان کا کلام وجد آور اور ان کی دید مشاہدہ حق ہوتا ہے۔ صحیح علم کی بناء پر وہ صرف حلال کھاتے ہیں۔ بولتے ہیں تو اس کی توصیف کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں تو اسی کو دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے وہی چیز حلال ہے جو وہ عطا کرے اور اس کے کھانے کی اجازت دے۔ وہی تعریف قابل اظہار ہے جو اٹھارہ ہزار عالم میں صرف اس کے لئے ہو۔ فقط وہی چیز قابل قدر ہے جو اس کی شان اور اس کے جبروت کی حامل ہو۔ جب اس سے لے کر اس کی اجازت سے کھایا جائے تو شہوت نہیں۔ جب اس کا ذکر اسی کی اجازت سے ہو تو شہوت نہیں۔ جب اس کی قدرت کو اس کی اجازت سے دیکھا جائے تو شہوت نہیں۔ اپنی خواہش سے کھانا شہوت ہے چاہے اکل حلال ہو۔ خواہش نفسانی پر مبنی گفتگو شہوت ہے چاہے ذکر الٰہی ہو۔ خواہش نفسانی سے لبریز نظر شہوت اور وبال ہے چاہے اس کے لئے استدلال موجود ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے وقت کے بزرگوں میں سے تھے اور تمام علوم میں یگانہ روزگار تھے۔ جوانمردی اور پرہیزگاری میں آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ کے قیام تک امام مالک کے شاگرد تھے عراق میں آ کر محمد بن حسن سے فیض یاب ہوئے۔ آپ ہمیشہ گوشہ نشینی کی طرف مائل رہتے تھے۔ تحقیق تصوف کا شوق تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ متعدد پیروکار آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں احمد بن حنبل بھی تھے۔ بعد ازاں طبیعت مقام طلبی اور امامت کی طرف مائل ہوئی اور آپ نے گوشہ نشینی کا خیال ترک کر دیا ہر حال میں ستودہ خصال تھے۔ ابتداً ہیں صوفیائے کرام سے پرخاش تھی مگر جب سلیمان رائی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی اور تقرب حاصل ہوا تو طبیعت بدل گئی اور اس کے بعد جہاں کہیں بھی گئے تلاش حقیقت میں

مصروف رہے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اذا رأیت العالم یشتغل بالرخص فلیس یجیئ منه شیء "جب کوئی عالم دین میں آسان طلبی کا شائق ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دامن میں کچھ بھی نہیں۔" عالم خلق کے پیشرو ہوتے ہیں۔ یہ جائز نہیں کہ کوئی اپنا قدم ان سے آگے رکھے خواہ کسی مطلب سے ہو۔ راہ حق پر گامزن ہونے کے لئے نہایت درجہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ رخصت و تاویل وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں حقیقت سے روگردانی منظور ہوتی ہے اور وہ اختصار و سہولت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ رخصت ایک عامیانہ روش ہے اور صرف دائرہ شریعت کے اندر رہنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ مجاہدہ خواص کا شیوہ ہے اور وہ اس کے ثمر کی لذت اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ علماء خواص میں شامل ہیں اور خواص عامیانہ روش اختیار کر لیں تو ان سے کسی چیز کی توقع بے کار ہے۔ علاوہ ازیں رخصت احکام خداوندی سے متعلق سبک سری کے برابر ہے اور دوست حکم دوست کی طرف سے سبک سر نہیں ہو سکتا۔

ایک شیخ طریقت نے بیان کیا ہے کہ ایک رات اسے پیغمبر ﷺ خواب میں نظر آئے شیخ نے کہا "حضور ﷺ آپ کی ایک حدیث ہے کہ روئے زمین پر مختلف درجات کے نیک لوگ ہیں: اوتاد، اولیاء، ابرار، حضور ﷺ نے فرمایا: "میری حدیث صحیح روایت ہوئی ہے۔" شیخ نے عرض کی: "یا رسول اللہ ﷺ میں کسی ایک کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "محمد بن ادریس کو دیکھو۔"

اس کے علاوہ بھی آپ کے بہت سے مناقب ہیں۔

ابو عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

ورع اور تقویٰ آپ کی خصوصیت تھی۔ حدیث پیغمبر ﷺ کے حافظ تھے۔ اہل طریقت کا ہر طبقہ آپ کو واجب التکریم سمجھتا ہے کئی مشائخ کبار سے مصاحبت کی۔ ذوالنون مصری، بشر حافی، سری سقطی، معروف کرخی رضی اللہ عنہم وغیرہم۔ کرامات ظاہر اور فراست صحیح کے مالک تھے۔ آج کل کچھ لوگ مشبہین کی تعلیمات آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں

یہ سراسر افترا پردازی ہے اور من گھڑت باتوں پر مبنی ہے۔ آپ ان سب سے بری ہیں۔ اصول دین میں آپ کے اعتقادات جملہ علماء کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔

جب بغداد میں معتزلہ کا زور ہوا تو انہوں نے امام احمد حنبل رضی اللہ عنہ کو ایذا پہنچانے کا ارادہ کیا۔ آپ سے کہا گیا کہ قرآن کو مخلوق کہیں۔ آپ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ آپ کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ ظالموں نے ہزار کوڑا مارا مگر آپ نے قرآن کو مخلوق نہ کہا۔ اسی عالم میں آپ کا ازار بند کھل گیا۔ آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ دست غیب نے مدد کی۔ ازار بند از خود بندھ گیا۔ یہ کرامت دیکھ کر ایذا پسندوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور تھوڑے ہی عرصے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ موت سے کچھ دیر پہلے لوگ حاضر خدمت ہوئے اور پوچھا کیا فرماتے ہیں، آپ ان ظالموں کے حق میں جنہوں نے آپ کو زدوکوب کیا۔ فرمایا کچھ نہیں۔ ان لوگوں نے مجھے خدا کی راہ میں مارا ہے اور یہ سمجھ کر مارا ہے کہ وہ سچے ہیں اور میں جھوٹا ہوں۔ میں کسی ایک زخم کے لئے بھی قیامت کے دن ان سے مخاصمت نہیں کروں گا۔ معاملات میں ان کے اقوال بڑے بیش قیمت ہیں۔ جب کسی مسئلہ پر آپ سے سوال کیا جاتا اور موضوع سوال معاملت ہوتا تو خود جواب دیتے۔ اگر حقیقت ہوتا تو فرما دیتے بشر حافی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرو۔ چنانچہ کسی نے پوچھا: مالإخلاص "اخلاص کیا ہے؟" فرمایا: الخلاص من آفات الأعمال "اخلاص یہ ہے کہ آفت اعمال سے نجات حاصل ہو۔" یعنی ہر عمل ریا، مکر، فریب اور غرض پرستی سے معرا ہو۔ پھر پوچھا: ما التوکل "توکل کسے کہتے ہیں؟" فرمایا: الثقة باللّٰہ "ایمان کی روزی باری تعالیٰ پہنچانے والا ہے۔" پھر پوچھا ما الرضاء "رضا کیا ہے؟" فرمایا: تسلیم الأمور إلی اللّٰہ "اپنے تمام امور کو سپرد خدا کرنا۔" پھر پوچھا: ما المحبة "محبت کسے کہتے ہیں؟" فرمایا یہ سوال بشر حافی سے پوچھو۔ جب تک وہ زندہ ہے میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔"

امام ابن حنبل رضی اللہ عنہ ہمیشہ امتحان میں مبتلا رہے۔ زندگی میں معتزلہ کا جور و ستم

تھا۔ وفات کے بعد مشبہین کے اتہامات یہاں تک کہ اہل سنت بھی ان سے کما حقہ واقف نہ ہو سکے اور ان پر تہمت تراشی کی مگر وہ سب تہمتوں سے بری ہیں۔ واللہ اعلم

ابوالحسن احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ

شام کے اجلہ مشائخ کرام میں سے تھے۔ تمام مشائخ آپ کے مداح ہیں۔ جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: احمد بن ابی الحواری رضی اللہ عنہ شام کے گل ریحان ہیں۔ علم طریقت پر آپ کے ارشادات نہایت لطیف ہیں پیغمبر ﷺ کی احادیث کے صحیح راوی تھے۔ ابو سلیمان دارانی کے مرید تھے۔ سفیان بن عیینہ اور مروان بن معاویہ قاری سے مصاحبت رکھتے تھے۔ سیر و سفر کرتے تھے اور ہر جگہ مستفید ہوتے تھے۔ آپ کا قول ہے: الدنیا مزبلة ومجمع الكلاب، وأقل من الكلاب من عكف عليها فان الكلب ياخذ منها حاجته و ينصرف عنها والمحب لها لا يزول عنها بحال "یہ دنیا کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہے جس پر کتے جمع ہوتے ہیں جو اس پر زیادہ دیر ٹھہرے وہ کتے سے بھی بدتر ہے کیونکہ کتا ڈھیر میں سے اپنے مطلب کی چیز حاصل کر کے پرے ہٹ جاتا ہے مگر دنیا دار پرے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔" اس سے ظاہر ہے کہ وہ دنیا اور اہل دنیا سے کس قدر بیزار تھے۔ اہل طریقت کے لئے یہ قطع تعلق اور بیزاری وجہ مسرت ہوتی ہے۔ ابتدا میں طلب علم ان کا مشغلہ تھا اور اسی سے امام وقت کا مرتبہ حاصل کیا۔ بعد ازاں تمام کتابیں دریا برد کر دیں اور کہا "تم نے اچھی رہبری کی مگر منزل پر پہنچ کر رہبر کی ضرورت نہیں رہتی۔" رہبر کی ضرورت ہوتی ہے جب تک سالک رہروی کر رہا ہو۔ جب بارگاہ اور منزل آ جائے تو راہ یا دروازے بے کار ہیں۔ مشائخ کا خیال ہے کہ احمد رضی اللہ عنہ سے یہ چیز حالت سکر میں سرزد ہوئی۔ کیونکہ راہ طریقت میں جس نے کہا "میں نے منزل مقصود پالی وہ گمراہ ہو گیا"۔ (کسی) منزل کا پالینا (اگلی) منزل سے دور رہنا ہے شغل مشغلہ بے کار ہے۔ فراغت کسل ہے۔ وصول لاشی ہے۔ شغل اور فراغت میں ایک نسبت ہے اور دونوں انسانی صفات میں شامل ہیں۔ وصل و فراق خدائے عز و جل کی مرضی اور قدرت کاملہ پر منحصر ہیں۔

اس کا وصل ناممکن ہے۔ قرب اور نزدیکی کو اس ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وصل یہی ہے کہ انسان کو باری تعالیٰ سے عزت نصیب ہو اور فراق یہی ہے کہ وہ ذلیل و خوار ہو۔

میرا (علی ہجویری) کا خیال ہے کہ ابی الحواری رضی اللہ عنہ نے (وصول) کا لفظ راہ حق کے حاصل ہو جانے کے معنوں میں استعمال کیا ہے راہ حق کتابوں میں نہیں ملتی اور جب راہ روشن سامنے ہو تو کسی رہنمائی یا تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔ تحصیل علم کے بعد کتاب یا گفتگو ضروری نہیں اور مشائخ نے بھی ایسا کیا ہے مثلاً شیخ اعظم ابوسعید فضل اللہ بن محمد میہنی وغیرہ نے کتابیں دریا برد کر دیں۔ ان کی نقل بعض رسم کے شیدائیوں نے بھی کی مگر صرف اپنی کاہلی اور جہالت کے باعث، مشائخ کبار کا مطلب یقیناً یہی تھا کہ ان کے اور ذات حق کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے اور قطع علائق دنیا و اہل دنیا مکمل ہو جائے۔ مگر یہ چیز صرف ابتدائے سکر اور جوش طفلگی میں ہو تو ہو متمکن کے لئے کونین حجاب نہیں بن سکتے چہ جائیکہ پرزۂ کاغذ حجاب بن جائے۔ جب دل علائق سے منقطع ہو چکا ہو تو کاغذ کی کیا حقیقت ہے ہو سکتا ہے کہ کتاب دھو ڈالنے سے مراد نفی عبارت ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ عبارت زبان سے مفقود ہو کیونکہ کتاب میں عبارت مکتوب ہوتی ہے اور زبان پر عبارت جاری۔ عبارت عبارت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ احمد بن ابی الحواری کو غلبہ حال کے عالم میں کوئی سننے والا میسر نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی شرح حال کاغذ کے پرزوں پر لکھ لی جب بہت سے کاغذ کے پرزے جمع ہو گئے اور کوئی اہل نظر نہ آیا سب کو دریا برد کر دیا اور کہا: **نعم الدلیل کنت وأما الاشتغال بالدلیل بعد الوصول محال** "اچھے رہنما ہو مگر تمہارے اندر مشغول ہونا محال ہے۔" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس بہت سی کتب تھیں اوراد و معاملات پر، ان کی ضرورت نہ رہی ہو ان سے دست بردار ہوئے اور اسے ترک عبارت سے تعبیر کیا۔ واللہ اعلم

ابو حامد احمد بن خضرویہ بلخی رحمۃ اللہ علیہ

جوان مرد سپاہی، آفتاب خراسان ابو احمد بن خضرویہ بلند حال اور پسندیدہ وقت

صاحب طریقت تھے اپنے زمانے میں اہل تصوف کے پیش رو اور خاص و عام میں ہر دل عزیز بزرگ تھے راہ ملامت پر گامزن تھے اور سپاہیانہ لباس پہنتے تھے۔ ان کی اہلیہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بڑی شان کی عورت تھی امیر بلخ کی بیٹی تھی جب اس کے دل میں توبہ کا خیال پیدا ہوا تو اس نے احمد کو پیغام دیا کہ وہ اس کے باپ سے درخواست کریں۔ احمد نے منظور نہ کیا۔ فاطمہ نے پھر آدمی بھیجا اور کہا مجھے آپ سے جوانمردی کی توقع تھی۔ آپ کو ایک عورت کا رہبر ہونا چاہئے تھا نہ کہ راہزن۔ احمد راضی ہوگئے اور فاطمہ کے باپ سے درخواست کی اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ آپ کے سپرد کر دیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے گھر میں گوشہ نشین ہوگئی۔ جب احمد نے ابو یزید کی زیارت کا قصد کیا تو فاطمہ بھی ہمراہ ہوگئی۔ ابو یزید کے سامنے فاطمہ نے نقاب رخ اٹھا دی اور ان سے بے دریغ گفتگو کی۔ احمد کو سخت تعجب ہوا اور انہوں نے معرض غیرت میں فاطمہ سے کہا: "مجھے بتاؤ ابو یزید کے سامنے اس قدر بے دریغ ہو کر گفتگو کرنے کا کیا مطلب ہے؟" فاطمہ نے جواب دیا: "آپ میری طبیعت کے محرم ہیں اور ابو یزید میری طریقت کے۔ آپ سے نفس کی حرص و ہوا کا تعلق ہے اور ان سے راہ خدا کا۔ اس کی بین دلیل یہ ہے کہ ان کو میری مصاحبت کی ضرورت نہیں۔ آپ میری صحبت کے محتاج ہیں۔" فاطمہ اسی طرح ابو یزید سے بے تکلف گفتگو کرتی رہی۔ ایک روز ابو یزید نے فاطمہ کا ہاتھ دیکھا حنا سے رنگین تھا۔ پوچھا یہ کیوں؟ فاطمہ نے جواب دیا۔ آج تک آپ نے میرا ہاتھ اور اس پر حنا کا رنگ نہیں دیکھا تھا۔ میرے لئے آپ کی مصاحبت باعث مسرت تھی۔ اب آپ کی نظر میرے ہاتھ اور رنگ حنا پر پڑ گئی ہے اس لئے ہماری مصاحبت حرام ہوگئی۔ وہاں سے ہٹ کر نیشاپور آ گئے اور وہاں قیام کیا۔ نیشاپور کے لوگوں کو آپ سے بہت ارادت تھی۔ جب یحییٰ بن رازی نیشاپور آئے تو احمد نے ان کی دعوت کا ارادہ کیا۔ فاطمہ سے مشورہ کیا کہ دعوت کے لئے کس سامان کی ضرورت ہوگی فاطمہ نے کہا اتنی گائیں، اتنی بھیڑیں، اتنی سبزی، مصالحے، خوشبو، بتیاں اور بیس گدھے۔ احمد رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا گدھے کس مقصد کے لئے؟ فاطمہ نے جواب دیا: "جب کوئی نیک آدمی کسی

نیک آدمی کے ہاں مہمان ہو تو گردونواح کے کتوں کا بھی حق ہوتا ہے۔"

ابو یزید نے فاطمہ سے متعلق فرمایا: من أراد أن ینظر إلی رجل من رجل مخبو تحت لباس النسوان فلینظر إلی فاطمة "اگر کوئی مرد کسی کو نسوانی لباس میں دیکھنا چاہے تو فاطمہ کو دیکھے۔" ابو حفص حداد کا قول ہے: "اگر احمد بن خضرویہ نہ ہوتے تو دنیا میں جوانمردی نہ ہوتی۔"

احمد کے اقوال بہت بلند ہیں۔ مہذب روایات کے لئے آپ مخصوص ہیں۔ اخلاقیات اور تصوف پر آپ کی بے شمار تصانیف ہیں۔ آپ نے فرمایا: الطریق واضح والحق لائح والداعی قد أسمع فما التحیر بعدها إلا من العمی "راستہ ظاہر ہے۔ حقیقت روشن ہے، پاسبان پکار چکا ہے۔ اگر اب بھی کوئی بھٹک جائے تو اس کے اپنے اندھا پن کا قصور ہے۔" راستہ ڈھونڈنا بے وقوفی ہے کیونکہ راہ حق آفتاب کی طرح روشن ہے۔ ذات حق اتنی نمایاں ہے کہ اس کی تلاش ضروری نہیں۔ آپ ہی کا قول ہے: استر عز فقرک "اپنے فقر کی شان کو چھپائے رکھو۔ لوگوں سے یہ نہ کہتے پھرو کہ ہم درویش ہیں۔" فقر انعام خداوندی ہے اور اس کا راز فاش نہیں ہونا چاہئے۔ آپ نے ماہ رمضان میں کسی امیر آدمی کو کھانے کی دعوت دی۔ گھر میں ایک سوکھی روٹی کے ٹکڑے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ امیر آدمی نے گھر جا کر آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی۔ آپ نے واپس کر دی اور فرمایا: "یہ میرا راز فاش ہونے کی سزا ہے۔" یہ چیز آپ کے صحیح فقر پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم

ابوتراب عسکری بن الحسین نخشبی رحمۃ اللہ علیہ

امام متوکلاں، برگزیدۂ اہل زباں ابوتراب عسکری خراسان کے پیشرو اور اجلہ مشائخ میں سے تھے۔ جوانمردی، زہد اور پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ ان کی کرامات وعجائبات بے شمار ہیں۔ سیر وسفر کرنے والے صوفیائے کرام میں آپ خاص مقام رکھتے تھے۔ دنیا سے منہ پھیر کر دشت وجبل میں تنہا پھرا کرتے تھے۔ صحرائے بصرہ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک

کہا مرنے کے بعد بہت عرصہ تک آپ کا جسم صحرا میں دیکھا گیا قبلہ رو کھڑے ہوئے تھے۔ عصا ہاتھ میں تھا اور پانی کا برتن سامنے پڑا تھا۔ درندے اور جنگلی جانور آپ کے قریب نہیں پھڑ کتے تھے۔ آپ کا قول ہے: ''درویش کی خوراک وہی ہے جو اسے میسر آئے۔ اس کا لباس وہی ہے جو اسے ڈھانپ لے۔ اس کی جائے رہائش وہی ہے جہاں وہ قیام کر لے۔'' مطلب یہ کہ خوراک، لباس اور مسکن کے معاملے میں درویش کی اپنی خواہش کارفرما نہیں ہوتی۔ تمام دنیا ان تین آفات میں مبتلا ہے اور تینوں کی ہوس ہمیں مصروف کار رکھتی ہے۔ یہ ظاہری صورت ہے۔ حقیقی معنوں میں درویش کی خوراک وجد ہے۔ اس کا لباس پرہیزگاری ہے اور اس کی جائے رہائش عالم غیب ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا۔ وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ⑯ (الجن) ''اگر وہ راہ حقیقت پر استقامت اختیار کریں تو ہم ان پر باران رحمت برساتے ہیں۔'' اور پھر فرمایا، وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف:24) ''لباس خوشنما مگر پرہیزگاری کا لباس بہتر ہے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، فقر کا وطن عالم غیب ہے۔'' درجہ کمال یہ ہے کہ درویش کی غذا شراب قرب ہو۔ لباس تقویٰ و مجاہدہ ہو۔ وطن عالم غیب ہو۔ طریق فقر ظاہر اور تائید ربانی سے مامور ہو اس کے معاملات روشن اور بین ہوں۔ واللہ اعلم

ابوزکریا یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ

عالی حال اور نیک سیرت تھے۔ راہ حقیقت میں رجا بحق تعالیٰ کے مسلک پر گامزن تھے حصری نے فرمایا اللہ کی طرف سے دو یحییٰ آئے: ایک نبی ایک ولی۔ یحییٰ بن زکریا علیہ السلام طریق خوف پر اس طرح رواں تھے کہ سب مدعی شدت خوف میں اپنی بہبود سے ناامید ہو گئے۔ یحییٰ بن معاذ کا کیا حال ہوا؟ جواب ملا وہ جہالت سے معرا تھے اور ان سے کبھی کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہوا۔ معاملت اور اس کے برتاؤ میں نہایت سرگرم تھے اور کوئی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان کے احباب نے پوچھا آپ کا مسلک تو رجا ہے مگر معاملت میں آپ خائف ہیں۔ اس کا کیا مطلب؟ فرمایا ترک عبودیت ضلالت ہے۔ خوف و رجا

دین کے دو ارکان ہیں۔ ناممکن ہے کسی ایک رکن ایمان کی پیروی کرتا ہوا آدمی قعر مذلت میں گر جائے خائف عبادت کرتا ہے خوف فراق میں اور صاحب رجا امید وصال میں۔ جب تک عبودیت نہ ہو دونوں غلط ہیں عبودیت موجود ہو تو دونوں داخل عبادت ہیں۔ جہاں عبادت ہو وہاں عبارت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ان کی تصانیف بے شمار ہیں۔ اقوال وارشادات نہایت لطیف ہیں۔ خلفائے راشدین کے بعد پہلے صاحب طریقت آپ تھے کہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ مجھے ان کے کلام سے بڑی ارادت ہے جو رقت انگیز ہے۔ کانوں کے لئے خوشگوار، معانی میں دقیق اور عبارت میں مفید۔ آپ کا قول ہے: الدنیا دار الاشغال والآخرة دار الأهوال ولا يزال العبد بين الاشتغال والأهوال حتى يستقربه القرار إما إلى الجنة وإما إلى النار " دنیا مقام اشغال ہے۔ عاقبت جائے احوال۔ بندہ ہمیشہ بیم ورجا میں مبتلا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ یا بہشت میں راحت پذیر ہوگا یا جہنم میں نذر آتش" صاحب نصیب آدمی وہ ہے جو اشغال سے نجات پائے اور احوال سے محفوظ رہے۔ دونوں جہان سے منقطع ہو کر مشغول بحق ہو۔ یحیٰ رحمۃ اللہ علیہ غنا کو فقر پر ترجیح دیتے تھے۔ رے میں جب ان پر بہت قرض ہو گیا تو خراسان چلے گئے۔ بلخ کے لوگوں نے آپ کو روک لیا۔ وہاں ایک عرصہ تک وعظ فرماتے رہے۔ لوگوں نے ایک لاکھ درہم نذر کیا تا کہ قرضہ ادا کر سکیں۔ رے کو واپس آ رہے تھے کہ راہزنوں کے نرغے میں آ گئے تمام چاندی سکہ لٹ گیا۔ خالی ہاتھ نیشا پور پہنچے اور وہاں وفات پائی۔

ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری حدادی رحمۃ اللہ علیہ

عالی مرتبہ بزرگان دین میں سے تھے۔ جملہ مشائخ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے آپ نے ابو عبداللہ ابیوردی اور احمد بن خضرویہ سے مصاحبت کی۔ شاہ شجاع آپ کی زیارت کیلئے کرمان سے آئے۔ زیارت مشائخ کرام کے لئے آپ بغداد گئے۔ عربی زبان سے نابلد تھے۔ بغداد میں مریدوں نے آپس میں کہا کتنی شرم کی بات ہے کہ مشائخ کرام کی

بات سمجھنے کے لئے ہمارے پیشوا کو ترجمان کی ضرورت پڑے گی۔ مسجد شونیزیہ میں مشائخ سے ملاقات ہوئی۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ بھی ان میں موجود تھے۔ ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت فصیح عربی میں گفتگو کی اور تمام مشائخ آپ کی فصاحت پر عش عش کر اٹھے۔ ان سے پوچھا گیا: ما الفتوة ''فتوت (جوانمردی) سے کیا مراد ہے؟'' فرمایا پہلے آپ لوگوں میں سے کوئی بتائے۔ جنید نے فرمایا: الفتوة عندی ترک الرؤية وإسقاط النسبة ''میرے خیال میں فتوت یہ ہے کہ فتوت کو فتوت نہ سمجھا جائے اور اسے اپنی ذات سے منسوب نہ کیا جائے۔'' آپ نے فرمایا ''بہت خوب...... مگر میرے خیال میں فتوت انصاف کرنے کو اور اپنی ذات کے لئے انصاف طلب نہ کرنے کو کہتے ہیں۔'' جنید نے اپنے مریدوں سے فرمایا: ''اٹھو! ابوحفص فتوت میں آدم اور اولاد آدم سے آگے نکل گیا۔''

آپ کی ابتدائے توبہ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کسی لڑکی کی محبت میں مبتلا تھے اور اپنے دوستوں کے مشورے کے مطابق نیشاپور کے ایک یہودی سے مدد کے طالب ہوئے۔ یہودی نے کہا چالیس دن تک نماز اور دعا کو ترک کرو۔ کوئی نیکی کا کام نہ کرو۔ کوئی نیکی کی نیت نہ کرو۔ پھر میرے پاس آؤ میں کچھ ایسا انتظام کروں گا کہ محبوب تمہارے قدموں میں ہو۔ ابوحفص نے یہودی کی ہدایات پر عمل کیا اور چالیس دن کے بعد پھر اس کے پاس پہنچے۔ اس نے حسب وعدہ ایک نقش بنا دیا۔ مگر یہ بالکل بے اثر ثابت ہوا۔ یہودی نے کہا ''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان چالیس دنوں میں تم نے ضرور کوئی نیک کام کیا ہے سوچو۔'' ابوحفص نے جواب دیا ''کوئی ایسا کام نہیں کیا سوائے اس چیز کے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ وہ میں نے پرے ہٹا دیا تھا تا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔'' یہودی نے کہا ''اس خدا کی خلاف ورزی نہ کرو جس نے تمہاری اتنی سی نیکی کو ضائع ہونے نہیں دیا حالانکہ تم متواتر چالیس روز تک اس کے احکام سے روگرداں رہے ہو۔'' ابوحفص نے توبہ کی اور یہودی مسلمان ہو گیا۔

ابوحفص نے لوہار کا کام کیا جب تک آپ نے باورد جا کر ابوعبداللہ باوردی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی۔ ایک دن نیشاپور واپس آ کر اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے ایک نابینا قاری سے قرآن

سن رہے تھے ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ بے خود ہو گئے۔ آگ میں ہاتھ ڈال دیا اور دہکتا ہوا کوئلہ بغیر دست پناہ اٹھا لیا۔ دکان پر کام کرنے والے لڑکے نے یہ چیز دیکھی تو وہ خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کام نہیں کیا اور دکان پر واپس نہ آئے۔

آپ کا قول ہے "میں نے کام سے منہ پھیرا اور پھر اس کی طرف پلٹ کر آیا۔ پھر کام نے مجھ سے منہ پھیرا اور میں اس کی طرف لوٹ کر نہ آیا۔" جب کوئی انسان کسی چیز کو تکلف و کوشش سے ترک کرتا ہے تو ترک کا مقام اس چیز کو حاصل کرنے سے بلند تر نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کوشش سے حاصل کی ہوئی جملہ چیزیں باعث آفت ہوتی ہیں۔ قدر و قیمت اسی چیز کی ہے جو از خود پردۂ غیب سے نمودار ہو اور جس جگہ بھی ہو انسانی اختیار اس کے متصل ہو اور تائید غیب کارفرما نظر نہ آئے۔ ترک و اخذ میں سے کوئی چیز بھی بندے کو راس نہیں کیونکہ دونوں چیزیں خدائے عزوجل کی طرف سے ہیں جب قدرت مائل بہ عطا ہوتی ہے تو اخذ رونما ہوتا ہے اور جب منشائے قدرت زوال پذیر ہو تو ترک ظہور پذیر ہوتا ہے یہ صورت ہے دراصل انسان کو صرف اخذ و ترک کا علم ہو جاتا ہے۔ اس کی کوشش اور ہمت کو جذب و دفاع پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ رضائے خداوندی کی جستجو میں مرید کی ہزار سالہ کوشش کی کوئی وقعت نہیں۔ رضائے خداوندی کا ایک لمحہ ہزار سالہ کوشش سے بہتر ہے۔ لازوال اقبال قبول ازلی سے پیوستہ ہے اور سرور جاوید کو خوش بختی سابقہ سے نسبت ہے۔ آدمی کے لئے راہ نجات ذات حق کی رحمت بے قیاس کے سوا نہیں۔ صاحب توقیر ہے وہ انسان جس کے لئے مسبب حقیقی اسباب برملا کو ختم کر دے۔

ابو صالح حمدون بن احمد بن عمار قصار رحمۃ اللہ علیہ

قدمائے مشائخ میں سے تھے۔ زہد و اتقاء میں پیش پیش تھے۔ فقہ اور علم اصل میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ثوری فرقہ سے تعلق تھا اور طریقت میں ابو تراب نخشبی اور علی نصر آبادی کے مرید تھے۔ آپ کے رموز معاملت میں اور کام مجاہدات میں دقیق ہے۔ مشہور ہے کہ جب آپ کا مقام علم میں بلند ہوا تو نیشاپور کے لوگ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی کہ آپ منبر

پر تشریف لائیں۔ وعظ فرمائیں تاکہ عوام الناس مستفید ہوسکیں۔ فرمایا مجھے وعظ کرنا زیبا نہیں کیونکہ میرا دل ابھی دنیا اور جاہ و مرتبت دنیا پر مائل ہے۔ میرے وعظ کا کوئی فائدہ نہیں اس کا کسی دل پر اثر نہیں ہوگا۔ بے اثر بات شریعت کا مذاق اڑانے کے برابر ہے۔ وعظ ایسے آدمی کو سزاوار ہے جس کی خاموشی دین میں خلل پیدا کر رہی ہو اور اس کی گفتگو سے خلل دور ہوسکتا ہو۔ لوگوں نے پوچھا پہلے لوگوں کا کلام کیوں اس قدر پرتاثیر ہے؟ فرمایا: إنهم تكلموا لعز الإسلام و نجاة النفوس ورضا الرحمٰن و نحن نتكلم لعز النفس و طلب الدنيا و قبول الخلق۔ ''وہ کلام کرتے تھے عزت اسلام، نجات نفس اور رضائے خداوندی کے لئے۔ ہم کلام کرتے ہیں، عزت نفس، طلب دنیا اور قبول خلق کے لئے۔'' جو کوئی مراد حق کے مطابق بات کرتا ہے اس کے کلام میں شوکت و دبدبہ ہوتا ہے جس سے اہل شہر کے دل مرعوب ہو جاتے ہیں۔ جو اپنی ذاتی مراد کے موافق بات کرتا ہے اس میں ہوش اور ذلت ہوتی ہے۔ خلقت کو اس سے کوئی منفعت نہیں ہوتی۔ ایسے کلام سے خاموشی بہتر ہے۔

ابوالسری منصور بن عمار رحمۃ اللہ علیہ

درجہ و مرتبت میں بزرگ مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے مگر مقبولیت اہل خراسان میں حاصل تھی۔ آپ کا کلام نہایت درجہ حسین اور طرز بیان نہایت درجہ لطیف تھا۔ وعظ فرماتے تھے۔ روایات، درایات، احکام و معاملت کے عالم متبحر تھے۔ بعض اہل تصوف آپ کی تعریف میں بے حد مبالغہ کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے: سبحان من جعل قلوب العارفين أوعية الذكر و قلوب الذاهدين أوعية التوكل و قلوب المتوكلين أوعية الرضا و قلوب الفقراء وعية القناعة و قلوب أهل الدنيا أوعية الطمع ''پاک ہے وہ جس نے عارفوں کے دل محل ذکر، زاہدوں کے دل موضوع توکل، متوکلوں کے دل منبع رضا، درویشوں کے دل جائے قناعت اور اہل دنیا کے دل محل طمع بنائے۔'' یہ چیز قابل غور ہے کہ باری تعالیٰ نے عضو اس کی حس اور فعل میں نسبت رکھی ہے۔

ہاتھوں میں پکڑنے کی قوت ہے، پاؤں میں چلنے کی، آنکھوں میں دیکھنے کی، کانوں میں سننے کی، زبان میں بولنے کی۔ ان سب اعضاء کے وجود وظہور میں کچھ ایسا تفرقہ نہیں ہوتا۔ دلوں کا منہاج الگ الگ ہے۔ جدا جدا ارادے، علیحدہ علیحدہ خواہشیں۔ ایک دل معرفت کا مقام ہے دوسرے میں بجز گمراہی کے کچھ بھی نہیں۔ ایک قناعت سے لبریز ہے۔ دوسرا صرف طمع ولالچ کا گھر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ دل قدرت حق کا عجیب مظہر ہے۔ آپ کا قول ہے: الناس رجلان عارف بنفسه فشغله فی المجاهدة والریاضة و عارف بربه فشغله بخدمته و عبادته و رضاته" آدمیوں کے دو گروہ ہیں، ایک اپنے آپ کو پہچاننے والے جو مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول رہتے ہیں دوسرے اپنے رب کو پہچاننے والے جو بندگی، عبادت اور طلب رضا میں مصروف رہتے ہیں پہلے گروہ کی عبادت ریاضت ہے۔ دوسرے گروہ کی ریاست، وہ عبادت حصول مقامات کے لئے کرتے ہیں یہ فارغ مقامات ہوئے ہیں۔ دونوں میں کتنا فرق ہے؟ ایک کی زندگی مجاہدہ ہے۔ دوسرے کی مشاہدہ۔

آپ کا ایک قول ہے: الناس رجلان مفتقر إلی الله فهو أعلی الدرجات علی لسان الشریعة وآخر لایری الافتقار لما علم من فراغ الله من الخلق والرزق ولأجل والسعادة والشقاوة فهو فی افتقاره إلیه واستغناء به" آدمی دو طرح کے ہیں، ایک خدا کے نیاز مند جن کا درجہ شریعت ظاہر میں بزرگ ترین ہے۔ دوسرے وہ جو بے نیاز ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدائے عزوجل نے ازل سے سب کا رزق، موت، زندگی، خوش بختی اور بدبختی مقرر کر رکھی ہے، یہی لوگ ہیں جو درحقیقت اس کے نیاز مند ہیں اور اس کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہیں۔" پہلے لوگ اپنی نیاز مندی کے پردے میں محجوب ہیں دوسرے اپنی نیاز مندی میں صاحب کشف اور غنی بالحق ہیں۔ ایک نعمت کے طالب ہیں دوسرے منعم کے۔ نعمت کے طالب غنی بھی ہوں تو فقیر ہیں۔ منعم کے طالب مشاہدہ کی دولت سے بہرہ ور ہو کر فقیر بھی ہوں تو غنی ہیں۔

ابوعبداللہ احمد بن عاصم انطا کی رحمۃ اللہ علیہ

ممدوح اولیاء، قدوۂ اہل رضا ابوعبداللہ احمد بن عاصم اہل طریقت کے برگزیدہ پیشرو تھے علوم شریعت، اصول، فروع اور معاملت کے ماہر تھے۔ بہت دراز عمر پائی۔ قدیم مشائخ کبار کی صحبت میں رہے اور تابعین کا اتباع کیا۔ بشر اور سقطی کے ہم عصر تھے اور حارث محاسبی کے مرید، فضیل کی ملاقات اور مصاحبت سے مستفید ہوئے۔ تمام زبانوں پر عبور تھا۔ شافی لطائف اور عالی کلام مشہور تھے۔ آپ کا قول ہے: انفع الفقر ما کنت به متجملا وبه راضیا ''بہترین فقر وہ ہے جو تیرے لئے باعث عزت ہو اور تو اس سے راضی ہو۔'' یعنی عام لوگوں کی عزت اسباب ظاہر کی موجودگی ہے مگر درویش کی عزت مسبب الاسباب سے ہے۔ وہ ہر حالت میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کے احکام کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ فقر عدم اسباب کا نام ہے اور غنا وجود اسباب کا۔ اسباب کے بغیر فقر خدا شناسی اور اسباب کے ساتھ فقر کا دعویٰ خودنمائی۔ اس لئے اسباب حجاب کا باعث ہیں اور ترک اسباب ذریعہ کشف و جمال۔ دونوں جہان کی دولت کشف و رضا میں ہے اور غضب حجاب میں۔ یہ بیان فقر کی افضلیت کو واضح کرتا ہے۔ واللہ اعلم

ابومحمد عبداللہ بن خبیق رحمۃ اللہ علیہ

راہرو طریق پرہیز و اتقاء ابومحمد عبداللہ بن خبیق اہل تصوف کے متقی اور متورع مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ صحیح احادیث کے راوی تھے فقہ، معاملت اور حقیقت میں ثوری مسلک سے تعلق تھا ان کے مریدوں سے آپ کا اختلاط تھا۔ تصوف و معاملت پر ان کے اقوال نہایت لطیف ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''جو اپنی زندگی میں صحیح زندگی کی طلب رکھتا ہے اسے اپنے دل میں طمع کو جگہ نہیں دینی چاہئے۔'' طمع کرنے والا اپنے لالچ کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے طمع دل پر مہر لگا دیتی ہے اور مہر زدہ دل مردہ ہوتا ہے۔ مبارک ہے وہ دل جو ماسوائے اللہ کے لئے مردہ ہو اور صرف اللہ کے لئے زندہ ہو۔ دل میں عزت و ذلت مضمر ہے۔ باری تعالیٰ کا ذکر اس کی عزت ہے اور لالچ اس کی ذلت۔ چنانچہ آپ ہی کا قول ہے: خلق اللہ

القلوب مساكن الذكر فصارت مساكن الشهوات لا يمحو من الشهوات من القلوب إلا خوف مزمج أو شوق مغلق "باری تعالیٰ نے دل کو مقام ذکر پیدا کیا جو نفس کی قربت سے مقام شہوات بن گیا۔ سوائے خوف قرار دشمن اور شوق آرام شکن کے کوئی چیز دل کو شہوات سے خالی نہیں کر سکتی۔" خوف وشوق ایمان کے ستون ہیں۔ اہل ایمان کے دلوں میں قناعت و ذکر ہوتا ہے اور طمع اور غفلت سے پاک ہوتے ہیں۔ مومن کا دل طمع اور شہوات کا تابع نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں وحشت سے پیدا ہوتی ہیں اور دل وحشت زدہ ایمان سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ ایمان کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے اور وحشت ہمیشہ غیر حق سے ہوتی ہے۔ داناؤں کے بقول الطماع مستوحش به "طمع رکھنے والے سے ہر ایک ڈرتا ہے۔"

ابوالقاسم جنید بن محمد جنید قواریری رحمۃ اللہ علیہ

اہل ظاہر اور اہل باطن دونوں میں مقبول تھے۔ فنون علم، اصول، فروع اور معاملت میں کامل تھے۔ ابوسفیان ثوری کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ عالی کلام اور بلند احوال تھے۔ تمام اہل تصوف آپ کو امام طریقت تسلیم کرتے ہیں اور کسی مدعی یا متصوف کو اس پر اعتراض نہیں۔ سری سقطی کے بھانجے اور مرید تھے لوگوں نے سری سے پوچھا "کیا مرید کا مقام کبھی اپنے پیر کے مقام سے بھی بلند تر ہو سکتا ہے۔" فرمایا: "بے شک ہو سکتا ہے اس کی بین دلیل یہ ہے کہ جنید میرے مرید ہیں مگر مجھ سے اونچا مقام رکھتے ہیں۔"

سری نے یہ بات از راہ تواضع کہی اور بصیرت پر مبنی تھی مگر آدمی اپنے اوپر نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ نیچے دیکھتا ہے۔ سری کے قول کی دلیل بین ہے۔ انہوں نے جنید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مقام سے اوپر دیکھا اگرچہ ان کا مکان دید نیچے ہی تھا اوپر نہیں تھا۔ مشہور ہے کہ سری رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں لوگوں نے جنید رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ وہ وعظ فرماویں مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جب تک میرے شیخ طریقت موجود ہیں میں کلام نہیں کر سکتا۔ ایک رات خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا۔ آپ نے فرمایا "جنید رحمۃ اللہ علیہ!

لوگوں کو اپنا کلام سناؤ۔ خدا نے تمہارے کلام کو خلق کے لئے ذریعہ نجات بنایا ہے۔" بیدار ہوئے تو دل میں خیال آیا شاید اب میرا مقام شیخ طریقت سے بلند تر ہو گیا ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم صادر فرمایا ہے۔ صبح ہوئی تو سری نے ایک مرید کو بھیجا اور حکم دیا کہ جب جنید نماز سے فارغ ہوں تو ان سے کہنا کہ مریدوں کے کہنے پر وعظ شروع نہ کیا۔ مشائخ بغداد کی سفارش بھی رد کر دی۔ میں نے پیغام دیا مگر راضی نہ ہوئے۔ اب تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے، بجالاؤ۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہو گیا کہ سری رحمۃ اللہ علیہ ان کے احوال ظاہر و باطن سے کماحقہ واقف ہیں۔ ان کا درجہ بلند تر ہے کیونکہ وہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کے اسرار سے واقف ہیں اور جنید رحمۃ اللہ علیہ ان کے حال سے بے خبر ہے۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ سری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوئے توبہ کی اور دریافت کیا: " آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم کلام دیا ہے" فرمایا" خواب میں ہاتف غیب نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنید رحمۃ اللہ علیہ کو حکم وعظ فرمانے گئے ہیں تا کہ بغداد کے لوگ مستفید ہوں۔" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخ طریقت ہر حال میں اپنے مرید سے باخبر ہوتا ہے۔

آپ بڑے عالی کلام تھے آپ نے بہت سے لطیف رموز بیان فرمائے ہیں۔ فرمایا:

كلام الانبياء بناء عن الحضور و كلام الصديقين إشارة لمن المشا هدات

" انبیاء کا کلام خبر حضور سے معمور ہوتا ہے اور صدیقوں کا رموز مشاہدات سے۔ خبر کا تعلق نظر سے ہے اور مشاہدے کا فکر سے۔ خبر دیدار پر مبنی ہوتی ہے اور رمز کا تعلق غیر سے ہوتا ہے اسی لئے اولیاء کا انتہائے کمال انبیاء کا مقام ابتداء ہوتا ہے۔ نبی اور ولی کا فرق بالکل بین ہے نبی ولی سے افضل ہے بخلاف دو ملحد جماعتوں کے جو ولی کو پہلا اور نبی کو بعد کا درجہ دیتی ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مجھے ابلیس کو دیکھنے کا شوق تھا ایک روز مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دور سے ایک بوڑھا مرد آتا دکھائی دیا۔ قریب آ کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اسے دیکھتے ہی میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ میں نے پوچھا " تو کون ہے؟ تیری ہیبت سے میرا دل لرز گیا ہے۔" بوڑھے نے کہا" میں وہی ہوں جس کو دیکھنے کی تجھے آرزو تھی۔" میں نے پوچھا

''ملعون تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہ کیا'' بولا'' جنید تجھے کیا ہو گیا؟ کیا میں غیر اللہ کو سجدہ کرتا؟'' میں ابلیس کا جواب سن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ ہاتف غیب نے میرے دل میں یہ بات ڈالی'' اس سے کہو تو جھوٹ بکتا ہے اگر تیرے دل میں فرمانبرداری کا جذبہ ہوتا تو تو رب العزت کے فرمان سے سرتابی نہ کرتا اور اس طرح خدا کا قرب کیوں نہ حاصل کیا؟'' ابلیس نے بھی میرے دل میں آنیوالی ندائے ہاتف سن لی اور چلایا:'' جنید تو نے مجھے پھونک دیا۔'' اور غائب ہو گیا۔ یہ حکایت جنید رضی اللہ عنہ کی پاکدامانی اور ان کے محفوظ ہونے کی دلیل ہے۔ باری تعالیٰ ہر حال میں اپنے دوستوں کو ابلیس کے مکر وفریب سے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک مرید آپ سے کبیدہ خاطر ہو گیا اور سمجھا کہ اسے بھی مقام حاصل ہو گیا ہے اور وہ شیخ طریقت کا ضرورت مند نہیں رہا ایک روز وہ بغرض امتحان آیا۔ جنید رضی اللہ عنہ کو اس کی قلبی کیفیت سے آگاہی ہو گئی۔ اس نے کوئی سوال پوچھا۔ آپ نے فرمایا'' لفظی جواب چاہتے ہو یا معنوی۔'' مرید نے کہا دونوں۔ فرمایا'' لفظی جواب تو یہ ہے کہ اگر تو نے اپنا امتحان کیا ہوتا تو میرا امتحان لینے یہاں نہ آتا۔ معنوی جواب یہ ہے کہ'' میں نے تجھے ولایت سے خارج کیا۔'' مرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور اس کا سکون دل لٹ گیا۔ توبہ میں مشغول ہوا اور لغو باتوں سے پرہیز کرنے لگا۔ جنید نے فرمایا'' تجھے یہ بھی خبر نہیں اولیاء واقف اسرار ہوتے ہیں اور تو ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا۔'' پھر اس پر دم کیا اسے اپنی مراد حاصل ہوئی وہ مشائخ کے کام میں تصرف سے دست بردار ہوا اور توبہ کی۔

ابوالحسن احمد بن محمد نوری رحمۃ اللہ علیہ

طریقت کے شیخ المشائخ، شریعت کے امام الآئمہ، اہل تصوف کے بادشاہ، تکلف آفت سے بے نیاز ابوالحسن احمد بن محمد نوری معاملات میں بہت نیک، کلام میں بہت فصیح، مجاہدے میں بہت عظیم تھے۔ طریقت میں ان کا مسلک جداگانہ ہے اور اہل تصوف میں سے ایک گروہ جو نوری کہلاتا ہے، ان کا پیروکار اور مقتدی ہے۔ اہل تصوف بارہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں دس ان میں سے مقبول ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں،

۱، محاسبی۔ ۲، قصاری۔ ۳، طیفوری۔ ۴، جنیدی۔ ۵، نوری۔ ۶، سہلی۔ ۷، حکیمی۔ ۸، خرازی۔ ۹، خفیفی۔ ۱۰، شطاری۔

یہ سب راہ حق پر ہیں اور اہل سنت والجماعت میں شامل ہیں۔ باقی دو گروہ مردود ہیں۔ ایک ان میں حلولی کہلاتے ہیں۔ یہ حلول وامتزاج میں الجھے ہوئے ہیں۔ مسالمی اور مشبہ فرقوں کے لوگ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں دوسرا مردود گروہ حلاجیوں کا ہے جو ترک شریعت کرتے ہیں اور الحاد میں مبتلا ہیں۔ اباحتی اور فارسی فرقے اسی گروہ میں شامل ہیں۔ آگے چل کر اسی کتاب کے علیحدہ باب میں ان فرقوں میں اختلاف کی تشریح ہوگی۔ انشاءاللہ العزیز

نوری کا سلوک طریقت قابل تعریف تھا۔ سست روی کو ترک کرنے، سہولت طلبی کو چھوڑنے اور دوام مجاہدہ اختیار کرنے میں پیش پیش تھے۔ کہتے ہیں آپ جنید رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے آئے وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے فرمایا ''اے ابوالقاسم! تو نے سچ کو ان سے چھپایا اور انہوں نے تجھے صدر نشین کیا۔ میں نے نصیحت کی۔ لیکن انہوں نے مجھ پر پتھر برسائے۔ تعریف وستائش کا تعلق خواہش نفس کے ساتھ ہے اور نصیحت کو نفس کے ساتھ مخالفت ہے۔ آدمی ہر اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جو اس کے نفس کے خلاف ہے اور اسے ہر اس چیز سے محبت ہوتی ہے جو اس کی ہوائے نفس کے موافق ہو۔

ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق تھے اور سری کے مرید۔ بہت سے مشائخ سے مل چکے تھے اور ان کی مصاحبت سے مستفید ہو چکے تھے۔ احمد بن الحواری سے بھی ملے۔ تصوف پر آپ کے لطیف اشارات اور جمیل اقوال ہیں۔ آپ نے علم وفن میں بڑے نازک نکتے بیان فرمائے ہیں۔ آپ کا قول ہے: ''روبہ حق ہونا ہر چیز سے کنارہ کشی کا نام ہے اور ہر چیز سے کنارہ کش ہونا روبہ حق ہونے کے مترادف ہے۔'' یعنی جس کسی کو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہو وہ ہر غیر اللہ سے منقطع ہے اور جو غیر اللہ سے منقطع ہو وہ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہوتا ہے۔ رجوع بحق غم مخلوقات سے رہائی ہے۔ جب غم مخلوقات سے نجات ملی تو اقبال بحق درست ہوا اور جب اقبال درست ہوا تو خلق سے روگردانی واجب

ہوئی۔ کیونکہ متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سنا کہ آپ تین سے روز دن رات ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے نالہ و بکا کر رہے تھے۔ لوگوں نے جنید رحمۃ اللہ علیہ کو خبر کی وہ آئے اور فرمایا "اے ابوالحسن! اگر تجھے علم ہے کہ خروش رب العزت کے سامنے سود مند ہے تو مجھے بھی بتا میں بھی یہی چیز اختیار کروں۔ اگر خروش سود مند نہیں تو سر تسلیم خم کر تیرے دل کو مسرت نصیب ہو۔" نوری نے خروش ختم کیا اور کہا "ابوالقاسم! تو کتنا اچھا معلم ہے۔"

آپ کا قول ہے: "ہمارے زمانے میں دو چیزیں نہایت کمیاب ہیں، ایک عالم جو اپنے علم پر کاربند ہو۔ دوسرا عارف جو اپنی حقیقت حال کو معارض بیان میں لائے۔" علم بے عمل علم نہیں ہوتا، معرفت بے حقیقت معرفت نہیں ہوتی۔

نوری نے اپنے زمانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ چیزیں ہر زمانے میں کمیاب رہی ہیں۔ جو بھی عالم و عارف کو تلاش کرتا ہے اپنے وقت کو ضائع کرتا ہے اور بجز پریشانی اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ ساری دنیا عالم نظر آئے۔ خدا کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ ساری دنیا عارف دکھائی دے۔ عالم و عارف کمیاب ہیں۔ کمیاب چیز مشکل ملتی ہے۔ جس چیز کے وجود کا ادراک مشکل ہو اس کی تلاش وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ علم و معرفت اپنی ذات سے طلب کرنی چاہئے اور حقیقت کی روشنی میں اپنے آپ کو عمل پر مجبور کیا جائے۔

آپ کا قول ہے: "جو لوگ ہر چیز کو من اللہ سمجھتے ہیں وہ ہر چیز میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔" ملک اور ملک کا قیام مالک سے ہوتا ہے۔ راحت خالق کی جانب دیکھنے سے ہوتی ہے مخلوق پر نظر کرنے سے نہیں۔ اشیاء کو سبب افعال سمجھنے میں مصیبت ہی مصیبت ہے۔ سالک کے لئے اشیائے عالم کی طرف رجوع بمنزلہ شرک ہے کیونکہ اشیاء کو فعل یا عمل کا سبب سمجھنا اسباب میں لے ڈوبتا ہے اور نجات مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل حیری رحمۃ اللہ علیہ

قدیم بزرگ صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں اپنے زمانے میں یگانہ روزگار تھے۔ سب لوگوں کے دل میں ان کے لئے قدر و منزلت تھی۔ ابتدا میں یحییٰ بن معاذ سے مستفید ہوئے۔ پھر کچھ مدت شاہ شجاع کی صحبت میں رہے۔ ان کے ہمراہ ابو حفص کی زیارت کے لیے نیشا پور آئے اور وہیں ٹھہر گئے اور ان کی صحبت میں عمر گزار دی۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق آپ لڑکپن ہی سے حقیقت کی تلاش میں تھے اور ظاہر داروں سے نفرت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ''میرا دل کہتا تھا کہ اس ظاہر کے علاوہ جو عام لوگوں کے علم میں ہے، شریعت میں ایک راز ہے یہاں تک کہ میں سن بلوغت کو پہنچا اور ایک روز یحییٰ بن معاذ کی مجلس میں یہ راز مجھ پر آشکارا ہو گیا اور میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا میں نے یحییٰ بن معاذ کی صحبت اختیار کی۔ کچھ لوگ شاہ شجاع کی طرف سے آئے اور ان کا ذکر کیا میرے دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور میں رے سے کرمان روانہ ہوا اور طریق صحبت شاہ شجاع کا طالب ہوا۔ انہوں نے مجھے باریابی کی اجازت نہ دی اور کہا تیری طبیعت رجا پروردہ ہے کیونکہ یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام رجا ہے اور اہل رجا راہ طریقت کے قابل نہیں ہوتے۔ رجا کسل کا باعث ہوتی ہے۔ میں نے بہت آہ و زاری کی اور بیس روز تک ان کے آستانے پر پڑا رہا۔ بیس روز کے بعد اذن باریابی ملا اور مجھے شرف قبولیت بخشا گیا۔ پھر میں شاہ شجاع کی صحبت میں رہا۔ عجیب مرد غیور تھا۔

شاہ شجاع رحمۃ اللہ علیہ، نیشا پور ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو آرہے تھے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ جب ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے تو شاہ شجاع نے قبا زیب تن کی ہوئی تھی۔ ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور کہا: وجدت فی القباء ما طلبت فی العباء ''جس چیز کی عبا میں تلاش تھی وہ آج قبا میں مل گئی۔'' اس دوران میری جملہ کوشش یہی تھی کہ مجھے ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نصیب ہو مگر شاہ شجاع رحمۃ اللہ علیہ کا دبدبہ سدراہ تھا۔ ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ نے میری ارادت کا اندازہ لگا لیا اور میں خدائے عزوجل سے رو

رو کر دعا کرتا رہا کہ مجھے ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ کی مصاحبت میسر آئے مگر شاہ شجاع بھی آزردہ خاطر نہ ہوں۔ شاہ نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا اور میں بھی از راہ تیاری کپڑے پہننے لگا۔ مگر میرا دل ابوحفص کے ساتھ تھا۔ آخر کار انہوں نے فرمایا: اے شاہ! بحق فیض صحبت اس لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ مجھے اس سے انس ہو گیا ہے۔ شاہ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا "شیخ کا حکم مانو۔" شاہ شجاع چلے گئے اور میں ابوحفص کی خدمت میں ٹھہر گیا اور پھر ان کی صحبت میں عجائبات سے جو کچھ دیکھا وہ دیکھا۔ ان کا مقام شفقت تھا۔

باری تعالیٰ نے ابوعثمان کو تین مختلف شیوخ کی بدولت تین مختلف مقامات عطا فرمائے: مقام رجا صحبت یحییٰ میں، مقام غیرت خدمت شاہ شجاع میں اور مقام شفقت مجلس ابوحفص میں۔ یہ روا ہے کہ مرید پانچ یا چھ یا اس سے زیادہ مصاحبتوں کے ذریعہ منزل مقصود حاصل کرے اور ہر پیر کی صحبت میں اس کے لئے نئے مقام کا کشف ہو۔ تاہم مناسب یہی ہے کہ مرید پیر کو کسی جگہ بھی اپنے مقام سے آلودہ نہ کرے۔ پیر کے کمال کی نشان دہی نہ کرے اور یہی کہے کہ میں نے سب کچھ اس کی صحبت میں حاصل کیا مگر اس کا مقام بہر حال بلند تر تھا۔ یہ اخلاق کا تقاضا ہے اور مریدوں کو مقامات و احوال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ابوعثمان نے نیشاپور اور خراسان میں تصوف کی تعلیم دی انہوں نے جنید، رویم، یوسف بن حسین اور محمد بن فضل رضی اللہ عنہم سے مصاحبت کی۔ کوئی آدمی آپ سے زیادہ اپنے پیروں اور استادوں سے بہرہ ور نہیں ہوا۔ اہل خراسان نے آپ کو منبر پیش کیا اور آپ نے تصوف پر تقاریر کیں۔ آپ کی تصانیف بہت بلند پایہ ہیں اور فنون علم تصوف پر پختہ روایات ہیں۔ آپ کا قول ہے "لازم ہے کہ جس کو خدا معرفت سے سرفراز کرے وہ گناہوں سے آلودہ نہ ہو۔" اس کا تعلق انسانی افعال اور انسان کی احکام خداوندی بجالانے میں کوشش پیہم سے ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہ جسے اپنی معرفت سے سرفراز کرتا ہے اسے گناہوں میں ملوث ہو کر ذلیل ہونے سے بچاتا ہے۔ تاہم معرفت اس کی عطا ہے اور گناہ انسانی فعل ہے۔ حق لمن أعزہ اللّٰہ بالمعرفة أن لا یذله بالمعصیة "جسے اللہ کی طرف سے عزت عطا ہو

اس کے لئے اپنے فعل سے ذلیل ہونا ممکن نہیں"۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی معرفت سے عزت دی مگر ان کی لغزش سے ان کو ذلیل نہیں کیا۔

ابو عبداللہ بن یحییٰ بن جلال رحمۃ اللہ علیہ

عظیم اہل طریقت میں سے تھے اور اپنے وقت کے پیش رو تھے۔ آپ کا طریق نیک اور سیرت قابل تعریف تھی۔ جنید کی صحبت پائی تھی ابو الحسن نوری اور دیگر مشائخ کبار سے ملاقات رہی۔ آپ کا کلام بلند اور اشارات لطیف ہیں۔ فرمایا **همة العارف إلى مولاه لم يعطف إلى شيء سواه** "عارف کا دل مشغول بحق ہوتا ہے اور وہ کسی اور چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔" عارف کے پاس بجز معرفت کے کچھ نہیں ہوتا۔ معرفت اس کے لئے سرمایہ دل ہوتی ہے اور دل ہمہ تن مشغول بحق ہوتا ہے۔ دل پراگندہ خیال ہو تو توہمات کی یورش ہوتی ہے اور توہمات پردۂ حائل بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ آپ نے ایک روز ایک نوجوان آتش پرست کو دیکھا اور اس کے حسن و جمال سے حیرت زدہ ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جنید کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا: "استاد محترم! کیا اتنا حسین چہرہ بھی جہنم کی نذر ہو سکتا ہے؟" جنید نے فرمایا: "بیٹا! یہ نفس کا کھیل ہے جس میں تو الجھ گیا ہے۔ نظارۂ عبرت نہیں اگر چشم عبرت سے دیکھے تو کارگاہ حیات کا ہر ذرہ یہی حسن و جمال رکھتا ہے۔ بہت جلد اس بے حرمتی کے باعث تجھ پر عذاب آنے والا ہے۔"

جنید یہ کہہ کر چلے گئے اور قرآن احمد بن یحییٰ کے دل و دماغ سے محو ہو گیا۔ سالہا سال توبہ کی۔ خدا سے توفیق مانگی۔ قرآن پھر یادداشت پر وارد ہوا اور اس کے بعد یہ یارا نہ رہا کہ بجز حق کے کسی چیز کی طرف نظر کرتے یا نظارۂ غیر پر وقت ضائع کرتے۔

ابو محمد رویم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ

جنید رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی رفیق تھے۔ فقہ میں داؤد کے پیروکار تھے۔ قرأت اور تفسیر قرآن کے عالم جید تھے۔ بلندی احوال اور رفعت مقام کے لئے مشہور تھے۔ مجرد سفر کرتے

تھے اور ریاضت شدید فرماتے تھے۔ اواخر عمر میں اپنے آپ کو اہل اموال میں چھپا لیا اور خلیفہ وقت کا اعتماد حاصل کر کے عہدۂ قضا پر فائز ہو گئے مگر ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ یہ چیز بھی انہیں محجوب نہ کر سکی جنید نے فرمایا: "ہم لوگ فارغ ہونے کے باوجود مشغول ہیں اور رویم مشغول ہونے کے باوجود فارغ ہے"۔

تصوف پر آپ کی تصانیف ہیں۔ ایک خاص کتاب سماع پر ہے جس کا نام "غلط الواجدین" ہے۔ میں اس کتاب کا بے حد مشتاق ہوں۔

کہتے ہیں ایک روز کسی شخص نے آ کر پوچھا "آپ کا کیا حال ہے؟" فرمایا "کیا حال ہوگا ایسے آدمی کا جس کا مذہب اس کی اپنی ہوس ہو جس کے خیالات دنیا تک محدود ہوں جو نہ زاہد متقی ہو نہ عارف برگزیدہ۔"

یہ اشارہ ہے عیوب نفس کی طرف کیونکہ نفس کے لئے مذہب، خواہش نفس تک محدود ہوتا ہے اور لوگ خواہش نفس کی متابعت کو مذہب کا نام دیتے ہیں اور اس کی پیروی کو شریعت کا جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے متقی ہے چاہے ملحد ہی کیوں نہ ہو۔ جو ان کی مرضی کے خلاف چلے بے دین ہے چاہے متقی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ آفت ہمارے زمانے میں زیادہ نمایاں ہے اور خدا کی پناہ ایسے آدمی سے جو اس قماش کا ہو۔

رویم کا جواب سائل کی قلبی کے مطابق تھا اور یقیناً انہوں نے صحیح تشخیص کی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود ایسی حالت میں مبتلا تھے اور اپنی ہی کیفیت بیان کر رہے تھے یعنی اپنی کمزوری کو انصاف کرنے والے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

ابو یعقوب یوسف ابن الحسین رازی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے وقت کے عظیم آئمہ اور قدیم مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ بہت لمبی عمر پائی۔ ذوالنون مصری کے مرید تھے۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات رہی اور سب کی خدمت کی۔ ان کا قول ہے: أذل الناس الفقير الطموع والمحب لمحبوبه "لوگوں میں ذلیل ترین شخصیت طمع کرنے والے فقیر کی ہے اور عزیز ترین محبوب سے سچی محبت رکھنے والے

کی۔" طمع درویش کے لئے دو جہاں کی رسوائی کا باعث ہے درویش تو پہلے ہی دنیا کی نظر میں حقیر ہوتا ہے اور اگر دنیا کی طمع رکھے تو اور بھی حقیر ہو جاتا ہے۔ غنا جس میں آبرو ہو ذلیل فقر سے بہتر ہے۔ طمع سے آلودہ فقیر بین طور پر جھوٹا نظر آتا ہے۔ محبّ اپنے آپ کو محبوب کے سامنے حقیر ترین سمجھتا ہے اور محبوب کی تواضع میں مصروف رہتا ہے۔ اس میں بھی طمع کا شائبہ ہے۔ طمع ختم ہو جائے تو حقیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زلیخا کو یوسف کی طمع تھی تو خواری ہی خواری تھی۔ جب طمع مٹ گئی تو رب العزت نے حسن و جوانی از سر نو عطا فرمائی۔ قاعدہ ہے کہ محبّ قدم آگے بڑھائے تو محبوب پیچھے ہٹتا ہے۔ جب دوست دوستی کو سینے سے لگا کر دوست سے فارغ ہو جاتا ہے اور صرف دوستی سے تسکین خاطر حاصل کرتا ہے تو دوست اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ محبت کے لئے عزت ہی عزت ہے۔ جب تک اسے وصل کی آرزو نہ ہو جب آرزوئے وصل ہو اور وہ کامیاب نہ ہو تو بجز ذلت کچھ بھی نہیں۔ اگر محبّ کو احساس دوستی فراق و وصال سے بے نیاز نہیں کرتا تو اس کی محبت یقیناً خام ہے۔ واللہ اعلم

ابوالحسن سمنون بن عبداللہ خواص رحمۃ اللہ علیہ

اپنے زمانے میں بے مثال تھے۔ محبت میں بلند مقام رکھتے تھے۔ سب مشائخ ان کی بزرگی کے قائل تھے۔ عام لوگوں میں "سمنون محبّ" کے نام سے مشہور تھے وہ خود اپنے آپ کو "سمنون کذاب" کہتے تھے۔ غلام الخلیل کے ہاتھوں بہت مصائب اٹھائے اور خلیفہ وقت کے روبرو محال شہادتیں دیں۔ مشائخ اس بات پر نہایت کبیدہ خاطر تھے۔ یہ غلام الخلیل ایک ریاکار اور جھوٹا مدعی طریقت و زہد تھا جو خلیفہ وقت اور امراء کے منہ چڑھا ہوا تھا۔ دین کو دنیا کے بدلے فروخت کرتا تھا جیسا کہ اس زمانے میں بھی ہو رہا ہے۔ غلام الخلیل مشائخ طریقت کی امراء کے سامنے برائی کرتا تھا اور اس کی مراد یہ تھی کہ صرف اس کی رسائی ہو اسکی جاہ و مرتبت قائم رہے اور کوئی سچے اہل دل کی طرف منہ نہ کرے۔ سمنون اور ان کے ہم عصر مشائخ کتنے خوش بخت تھے کہ ان کو صرف ایک غلام الخلیل سے واسطہ پڑا اس زمانے میں تو لاکھوں غلام الخلیل ہیں مگر کوئی ڈر نہیں مردار پر صرف کرگس گرتے ہیں۔

جب سمنون کی بغداد میں شہرت ہوئی اور لوگ آپ کی طرف جوق در جوق آنے لگے۔ تو غلام الخلیل کو بہت تکلیف ہوئی۔ مکروفریب کے جال پھیلانے لگا۔ ایک عورت سمنون کے حسن پر بظاہر فریفتہ ہوگئی اور اپنے آپ کو پیش کیا۔ آپ نے رد کر دیا۔ وہ جنید کے پاس گئی اور کہا کہ سمنون کو سمجھائیں کہ وہ اسے اپنی زوجیت میں قبول کرلیں۔ جنید برافروختہ ہوئے اور اس عورت کو سرزنش کی وہ پھر سمنون کے پاس آئی اور آپ پر ناپاک تہمت لگائی۔ غلام الخلیل دشمنوں کی طرح اس بات کو لے اڑا اور خلیفہ وقت کے سامنے شکایت کی۔ خلیفہ نے خفا ہو کر موت کا حکم دے دیا۔ جب جلاد آیا اور خلیفہ حکم دینے لگا تو اس کی زبان بند ہوگئی۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ ملک کا زوال سمنون کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسرے روز خلیفہ نے عذرخواہی کی اور سمنون کو عزت وآبرو سے رہا کر دیا۔

آپ کا کلام بلند ہے اور محبت پر دقیق اشارات ہیں۔ ایک دفعہ آپ حجاز سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں اہل فید نے وعظ کی درخواست کی۔ آپ نے منبر پر چڑھ کر کلام کیا مگر کسی پر اثر نہ ہوا۔ آپ نے قندیلوں کی طرف منہ کر کے فرمایا ''میں تم سے مخاطب ہوں۔'' تمام قندیلیں گر کر چور چور ہوگئیں۔ آپ کا قول ہے: **لا يعبر عن شيىء إلا بما هو أرق منه ولا شيء أرق من المحبة فبم يعبر عنها** ''ہر چیز کی تشریح اس چیز سے نازک تر الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔ محبت سے نازک تر کوئی چیز نہیں۔ محبت کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے۔'' مراد یہ ہے کہ محبت کی تعبیر محال ہے کیونکہ تعبیر معبر کی صفت اور محبت محبوب کی صفت ہے اس لئے الفاظ میں اس کے معانی نہیں سما سکتے۔ واللہ اعلم

ابوالفوارس شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ

شاہی خاندان سے تھے اور اپنے زمانے میں بے مثال تھے۔ ابوتراب نخشبی سے شرف مصاحبت تھا اور کئی مشائخ سے ملاقات تھی۔ ابوعثمان حیری کے سوانح میں آپ کے کچھ حالات بیان ہو چکے ہیں۔ تصوف پر ان کے کئی رسالے ہیں۔ ایک کتاب بھی ہے جسے ''مرآۃ الحکماء'' کہتے ہیں۔ آپ کا طرز کلام بہت بلند ہے فرماتے ہیں: **ولأهل الفضل**

فضل مالم یروه فإذا رأوه فلا فضل لهم ولأهل الولاية ولاية مالم يروها فإذا رأوها ولا ولاية لهم ''اہل فضیلت صاحب فضیلت ہیں جب تک وہ اپنی فضیلت کونہیں دیکھتے اور اہل ولایت صاحب ولایت ہیں جب تک ان کی نظر اپنی ولایت پر نہیں ہوتی۔'' مطلب یہ ہے کہ جہاں فضل وولایت ہو وہاں نظر ساقط ہو جاتی ہے اور جہاں نظر ہو وہاں فضل وولایت ساقط ہو جاتے ہیں کیونکہ فضل ایک ایسی صفت ہے جسے فاضل نہیں دیکھ سکتا اور ولایت ایک ایسی چیز ہے جسے ولی نہیں دیکھ سکتا۔ جب کوئی کہے کہ میں فاضل یا ولی ہوں تو وہ نہ فاضل ہے نہ ولی۔ کہتے ہیں آپ نے چالیس برس بیداری میں گزار دیئے۔ چالیس برس کے بعد سوئے تو خواب میں رویت باری تعالیٰ سے سرفراز ہوئے۔ عرض کی ''باری تعالیٰ! میں بیداری میں طالب دید تھا۔'' آواز آئی: ''اگر بیدار نہ رہتے تو آج خواب میں رویت بھی نصیب نہ ہوتی۔'' واللہ اعلم

عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ

بزرگ اور پیشرو اہل طریقت میں شمار ہوتے ہیں طریقت پر آپ کی تصانیف مشہور ہیں۔ ابوسعید خرازی کی ملاقات اور نباجی کی مصاحبت کے بعد آپ جنید کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ اصول میں آپ امام وقت تھے۔ آپ کا قول ہے: **لا يقع على كيفية الوجد عبارة لأنه سر الله عند المؤمنين** ''وجد کی تشریح نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ رب العزت اور مومن کے درمیان ایک راز ہے۔''

آدمی لاکھ کوشش کرے اس کی کوئی تشریح راز حق کو نہیں چھو سکتی کیونکہ انسانی گفتار اسرار ربانی کو قطعاً نہیں چھو سکتی۔

کہتے ہیں جب عمرو اصفہان آئے تو ایک نوجوان اپنے باپ کے فرمان کے خلاف آپ کی مجلس میں شامل ہوگیا۔ یہ نوجوان بیمار ہوگیا۔ بیماری طویل ہوگئی۔ ایک روز آپ کچھ لوگوں کے ساتھ اس کی عیادت کو گئے۔ نوجوان نے اشارے سے کہا: کسی قوال سے کہیے چند اشعار گائے آپ نے قوال کو حکم دیا اور اس نے گایا۔

مالی مرضت فلم یعدنی عائد منکم و یمرض عبدکم فاعود

"جب میں بیمار ہوتا ہوں تو تم عیادت نہیں کرتے جب تم بیمار ہوتے ہو تو میں عیادت کرتا ہوں۔"

بیمار نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی بیماری کم ہونے لگی۔ اس نے کہا کچھ اور۔ قوال نے پھر کہا،

أشد من مرضی علی صدودکم و صدود عبدکم علی شدید

"تمہارا نہ آنا عیادت کے لئے بیماری سے زیادہ سخت ہے۔ عیادت سے روکنا تکلیف دہ ہے۔"

نوجوان کھڑا ہو گیا اور اس کی بیماری دور ہو گئی اس کے باپ نے اسے عمرو کے سپرد کر دیا اور جو وسوسہ اس کے دل میں تھا اس سے توبہ کی۔ یہی نوجوان بعد میں ایک بزرگ صاحب طریقت ہوا۔ واللہ اعلم

ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ

شیخ وقت تھے۔ سب لوگ آپ کے مداح تھے۔ سخت ریاضت، نیک معاملت اور خلوص دل میں صاحب مقام تھے۔ عیوب افعال پر روشنی ڈالنے میں مشہور تھے۔ علمائے ظاہر کہتے ہیں کہ آپ نے شریعت اور حقیقت کو یکجا کیا۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ کسی نے شریعت اور حقیقت میں تفریق نہیں کی۔ شریعت بجز حقیقت کچھ نہیں اور حقیقت بجز شریعت کچھ نہیں۔ ابو محمد سہل کے اقوال عام طور پر آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس لئے علمائے ظاہر نے یہ غلطی کی ہے رب العزت نے شریعت کو حقیقت سے وابستہ کیا ہے اور کسی ولی اللہ کی جرأت نہیں کہ ان کو جدا کر سکے۔ اگر تفرقہ ثابت ہو جائے تو یقیناً ایک کو رد اور ایک کو قبول کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے رد شریعت الحاد ہے اور رد حقیقت شرک۔ جو فرق کیا جاتا ہے وہ معنوی نہیں بلکہ صرف اثبات حقیقت کے لئے کیا جاتا ہے چنانچہ لا إله الا اللّٰہ حقیقة و محمد رسول اللّٰہ شریعة "لا الہ الا اللہ حقیقت ہے اور محمد رسول اللہ شریعت"۔ اگر کوئی

چاہے کہ صحت ایمان بھی رہے اور ان دونوں جملوں میں فرق بھی ہو تو یہ قطعاً ناممکن ہے اور باطل کوشش ہے۔

الغرض حقیقت اصل ہے اور شریعت اس کی شاخ ہے۔ معرفت حقیقت ہے اور احکام خداوندی کی بجا آوری شریعت۔ دراصل اہل ظاہر ہر اس چیز سے انکار کر گزرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ یاد رکھو اصل راہ حق سے انکار کرنا خطرناک ہے اور دولت ایمان کے لئے اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

آپ کا قول ہے ما طلعت شمس ولا غربت علی وجه الارض الا وهم جهال بالله إلامن بواثر الله علی نفسه وروحه و دنياه واخرته "روئے زمین پر آفتاب طلوع ہو کر غروب ہو جاتا ہے مگر انسان خدا سے غافل رہتا ہے۔ سوائے اس شخص، کے جس نے خدا کو اپنے جان وتن اور خیال دنیا و عقبیٰ سے مقدم سمجھا۔"

مطلب یہ ہے کہ اپنے نصیب کی آغوش میں آسودہ رہنے والا اپنے خدا سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی معرفت ترک تدبیر کی مقتضی ہوتی ہے اور ترک تدبیر تسلیم کا باعث ہے تدبیر کا سہارا تردید تقدیر کے مترادف ہے۔ واللہ اعلم

ابو عبداللہ بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ

آپ عراق اور خراسان دونوں جگہ مقبول تھے۔ احمد بن خضرویہ کے مرید تھے۔ ابو عثمان حیری کو آپ سے بڑی ارادت تھی عشق تصوف کی پاداش میں متعصب لوگوں نے آپ کو بلخ سے نکال دیا تو آپ سمرقند چلے گئے اور وہیں عمر گذار دی۔ آپ کا قول ہے: أعرف الناس بالله أشد مجاهدة فی أو امره و اتبعهم لسنة نبيه "سب سے بڑا عارف وہ ہے جو سب سے زیادہ ریاضت کرے اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلے"۔ جو حق سے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ اس کے احکام پر زیادہ کاربند ہوتا ہے۔ جس کے مقدر میں دوری ہو وہ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی متابعت سے دور بھاگتا ہے۔

آپ کا ایک اور قول ہے: عجبت ممن يقطع البوادی والقفار والمفاو

حتى يصل إلى بيته و حرمه لأن فيه آثار أنبيائه كيف لا يقطع نفسه وهواه حتى يصل إلى قطبه لأن فيه آثار مولاه ''مجھے تعجب ہے اس آدمی پر جو خانہ خدا تک جانے کے لئے دشت وصحرا کو طے کرتا ہے تاکہ وہاں انبیاء علیہم السلام کی نشانیاں دیکھے۔ کیونکہ اپنے نفس اور نفسانی خواہشات کو عبور کر کے اپنے دل تک نہیں پہنچتا۔ دل میں تو اس کے مولا کے آثار ہیں۔'' مطلب یہ کہ دل معرفت حق کا مقام ہے اور اس کعبہ سے عظیم تر ہے جس طرف جبین بندگی ختم ہوتی ہے۔ خلق رو بہ قبلہ ہوتی ہے اور حق رو بہ دل۔ جہاں دل ہے میرا دوست وہیں ہے۔ جہاں اس کا حکم ہے میری آرزو وہیں ہے جہاں میرے انبیاء کے نشانات ہیں۔ میرے دوستوں کی نگاہیں وہیں مرکوز ہیں۔ واللہ اعلم

ابو عبداللہ بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کئی مایہ ناز کتابوں کے مصنف تھے جن کی فصاحت و بلاغت آپ کی کرامت کی دلیل ہے مثلاً ''ختم الولایت، کتاب النہج، نوادر الاصول'' وغیرہ۔ میرے نزدیک آپ کی عظمت بہت زیادہ اور میرا دل آپ کا گرویدہ ہے۔ میرے شیخ طریقت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ محمد بن علی ترمذی ایک ایسے در یکتا ہیں جس کی مثال نہیں۔ علوم ظاہری پر بھی آپ کی بہت تصانیف ہیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت ثقہ راوی ہیں۔ کلام پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ جس قدر معرض تحریر میں آ گئی تھی اہل عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ فقہ آپ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دوست سے پڑھی۔ ترمذ میں لوگ آپ کو محمد حکیم کہتے ہیں اور اہل تصوف میں فرقہ حکیمیہ کو آپ سے نسبت ہے۔

آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ آپ کی خضر علیہ السلام سے ملاقات تھی۔ وراق جو آپ کے مرید تھے، فرماتے ہیں کہ ہر شنبہ کو خضر علیہ السلام آپ کے پاس آتے تھے اور دونوں میں گفتگو ہوتی تھی۔

ان کا قول ہے: من جهل أوصاف العبودية فهو بنعوت الربانية أجهل ''جسے شریعت اور آداب بندگی کا علم نہ ہو اسے ہرگز علم حق نہیں ہوتا۔'' مطلب یہ ہے کہ جسے

ظاہراً اپنے نفس کی معرفت حاصل نہ ہوا سے معرفت حق بھی حاصل نہیں ہوتی۔ جسے آفات بشریت کی خبر نہ ہو وہ صفات حق سے بھی نا آشنا ہوتا ہے۔ ظاہر کو باطن سے تعلق ہے جس کو ظاہر سے آویزش ہو وہ بے باطن نہیں ہوسکتا اور جس کو باطن کا دعویٰ ہو وہ بے ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اوصاف ربانی کی معرفت ارکان بندگی کی صحت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے بغیر کبھی درست نہیں ہوسکتی۔ یہ بات نہایت درجہ صادق اور سود مند ہے اپنی جگہ پر بیان ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عزوجل

ابوبکر محمد بن عمر وراق رحمۃ اللہ علیہ

عظیم مشائخ اور زاہدوں میں شامل تھے۔ احمد خضرویہ سے ملاقات اور محمد بن علی سے مصاحبت رکھتے تھے۔ آداب و معاملات پر آپ کی بہت سی کتب ہیں۔ مشائخ کبار آپ کو ''مؤدب اولیاء'' کہا کرتے تھے۔ کہتے ہیں محمد بن علی نے چند کتابیں آپ کو دیں اور کہا انہیں دریا میں ڈال دو۔ آپ کو حوصلہ نہ ہوا۔ کتابیں گھر میں رکھ لیں اور محمد بن علی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ دریا میں ڈال دیں۔ پوچھا ''کیا دیکھا؟'' کہا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کہنے لگے غلط ہے پھر جاؤ اور کتابیں پانی میں ڈال کر آؤ۔ وراق کے دل پر اس کرامت کا اثر ہوا فوراً جا کر اجزائے کتاب پانی میں ڈال دیئے۔ پانی دو ٹکڑے ہو گیا ایک صندوق ظاہر ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ اجزاء اس صندوق میں چلے گئے۔ ڈھکنا بند ہو گیا۔ وراق نے واپس آ کر سب کیفیت بیان کی۔ محمد بن علی نے فرمایا: ''اب ٹھیک ہے۔'' آپ نے پوچھا ''یہ کیا راز ہے؟ مجھے بتایئے۔'' فرمایا: میں نے یہ کتاب اصول و تحقیق پر لکھی تھی مگر اتنی مشکل تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ خضر علیہ السلام نے مجھ سے طلب کی تھی اور دریا کو باری تعالیٰ کا حکم تھا کہ ان تک پہنچا دے۔''

ابوبکر وراق کا قول ہے: الناس ثلاثة: العلماء والفقراء والأمراء فإذا فسد العلماء فسد الطاعة وإذا فسد الفقراء فسد الأخلاق وإذا فسد الأمراء فسد المعاش ''لوگوں کے تین گروہ ہیں: علماء، امراء اور فقراء علماء تباہ ہو جائیں تو عمل

شریعت ختم ہو جائے۔ امراء تباہ ہو جائیں تو معیشت خلق برباد ہو جائے اور اگر فقراء مٹ جائیں تو لوگوں کے اخلاق نیست و نابود ہو جائیں۔"

امراء اور سلاطین کی تباہی جور و ستم سے ہوتی ہے۔ علماء کی طمع سے اور فقراء کی ریا سے امراء برباد نہ ہوں اگر وہ علماء سے منہ نہ موڑیں۔ علماء برباد نہ ہوں اگر وہ دولت کو تلاش نہ کریں۔ شاہوں کا جور و ستم بے علمی پر مبنی ہوتا ہے۔ طمع علماء کی بددیانتی سے جنم لیتی ہے اور فقراء کی ریا کے پیچھے بے توکلی کارفرما ہوتی ہے۔ بادشاہ بے علم، عالم بے پرہیز اور فقیر بے توکل شیطان کے قریب تر ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کا فساد ان تین گروہوں سے وابستہ ہے۔ واللہ اعلم

ابو سعید احمد بن عیسیٰ خراز رحمۃ اللہ علیہ

سفینہ اہل رضا، سالک طریق فنا احمد بن عیسیٰ خراز مریدوں کے حال بیان کرنے والے اور طالبوں کے وقت کو ثابت کرنے والے تھے۔ سب سے پہلے صاحب طریقت ہیں جنہوں نے فنا اور بقا کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ ریاضت، نکتہ رسی، عالی کلامی اور بلند اشارات کے لئے مشہور ہیں۔ ذوالنون مصری سے ملاقات اور بشر و سری سے مصاحبت فرمائی تھی۔ پیغمبر ﷺ کی حدیث ہے: جَبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰی حُبِّ مَنْ أَحْسَنَ اِلَیْهَا (1) "دل قدرتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے جو مہربانی سے پیش آئے۔"

اس حدیث سے متعلق ابو سعید نے فرمایا: واعجبا لمن یری محسنا غیرہ کیف لا یمیل بکلیته إلی الله "تعجب ہے اس آدمی پر جو دنیا میں بجز ذات خدا کسی کو محسن سمجھے اور خدا کو محسن سمجھ کر جان و دل اس کا نہ ہو جائے"۔

حقیقی احسان کرنے والا خالق اکبر ہے اور احسان دراصل اس پر ہوتا ہے جو احسان کا محتاج ہو۔ جو خود احسان کے محتاج ہوں وہ دوسروں پر کیا احسان کریں گے۔ رب العزت ہر چیز کا مالک و حاکم ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر دوستان حق ہر انعام

1۔ شعب الایمان، المقاصد الحسنۃ

میں منعم کو دیکھتے ہیں۔ ان کے دل مکمل طور پر اس کی محبت میں اسیر ہوتے ہیں اور وہ ہر غیر چیز سے اعتراض کرتے ہیں۔

ابوالحسن علی بن محمد اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ

کچھ لوگوں کے نزدیک آپ کا نام علی بن سہل تھا۔ مشائخ کبار میں ں شمار ہوتے تھے۔ جنید اور آپ کے درمیان لطیف خط و کتابت تھی۔ عمرو بن عثمان مکی آپ کی زیارت کے لئے اصفہان تشریف لائے۔ وہ ابوتراب کے مصاحب اور جنید کے رفیق تھے۔ تصوف میں آپ کا طریق قابل ستائش تھا۔ رضا و ریاضت سے آراستہ تھے اور فتنہ و آفت سے محفوظ۔ حقائق و معالات پر کلام بلیغ اور دقائق و اشارات پر بیان لطیف رکھتے تھے۔

آپ کا قول ہے: **الحضور أفضل من اليقين لأن الحضور و طنات واليقين خطرات** "حضوری یقین سے بہتر ہے کیونکہ حضوری کیفیت مستقل ہے اور یقین بدلنے والی چیز ہے۔" مطلب یہ کہ حضوری کا مقام دل ہے اور فراموش نہیں ہوسکتی۔ یقین ایک آنی جانی چیز ہے، جن کو حضور حاصل ہے وہ بارگاہ میں باریاب ہیں اور اہل یقین گویا آستانے پر پڑے ہیں۔ غیب و حضور پر ایک علیحدہ باب مناسب جگہ پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

آپ کا ایک قول ہے: **من وقت آدم إلى قيام الساعة الناس يقولون القلب القلب أن احب ان ارى رجلا يصف أيش القلب أو كيف القلب فلا أرى** "آدم سے لے کر قیامت تک لوگ دل دل پکاریں گے۔ مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جو یہ بتا سکے کہ دل کیا ہے اور کیسا ہے؟ کوئی نظر نہیں آتا۔" عام لوگ گوشت کے ٹکڑے کو دل کہتے ہیں۔ یہ دیوانوں، از خود رفتہ لوگوں اور بچوں کے پاس بھی ہوتا ہے مگر وہ بے دل ہوتے ہیں دل کیا ہے؟ بجز عبارت کچھ بھی نہیں۔ عقل کو دل کہو تو وہ دل نہیں۔ روح کو دل کہو تو وہ دل نہیں۔ مشاہدات حق کا مقام دل ہے اور دل بجز عبارت موجود نہیں۔

ابوالحسن محمد بن اسمٰعیل خیر النساج رحمۃ اللہ علیہ

اپنے وقت کے مشائخ کبار میں شمار ہوتے تھے۔ معاملات پر اور خطبات میں لطیف

طرز بیان رکھتے تھے۔ تحریر نہایت پاکیزہ تھی۔ عمر دراز پائی تھی۔ شبلی اور ابراہیم خواص نے آپ کی مجلس میں توبہ کی۔ شبلی کو آپ نے تعظیماً جنید کے پاس بھیجا۔ آپ سری کے مرید اور جنید اور ابوالحسن نوری کے ہم عصر تھے۔ جنید آپ کو بہت عزیز سمجھتے تھے اور ابوحمزہ بغدادی آپ سے بڑی ارادت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کو خیر النساج اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب آپ اپنے وطن سامرہ سے حج کی نیت سے نکلے اور کوفہ سے گذرے تو شہر کے دروازے پر ایک ریشم باف نے آپ کو پکڑ لیا اور کہا "تو میرا غلام ہے اور تیرا نام خیر ہے۔" آپ نے اس چیز کو من جانب اللہ سمجھا اور تردید نہ کی۔ کئی سال ریشم باف کی خدمت کرتے رہے وہ جب بھی کہتا "یا خیر" آپ فرماتے "لبیک۔ وہ از خود پشیمان ہوا۔ آخر ایک روز بولا "میں نے غلطی کی جاؤ، تم میرے غلام نہیں ہو۔

رہا ہو کر آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہ مقام پایا کہ جنید نے کہا "خیر ہم سب سے بہتر ہے۔" آپ "خیر" کہلوانا پسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے لئے روا نہیں کہ وہ نام بدل دوں جو ایک مرد مسلمان نے مجھے دیا ہے۔

کہتے ہیں جب آپ قریب المرگ ہوئے نماز شام کا وقت تھا۔ موت کی غفلت سے ذرا ہوشیار ہوئے۔ آنکھیں کھولیں اور ملک الموت کی طرف دیکھ کر بولے: "تو خدا کا فرمانبردار ہے۔ میں بھی فرماں بردار ہوں جو تجھے حکم ہوا ہے وہ تو بجا لا رہا ہے یعنی جان قبض کرنا۔ جو مجھے حکم ہوا ہے وہ رہا جاتا ہے۔ یعنی نماز شام۔ جو مجھے حکم ہے وہ بجا لانے دے پھر وہ حکم بجا لا جو تجھے ہوا ہے۔" پانی طلب کیا۔ وضو کے بعد نماز ادا کی اور داعی اجل کو لبیک کہی۔ اسی رات وہ خواب میں نظر آئے۔ آپ سے پوچھا گیا: "باری تعالیٰ کے حضور کیا گذری؟" فرمایا "یہ نہ پوچھو۔ مختصر یہ ہے کہ مجھے تمہاری دنیا سے نجات نصیب ہوئی۔"

آپ نے اپنی مجلس میں فرمایا: **شرح صدور المتقین و کشف بصائر الموقنین بنور حقائق الإیمان** "اللہ نے اہل اتقاء کے سینوں کو نور یقین سے کھول دیا اور اہل یقین کی بصارت کو حقائق ایمان کے نور سے۔" جہاں ایمان ہے وہاں یقین ہے اور جہاں یقین

ہے وہاں تقویٰ ہے کیونکہ یہ سب ایک دوسرے کے قریب ہیں اور تابع۔ واللہ اعلم بالصواب

ابوحمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ

خراسان کے قدیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابوتراب کے مصاحب تھے اور خراز سے ملاقات رکھتے تھے۔ توکل پر عزم راسخ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں آپ کسی کنوئیں میں گر گئے۔ تین دن کے بعد کچھ مسافر وہاں سے گذرے۔ آپ نے سوچا اُن کو پکارنا چاہئے پھر کہا ''نہیں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں غیر اللہ سے مدد کی درخواست کر رہا ہوں اور اپنے اللہ کی شکایت کر رہا ہوں۔'' جب مسافروں نے عین راہ میں کنواں دیکھا تو کہنے لگے آؤ اسے بند کر دیں۔ کوئی اس میں گر نہ جائے۔ ثواب ہوگا۔ ابوحمزہ بہت پریشان ہوئے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مسافروں نے کنواں اوپر سے بند کر دیا اور چلے گئے۔ ابوحمزہ عبادت حق میں مصروف ہو گئے اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ رات ہوئی تو کنوئیں سے باہر انہیں کچھ حرکت محسوس ہوئی غور سے دیکھا تو کنویں کا منہ کھلا ہوا تھا اور ایک اژدھا کی دم نیچے کو آ رہی تھی۔ آپ نے اسے تائید خداوندی سمجھا۔ دم کو تھام لیا اور اژدھا نے باہر کھینچ لیا۔ ہاتف غیب نے آواز دی: ''اب حمزہ کیا عمدہ نجات ہے۔ ہم نے تجھے موت کے ذریعہ موت سے بچا لیا۔''

آپ سے پوچھا گیا ''غریب کون ہوتا ہے؟'' فرمایا المتوحش من الالف'' جس کو انس و تعلق سے پرہیز ہو۔'' درویش کا دونوں عالم میں گھر نہیں ہوتا۔ عالم مستعار سے منقطع ہو کر وہ ہر چیز سے پرہیز کرتا ہے اور غریب ہوتا ہے۔ یہ مقام بہت بلند ہے۔

ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ

خراسان کے عظیم مشائخ میں سے تھے۔ جملہ اولیائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ آپ اوتاد میں شامل تھے اور قطب آپ کے شریک کار تھے۔ آپ سے پوچھا گیا بتایئے قطب کون ہے؟ آپ نے نام تو ظاہر نہیں کیا مگر اشارۃً بتایا کہ جنید قطب ہیں۔ کہتے ہیں آپ نے چالیس ایسے مشائخ کی خدمت کی جو صاحب تمکین تھے اور سب سے مستفید

ہوئے۔ان کی ظاہری باطنی قابلیت مسلمہ ہے۔آپ کا قول ہے: من کان سروره بغیر الحق یورث المهوم ومن لم یکن أنسه فی فد متمدیه یورث الوحشة" جسے بجز خدائے تعالیٰ کے کسی چیز سے خوشی ہو اس کی خوشی سر بسر رنج والم ہوتی ہے۔ جسے طاعت خداوندی سے محبت نہ ہو اس کی محبت سراپا وحشت ہوتی ہے۔" مطلب یہ ہے کہ بجز خدا کے ہر چیز فانی ہے۔ جسے فانی چیز سے لگاؤ ہے وہ اپنے مقصود کے فنا ہونے پر سوائے حسرت و اندوہ کے کچھ نہیں دیکھتا۔ اس کی اطاعت کے سوا ہر چیز خاک ہے۔ جب عالم ہستی کی بے مائیگی نمایاں ہوتی ہے تو اس کی محبت صرف وحشت ہو کر رہ جاتی ہے۔ الغرض غم و وحشت غیر اللہ کی طرف مائل ہونے کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم

ابو عبداللہ بن احمد بن اسمٰعیل مغربی رحمۃ اللہ علیہ

اہل توکل کے استاد، محققین کے پیشوا ابو عبداللہ بن احمد اپنے زمانے کے بزرگ پیشرو تھے۔ اپنے اساتذہ کی نظر میں مقبول تھے اور اپنے مریدوں کے احوال کے پاسدار۔

ابراہیم خواص اور ابراہیم شیبانی رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے مرید تھے۔ آپ کا کلام بلند تھا اور براہین نمایاں۔ تارک الدنیا ہونے میں ثابت قدم تھے۔ آپ کا قول ہے: ما رأیت أنصف من الدنیا إن خدمتها خدمتک وإن ترکتها ترکتک" دنیا سے زیادہ انصاف پسند کوئی چیز نہیں۔ جب تک اس کی خدمت کرو خدمت کرتی ہے۔ جب منہ پھیر لو منہ پھیر لیتی ہے۔" جو آدمی سچے دل سے دنیا سے روگرداں ہو وہ اس کی مصیبت سے بچ نکلتا ہے اور اس کی آفت سے محفوظ رہتا ہے۔ واللہ اعلم

ابو علی حسن بن علی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے زمانہ میں یگانہ روزگار تھے۔ علم معاملات اور رویت آفات پر آپ کی تصانیف بڑی روشن ہیں۔ آپ محمد علی ترمذی کے مرید تھے اور ابو بکر وراق کے ہم عصر تھے۔ ابراہیم سمرقندی آپ کے مرید تھے۔

آپ کا قول ہے: الخلق کلهم فی میادین الغفلة یرکضون وعلی الظنون

یعتمدون وعندھم انھم فی الحقیقة ینقلبون وعن المکاشفة ینطقون ''اہل دنیا غفلت کے میدان میں گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اپنے وہم وگمان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے اعمال حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا کلام کشف پر۔'' اس شیخ طریقت کا اشارہ غرور طبع اور رعونت نفس کی طرف ہے۔ جاہل کبھی اپنی جہالت کا معترف نہیں ہوتا بے علم جھوٹے صوفیاء کی طرح۔ صاحب علم صوفی تمام مخلوق میں قابل توقیر ہوتے ہیں اور بے علم ذلیل وخوار۔ عالم کا سہارا گمان نہیں بلکہ حقیقت ہوتی ہے۔ جاہل حقیقت سے دور وہم وگمان میں مبتلا ہوتے ہیں۔ راہ غفلت پر گامزن ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ راہ ولایت ہے۔ گمان پر اعتماد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں یہ حقیقت ہے۔ ظاہری رسوم کی پابندی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہ اصلیت ہے۔ خواہش نفس کی بناء پر کلام کرتے ہیں اور اسے کشف کا نام دیتے ہیں۔ انسان کے سر سے غرور وپندار نہیں نکلتا جب تک جلال حق رونما نہیں ہوتا۔ اس کے جمال میں ہر چیز غائب ہوجاتی ہے۔ ان کا پندار بھی فنا ہوجاتا ہے اس کے جلال کے سامنے وہ خود بھی کالعدم ہوجاتے ہیں پندار کا تو ذکر ہی کیا۔ واللہ اعلم

ابومحمد بن حسین جریری رحمۃ اللہ علیہ

جنید کے رفیق تھے۔ سہل بن عبداللہ کی مصاحبت سے مستفید ہوئے۔ تمام اصناف علوم کے ماہر اور فقہ کے امام وقت تھے۔ نیک اصول تھے اور تصوف میں اتنے بلند مقام تھے کہ جنید نے آپ کو اپنے مریدوں کے لئے تلقین ادب وریاضت پر مقرر فرمایا۔ جنید کے بعد آپ ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کا قول ہے: دوام الإیمان و قوام الأدیان و صلاح الابدان فی خلال ثلاث: الاکتفاء والاتقاء والاحتماء...... الخ ''دوام ایمان، پختگی دین اور اصلاح بدن تین چیزوں سے وابستہ ہے: کفایت، تقویٰ اور احتیاط سے جس نے اللہ کو کفیل سمجھا اس کا دل منور ہوا۔ جس نے ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کیا اس کی سیرت پاک ہوئی جو اپنے طعام کے معاملے میں محتاط ہوا اس کے نفس کو ریاضت نصیب ہوئی۔ کفایت کا ثمرہ معرفت ہے۔ تقویٰ کا حاصل حسن اخلاق اور احتیاط طعام کا اعتدال طبیعت۔''

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: ''نماز شب کی کثرت دن کے وقت چہرہ کو منور رکھتی ہے(1)۔'' احادیث میں ہے کہ ''متقی لوگ قیامت کے روز آئیں گے منور چہروں کے ساتھ نور کے تختوں پر۔''(2)

جو آدمی طعام کے معاملے میں احتیاط برتتا ہے علت نفس اور شہوت سے پاک رہتا ہے یہ نہایت حسین و بلیغ بات ہے۔ واللہ اعلم

ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل آملی رحمۃ اللہ علیہ

محتشم بزرگ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تفسیر و قرآت کے عالم تھے۔ لطائف قرآن کا فہم و ادراک آپ کی خصوصیت تھی۔ جنید کے عظیم مریدوں میں شامل تھے۔ ابراہیم مارستانی کی صحبت سے مستفید ہوئے ابوسعید خراز آپ کی بہت توقیر کرتے تھے اور تصوف میں بجز آپ کے کسی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

آپ کا قول ہے: **السکون إلی مالوفات الطبائع یقطع صاحبها عن بلوغ درجات الحقائق** ''جس چیز سے محبت ہو اس سے سکون حاصل کرنا آدمی کو اس کے مقام سے گرا دیتا ہے۔'' مطلب یہ کہ جو کوئی محبوب چیزوں کی وجہ سے تسکین پاتا ہے وہ حقیقت سے دور جا پڑتا ہے کیونکہ میلان طبیعت نفس کا آلہ کار ہے۔ نفس مقام حجاب ہے اور حقیقت کشف کا محل ہے۔ محبوب چیز سے الجھا ہوا مرید صاحب کشف کی برابری نہیں کر سکتا۔ ادراک حقائق کشف ہے اور محبوب اشیاء سے روگردانی میں مضمر ہے۔ انسانی طبیعت کا میلان دو طرف ہوتا ہے: ایک دنیا اور اس کی دلچسپیوں کی طرف دوسرا عقبیٰ اور اس کی نعمتوں کی طرف۔ دنیا کا میلان جنسیت سے جنم پاتا ہے۔ عقبیٰ کی محبت کی بناء خیال پر ہوتی ہے جس میں ناجنسیت اور ناآشنائی شامل ہوتی ہے۔ عقبیٰ کا تصور، تصور ہی ہوتا ہے کیونکہ اگر حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے تو آدمی دنیا سے کلیتہً منقطع ہو جائے ولایت کی منزل

1۔ عقیلی، الضعفاء، یہ مدرج ہے۔ 2۔ مشکوٰۃ المصابیح میں شاہد مذکور ہے۔

سامنے آجائے اور حقائق روشن ہو جائیں۔ عقبیٰ کا تعلق فطری طور پر فنا سے ہے۔ ''عقبیٰ میں جو کچھ ہے وہ انسانی وہم و قیاس میں نہیں آسکتا۔'' عقبیٰ کی منزلت اسی میں ہے کہ اس کی راہ سخت مشکل ہے۔ جو چیز انسانی دل و دماغ میں سما سکے وہ بے قدر و منزلت ہوتی ہے۔ جب وہم و قیاس حقیقت عقبیٰ کو نہیں پا سکتے طبیعت کو اس کے عین نظارہ سے کیا الفت ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے میلان طبع صرف عقبیٰ کے تصور کی طرف ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

ابوالمغیث حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

غریق معانی، ہلاک دعویٰ حسین بن منصور حلاج اس طریقت کے مشتاقوں اور مستوں میں شامل تھے۔ بہت عالی ہمت تھے۔ مشائخ کبار میں آپ کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک گروہ انہیں مردود کہتا ہے دوسرا مقبول سمجھتا ہے۔ مثلاً عمرو بن عثمان مکی، ابو یعقوب نہر جوری، ابو ایوب اقطع، علی بن سہل اصفہانی وغیرہم۔ نیز ابن عطا، محمد بن حنیف، ابوالقاسم نصر آبادی اور تمام متاخرین آپ کو مقبول سمجھتے ہیں کچھ لوگ آپ کے معاملے میں فیصلہ کن بات نہیں کہتے مثلاً جنید، شبلی، جریری، حصری، کچھ اور لوگ آپ کو جادوگر تصور کرتے ہیں مگر ہمارے زمانے میں شیخ ابو سعید ابو الخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابو العباس اشقانی آپ کے ساتھ ارادت کا اظہار کرتے ہیں اور آپ کی بزرگی کے معترف ہیں۔ ابوالقاسم قشیری کہتے ہیں کہ اگر حسین بن منصور حلاج ارباب حقیقت و معانی میں سے ہے تو خلقت کے رد کرنے سے رد نہیں ہوتے۔ اگر مہجور طریقت اور مردود حق تھے تو خلقت کے مقبول کہنے سے مقبول نہیں ہوتے۔ آپ کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہئے اور جہاں تک وہ حق پر نظر آئیں آپ کو قابل تحریم سمجھنا چاہئے الغرض چند مشائخ کے سوا باقی آپ کے کمال فضل، صفائی حال اور کثرت اجتہاد و ریاضت کے منکر نہیں ہیں۔

خیانت تھی کہ آپ کا ذکر اس کتاب میں نہ کیا جاتا اور وہ بھی صرف اس بناء پر کہ چند اہل ظاہر آپ کو کافر سمجھتے ہیں۔ آپ کی بزرگی سے انکار کرتے ہیں۔ آپ کے احوال کو جادو اور فریب سے منسوب کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حسین بن منصور وہی ملحد حسین

بن منصور حلاج ہے جو محمد بن زکریا کا استاد اور ابوسعید قرمطی کا رفیق تھا۔ مگر یہ منصور جن کے متعلق مشائخ میں اختلاف ہے فارسی النسل تھے اور بیضاء کے رہنے والے تھے اور آپ کو رد اس بناء پر نہیں کیا جاتا کہ آپ کی تعلیم اور آپ کا دین خام تھا بلکہ اس واسطے کیا جاتا ہے کہ آپ کا کردار اور خلق قابل گرفت تھا۔

وہ پہلے پہل سہل بن عبداللہ کے مرید ہوئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ان کی اجازت حاصل کئے بغیر چلے گئے اور عمرو بن عثمان سے جا ملے۔ کچھ عرصہ بعد ان کو بھی بلا اجازت چھوڑ دیا اور جنید کی طرف منہ کیا مگر انہوں نے قبول نہ فرمایا اسی وجہ سے ان کو سب نے چھوڑ دیا۔ وہ دراصل مہجور معاملت تھے مہجور اصل نہیں تھے۔ شبلی نے آپ کی نسبت فرمایا: ''میں اور حلاج برابر ہیں۔ میرے جنون نے مجھے بچالیا اور اس کی عقل نے اسے ہلاک کر دیا۔'' محمد بن حنیف نے فرمایا'' وہ عالم ربانی ہے۔'' وغیرہ۔ دراصل مشائخ کرام کی ناخوشنودی اور ان سے علیحدگی نے منصور کو مہجور اور وحشت زدہ کر دیا۔

آپ کی تصانیف روشن ہیں اور اصول و فروع میں آپ کے رموز اور آپ کا کلام مہذب ہے۔ میں نے بغداد اور اس کے نواح میں کم وبیش پچاس رسالے آپ کے قلم سے نکلے ہوئے دیکھے اور کچھ خوزستان، فارس اور خراسان میں بھی۔ سب میں ایسی چیزیں نظر آئیں جو عموماً مرید ابتداء میں ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ ٹھوس ہیں۔ کچھ کمزور، کچھ آسان اور کچھ ناقابل قبول۔ جب بارگاہ حق سے کسی چیز کا ظہور ہوتا ہے تو دیکھنے والا اپنی وجدانی کیفیت کو معرض بیان میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ الفاظ مبہم ہوتے ہیں خاص طور پر جب لکھنے والا تعجیل بھی کرے اور اسے اپنے اوپر ناز بھی ہو۔ یہ الفاظ تخیل پر گراں گذرتے ہیں۔ سننے والے ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں'' واہ کیا نازک چیز ہے۔'' قطع نظر اس سے کہ وہ باور کریں یا نہ کریں۔ بہر حال وہ سمجھتے کچھ بھی نہیں اور ان کا باور کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب اہل نظر کسی ظہور حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کو معرض بیان میں لانے سے گریز کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی تفاخر کا مستحق نہیں

سمجھتے۔ عزت وذلت سے بے نیاز ہوتے ہیں اور کسی کا باور کرنا یا نہ کرنا ان کو متاثر نہیں کرتا۔

جو لوگ منصور کے احوال کو جادو سے منسوب کرتے ہیں غلطی پر ہیں۔ اہل سنت کے اصول کے مطابق جادو ٹھیک ہے جس طرح کہ کرامت۔ مگر عالم باکمال کا جادو کا مرتکب ہونا کفر ہے اور کرامت کا سرزد ہونا معرفت ہے۔ جادو قہر خداوندی کا مظہر ہے اور کرامت اس کی رضا کا۔ اہل سنت میں صاحب بصیرت لوگ بالاتفاق مانتے ہیں کہ جادوگر مسلمان نہیں ہوسکتا اور کافر صاحب کرامت نہیں بن سکتا کیونکہ متضاد چیزیں بہم جمع نہیں ہوسکتیں۔ اثبات کرامت کے تحت اس بارے میں اور تشریح کی کی جائے گی۔

حسین بن منصور تابقید حیات خیر وصلاح کے راستے پر رہے تھے۔ نماز، ذکر، مناجات، روزہ دائمی، اور پاکیزہ حمد وثنا آپ کا شیوہ تھا۔ آپ نے توحید پر لطیف نکات بیان فرمائے اگر وہ جادوگر ہوتے تو یہ سب چیزیں محال تھیں۔ لامحالہ کرامات تھیں اور کرامات صرف ولی محقق سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اہل اصول میں سے کچھ لوگ آپ کو اس بناء پر رد کرتے ہیں کہ آپ کے اقوال میں اتحاد وامتزاج کا پہلو نکلتا ہے لیکن یہ عیب عبارت میں ہے۔ معانی میں نہیں۔ مغلوب الحال لوگ صحیح عبارت پر قادر نہیں ہوتے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عبارت کا اصلی مفہوم مشکل ہو پڑھنے والا صاحب عبارت کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہو اور اپنی کوتاہی کی وجہ سے عبارت کو بے معنی قرار دے دے۔ یہ کوتاہی اس کی اپنی ہے عبارت کی نہیں۔

میں نے بغداد کے ملحدوں کا ایک ایسا گروہ بھی دیکھا جو حلاج کی اقتداء کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ کے اقوال کو اپنی بے دینی کی بنیاد بناتے ہیں اور حلاجی کہلاتے ہیں۔ منصور کے بارے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ جس طرح رافضی لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں۔ ان کی تردید باب اختلافات میں آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ مختصراً یہ ہے کہ منصور بن حلاج کے اقوال کی پیروی روا نہیں کیونکہ وہ مغلوب الحال تھے اور پیروی صرف صاحب تمکین کی ہوسکتی ہے۔

الحمدللہ مجھے حسین بن منصور سے ارادت ہے لیکن آپ کا طریق کسی اصلیت پر قائم نہیں اور حال کسی ایک محل پر قرار پذیر نہیں۔ آپ کے احوال میں بہت فسادات ہیں۔ میں نے ابتدائے حال میں آپ کے قوال سے بہت سے دلائل حاصل کئے آپ کے کلام کی شرح بھی لکھی اور دلائل و براہین سے اس کی صحت حال اور رفعت کلام کو ثابت کیا۔ اپنی کتاب ''منہاج الدین'' میں بھی اس کی ابتداء اور انتہاء پر تبصرہ کیا اور یہاں بھی کچھ نہ کچھ بیان کر دیا۔ جس چیز کو اتنی احتیاط اور کاٹ چھانٹ کے بعد اپنایا جاسکے اس کی پیروی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یاد رکھو خواہش و ہوا کو صداقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ صاحب ہوا ہمیشہ طریقت میں ناہموار اور الٹی سیدھی چیزیں تلاش کرتا ہے۔ حسین بن منصور کا ایک قول ہے: ''زبانیں بولنے کی خواہش مند ہیں اور گفتگو کے تلے ہلاک ہونے کی آرزو مند۔'' اس قسم کے اقوال خطرناک ہوتے ہیں۔ حقیقت کے معانی بیان کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ اگر معانی موجود ہیں تو اظہار سے معرض وجود میں نہیں آسکتے۔ اظہار صرف تو ہم آفرین ہوتا ہے اور تو ہم طالب کو گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ لفظی اظہار ہی اصل حقیقت ہے۔ واللہ اعلم

ابواسحاق ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ

توکل میں عظیم الشان اور بلند منزلت رکھتے تھے۔ بہت سے مشائخ کرام سے ملاقات کی۔ آپ کی کرامات بے شمار ہیں اور معاملات طریقت پر کئی خوبصورت تصانیف۔

آپ کا قول ہے: **العلم کلة فی کلمتین لا تتکلف ما کفیت و لا تضیع ما استکفیت** ''تمام علم دو جملوں میں مضمر ہے، اس چیز کو کرنے کی کوشش نہ کرو جو تمہارے لئے ہو چکی ہے اور اس چیز کو کرنے سے گریز نہ کرو جو تمہارے اوپر عائد ہو چکی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ مقدر کے ساتھ مت کھیلو جو ازل سے مقدر ہو چکا ہے وہ کوشش سے بدلا نہیں جاسکتا۔ اس کے احکام سے سرتابی نہ کرو۔ سرتابی کے لئے سزا ملے گی۔

آپ سے پوچھا گیا'' آپ نے کیا عجائبات دیکھے؟''

فرمایا: ''بہت عجائبات دیکھے مگر سب سے زیادہ عجیب چیز یہ ہے کہ مجھے خضر علیہ السلام

نے دعوت شرکت دی اور میں نے انکار کر دیا۔ اس واسطے نہیں کہ مجھے کسی بہتر رفیق کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس لئے کہ مجھے بجائے خدا کے ان پر زیادہ اعتماد کرنا پڑے گا اور خدا پر میرا توکل گھٹ جائے گا اور نتیجہ کے طور پر میں اپنے فرائض کو تندہی کے ساتھ سرانجام نہ دے سکوں گا۔'' یہ کامل ہونے کا ایک مقام ہے۔

ابوحمزہ بغدادی بزاز رحمۃ اللہ علیہ

آپ عظیم صوفی متکلموں میں شمار ہوتے ہیں۔ حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ سری کے مصاحب اور نوری اور خیر النساج کے ہم عصر تھے۔ بغداد کی مسجد رصافہ میں وعظ کیا کرتے تھے۔ تفسیر اور قرأت کے جید عالم تھے۔ احادیث پیغمبر ﷺ کے قابل اعتماد راوی بھی تھے۔ آپ نوری کے ساتھ تھے جب ان پر سختی کی جا رہی تھی اور جب باری تعالیٰ نے صوفیاء کو موت کے پنجے سے نجات دی تھی۔ نوری کی تعلیم کی تشریح کرتے وقت اس حکایت کو بیان کیا جائے گا۔

آپ کا قول ہے: إذا سلمت منک نفسک فقد أدیت حقها وإذا سلم منک الخلق قضیت حقوقهم ''اگر تمہارا نفس اپنے ہاتھ سے محفوظ ہے تو تم نے اپنی ذات کا حق ادا کر دیا اور اگر خلقت تمہارے ہاتھوں سے محفوظ ہے تو تم نے ان کا تمام قرض چکا دیا۔'' مطلب یہ ہے کہ انسان پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ایک اپنی ذات کے ساتھ اور ایک باقی انسانوں کے ساتھ۔ اگر تم اپنے نفس سے گریز کرو اور نجات اخروی کا راستہ تلاش کرو تو تمہاری پہلی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ اگر خلقت کو اپنی بدکرداری سے نقصان نہ پہنچاؤ تو دوسرا حق بھی ادا ہو گیا۔ اپنے نفس کو محفوظ رکھو۔ دوسروں کو تکلیف نہ دو اور اس کے بعد اپنے خالق کے حقوق پورے کرو۔

ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ

آپ محقق مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے اور حقائق کے معاملے میں بڑی شان اور منزلت رکھتے تھے تمام مشائخ آپ کو قابل احترام سمجھتے تھے۔ آپ جنید کے قدیم مریدوں

میں شامل تھے۔ آپ کا کلام نہایت گہرا تھا اور ظاہر پرست اس کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ آپ کو امن وسکون نصیب نہ ہوا جب تک آپ مرو میں تشریف فرمانہ ہوئے۔ مرو کے لوگوں نے آپ کا خیر مقدم کیا کیونکہ آپ نہایت حلیم الطبع اور متورع بزرگ تھے۔ اہل مرو نے آپ کا کلام سنا اور آپ نے اپنی باقی عمر وہیں گذار دی۔

آپ کا قول ہے: الذاکرون فی ذکرہ أکثر غفلة من الناسین ''ذکر بھول جانے والوں سے ذکر یاد رکھنے والے زیادہ غافل ہوتے ہیں۔'' اگر کوئی ذکر بھول جائے تو کوئی حرج نہیں۔ حرج یہ ہے کہ ذکر یاد رہے اور خدا بھول جائے۔ ذکر مقصود ذکر سے مختلف ہوتا ہے۔ مقصود ذکر کو فراموش کر دینا اور پندار ذکر میں مبتلا رہنا غفلت سے زیادہ قریب ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ ذکر بے پندار فراموش ہو جائے۔ بھولنے والے کو اپنے نسیان و غیبت کے عالم میں پندار حضوری نہیں ہوتا۔ ذاکر کو ذکر و غیبت کی حالت میں پندار حضوری ہوتا ہے۔ پندار حضوری بدون حضوری غفلت کے نزدیک تر ہے۔ طالبان حق کی ہلاکت پندار سے واقع ہوتی ہے۔ جہاں پندار زیادہ ہو وہاں حقیقت کم ہوتی ہے اور جہاں حقیقت کم ہو وہاں پندار کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ پندار کی بنیاد عقل کی بدگمانی پر ہوتی ہے اور عقل کی بدگمانیوں سے بدگمانیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہمت اہل حق کو بدگمانی اور حرص سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ ذکر حق یا غیبت میں ہوتا ہے یا حضور میں۔ جب ذاکر اپنے آپ سے غائب اور حضور حق میں حاضر ہو تو یہ حضور ہی نہیں بلکہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ جب ذکر کرنے والا حق سے غائب اور اپنی ذات میں حاضر ہو تو یہ ذکر نہیں غیبت ہے اور غیبت غفلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

ابو بکر بن دلف بن جحدر شبلی رحمۃ اللہ علیہ

آپ مشہور اور بزرگ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ عنایت حق سے مہذب اور پاک وقت پایا۔ آپ کے لطیف ارشادات نہایت درجہ قابل تعریف ہیں چنانچہ متاخرین میں سے کسی نے کہا ہے: ''دنیا کی تین عجیب چیزیں ہیں، شبلی کے اشارات، مرتعش کے نکات اور

جعفر کی حکایات۔'' آپ قوم کے سردار اور اہل طریقت کے پیش رو تھے۔ ابتداء میں خلیفہ وقت کے حاجبوں کے افسر تھے۔ خیر النساج کی مجلس میں توبہ کی اور تعلق ارادت جنید سے کیا۔ اکثر مشائخ کبار سے ملاقات کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور:30) ''اہل ایمان سے کہو اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔'' اس کی تفسیر کرتے ہوئے شبلی نے فرمایا: ''اے پیغمبر! اہل ایمان سے کہو کہ وہ اپنی جسمانی آنکھیں حرص انگیز چیزوں سے بچائیں اور اپنی روحانی آنکھیں بجز اللہ کے ہر چیز سے بچائیں۔'' مطلب یہ کہ مومن حرص انگیز چیز سے نظر پھیریں اور بجز مشاہدہ حق کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں، یہ نشان غفلت ہے کہ انسان حرص وہوا کی پیروی کرے اور نفسانی خواہشات کو برانگیختہ کرنے والی چیزوں کو دیکھتا پھرے۔ غافل کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اسے اپنے عیوب کی خبر نہیں ہوتی۔ دنیا کا بے خبر عاقبت میں بھی بے خبر ہوگا۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (الاسراء:72) ''اس دنیا کے اندھے آخرت میں بھی اندھے ہوں گے۔''

فی الحقیقت جب تک باری تعالیٰ کسی کو حرص وہوا سے پاک نہ کرے اس کی آنکھیں ناقابل دید چیزوں سے محفوظ نہیں ہوتیں۔ اور جب تک اس کی ذات پاک کسی دل کو اپنی محبت کا مسکن نہ بنائے اس کی روحانی آنکھیں رویت غیر سے مصون (محفوظ) نہیں رہ سکتیں۔

کہتے ہیں آپ ایک روز بازار میں نکلے تو لوگوں نے آپ کو دیوانہ کہہ کر پکارا۔ آپ نے فرمایا: أنا عندكم مجنون وأنتم عندى أصحاء فزاد الله فى جنونى وزادفى صحتكم ''تم مجھے دیوانہ کہو میں تمہیں فرزانہ (ہوشیار) کہتا ہوں۔ میری دیوانگی محبت کے سبب ہے تمہاری فرزانگی غفلت کے باعث۔ اللہ میری دیوانگی کو زیادہ کرے اور تمہاری فرزانگی کو۔''

یہ آپ نے معرض غیرت میں کہا ورنہ آدمی اتنا بے خود کیوں ہو کہ خدا کی محبت اور دیوانگی میں فرق قائم نہ رکھ سکے اور دنیا و آخرت میں دونوں کی حد امتیاز نمایاں نہ رہنے دے۔ واللہ اعلم

ابو محمد بن جعفر بن نصر خالدی رحمۃ اللہ علیہ

آپ جنید کے قدیم اصحاب میں شامل تھے۔ علم طریقت میں کامل تھے۔ انفاس شیوخ کے پاسدار اور ان کے حقوق کے نگہبان تھے۔ آپ کا کلام ہر فن پر بہت بلند تھا خاص طور پر ترک رغبت پر، ہر مسئلہ پر کوئی نہ کوئی حکایت بیان فرماتے تھے اور اس کا حوالہ کسی نہ کسی کی طرح ہوتا تھا۔

آپ کا قول ہے: التوکل: استواء القلب عند الوجود والعدم ''توکل یہ ہے کہ تیرے رزق کا عدم و وجود تیرے دل کے لئے یکساں ہو۔'' مطلب یہ کہ رزق کی موجودگی مسرت کا باعث نہ ہو اور اس کی غیر موجودگی غم والم کا سبب نہ بنے۔ وجود انسانی خدا کی ملکیت ہے۔ اس کی پرورش اور ہلاکت پر وہ مالک ہی قادر ہے۔ بلا چون و چرا ملکیت کو مالک کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

آپ فرماتے ہیں: میں ایک روز جنید کے پاس آیا اور وہ بخار کی حالت میں تھے۔ میں نے کہا دعا کریں خدا صحت دے فرمایا'' میں نے کل دعا کی تھی ہاتف غیب نے کہا: تیرا جسم خدا کی ملکیت ہے وہ تندرست رکھے یا بیمار تو دخل دینے والا کون ہے اپنا تصرف ختم کرتا کہ صحیح مقام بندگی حاصل ہو۔'' واللہ اعلم

ابو علی بن محمد قاسم رودباری رحمۃ اللہ علیہ

آپ بزرگ اور جواں مرد صوفیائے کرام میں شمار ہوتے تھے اور ان کے پیشرو تھے۔ شہزادے تھے۔ فن معاملت میں عظیم شان کے مالک تھے۔ آپ کے مناقب اور آیات بے شمار ہیں۔ تصوف کے دقیق نکات پر آپ کا کلام نہایت لطیف ہے۔

آپ کا قول ہے: المرید لا یرید لنفسه إلاما أراد الله له والمراد لا یرید من الکونین شیئا غیره ''مرید صرف اس چیز کی طلب کرتا ہے جو حق تعالیٰ اس کے لئے چاہتا ہے اور مراد کونین میں کسی غیر اللہ کی طلب نہیں رکھتا۔'' مطلب یہ ہے کہ رضائے حق پر راضی رہنے والا مرضی کو ترک کر دیتا ہے تا کہ صحیح مرید کا مقام حاصل کر سکے۔ اہل محبت کی

اپنی مرضی کوئی ہوتی ہی نہیں اس لئے اس کی اپنی مراد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ حق کو چاہتا ہے، اور وہی چاہتا ہے جو حق چاہتا ہے جسے حق چاہے وہ بجز حق کے کسی چیز کو نہیں چاہتا۔ الغرض رضا مقام ابتدا ہے اور محبت انتہا۔ مقامات تحقیق بندگی کے لئے ہیں اور وحدانیت (مشرب) تائید ربوبیت کے لئے۔ مرید اپنی ذات میں قائم ہوتا ہے اور مراد ذات حق میں۔ واللہ اعلم

ابو العباس قاسم بن مہدی سیاری رحمۃ اللہ علیہ

آپ اپنے وقت کے امام تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے علمبردار تھے۔ ابو بکر واسطی کی مصاحبت پائی تھی۔ کئی مشائخ کبار سے تحصیل ادب کی تھی۔ اہل طریقت میں رفاقت کے معاملے میں بہت آراستہ اور الفت میں بہت پیراستہ تھے۔ آپ کا کلام عالی اور تصانیف عمدہ ہیں۔

آپ نے فرمایا: التوحید أن لا یخطر بقلبک مادونہ ''توحید یہ ہے کہ دل میں کوئی چیز بجز خدا کے راہ نہ پائے۔'' مطلب یہ کہ مخلوقات میں سے کسی کو دل سے تعلق نہ ہو اور معاملت کی صفائی میں کدورت نام کو نہ ہو۔ خیال غیر کی بنیاد اثبات غیر اللہ پر ہے اور اثبات غیر توحید کی نفی ہے۔

آپ مرو کے ایک خوشحال اور بلند اقتدار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ کی طرف سے بہت سی دولت ورثہ میں ملی مگر آپ نے تمام کی تمام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو عدد موئے مبارک کے عوض دے دی۔ ان دو بالوں کی برکت سے رب العزت نے آپ کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ ابو بکر واسطی کی صحبت میں رہے اور وہ مقام پایا کہ اہل طریقت کے ایک گروہ کے امام کہلائے۔ وفات سے پہلے وصیت کی کہ موئے مبارک دفن کرتے وقت ان کے منہ میں رکھ دیئے جائیں۔ آپ کا مزار مرو میں ہے آج بھی حاجت مند لوگ وہاں جاتے ہیں، منتیں مانتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔ اور حل مقاصد کے لئے آپ کی قبر پر جانا مجرب ہے۔ واللہ اعلم

ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ

اپنے زمانے کے امام تھے اور مختلف علوم پر عبور رکھتے تھے۔ مجاہدہ میں عظیم شان اور حقائق میں شافی بیان کے مالک تھے۔ آپ کے احوال کی پاکیزگی آپ کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ ابن عطا، شبلی، حسین بن منصور اور جریری رضی اللہ عنہم سے مصاحبت رہی۔ مکہ معظمہ میں یعقوب نہرجوری سے ملاقات کی۔ عالم تجرید میں بہت سفر کیے۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ رب العزت نے توبہ کی توفیق دی اور آپ نے حکومت سے اعراض کیا۔ آپ کا مقام اہل معانی کے نزدیک بہت بلند ہے۔ آپ نے فرمایا: التوحید الإعراض عن الطبیعة ''توحید طبیعت سے اعراض کرنے کا نام ہے۔'' مطلب یہ کہ طبیعتیں آلائے حق سے محجوب ہیں اور اس کی نعمتوں کو دیکھنے سے قاصر۔ جب تک طبیعت سے اعراض نہ ہو اقبال خداوندی حاصل نہیں ہوتا اور صاحب طبع حقیقت توحید سے محجوب رہتا ہے۔ جب آفت طبیعت کا علم ہو جائے تو گویا توحید کی معرفت حاصل ہوئی آپ کی آیات و براہین بہت ہیں۔ واللہ اعلم

ابوعثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ

سیف سیادت، آفتاب سعادت ابوعثمان رضی اللہ عنہ اہل تمکین بزرگان طریقت میں سے ہیں۔ علم وفن میں تبحر حاصل تھا۔ صاحب ریاضت وثبات تھے۔ آپ کی آیات اور عمدہ دلائل کثرت سے ہیں۔ فرماتے ہیں: من أثر صحبة الأغنياء على مجالسة الفقراء ابتلاہ اللہ بموت القلب ''جو امراء کی صحبت کو فقراء کی مجلس پر ترجیح دے خدائے عزوجل اس کو مرگ دل میں مبتلا کر دیتا ہے۔'' یہاں الفاظ صحبت اور مجلس استعمال کیے گئے ہیں کیونکہ فقراء سے پلٹنے والے صرف مجالست کے بعد پلٹتے ہیں صحبت کے بعد نہیں۔ صحبت سے اعراض نہیں ہوتا۔ جب لوگ مجالست فقراء سے صحبت امراء کی طرف جاتے ہیں تو ان کے دل حاجت مندوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتے ہیں اور ان کے جسم پندار میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مجالست سے منہ پھیرنے کی سزا مرگ دل ہے تو فقراء کی صحبت سے منہ پھیرنے کی سزا

کیا ہوگی؟ اس بیان سے مجالست اور صحبت کا فرق ظاہر ہو گیا۔ واللہ اعلم

ابوالقاسم بن ابراہیم بن محمد بن محمود نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

آپ نیشاپور میں بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بادشاہوں کی جاہ وحشمت اس دنیا کے لئے ہوتی ہے آپ کی اس دنیا کے لئے تھی۔ آپ کا کلام بلند تھا اور آیات دل نشین تھیں۔ شبلی کے مرید تھے اور خراسان کے متاخرین کے استاد۔ اپنے زمانے میں یگانہ روزگار تھے اور علم و ورع میں سب سے برگزیدہ تھے۔

آپ نے فرمایا: "تیری نسبت دو طرفہ ہے، ایک آدم سے دوسری خدا سے۔ اگر نسبت آدم کا دعویدار ہے تو تیرے سامنے شہوات نفسانی اور سہو و خطا کا میدان ہے۔ یہ حصول بشریت کا راستہ ہے اور باری تعالیٰ فرما چکے ہیں: اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ (الاحزاب) "انسان ظالم اور جاہل تھا" اگر خدائی نسبت کی تلاش ہے تو مقامات کشف، برہان، عصمت اور ولایت سامنے ہیں۔ یہ نسبت تحقیق عبودیت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان:63) "اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکسار سے چلتے ہیں" آدم کی نسبت قیامت کے دن ختم ہو جائے گی۔ حق سے نسبت عبودیت ابد تک رہے گی اور کبھی تغیر پذیر نہ ہوگی۔ جب بندہ اپنی ذات یا آدم سے نسبت قائم کرے تو اس کا کمال یہ ہے کہ اقرار کرے۔ "اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ (القصص:14) "تحقیق میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔" جب نسبت حق سے ہو تو اس کا مقام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کہے۔ یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ (الزخرف:48) "میرے بندو! آج تمہارے لئے کوئی خوف نہیں۔" واللہ اعلم۔

ابوالحسن علی بن ابراہیم حصری رحمۃ اللہ علیہ

سرور سالکان طریقت، جمال جان اہل تحقیق ابوالحسن علی بن ابراہیم درگاہ حق کے محتشم حر اور امام صوفیائے کرام تھے۔ اپنے زمانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آپ کا کلام بلند اور عبارت دلنشین تھی۔ آپ نے فرمایا: "مجھے میری آفت میں مبتلا رہنے دو۔ کیا تم اسی آدمی

کی اولاد نہیں جسے خدائے عزوجل نے خاص تقویم پر پیدا کیا اور بے واسطہ غیرا سے زندگی عطا کی۔ فرشتوں کو کہا اسے سجدہ کرو۔ پھرا سے کچھ حکم دیا اور اس نے نافرمانی کی پہلے ہی جام میں تلچھٹ ہو تو آخری جام تک کیا گذرے گی۔''

مطلب یہ کہ اگر آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سراسر نافرمان ہے۔ اگر رب العزت کی عنایت شامل ہو تو سرتا بقدم محبت ہے۔ عنایات پروردگار پر نظر کرو اور پھر اپنی برائیوں کی طرف دیکھو تمام عمر اسی میں گذار دو۔ واللہ اعلم بالصواب

یہ تھے حالات چند برگزیدہ متقدمین صوفیائے کرام کے۔ اگر تمام کا ذکر کیا جاتا یا صرف انہی کے احوال پر تفصیل سے لکھا جاتا اور ان کی حکایات کو معرض تحریر میں لایا جاتا تو مقصد مفقود ہو جاتا اور کتاب طویل ہو جاتی۔ اب کچھ متاخرین پر لکھنا مقصود ہے۔ وباللہ التوفیق الاعلیٰ

بارہواں باب

صوفیائے متاخرین

ہمارے زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ریاضت کا بار تو اٹھا نہیں سکتے مگر ریاست کے طلب گار ہیں۔ تمام اہل طریقت کو اپنے جیسا خیال کرتے ہیں۔ جب بزرگان سلف کے اقوال سنتے ہیں، ان کی شان و عظمت دیکھتے ہیں، ان کے معاملات سے متعلق پڑھتے ہیں اور پھر اپنے اوپر نظر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو پس ماندہ دیکھ کر کہتے ہیں، ہمارا ان سے کیا مقابلہ وہ لوگ ختم ہو چکے۔ ایسے لوگ اب پیدا نہیں ہوتے۔ یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ رب العزت کبھی اہل زمین کو بلا صحت نہیں چھوڑتا اور امت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بغیر ولی نہیں رہنے دیتا۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِیْ عَلَی الْخَبَرِ وَالْحَقِّ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ(1)

"میری امت میں ایک گروہ تا قیامت بھلائی اور حق پر رہے گا۔"

اور نیز فرمایا:

لَا یَزَالُ مِنْ أُمَّتِیْ أَرْبَعُوْنَ عَلٰی خُلُقِ اِبْرَاهِیْمَ

"میری امت میں ہمیشہ چالیس آدمی خلق ابراہیمی پر رہیں گے(2)۔"

جن مشائخ کبار کا ذکر اب ہوگا ان میں سے کچھ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں اور کچھ ابھی بقید حیات ہیں۔ رضی اللہ عنهم وعنا وعن جميع المسلمين والمسلمات

ابوالعباس احمد بن محمد قصاب رحمۃ اللہ علیہ

آپ ماوراء النہر کے متقدمین سے مصاحبت رکھتے تھے۔ رفعت حال، صدق فراست، کثرت برہان اور کرامات کے لئے مشہور تھے۔ ابو عبداللہ خیاطی جو طبرستان کے امام تھے،

1۔ طیالسی: المسند۔ دارمی: حاکم 2۔ ابو نعیم: حلیۃ الاولیاء

فرماتے ہیں کہ یہ باری تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ وہ کسی کو بغیر تعلیم وہ مقام عطا کر دیتا ہے کہ اگر اصول دین اور دقائق توحید میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ رہنمائی کرے، ابوالعباس قصاب ایک ایسے ہی بزرگ ہیں۔ آپ امی تھے مگر دینیات اور طریقت پر نہایت عالی کلام تھے۔ میں نے آپ کی بہت سی حکایات سنی ہیں مگر اس کتاب میں مجھے اختصار مدنظر ہے۔

ایک روز ایک بھاری بوجھ سے لدا ہوا اونٹ آمل کے بازار سے گذر رہا تھا کیچڑ بہت تھی اونٹ کا پاؤں پھسل گیا وہ گر گیا اور اس کی ہڈی ٹوٹ گئی لوگ اونٹ کا بوجھ اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اونٹ کا مہار بردار لڑکا رو رہا تھا اور ہاتھ اٹھا کر خدا کے سامنے فریاد کر رہا تھا۔ ابوالعباس کا ادھر سے گذر ہوا۔ انہوں نے اونٹ کی مہار تھام لی اور رو بہ آسمان ہو کر عرض کی ”باری تعالیٰ! اس اونٹ کو ٹھیک کر دے۔ اگر اسے ٹھیک نہیں ہونا تو میرے دل پر اس لڑکے کی فریاد نے اتنا اثر کیوں کیا؟ اونٹ یکبار کھڑا ہو گیا اور چلنے لگا۔“

آپ کا قول ہے: ”تمام عالم کو راضی برضائے حق ہونا چاہئے ورنہ دکھ ہوگا۔“

اگر کوئی راضی برضا ہے تو اس کا میلان طبع بلا کی طرف ہوگا اور بلا بلا کی طرف نہیں آتی۔ اگر خود کردہ بلا نہیں تو بلا ضرور آئے گی اور باعث رنج ہوگی۔ ہمارا رنج و راحت مقدر ہو چکا ہے اور مقدر میں تغیر نہیں آتا۔ راضی برضا ہونا راحت کا باعث ہے جو خوگر رضا ہو اس کے لئے راحت ہی راحت ہے اور روگردانی کرنے والے کے لئے قضا کے صورت پذیر ہونے میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ واللہ اعلم

ابوعلی بن حسین بن محمد دقاق رحمۃ اللہ علیہ

آپ فن کے امام تھے۔ زمانے میں بے نظیر تھے۔ صاف بیان اور فصیح زبان تھے۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات اور مصاحبت فرمائی۔ محمد بن محمود نصیر آبادی کے مرید تھے اور وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: من أنس بغيره ضعف في حاله ومن نطق من غيره كذب في مقاله ”جو بجز خدا کسی چیز کو دوست رکھتا ہے اپنے حال میں کمزور ہے۔ جو بجز خدا کے کسی کا ذکر زبان پر لاتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔“

مطلب یہ کہ غیر اللہ سے دوستی کی بنیاد اللہ کو نہ جاننے پر ہوتی ہے۔ اللہ سے دوستی غیر اللہ سے عدم دوستی کا نشان ہے۔ جو غیر سے دور بھاگے وہ اس کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے گا۔

ایک بوڑھے آدمی نے بیان کیا کہ وہ ایک دن آپ کی مجلس میں اس خیال سے گیا کہ متوکلوں کی کیفیت سے متعلق کچھ دریافت کرے۔ آپ نے طبرستان کا بنا ہوا خوبصورت عمامہ زیب سر کیا ہوا تھا۔ بوڑھے نے سوال کیا: ''توکل علی الحق کیا چیز ہے؟'' فرمایا ''لوگوں کی پگڑیوں کو لالچ کی نظر سے نہ دیکھنے کو توکل کہتے ہیں'' یہ کہا اور پگڑی اتار کر بوڑھے آدمی کے سامنے رکھ دی۔ واللہ اعلم

ابوالحسن علی بن احمد خرقانی رحمۃ اللہ علیہ

آپ قدیم مشائخ کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے میں تمام اولیائے کرام کی نگاہوں میں ممتاز تھے۔ شیخ ابوسعید نے آپ سے ملاقات کی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ چلتے وقت شیخ ابوسعید نے کہا: ''میں آپ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔''

میں نے شیخ ابوسعید کے خادم حسن مودب سے سنا کہ جب شیخ ابوسعید کے پاس پہنچے تو آپ نے کوئی بات نہیں کی صرف سنتے رہے اور گاہے گاہے احمد خرقانی کوئی سوال کرتے تو آپ جواب ضرور دیتے۔ حسن مودب نے پوچھا ''آپ خاموش کیوں رہے؟'' فرمایا ''ایک موضوع کی تشریح ایک ہی آدمی کر سکتا ہے۔''

میں نے اپنے استاد ابوالقاسم قشیری سے سنا کہ جب وہ خرقان آئے تو احمد خرقانی کے دبدبہ سے ان کی فصاحت و بلاغت ختم ہوگئی اور یہ محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان کی ولایت چھین لی۔

آپ نے فرمایا ''دو راستے ہیں: ایک غلط اور ایک صحیح۔ غلط راستہ بندے کا خدا کی جانب ہے اور صحیح راستہ خدا کا بندہ کی طرف ہے۔'' جو یہ دعویٰ کرے کہ خدا کو پالیا ہے اس نے نہیں پایا ہاں جو یہ کہے کہ مجھے خدا تک پہنچا دیا گیا اس نے واقعی خدا کو پالیا۔ سوال خدا کو پانے یا نہ پانے یا نجات حاصل کرنے یا نہ کرنے کا نہیں بلکہ خدا تک پہنچائے جانے یا نہ

جانے کا اور نجات دیئے جانے یا نہ دیئے جانے کا ہے۔ واللہ اعلم

ابو عبداللہ محمد بن علی داستانی رحمۃ اللہ علیہ

آپ اپنے وقت کے بادشاہ تھے۔ بیان و عبارت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ آپ کا کلام مہذب اور اشارات نہایت لطیف ہیں۔ شہر کے امام شیخ سہلکی آپ کے نیک سیرت جانشین تھے۔ میں نے ان سے داستانی کے کئی خوبصورت اور دل نشین اقوال سنے۔ مثلاً آپ نے فرمایا "توحید موجود ہے اور تو توحید میں مفقود" یعنی توحید درست ہے مگر تو نا درست۔ کیونکہ تجھے اقتضائے حق پر قیام حاصل نہیں۔ توحید کا کمترین درجہ یہ ہے کہ تو اپنی ہر ملکیت میں تصرف سے دست بردار ہو اور ہر امر میں مکمل تسلیم کا اقرار کرے۔

شیخ سہلکی کہتا ہے "ایک موقع پر بسطام پر ٹڈی دل اُمڈ پڑا۔ تمام کھیت اور درخت سیاہ ہو گئے۔ لوگ چلا رہے تھے۔ شیخ نے سبب پوچھا میں نے ٹڈی دل کا ذکر کیا۔ آپ چھت پر چڑھ گئے اور روبہ آسمان کھڑے ہو گئے۔ ٹڈی دل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ ظہر تک فضا صاف ہو گئی اور کسی کو گھاس کے ایک تنکے کے برابر بھی نقصان نہ پہنچا۔ واللہ اعلم

ابو سعید فضل اللہ بن محمد میہنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ شہنشاہ اہل محبت اور اہل تصوف تھے تمام ہم عصر آپ سے بہرہ ور تھے کچھ دیدار سے کچھ اعتقاد سے کچھ اپنے روحانی جذبات کی بناء پر۔ آپ تمام علوم کے ماہر تھے۔ عجیب فراست کے مالک تھے۔ لوگوں کے اسرار دل سمجھنے میں کمال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے آثار، آیات اور براہین بے شمار ہیں اور آج تک ان کے اثرات موجود ہیں۔

اوائل عمر میں آپ تعلیم کی خاطر مہنہ سے سرخس تشریف لائے اور ابو علی طاہر سے تعلق پیدا کیا۔ تین دن کا سبق ایک دن میں ختم کر لیا کرتے تھے اور یہ تین دن عبادت میں مصروف کرتے تھے۔ اس وقت شیخ ابو الفضل حسن والی سرخس تھے۔ ایک روز دریائے سرخس کے کنارے جا رہے تھے۔ ابو الفضل حسن آپ سے ملے اور کہا: "تمہارا یہ راستہ نہیں

اپنے راستے پر جاؤ۔" آپ نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنی جگہ پر واپس آکر ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ بالآخر در ہدایت کھلا اور آپ کو مقام بلند نصیب ہوا۔

میں نے شیخ ابو مسلم فارسی سے سنا جس کو ابوسعید سے مخاصمت تھی، ان کی زیارت کے لئے گھر سے نکلا۔ جسم پر ایک خرقہ تھا جو بوسیدگی اور میل کی وجہ سے چمڑے کی طرح ہو چکا تھا۔ خدمت میں پہنچ کر دیکھا کہ آپ مصری کپڑے کا لباس پہنے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دل میں کہا یہ آدمی اس تعلق دنیا کے باوجود فقر کا دعویدار ہے اور مجھے فقر کا دعویٰ اس بے سروسامانی پر ہے۔ مجھے ان کے ساتھ کیا موافقت ہو سکتی ہے؟ ابوسعید نے اس دلی کیفیت کو پالیا اور فرمایا "یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ فقر کا لفظ صرف ایسے آدمی پر عائد ہوتا ہے جس کا دل مصروف مشاہدہ ہو۔" یعنی اہل مشاہدہ غنی بالحق ہوتے ہیں اور فقراء مبتلائے مجاہدہ۔ ابو مسلم کہتا ہے میں اپنے دل میں سخت پشیمان ہوا اور اپنی بدگمانی سے توبہ کی۔

آپ کا قول ہے: التصوف قیام القلب مع اللہ بلا واسطۃ "تصوف خدا سے دل کے بلاواسطہ تعلق کا نام ہے۔"

یہ اشارہ مشاہدہ دوستی کی شدت وفور شوق اور دیدار جمال میں انسانی عوارض کو ختم کر دینے کا نام ہے یا بہ الفاظ دیگر بقائے حق میں فنائے صفت کو کہتے ہیں۔ "کتاب الحج" میں مشاہدہ اور اس کے وجود پر کچھ اور تحریر ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

آپ نیشاپور سے طوس جا رہے تھے راستے میں ایک سرد وادی پڑتی تھی خنکی کی وجہ سے آپ کے پاؤں سرد ہو گئے۔ ایک درویش ساتھ تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنے کمر بند کو پھاڑ کر دونوں پیروں پر لپیٹ دے۔ پھر خیال آیا کمر بند اتنا خوبصورت ہے ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ طوس پہنچ کر وہ درویش حاضر مجلس ہوا اور پوچھا "وسوسہ اور الہام میں کیا فرق ہے۔" فرمایا "کمر بند کو پھاڑ کر پاؤں پر ڈال دینے کا خیال الہام تھا۔ روکنے والی چیز وسوسہ تھا۔

ایسی کئی کرامات آپ سے منسوب ہیں مگر طول کلام ہمیں منظور نہیں۔ واللہ اعلم

ابوالفضل محمد بن حسین ختلی رحمۃ اللہ علیہ (1)

میں طریقت میں آپ کا مقتدی ہوں۔ آپ تفسیر اور حدیث کے معلم تھے اور تصوف میں مکتبہ جنید سے منسلک تھے۔ حصری کے مرید تھے اور ان کے واقف اسرار تھے۔ ابوعمرو قزوینی اور ابوالحسن بن سالبہ کے ہم عصر تھے۔ ساٹھ برس تک از راہ عزلت نشینی دنیا سے روپوش رہے۔ خلقت آپ کو بھول گئی۔ اکثر عمر لگام پہاڑ کی چوٹی پر گزاری۔ عمر دراز پائی۔ آپ کی کرامات، روایات اور براہین بے شمار ہیں۔ اہل تصوف کے لباس اور رسوم سے متنفر تھے اور اہل رسم کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے آپ سے زیادہ دبدبے والا آدمی نہیں دیکھا۔ میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا: الدنیا یوم وأنا فیھا صوم ''دنیا یک روز ہے اور ہم روزہ سے ہیں۔'' یعنی دنیا مختصر ہے اور ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ حالانکہ ہم اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ہم نے اس کی مصیبت دیکھ لی ہے اس کی حقیقت سے واقف اور اس سے کنارہ کش رہے۔

ایک دن میں آپ کو وضو کروا رہا تھا۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ جب ہر کام حسب تقدیر صورت پذیر ہوتا ہے تو آزاد لوگ کیوں کرامت کی امید پر پیروں کے غلام بنے رہتے ہیں؟'' آپ نے فرمایا ''عزیز من! میں تیرے دل کی کیفیت سمجھ رہا ہوں، تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ ہر چیز کے لئے سبب درکار ہے۔ جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ کسی حاجب زادہ کو تخت و تاج سے سرفراز کریں تو اسے توبہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور اپنے کسی دوست کی خدمت اس کے سپرد کرتے ہیں تا کہ یہ خدمت حصول کرامت کا سبب بن جائے۔''

ایسے کئی لطیف رموز آپ سے ہر روز ظاہر ہوتے تھے۔

وفات کے روز آپ بیت الجن کے مقام پر تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے دریائے بانیان اور دمشق کے درمیان ایک وادی کے کنارے۔ آپ کا سر میری آغوش میں تھا۔ میں اپنے دل میں بتقاضائے بشریت اپنے ایک دوست کی طرف سے سخت کبیدہ خاطر تھا۔ آپ نے

1۔ یہ حضرت داتا صاحب کے مرشد گرامی ہیں۔

فرمایا: ''بیٹا! میں تجھے ایک اعتقادی مسئلہ بتاتا ہوں جس پر کاربند ہو کر تو ہر رنج و تکلیف سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یاد رکھو ہر حال میں اور ہر مقام پر نیک و بد رب العزت کی طرف سے ہے اور اس کے کسی کام سے ارزاہ مخاصمت کبیدہ خاطر نہ ہو۔'' اس کے علاوہ کوئی اور وصیت نہ فرمائی اور جان بحق ہو گئے۔ واللہ اعلم

ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ

آپ اپنے زمانے کے یگانہ روزگار تھے۔ آپ کا درجہ بلند اور مقام رفیع تھا۔ آپ کی کرامات اور روحانی کمالات کی آج تک دنیا معترف ہے۔ آپ کے اقوال دلنشین اور تصانیف دل پذیر ہیں۔ باری تعالیٰ نے آپ کی زبان کو بے ہودہ کلامی سے پاک رکھا۔ آپ نے فرمایا ''صوفی مرض برسام کی طرح ہے جس کی ابتدا ہذیان سے اور انتہا خاموشی سے ہوتی ہے۔'' تصوف کے دو رخ ہیں: ایک وجد دوسرا نمود۔ نمود مبتدیوں کے لئے ہے اور اس کا مطلب ہذیان ہے۔ وجد منتہی لوگوں کا مقام ہے۔ وجد کے عالم میں گفتگو محال ہوتی ہے۔ جب طلب کا دور ہو تو بلند حوصلگی کا اظہار ہوتا ہے اور اظہار ہذیان کے مترادف ہے۔ جب در مقصود حاصل ہو گیا تو زبان خاموش ہو گئی اور گفتگو یا اشارے کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مبتدی تھے اور آپ کی خواہش رویت باری تک محدود تھی۔ چنانچہ فرمایا: اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (الاعراف:143) ''میرے مولا سامنے آتا کہ میں تجھے دیکھ سکوں۔'' یہ پکار حسرت مفقود کی مظہر تھی۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منتہی اور متمکن تھے۔ جب مقام مقصود پر پہنچے طلب ختم ہو گئی اور عرض کی: وَلَآ اُحۡصِیۡ ثَنَآءً عَلَیۡکَ(1) ''میں تیری ثنا کما حقہ نہیں کر سکتا۔'' یہ مقام بلند اور منزل عالی ہے۔ واللہ اعلم

ابو العباس احمد بن محمد اشقانی رحمۃ اللہ علیہ

آپ علوم اصول و فروع کے امام ہوئے ہیں اور ہر علم میں کامل۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات کی۔ کبیر اور اجل اہل طریقت میں شمار ہوتے تھے۔ ''طریق فنا'' پر لکھتے تھے اور

1۔ صحیح مسلم

انداز تحریر سخت مغلق تھا۔ یہ آپ کی خصوصیت تھی۔ میں نے جاہلوں کی ایک جماعت دیکھی جو تحریر میں آپ کی تقلید کرتے تھے اور آپ کے سمجھ میں نہ آنے والے اقتباسات لئے پھرتے تھے وہ معنی بھی سمجھنے سے قاصر تھے تقلید کے طور پر کچھ تحریر کرنا تو در کنار۔ مجھے آپ کے ساتھ بہت انس تھا اور وہ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ میں نے کسی مرد یا عورت کو آپ سے بڑھ کر شریعت کا پاسدار نہیں دیکھا۔ دنیا سے تمام علائق منقطع کر چکے تھے۔ علم اصول پر دقیق عبارات کے سبب بجز اہل تحقیق کے کوئی بھی آپ کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ آپ کی طبیعت ہمیشہ دنیا وعقبیٰ سے بے نیاز رہتی تھی اور وہ اکثر پکار اٹھا کرتے تھے: ''مجھے ایسی نیستی کی ضرورت ہے جس کا وجود نہیں۔'' فارسی میں فرماتے تھے: ''ہر آدمی کو کسی محال چیز کی خواہش ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کبھی پوری نہیں ہوگی یعنی خدا مجھے ایسا عدم نصیب کرے۔ جس کا وجود نہ ہو۔'' مقصد یہ کہ جملہ مقامات وکرامات محض حجاب کی حیثیت رکھتے ہیں جو انسان اور باری تعالیٰ کے درمیان حائل ہے۔ انسان کو محجوب رکھنے والی چیزوں سے محبت ہے۔ دیدار میں فنا ہو جانا حجاب میں اٹک رہنے سے بہتر ہے۔ باری تعالیٰ کی ہستی کو عدم نہیں اس کی سلطنت میں کیا فرق پڑتا ہے اگر میں اس طرح نیست و نابود ہو جاؤں کہ میری نیستی کا بھی وجود نہ ہو۔ یہ ''فنا'' کی اصل حقیقت ہے۔ واللہ اعلم

ابو القاسم بن علی بن عبد اللہ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے زمانے میں بے نظیر ہیں اور کوئی آپ کا ثانی نہیں۔ آپ کی ابتدا نہایت اچھی اور پائیدار تھی۔ آپ نے بہت سخت سفر بقید شریعت سرانجام دیئے۔ سب لوگ آپ کے گرویدہ ہیں اور سب طالب آپ کے معتقد۔ مریدوں کی دلی کیفیتوں کو بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں اور علمی فنون کے ماہر ہیں۔ آپ کے مرید جہاں بھی جاتے ہیں زینت مجلس بن جاتے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے پیچھے وہ ایک ایسا جانشین چھوڑیں گے جسے تمام صوفیائے کرام رہنما تسلیم کریں گے۔ یعنی لسان الوقت ابو علی ابو الفضل بن محمد فارمدی (اللہ اس کی عمر دراز کرے) جس نے حق خدمت ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جو مکمل طور پر

تارک علائق دنیا ہے اور جو اپنی خدمت اور ترک علائق کی برکت سے اس سردار مشائخ ابو القاسم گرگانی کی زبان حال ہے۔

ایک دن میں آپ کے سامنے اپنے احوال و مشاہدات بیان کر رہا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ ناقد وقت ہونے کی حیثیت سے میری کیفیت پر نظر فرمائیں۔ وہ نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ میں نے پندار طفلی اور زور جوانی میں طول بیانی سے کام لیا اور دل میں سوچا کہ غالباً یہ بزرگ ان مقامات سے نہیں گذرے ورنہ اس انہماک اور نیاز مندی سے نہ سنتے۔ انہوں نے میری دلی کیفیت کو سمجھ لیا اور فرمایا "جان پدر! میرا خضوع اور انہماک تیرے لئے یا تیرے احوال کے لئے نہیں بلکہ اس ذات کے لئے ہے جو خالق احوال ہے۔ یہ چیزیں ہر طالب کو پیش آتی ہیں۔ تیرے لئے کوئی خصوصیت نہیں۔" یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا "طریقت سے آدمی کو صرف اس قدر نسبت ہے کہ جب وہ اس پر گامزن ہوتا ہے تو سمجھتا ہے اس نے منزل کو پالیا۔ اور جب بھٹک جاتا ہے تو اپنے تصور کو عبادت میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے نفی اور اثبات، عدم اور وجود سب خیالی ہیں اور انسان کبھی خیالات کے دھندلکوں سے نجات نہیں پاتا۔ لازم یہی ہے کہ وہ درگاہ حق پر سرنگوں رہے اور بجز مردانگی و فرمانبرداری کے ہر نسبت یا تعلق سے دست بردار ہو جائے۔

اس کے بعد آپ کے ساتھ بہت راز و نیاز رہا مگر میں طوالت کے خوف سے بیان نہیں کر سکتا۔

ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ

آپ بارگاہ ریاست میں متمکن تھے کہ حق تعالیٰ نے در طریقت وا کیا اور تاج کرامت سے سرفراز فرمایا۔ آپ کو فنا اور بقا پر خوش بیانی اور ژرف نگاہی عطا فرمائی۔

شیخ المشائخ ابو سعید فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں درگاہ حق میں بندگی سے باریابی ملی اور خواجہ مظفر کو حکمرانی سے یعنی ہم مجاہدہ اور مشاہدہ سے کامیاب ہوئے اور وہ مشاہدہ اور مجاہدہ سے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا "اہل طریقت کو جو دشت و صحرا میں گھوم کر ملا مجھے

تخت پر اور بستر استراحت میں مل گیا۔

کچھ کم فہم اور کم نظر لوگوں نے اس قول کو اظہار تکبر قرار دیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اظہار حقیقت کو تکبر کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ بالخصوص جب اظہار کرنے والا صاحب دل ہو۔ آج کل ابوسعید خواجہ مظفر کے عالی ظرف اور قابل سجادہ نشین ہیں۔

ایک روز میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ نیشاپور کے ایک مدعی طریقت نے عبارتاً کہا: ''میں فنا ہو کر بقا حاصل کرتا ہوں۔'' خواجہ مظفر نے فرمایا: ''فنا سے بقا کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ فنا تو عدم کا عالم ہے اور بقا ہستی کا۔ دونوں چیزیں متضاد ہیں۔ فنا قرین فہم ہے جب تک عدم وجود پیش نظر ہے۔ اگر عدم وجود مفقود ہو جائے یعنی نیستی جامہ ہستی پہن لے تو فنا کی حقیقت ختم ہو جاتی ہے کسی چیز کی ذات فنا نہیں ہوتی البتہ صفت اور سبب فنا ہو جاتے ہیں۔ صفت کے بعد موصوف اور سبب کے بعد مسبب باقی رہ جاتا ہے۔ موصوف اور مسبب کی ذات فنا پذیر نہیں ہوتی۔''

خواجہ صاحب کا قول مجھے لفظ بہ لفظ یاد نہیں۔ مطلب یہی تھا جو کم وبیش بیان کر دیا۔ ذرا تشریح اور کئے دیتا ہوں تا کہ بات عام فہم ہو جائے۔ اختیار آدمی کی صفت ہے اور اس صفت کی وجہ سے وہ اختیار خداوندی سے محجوب ہے۔ اس کی صفت اس کے لئے پردہ ہے۔ اختیار خداوندی ازلی ہے اور اختیار انسانی محدث۔ ازلی چیز فنا سے بالاتر ہے جب اختیار خداوندی کسی آدمی سے متعلق ظہور پذیر ہوتا ہے تو آدمی کا اپنا اختیار فنا ہو جاتا ہے اور اس کا ذاتی تصرف ختم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

ایک دن میں آپ کے پاس حاضر ہوا۔ تپش بہت زیادہ تھی۔ میں لباس سفر میں تھا اور میرے بال پریشان تھے۔ آپ نے فرمایا ''بتاؤ کیا چاہتے ہو؟'' میں نے عرض کی ''مجھے سماع کی خواہش ہے۔'' خواجہ صاحب نے فوراً قوالوں کا انتظام کیا۔ میں جوان تھا۔ میری طبیعت میں جوش اور ایک ناآزمودہ مبتدی کا خروش تھا۔ نغمہ وسرود نے مجھے بے چین کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس آفت کا زور وغلبہ کم ہوا تو آپ نے فرمایا ''پسند آیا'' میں نے عرض کی ''بے

حد لطف اندوز ہوا ہوں" کہنے لگے "ایک وقت ایسا آئے گا جب تیرے لئے یہ سماع اور کووں کی کائیں کائیں برابر ہوگی۔ سماع کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ مشاہدہ حاصل ہو تو سماع بے کار ہو جاتا ہے۔ خبردار اسے عادت نہ بنانا جو طبیعت ثانی ہو کر رہ جائے اور اس سے دست بردار ہونا مشکل ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

تیرھواں باب

دیگر متاخرین صوفیائے کرام

سب کے سوانح حیات قلم بند کرنے کی گنجائش نہیں اور اگر کچھ حضرات کا ذکر چھوڑ دیا جائے تو مقصد کتاب فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہی ہوسکتا ہے کہ سوائے اہل رسوم کے ان پیشرو مشائخ کبار اور صوفیائے کرام کے نام لکھ دوں جو میرے وقت میں ہو گذرے ہیں یا ابھی زندہ ہیں۔

مشائخ شام و عراق

شیخ زکی بن العلا رحمۃ اللہ علیہ بزرگ مشائخ اور سرداران زمانہ میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح پایا۔ عجیب دلائل وآیات کے مالک تھے۔

ابو جعفر محمد مصباح صیدلانی رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے رئیس تھے۔ موضوع حقیقت پر عجیب حسن بیان پایا تھا۔ حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے۔ ان کی کئی تصانیف میں نے پڑھی ہیں۔

شیخ ابو القاسم سدی رحمۃ اللہ علیہ صاحب مجاہدہ اور نیک حال بزرگ تھے۔ درویشوں سے بڑی ارادت رکھتے تھے اور ان کے معتقد تھے۔

مشائخ فارس

شیخ المشائخ ابو الحسن بن سالبہ رحمۃ اللہ علیہ تصوف پر نہایت فصیح زبان اور توحید پر نہایت بلیغ بیان واقع ہوئے ہیں۔ آپ کے اقوال مشہور ہیں۔

شیخ مرشد ابو اسحاق بن شہریار رحمۃ اللہ علیہ نہایت بلند وقار اور صاحب اختیار صوفی تھے۔

شیخ طریقت ابو الحسن علی بن بکر رحمۃ اللہ علیہ بزرگ اہل تصوف میں شمار ہوتے تھے۔

ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے صالح بزرگوں میں سے تھے اور شیخ ابو الفتح رحمۃ اللہ

علیہ اپنے باپ کی طرح نیک اور رحمت خداوندی کے امیدوار تھے۔ شیخ ابو طالب رحمۃ اللہ علیہ صفات باری تعالیٰ کے متعلق سوچ بچار میں رہتے تھے۔

میں ان میں سے شیخ المشائخ ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں مل سکا۔

مشائخ قہستان، آزربائیجان، طبرستان اور کمس

شیخ شفیق فرخ معروف بہ اخی زنجانی رحمۃ اللہ علیہ نیک سیرت اور ستودہ طریقت بزرگ تھے۔ شیخ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ بزرگ اہل تصوف میں شامل تھے۔ آپ کی بہت سی نیکیاں مشہور ہیں۔ بادشاہ وقت بھی خدا سے رجوع کرنے والا اور اس کے نیک بندوں میں سے تھا۔ شیخ ابوعبداللہ جنیدی مرشد محترم تھے۔

شیخ ابوطاہر کشوف اپنے زمانے کے برگزیدہ صوفی تھے۔

خواجہ حسین سمنان رحمۃ اللہ علیہ خدا کی محبت کی لگن رکھتے اور ہمیشہ اس کے لطف وکرم کے امیدوار رہتے تھے۔

شیخ سہلکی بزرگ صوفی فقراء میں شامل تھے۔

شیخ احمد پسر شیخ خرقانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد کے بہترین جانشین تھے۔

شیخ ادیب گندی اپنے وقت کے اہم مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔

مشائخ کرمان

خواجہ علی بن حسین ایسرگانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے سیاح تھے خوب سفر کیے۔ آپ کے فرزند حکیم بھی بڑے باوقار آدمی تھے۔

شیخ محمد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ بزرگان وقت سے تھے۔ آپ سے پہلے بہت سے گمنام و پوشیدہ حال اولیائے کرام ہو گذرے ہیں اور کئی مسلک تصوف میں نووارد اور رحمت کے امیدوار جوان بھی موجود ہیں۔

مشائخ خراسان

اقبال حق کا سایہ آج کل خراسان پر ہے۔ اسی جگہ شیخ مجتہد ابوالعباس سیرکانی رحمۃ اللہ

علیہ ہوئے ہیں۔ زندہ دل اور خوش وقت بزرگ تھے۔

خواجہ ابوجعفر محمد بن علی حواری رحمۃ اللہ علیہ اہل تصوف کے بزرگ محققین میں شامل ہیں۔

خواجہ ابوجعفر ترشیزی رحمۃ اللہ علیہ عزیز وقت ہو گزرے ہیں۔

خواجہ محمود نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ امام وقت تھے اور نہایت درجہ خوش زبان تھے۔

شیخ محمد معشوق رحمۃ اللہ علیہ خوش وقت اور فارغ البال تھے۔ محبت کے نور سے درخشاں تھے نیک باطن اور خرم۔

خواجہ رشید مظفر پسر شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک دن پیش رو اہل تصوف ہوں گے اور اہل دل کا قبلہ امید۔

خواجہ احمد حمادی سرخسی رحمۃ اللہ علیہ وقت کے مرد میدان تھے۔ مدت تک میرے رفیق رہے۔ میں نے ان کی بہت سی کرامات دیکھیں۔ جواں مرد صوفی تھے۔

شیخ احمد نجار سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ مرو میں قیام رکھتے تھے اور اپنے وقت کے حکمران تھے۔

شیخ ابوالحسن علی بن ابی طالب اسود رحمۃ اللہ علیہ اپنے باپ کے ارجمند فرزند تھے۔ یگانہ روزگار تھے۔ بلند ہمت اور صاحب صدق وفراست۔

اگر اہل خراسان کے سب بزرگوں کا ذکر کیا جائے تو یہ کتاب بہت طویل ہو جائے گی میں کم از کم تین سو ایسے بزرگوں سے ملا جن میں سے ہر ایک صاحب شرف تھا اور تنہا سارے عالم کے لئے کافی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب محبت اور اقبال طریقت اہل خراسان کے مقدر میں ہے۔

مشائخ ماوراء النہر

ابوجعفر محمد بن حسین حرمی رحمۃ اللہ علیہ امام وقت ہیں اور مقبول خاص وعام۔ صاحب وجد اور وارفتہ ہیں۔ عالی ہمت ہیں۔ صاحب شرف ہیں اور طالبان حق سے شفقت سے پیش آتے ہیں۔

خواجہ فقیہ پیکر وجاہت ابومحمد باکری رحمۃ اللہ علیہ خوش وقت اور نیک معاملہ بزرگ تھے۔

احمد ایلاقی رحمۃ اللہ علیہ شیخ وقت، بزرگ زمانہ اور تارک رسوم و عادات تھے۔

خواجہ عارف رحمۃ اللہ علیہ فرید وقت اور بدیع روزگار تھے۔

علی ابن اسحاق خواجہ رحمۃ اللہ علیہ روزگار اور محتشم وقت تھے۔ نہایت شیریں زبان تھے

یہ نام ان حضرات کے ہیں جن سے میں نے ملاقات کی اور جن کے مقامات کو پہچانا۔

مشائخ غزنین

غزنین اور اس کے ساکنوں میں شیخ عارف اور اپنے وقت کے منصف ابوالفضل بن اسدی رحمۃ اللہ علیہ پیر بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ کے دلائل روشن اور کرامات ظاہر تھیں۔ محبت کی آگ کے شعلہ جوالہ تھے۔ آپ کا مشرب اخفاء تھا۔

شیخ مجرد علائق دنیوی سے منقطع، اسماعیل شاشی رحمۃ اللہ علیہ پیر محتشم تھے اور راہ ملامت پر گامزن تھے۔

شیخ سالار طبری رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے عالم تھے اور خوش وقت تھے۔

شیخ عیار، معدن اسرار ابوعبداللہ محمد بن حکیم رحمۃ اللہ علیہ معروف بہ مرید سرمست بارگاہ حق تھے۔ آپ کی کیفیت خلقت سے معرض اخفا میں تھی مگر آپ کے دلائل، آیات ظاہر اور روشن تھے۔ دیدار کی بجائے آپ کی صحبت زیادہ دل نشین تھی۔

شیخ محترم اور سب سے مقدم سعید بن ابی سعید عیار رحمۃ اللہ علیہ حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حافظ تھے۔ عمر دراز پائی اور کئی مشائخ کبار سے ملاقات کی۔ قوی حال اور صاحب خبر تھے مگر پردۂ اخفاء میں رہتے تھے اور اپنی حقیقت کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔

پیکر حرمت و وقار ابو العلا عبدالرحیم بن احمد سعدی رحمۃ اللہ علیہ اہل طریقت میں صاحب عزت اور سردار وقت تھے۔ مجھے آپ سے بہت ارادت ہے۔ ان کی روحانی کیفیت بہت بلند ہے اور وہ علم تصوف کی تمام فروع سے بخوبی واقف ہیں۔

شیخ اوحد قسورۃ محمد جردیزی اہل طریقت سے ارادت تام رکھتے ہیں۔ آپ کے دل میں سب کے لئے جگہ ہے۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات کی۔

اس شہر کے خوش اعتقاد لوگوں اور علماء کو دیکھ کر امید کی جاسکتی ہے کہ وقت گزرنے پر ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ہمارے اعتقاد کے صحیح حقدار ہوں گے۔ وہ پراگندہ کار لوگ جو اس شہر میں جمع ہو گئے ہیں اور طریقت کو بدنام کر رہے ہیں دور ہو جائیں گے اور غزنین پھر قیام گاہ اولیائے کرام بن جائے گا۔

اب ہم اہل تصوف کے مختلف مکاتب اور ان کے اختلافات بیان کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

چودھواں باب

اہل تصوف کے مکاتب

میں پہلے ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں بیان کر چکا ہوں کہ اہل تصوف کے بارہ مختلف فریق ہیں: دو مردود ہیں اور دس مقبول۔ دس فریق مجاہدہ میں نیک معاملہ اور ستودہ طریق ہیں۔ مشاہدہ میں آداب لطیف رکھتے ہیں۔ گو معاملات، مجاہدات اور ریاضات میں اختلاف ہے مگر اصول اور فروع شرع و توحید میں اتفاق ہے۔ ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: ''علماء کا اختلاف رحمت ہے سوائے تجرید و توحید کے۔'' اسی موضوع پر ایک مشہور حدیث بھی ہے۔ دراصل حقیقت تصوف مشائخ کبار کی روایات میں ہے اور اس کی تقسیم صرف رسمی اور مجازی ہے۔ میں تصوف کی تشریح کے طور پر مختصراً ان کے اقوال کو تقسیم کروں گا تاکہ ہر فریق کا بنیادی مکتبہ خیال نمایاں ہو جائے۔ طالب کو علم حاصل ہو۔ علماء کو قوت، مریدوں کو اصلاح، اہل محبت کو فلاح، عاقلوں اور اہل مروت کو تنبیہ اور مجھے ثواب دو جہاں۔ و باللہ التوفیق الاعلیٰ

فرقہ محاسبیہ

محاسبی ابوعبداللہ حارث بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار ہیں۔ حارث کو آپ کے تمام ہمعصر ''مقبول النفس'' اور ''مقتول النفس'' مانتے تھے۔ آپ کو علم اصول و فروع اور حقائق پر پورا عبور تھا۔ تجرید و توحید پر صحت ظاہر و باطن سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ ''رضا'' کو مقام کا درجہ نہیں دیتے تھے بلکہ ''احوال'' میں شامل سمجھتے تھے۔ آپ پہلے صوفی ہیں جس نے اس مکتبہ خیال کو اپنایا اور جس پر اہل خراسان کاربند ہوئے۔ اس کے برعکس اہل عراق کے نزدیک ''رضا'' مقامات میں شامل ہے اور ''توکل'' کی انتہا ہے۔ یہ تفرقہ آج تک رونما ہے۔ اب ہم اس کی تشریح کرتے ہیں انشاء اللہ عزوجل

حقیقت رضا

سب سے پہلے حقیقت رضا کو ثابت کرنا اور اس کی اقسام کو قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد حقیقت حال و مقام اور دونوں کے فرق کو معرض تحریر میں لایا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

کتاب اور سنت رضا کے معاملے میں ناطق ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (المائدہ: 119) ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔'' اور پھر فرمایا: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح: 18) ''تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہوا جب انہوں نے درخت کے نیچے تیرے ہاتھ پر بیعت کی۔'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا(1) ''ایمان کا مزہ اس نے پایا جو اللہ سے اس کے رب ہونے پر راضی ہوا۔''

رضا کی دو صورتیں ہیں: ۱۔ خدا کا بندہ سے راضی ہونا۔ ۲۔ بندہ کا خدا سے راضی ہونا۔

خدا کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ بندے کی خوش اعمالی پر از راہ اجرا سے کرامت اور عزت عطا کرے۔ بندے کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام پر سر تسلیم جھکائے اور اوامر کو بجالائے۔ خدا کا راضی ہونا مقدم ہے کیونکہ جب تک اس کی رضا نہ ہو کوئی انسان اس کے احکام بجالانے کی توفیق نہیں رکھ سکتا۔ انسانی رضا کا تعلق رضائے خداوندی سے ہے۔ بلکہ وہ صورت پذیر ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس کی رضا شامل حال نہ ہو۔ القصہ رضائے بندہ قضائے حق کو بطیب خاطر قبول کرنے کا نام ہے۔ عطا ہو یا ضبط۔ اور حالات پر سر تسلیم خم کرنے کو کہتے ہیں۔ جلال ہو یا جمال۔ اہل رضا کے لئے غضب کی آگ میں جل بجھنا یا رحم و کرم کے نور میں چمک اٹھنا یکساں ہے غضب ہو یا رحم۔ ہر چیز اسی کی مظہر ہے اور دل نشین ہے کیونکہ اس کی آفریدہ (پیدا کی ہوئی) ہے۔

امیر المومنین حسین بن علی کرم اللہ وجہہ سے ابوذر غفاری کے اس قول سے متعلق سوال کیا گیا: الفقر أحب إلى من الغنى والسقم أحب إلى من الصحة ''مجھے دولت

1۔ مسند احمد

سے زیادہ فقیری اور صحت سے زیادہ بیماری عزیز ہے۔'' حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: رحم الله أباذر أما أنا فأقول من أشرف على حسن اختيار الله له لم يتمن غير ما اختار الله له ''خدا ابوذر پر رحم کرے مگر میں کہتا ہوں کہ رضائے مولا پر چلنے والا صرف اسی چیز کا آرزومند ہوتا ہے جو اس کے لئے مولائے مطلق نے پسند فرمائی۔''
جب انسان مرضی مولا کو سمجھ لیتا ہے تو اپنی مرضی سے دستبردار ہو جاتا ہے اور ہر مصیبت سے نجات پاتا ہے۔ یہ چیز غیبت سے نہیں بلکہ حضور سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ إن الرضا للأحزان نافية وللغفلة معالة شافية ''رضا غم و الم کو مٹاتی ہے اور غفلت کے چنگل سے رہائی دیتی ہے۔'' اندیشہ غیر دل سے ختم کر دیتی ہے اور مشقت کے بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ رضا نجات کا ذریعہ ہے۔

عملاً رضا علم خداوندی کے مطابق انسان کی پسندیدہ روی ہے اور اس چیز کو تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ اس کی ذات پاک ہر حال میں دیکھنے والی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے والوں کو چار فریقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلے وہ لوگ جو باری تعالیٰ کی عطا پر راضی ہیں یہ معرفت ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو نعمتوں پر راضی ہیں، یہ دنیا ہے۔ تیسرے وہ لوگ جو مصیبت پر راضی ہیں یہ جملہ رنج و محن کا مقام ہے۔ چوتھے وہ لوگ جو برگزیدہ ہونے پر راضی ہیں یہ محبت ہے۔

جو آدمی عطا کرنے والے سے عطا کو دیکھتا ہے وہ اسے بجان و دل قبول کرتا ہے اور تکلف و مشقت سے محفوظ رہتا ہے۔ جو عطیہ سے عطا کرنے والے پر نظر کرتا ہے وہ عطیہ میں الجھ جاتا ہے۔ راہ رضا پر تکلف سے گامزن ہوتا ہے اور تکلف میں تمام رنج و مشقت سے دو چار ہوتا ہے۔ حقیقی معرفت کشف پر منحصر ہوتی ہے۔ کوشش اور تکلف سے حاصل کی ہوئی معرفت پابند اور محجوب ہوا کرتی ہے۔ ایسی معرفت دراصل ناشناسی، ایسی نعمت عذاب اور ایسی عطا حجاب ہوتی ہے جو انسان دنیا میں راضی برضا کے مقام پر ہی رک جائے وہ بھی خسارے میں ہے کیونکہ اس طرح گویا اس کی زندگی میں جمود آ گیا جو اپنے ہی دل کی آگ

میں جلنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ عالم اسباب قطعاً اس قابل نہیں کہ کوئی ولی اللہ اس پر التفات کرے یا اس کا کوئی تصور اپنے دل میں آنے دے۔

مسرت صرف وہی مسرت ہے جو مسرت عطا کرنے والے کی طرف رہنمائی کرے۔ ورنہ مصیبت ہے۔ تکلیف میں راضی برضا ہونے والا ہر چیز کے خالق پر نظر رکھتا ہے اور اسی کے نام پر برداشت کرتا ہے بلکہ وہ تکلیف کو اپنے محبوب حقیقی کے تصور میں تکلیف ہی نہیں سمجھتا۔

برگزیدہ ہو کر راضی ہونے والا محب ذات حق واصل ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی اپنی ذات رضا و بلا میں یکساں طور پر بے حقیقت ہوتی ہے۔ ان کے دل صفائے حق سے لبریز اور محبت حق سے معمور ہوتے ہیں۔ حاضر نظر آتے ہیں مگر دراصل غائب ہوتے ہیں۔ زمین کے ساکن مگر عرش آشیاں۔ پیکر خاک مگر روحانی سرشت، موحد ربانی، خلق سے روگرداں، مقامات واحوال کے بندھنوں سے آزاد، موجودات سے دل برداشتہ، دوستی حق پر کمر بستہ، لطف دوست کے منتظر، باری تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝ (الفرقان) "وہ اپنی جانوں کے لئے نفع وضرر کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ زندگی، موت اور حشر پر قدرت رکھتے ہیں۔"

غیر حق پر راضی ہونا موجب زیاں اور راضی برضائے حق ہونا خوشنودی حق کا باعث ہے۔ اس کی رضا بادشاہی ہے اور عافیت کے بارے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ لَمْ يَرْضَ بِاللّٰهِ وَ بِقَضَائِهٖ شَغَلَ قَلْبُهٗ وَ تَعِبَ بَدَنُهٗ "جو شخص ذات حق اور اس کے حکم سے راضی نہیں ہوتا وہ اسباب دنیا اور نصیب کا طالب ہے، اور اس کا جسم شکار آفات و مصائب ہے۔"

فصل: رضا حال ہے مقام نہیں

حکایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اَللّٰهُمَّ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُ رَضِيْتَ عَنِّيْ فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ يَا مُوْسٰى فَخَرَّ مُوْسٰى

عَلَیْهِ السَّلَامُ سَاجِدًا مُتَضَرِّعًا فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلَیْهِ یَا ابْنَ عِمْرَانَ اِنَّ رَضَائِی فِیْ رَضَائِکَ بِقَضَائِیْ۔ ''باری تعالیٰ! وہ کام بتا جسے میں سرانجام دوں اور تیری رضا حاصل کرسکوں۔ حکم ہوا اے موسیٰ علیہ السلام! یہ تیرے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سجدہ میں گر گئے۔ تضرع کیا۔ وحی کا نزول ہوا اے ابن عمران! میری رضا اس میں ہے کہ تو میرے حکم پر سر تسلیم خم کرے۔'' مطلب یہ کہ جب آدمی راضی برضائے حق ہو جاتا ہے تو گویا ذات حق اس سے راضی ہو جاتی ہے۔

بشر حافی نے فضیل بن عیاض سے پوچھا: زہد اور رضا میں کس چیز کو فضیلت حاصل ہے۔ فضیل نے کہا، الرضا أفضل من الزهد لأن الراضی لا یتمنی فوق منزلته ''رضا کو زہد پر فضیلت ہے کیونکہ صاحب رضا کے دل میں کوئی تمنا نہیں رہتی۔''

زاہد آرزومند ہوتا ہے یعنی درجہ زہد سے اوپر اور درجہ ہے اور زاہد کو اس کی تمنا ہوتی ہے۔ رضا کے اوپر کوئی اور درجہ نہیں جس کی صاحب رضا کو تمنا ہو۔ بارگاہ بہر صورت آستانہ بارگاہ سے فاضل تر ہوتی ہے۔

اس حکایت سے محاسبی مکتبہ خیال کی تائید ہوتی ہے کہ رضا صیغہ احوال میں شامل ہے اور انعام حق ہے۔ تکلف سے حاصل کئے ہوئے مقامات میں شامل نہیں۔ اور نیز یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ صاحب رضا متمنی ہو سکتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعاؤں میں فرماتے، أَسْئَلُکَ الرِّضَاءَ بَعْدَ الْقَضَاءِ(1) ''باری تعالیٰ! میں قضا کے بعد رضا مانگتا ہوں۔''

یعنی مجھے ایسے حال میں رکھ کہ جب تیرا حکم نازل ہو تو مجھے راضی برضا پائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ رضا کا سوال قضا کے بعد پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر رضا مقدم ہو تو یہ صرف رضا کا ارادہ ہو سکتا ہے اور محض ارادہ رضا نہیں کہلا سکتا۔ ابو العباس فرماتے ہیں۔ الرضا نظر القلب إلی قدیم اختیار الله للعبد ''رضا خدائے قدیم کے اختیار کلی کو بدل و جان تسلیم کرنے کا نام ہے۔'' یعنی جو کچھ بھی رونما ہو انسان یہ سمجھے کہ عین قدیم ارادہ خداوندی

1۔ مسند احمد

اور سابق حکم حق کے مطابق ہے۔ شاداں ہو اور اضطراب سے بچے۔ حارث محاسبی نے جو اس مکتبہ فکر کے موجد ہیں فرمایا، الرضا سکون القلب تحت الأحکام ''رضا احکام جاریہ پر تسکین قلب کا نام ہے۔'' یہ قول ثقہ ہے کیونکہ دل کا سکون وطمانیت انسان کوشش سے حاصل نہیں کرتا بلکہ محض انعام خداوندی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ رضا احوال ہے مقام نہیں اکثر عتبۃ الغلام کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک رات سویا نہیں اور تا بہ سحر پکارتا رہا: ان تغذبنی فإنا لک محب وإن ترحمنی فانا لک محب۔ ''مجھے عذاب میں مبتلا کر یا رحمت سے نواز میں ہر حال میں تجھے محبت کرتا ہوں۔'' یعنی عذاب کی تکلیف اور نعمت کی لذت بدن کو حاصل ہوتی ہے۔ محبت کا معاملہ دل سے ہے۔ یہ چیز بھی محاسبی کے مکتبہ کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ رضا محبت کا نتیجہ ہے۔ محبوب جو کچھ کرے محبّ اس پر راضی ہوتا ہے۔ عذاب یا نعمت حجاب دوستی نہیں ہو سکتے۔ صرف اختیار حق کے مقابل اپنا اختیار بے کار سمجھنا چاہئے۔

ابو عثمان حیری فرماتے ہیں، منذ أربعین سنة ما أقامنی الله فی حال فکرهته وما نقلنی إلی غیره فسخطته ''چالیس برس گذر گئے باری تعالیٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اسے مکروہ نہیں سمجھا مجھے کوئی تغیر حال صرف اس بناء پر پیش نہیں آیا کہ میں کسی حال میں دل برداشتہ ہو چکا تھا۔'' یہ دوام رضا اور کمال محبت کی طرف اشارہ ہے۔

کہتے ہیں ایک درویش دریائے دجلہ میں گر گیا۔ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ کنارے پر سے کسی نے پکار کر پوچھا، ''کیا کسی کو مدد کے لئے پکاروں؟'' درویش نے کہا ''نہیں'' پکارنے والے نے پھر پوچھا ''کیا ڈوبنا چاہتے ہو؟''

درویش نے پھر کہا ''نہیں'' ''تو کیا چاہتے ہو؟''

''وہی جو خدا چاہتا ہے۔ میرے چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

مشائخ نے اختلاف عبارات کے ساتھ رضا پر بہت کچھ کہا ہے۔ مگر اصولاً وہی دو چیزیں ہیں جو بیان کر دی گئیں۔ مگر اب ضروری ہے کہ احوال ومقام کا فرق بیان کیا جائے

اوران کی حدود قائم کردی جائیں تا کہ آپ اور دوسرے پڑھنے والوں کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا آسان تر ہو جائے انشاء اللہ تعالیٰ عزوجل

حال اور مقام کا فرق

حال اور مقام کے الفاظ اہل تصوف عملاً استعمال کرتے ہیں اوران کی عبارات میں اکثر سامنے آتے ہیں۔ اہل تحقیق تفسیر علوم میں بیشتر ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ طالبان علم تصوف کے لئے ان کا صحیح مفہوم جان لینا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ باب اس تفصیل حدود کا مناسب مقام نہیں تاہم یہ تشریح ضروری ہے۔ سب توفیق ہمت اور پاکیزگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ لفظ مقام برفع میم اقامت کو کہتے ہیں اور فتح میم کے ساتھ جائے اقامت کو۔ یہ تفصیل اور معنی لفظ مقام کے بارے میں غلط ہے کیونکہ عربی قواعد کے مطابق مقام بضم میم اقامت اور جائے اقامت کو کہتے ہیں اور بفتح میم قیام اور جائے قیام کو کہتے ہیں۔ مقام سے مراد راہ حق میں کھڑا ہونا ہے اور اس مقام سے متعلقہ تمام فرائض کو پورا کرنا ہے یہاں تک کہ انسان کو تابہ امکان یقین ہو جائے کہ اسے درجہ کمال حاصل ہو چکا ہے۔ یہ روا نہیں کہ کوئی بغیر تکمیل کے کسی مقام سے گذر جائے پہلا مقام توبہ کا ہے دوسرا انابت کا تیسرا زہد کا اور پھر توکل کا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بغیر توبہ کے کوئی انابت کا مدعی ہو۔ بغیر انابت کے زہد کا اور بغیر زہد کے توکل کا۔ باری تعالیٰ نے بواسطہ جبرائیل علیہ السلام خبر دی، **وما منا إلا له مقام معلوم** "ایسا کوئی نہیں جس کے لئے مقام مقرر نہ ہو۔

"حال" وہ کیفیت ہے جو حق عزوجل کی طرف سے کسی دل پر وارد ہو۔ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کے ورود کو روک سکے یا کوشش سے حاصل کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ مقام سے مراد طالب کی راہ نوردی جدوجہد اور حسب استطاعت بارگاہ حق میں اس کے درجہ کا نام ہے۔ اس کے برعکس حال وہ لطف وکرم خداوندی ہے جو بغیر مجاہدہ قلب انسانی کو ارزاں ہوتا ہے۔ مقام، عمل اور کسب ہے اور حال فضل وعطائے خداوندی ہے۔ صاحب

مقام اپنے مجاہدہ سے برقرار ہوتا ہے۔ صاحب حال اپنی ذات سے بے خبر اس حال سے سرشار ہوتا ہے جو اسے بارگاہ حق سے عطا ہو۔

یہاں مشائخ کرام میں اختلاف ہے ایک گروہ حال کے دوام کا قائل ہے اور دوسرا گروہ اس چیز کو تسلیم نہیں کرتا۔ حارث محاسبی کے خیال میں حال دائمی چیز ہے۔ آپ کا استدلال ہے کہ محبت، شوق، انقباض اور انبساط سب حال کے تحت آتے ہیں اور اگر حال کو دوام نہ ہو، محبّ محبّ اور مشتاق مشتاق نہیں ہو سکتا۔ جب تک حال انسان کی صفت نہ ہو حال کے لفظ کا اطلاق اس پر ناروا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ حال کو منجملہ احوال تصور کرتے ہیں۔ اس خیال کو ابوعثمان کے اس قول میں ظاہر کیا گیا ہے: منذ أربعين سنة ما أقامني الله على حال فكرهته ''گذشتہ چالیس برس میں باری تعالیٰ نے مجھے کسی ایسے حال میں نہ رکھا جس سے میں دل برداشتہ ہوا۔''

دیگر مشائخ دوام حال کے منکر ہیں۔ جنید نے فرمایا ''احوال کی حیثیت چشمک برق سے زیادہ نہیں۔ ان کے دوام کا تصور نفس کی تخلیق ہے۔'' اسی طرح اوروں نے کہا، الأحوال كأسمها يعني أنها كما تحل بالقلب ''احوال کی حیثیت ان کے نام سے زیادہ نہیں یعنی دل پر ان کا ورود ہوتا ہے۔'' اور وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ باقی رہتا ہے وہ صفت ہے صفت کے لئے موصوف کی ضرورت ہوتی ہے اور موصوف کو صفت سے زیادہ صاحب وقار ہونا چاہئے۔ اس طرح سوچا جائے تو حال کا دوام بے معنی نظر آتا ہے۔ میں حال و مقام کا فرق بیان کر رہا ہوں تا کہ جہاں کہیں بھی عبارات صوفیہ یا اس کتاب میں یہ الفاظ استعمال ہوں ان کے یہ معانی پیش نظر رہیں۔

المختصر رضا مقامات کی انتہا اور احوال کی ابتدا ہے۔ ایک ایسی جگہ ہے جس کی ایک طرف کسب و مجاہدہ کا سہارا لئے ہوئے ہے اور دوسری طرف محبت و تواجد کا۔ اس کے بعد کوئی مقام نہیں۔ یہاں پہنچ کر مجاہدہ ختم ہو جاتا ہے یعنی آغاز کسب و مجاہدہ سے ہے اور انجام انعامات خداوندی پر اسے مقام کہو یا حال کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ محاسبی مکتبہ خیال ہے عملاً اسد محاسبی کوئی تخصیص نہیں فرماتے تھے۔ اپنے پیروکاروں کو یہ تنبیہ ضرور فرماتے تھے کہ عملاً یا قولاً کسی بات کے مرتکب نہ ہوں۔ جو درست تو ہو مگر اس برائی کا شبہ کیا جا سکے۔ مثلاً آپ کے پاس ایک بہت بڑا مرغ تھا جو بانگ دیا کرتا تھا۔ ایک روز ابوحمزہ بغدادی جو آپ کا فرماں بردار اور صاحب دل مرید تھا، آپ کے پاس آیا۔ مرغ نے بانگ دی۔ ابوحمزہ نے نعرہ بلند کیا۔ حارث کھڑے ہو گئے اور فرمایا: "تو کافر ہو گیا۔" یہ کہہ کر چھری سے اس کو ہلاک کرنے کو بڑھے۔ باقی مرید پاؤں پر گر گئے اور ابوحمزہ کو بچا لیا۔ حارث نے کہا "مردود! مسلمان ہو۔" لوگوں نے کہا حضرت! یہ تو ولی اللہ اور پکا موحد ہے آپ اس پر کیوں ناراض ہو رہے ہیں؟ فرمایا: میں ناراض نہیں ہو رہا۔ یہ صاحب مشاہدہ ہے اور اس کا باطن مستغرق توحید ہے۔ مگر اس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہیں ہونی چاہئے جو حلولیوں سے مشابہ ہو۔ مرغ جو بے عقل جانور ہے اپنی عادت کے مطابق بانگ دیتا ہے۔ یہ کیوں سمجھے کہ اس میں آواز حق ہے۔ خدا کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور اس کی ذات قدیم کسی چیز میں حلول نہیں کرتی۔ ابوحمزہ نے شیخ کا مطلب سمجھ کر کہا: "گو میں نظریاتی طور پر صحیح ہوں مگر چونکہ میرا فعل مرتدین سے ملتا ہے اس لئے میں توبہ کرتا ہوں۔"

اسی طریق پر اور بہت سی باتیں ہیں مگر میں اختصار سے کام لے رہا ہوں اور یہی راہ سلامتی پر قابل تعریف اور ہوش و خرد کے لئے بے ضرر ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَقِفْ مَوَاقِفَ التُّهَمِ(1)

"جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور روز قیامت کو مانتا ہے اس کو چاہئے کہ ہر اس موقف سے دور رہے جہاں تہمت لگ سکے۔"

میں علی بن عثمان عفی اللہ عنہ ہمیشہ بارگاہ حق سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس چیز کی توفیق عطا فرمائے مگر فی زمانہ ظاہر دار لوگوں کی صحبت میں بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ اگر سیاہ کاری اور فریب میں ان کی موافقت نہ کی جائے تو وہ عداوت پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ اللہ جہالت

1۔ ملا علی قاری: الاسرار المرفوعہ میں شاہد مذکور ہیں۔

سے اپنی پناہ میں رکھے۔ واللہ اعلم

فرقہ قصاری

قصاری فریق کے لوگ ابو صالح حمدون بن احمد بن عمار قصار رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں یہ بزرگ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور طریقت کے سردار تھے۔ ''ملامت'' کے اظہار و تشہیر پر اعتقاد رکھتے تھے۔ معاملات کے پہلوؤں پر عالی کلام تھے۔ آپ کا قول ہے: ''تجھے خدا خلقت سے بہتر جاننے والا ہے۔'' یعنی عالم خلوت میں تیرا معاملہ باری تعالیٰ کے ساتھ اس معاملہ سے بہتر ہونا چاہئے جو سر عام خلقت سے روا رکھتا ہے کیونکہ خلقت کے ساتھ تیرا تعلق تیرے اور تیرے خدا کے درمیان حجاب اعظم ہے۔ ابتدائے کتاب میں باب ملامت کے تحت میں ان کے متعلق کچھ احوال و حکایات معرض بیان میں لا چکا ہوں اختصار کے ساتھ تا کہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔

ایک نادر حکایت یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: میں ایک روز نواح نیشاپور میں دریائے حیرہ کے کنارے جا رہا تھا۔ نوح عیار جو نیشاپور کے تمام عیاروں کا سردار تھا سخاوت اور جوانمردی میں مشہور تھا، مجھے ملا۔ میں نے پوچھا: ''اے نوح! جوانمردی کیا چیز ہے؟'' نوح نے کہا ''میری جوانمردی یا تمہاری؟'' کہا ''دونوں'' نوح نے جواب دیا ''میری جوانمردی یہ ہے کہ میں قبا چھوڑ کر خرقہ اختیار کرتا ہوں اور وہ کام کرتا ہوں جو خرقہ کو زیبا ہیں تا کہ میں صوفی بن جاؤں اور باری تعالیٰ سے واصل ہو کر سیاہ کاری سے پرہیز کروں۔ تم خرقہ سے پرہیز کرو تا کہ خلقت تمہیں اور تم خلقت کو فریب نہ دے سکو۔ غرضکہ میری جوانمردی ظاہری حفظ شریعت ہے اور تمہاری باطنی حفظ طریقت۔'' یہ بات اصولاً نہایت ثقہ ہے۔

فرقہ طیفوریہ

یہ لوگ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار ہیں۔ آپ رئیس اور بزرگ اہل طریقت میں سے تھے۔ آپ کا طریق غلبہ اور مستی تھا۔ حق تعالیٰ کا غلبہ شوق اور اس کی دوستی میں از خود رفتگی انسانی دائرہ امکان سے باہر ہے۔ کسی غیر ممکن چیز

کا دعویٰ ہمیشہ باطل ہوتا ہے اور اس کی تقلید محال ہوتی ہے۔ صاحب ہوش کے لئے مستی صفت نہیں اور انسان مستی کو جذب کرنے پر قادر نہیں۔ مست بجائے خود از خود رفتہ ہوتا ہے اور خلقت سے بے نیاز۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کوشش کر کے کوئی صفت پیدا کر سکے۔ مشائخ کبار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صرف وہی آدمی قابل اتباع ہوتا ہے جو مستقیم ہو اور جملہ احوال سے آزاد ہو چکا ہو۔ تاہم بعض کا خیال ہے کہ ''مستی ووارفتگی'' کی راہ بھی کوشش سے طے ہوسکتی ہے کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: اِبْكُوْا فَاِنْ لَمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا(1) ''روؤ۔ اگر نہیں رو سکتے تو رونے والوں کی سی صورت بناؤ۔'' اس کی دو صورتیں ہیں: از راہ ریاکاری کسی کی نقل کرنا شرک صریح ہے۔ مگر جب نقل کا مقصد یہ ہو کہ شاید باری تعالیٰ از راہ کرم ان کی طرح ہی بنا دے جن کی نقل کی جارہی ہے تو یہ عین اس حدیث نبوی ﷺ کے مطابق ہے۔ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ(2) ''جو شخص کسی قوم کی شکل اختیار کرے وہ اسی قوم سے ہے۔'' بشرطیکہ جس مجاہدہ کی ضرورت پیش آئے اس سے عہدہ برآ ہو اور بارگاہ حق سے امید رکھے کہ حق تعالیٰ اس کے لئے تحقیق و معانی کے دروازے کھول دے گا۔ کسی شیخ طریقت کا قول ہے: ''مجاہدات مشاہدات کا ذریعہ بنتے ہیں۔'' میں یہ کہتا ہوں کہ مجاہدات بہر صورت قابل تحسین ہیں مگر غلبہ و مستی کسب کے تحت نہیں آتے اور مجاہدات سے صورت پذیر نہیں ہوتے۔ مجاہدات کسی حالت میں بھی غلبہ و مستی کا سبب نہیں بن سکتے۔

اب میں سکر و صحو (مستی و ہوشیاری) پر مشائخ کبار کے مختلف خیالات تحریر کرتا ہوں تا کہ ان کی صحیح کیفیت سامنے آجائے اور ابہام دور ہو جائے۔ انشاءاللہ تعالیٰ

سکر اور صحو

ارباب معانی سکر کا لفظ ''غلبہ محبت حق تعالیٰ'' کے لئے استعمال کرتے ہیں اور صحو ''حصول مراد'' کے لئے (سکر، نشہ، بے ہوشی اور صحو، ہوش) اس معاملہ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ کچھ لوگ سکر کو صحو سے افضل سمجھتے ہیں اور کچھ صحو کو سکر سے۔ ابو یزید اور اس کے پیروکار

1۔ قضاعی، مسند شہاب 2۔ سنن ابی داؤد، مسند احمد

سکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں صحو کی بنیاد آدمیت کی صفت کے استحکام و استقامت پر ہوتی ہے اور آدمیت کی صفت حجاب اعظم ہے۔ اس کے برعکس سکر صفات بشریت کے زوال اور نقصان پر مبنی ہوتا ہے۔ انسانی تدبر، اختیار، تصرف اور خودی کی فنا ہو تو سکر ظہور پذیر ہوتا ہے اور صرف وہ قوتیں رو بہ کار رہ جاتی ہیں جو بشریت سے بالاتر ہوں۔ یہی قوتیں کامل و بالغ ترین ہوتی ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام حالت صحو میں تھے جو فعل ان سے ظہور پذیر ہوا باری تعالیٰ نے اسے ان کی ذات سے منسوب کر دیا اور فرمایا: قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ (البقرہ:251) ''داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔'' ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم سکر میں تھے جو چیز ان سے ظہور پذیر ہوئی، باری تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا: وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (الانفال:17) ''(کنکریاں) جب پھینکیں، تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔'' بندے، بندے میں کتنا فرق ہے جو اپنی ذات میں قائم اور اپنی صفات میں ثابت تھا بوجہ کرامت اس کا فعل اسی سے منسوب کیا جو ذات حق سے قائم اور اپنی صفات میں فانی تھا، اس کا فعل اپنا فعل گردانا۔ انسانی فعل کا ذات حق سے منسوب ہونا اس سے بہتر ہے کہ فعل حق تعالیٰ بندے سے منسوب ہو۔ جب فعل حق بندے سے منسوب ہو تو بندہ صفات بشریت میں قائم ہوتا ہے اور جب بندے کا فعل حق سے منسوب ہو تو بندہ ذات حق سے قائم ہوتا ہے۔ صفات بشریت میں قائم ہونے سے یہ ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی نظر خلاف دستور اور کی عورت پر پڑی اور دیکھا جو دیکھا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر بھی اسی طرح پڑی اور وہ عورت زید پر حرام ہوگئی کیونکہ آپ سکر کے عالم میں تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام حالت صحو میں تھے۔

صحو کو سکر پر فضیلت دینے والے جنید اور ان کے پیرو کار ہیں۔ ان کے نزدیک سکر محل آفت ہے کیونکہ اس کا مطلب پریشان حالی، فنائے صحت اور از خود رفتگی ہے۔ طالب کی طلب از روئے فنا ہوتی ہے یا از روئے بقا، از روئے محویت ہوتی ہے یا از روئے ثبات، جب انسان صحیح الحال نہ ہو تو تحقیق و طلب بے کار ہے۔ اہل حق کا دل تمام موجودات سے

مجرد ہونا چاہئے۔ آنکھیں بند کر لینے سے عالم اشیاء کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ عالم اشیاء کی دلفریبیوں میں الجھ جاتے ہیں وہ دراصل کسی چیز کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھتے اگر دیکھتے تو الجھنے سے محفوظ رہتے۔ دیکھنے کی دو صورتیں ہیں: دیکھنے والا بقا کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے یا فنا کے۔ بقا کی نظر ہو تو کائنات کی ہر چیز اپنی بقا کے مقابل نامکمل دکھائی دیتی ہے کیونکہ شے بذات خود باقی نہیں۔ فنا کی نظر ہو تو حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی نظر آتی ہے بہرصورت وہ کائنات سے روگرداں ہو جاتا ہے۔ اس لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا میں فرمایا ہے، اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَاھِیَ ''اے خدا! ہمیں ہر چیز اس کے اصلی روپ میں دکھا۔'' یہ معنی ہیں باری تعالیٰ کے اس فرمان کے، فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۲﴾ (الحشر) ''اے آنکھ والو عبرت حاصل کرو۔'' یہ تمام بجز صحو کے سرانجام نہیں پا سکتا۔ اہل سکر اس سے قطعاً محروم ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام حالت سکر میں تھے ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے، بے ہوش ہو گئے۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت صحو میں تھے۔ مکہ سے قاب قوسین تک تجلیوں کی زد میں ہوشیار و بیدار تر رہے۔

شربت الراح کاسا بعد کأس فما نفد الشراب وما رویت

''میں نے ساغر پر ساغر پیا نہ شراب کم ہوئی نہ میں سیراب ہوا''۔

میرے پیر طریقت نے جو جنیدی مکتب سے تعلق رکھتے تھے، فرمایا: سکر بازیچہ اطفال ہے اور صحو رزم گاہ مرداں۔ میں بھی ان کی موافقت میں یہی کہتا ہوں کہ صاحب سکر کے حال کا کمال صحو ہے۔ صحو کا سب سے نچلا درجہ انسان کی بے چارگی کا ادراک ہے اس لئے وہ صحو جو بظاہر آفت معلوم ہو اس سکر سے بہتر ہے جو سر بسر آفت ہو۔ ابوعثمان مغربی سے متعلق مشہور ہے کہ ابتدا میں وہ بیس برس تک بیابانوں میں تنہا رہے جہاں انہوں نے انسانی آواز تک بھی نہ سنی۔ یہاں تک کہ ان کا جسم گھل گیا اور آنکھیں سکڑ کر ٹاٹ سینے والے سوئے کے ناکے کے برابر رہ گئیں۔ انسانی شکل و شباہت ختم ہو گئی۔ بیس برس کے بعد انسانی مجالست کا حکم ہوا۔ دل میں سوچا کہ ابتدا اہل حق اور مجاوران خانہ خدا سے کرنا چاہئے۔ چنانچہ مکہ کا

قصد کیا۔ مشائخ کو روحانی طور پر آپ کے آنے کی خبر ہوگئی۔ استقبال کے لئے آئے۔ دیکھا تو صورت بالکل بدل چکی تھی اور پیدائشی قویٰ میں صرف بال برابر سکت باقی تھی۔ مشائخ نے پوچھا آپ نے بیس برس اس طرح بسر کئے ہیں کہ آدم اور اس کی اولاد معرض حیرت میں ہے۔ فرمایئے آپ کیوں گئے تھے، کیا حاصل کیا، اب کیوں واپس آگئے؟ آپ نے فرمایا "حالت سکر میں نکل گیا تھا۔ آفت سکر دیکھی، ناامیدی حال ہوئی اور عاجز ہو کر واپس آنا پڑا۔" مشائخ نے کہا "مرحبا! آپ کے بعد تفرقہ سکر و صحو پر گفتگو کرنا حرام ہے۔ آپ نے معاملہ صاف کر دیا اور آفت سکر کو نمایاں فرما دیا"۔

"سکر" دراصل اپنی ذات کی فنا کا غلط احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ صفات بشریت موجود ہوتی ہیں۔ یہ ایک حجاب ہے اس کے برعکس صحو دیدار بقا ہوتا ہے جہاں صفات بشریت ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے کہ سکر فنا کے قریب تر ہے کیونکہ سکر صحو کی صفت پر ایک زائد صفت ہے اور جب تک انسانی صفات روبہ ترقی ہیں، انسان ان سے بے خبر ہوتا ہے۔ مگر جب انسان صفات بشریت سے دست بردار ہو رہا ہو تو اہل حق اس کے احوال کو امید افزا سمجھتے ہیں۔ صحو سکر کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔

ابو یزید کی نسبت مشہور ہے کہ آپ نے حالت غلبہ میں یحییٰ بن معاذ کو خط لکھا اور پوچھا، "آپ کا کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں جو دریائے محبت کا ایک قطرہ پی کر سرشار ہو جائے۔" بایزید نے جواباً پوچھا "آپ کیا فرماتے ہیں اس شخص کے بارے میں جس کے لئے تمام جہان شراب محبت ہو جائے اور وہ سب پی کر بھی تشنہ لب محسوس کرے۔"

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یحییٰ کا مطلب سکر سے تھا اور ابو یزید کا صحو سے۔ مگر یہ غلط ہے صاحب صحو اسے سمجھا جاتا ہے جو ایک قطرہ بھی نہ پی سکے اور صاحب سکر وہ کہلاتا ہے جو سب پی کر بھی تشنہ لب ہو۔ شراب مستی کا آلہ کار ہے اور ہوشیاری کی دشمن۔ سکر کو اس چیز کی ضرورت ہے جو اس کی ہم پایہ ہو یعنی شراب اور صحو یعنی ہوش کو شراب (مستی) سے کوئی تعلق نہیں۔

سکر کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں: ۱۔ سکر از راہ مودت، ۲۔ سکر از راہ محبت

پہلی قسم کا سکر نعمت کے پیش نظر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے سکر کے لئے علت کی ضرورت نہیں۔ وہ منعم کے التفات سے پیدا ہوتا ہے۔ نعمت پر نظر رکھنے والا ذاتی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے مگر منعم کو سامنے رکھنے والا منعم میں محو ہوتا ہے اور اپنی ذات کو نظر انداز کر دیتا ہے گویا وہ صاحب سکر ہو کر بھی صاحب صحو ہوتا ہے۔

صحو کی بھی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں: ۱۔ صحو از روئے غفلت، ۲۔ صحو از روئے محبت

پہلی قسم تو حجاب اعظم ہے مگر دوسری عین مشاہدہ۔ صحو از روئے غفلت محض سکر ہوتا ہے اور جو صحو محبت سے حاصل ہو وہ سکر سے کم نہیں ہوتا اور چونکہ اصلیت مستحکم ہوتی ہے اس لئے صحو و سکر میں فرق نہیں رہتا۔ اگر اصلیت غیر مستحکم ہو تو دونوں بے کار ہیں۔

الغرض سالکان طریقت کی راہ میں سکر و صحو اختلافات کی وجہ سے ہیں۔ جب سلطان حقیقت جلوہ فرما ہوتا ہے تو دونوں چیزیں طفیلی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دونوں کی حدود ملتی ہیں۔ ایک کی انتہا دوسرے کی ابتدا ہے۔ ابتدا اور انتہا فرق مابین ظاہر کو کرتی ہیں اور فرق صرف نسبت باہمی کا نام ہے۔ وصل ہر تفرقہ کی نفی کرتا ہے۔ بقول شاعر

إذا طلع الصباح بنجم راح تساوى فيه سكران وصاح

''جب آفتاب ساغر طلوع ہوتا ہے تو مست و ہوشیار میں کوئی فرق نہیں رہتا''۔

سرخس میں دو پیران طریقت تھے، لقمان اور ابو الفضل حسن رضی اللہ عنہما۔ ایک روز لقمان ابو الفضل کے پاس آئے اور دیکھا کہ وہ ایک مسودہ سامنے رکھے پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا ''ابو الفضل! اس کاغذ میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''وہی جو تم بغیر کاغذ تلاش کر رہے ہو۔'' لقمان نے کہا ''تو پھر یہ تفرقہ کیوں؟'' فرمایا ''تفرقہ تمہیں اپنے سوال کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ سکر سے نکل کر صحو میں آؤ اور پھر صحو سے دست بردار ہو جاؤ تاکہ تفرقہ مفقود ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ میں اور تم کیا تلاش کر رہے ہیں۔

یہ طیفوریہ اور جنیدیہ مکاتب تصوف کا فرق تھا جو میں نے بیان کر دیا۔ معاملت میں بایزید ترک صحبت اور عزلت گزینی کے قائل تھے اور اپنے مریدوں کو یہی تلقین کرتے تھے۔

اگر یہ میسر آ جائے تو یہ طریق نہایت درجہ قابل تحسین ہے۔

فرقہ جنیدیہ

اس مکتبہ تصوف کے لوگ ابو القاسم جنید بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں۔ جنید اپنے زمانے میں طاؤس العلماء مشہور تھے۔ اس طائفہ کے سردار تھے اور اماموں کے امام۔ آپ کی تعلیم صحو پر مبنی ہے۔ طیفوریہ مکتبہ کے برعکس جو سکر کو اپناتے ہیں، جنیدی مکتبہ مشہور و مقبول ترین گنا جاتا ہے۔ تمام مشائخ اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ گو بظاہر ان کے اقوال بہت حد تک مختلف ہیں۔ میں نے طول کلام کے خوف سے اختصار سے کام لیا ہے۔ اگر قارئین میں سے کسی کو اس سے زیادہ درکار ہو تو کسی اور کتاب سے رجوع کر سکتا ہے۔

حکایات میں سے ہے کہ جب حسین بن منصور مغلوب الحال ہونے کے بعد عمر بن عثمان سے روگرداں ہو کر جنید کے پاس آئے۔ جنید نے پوچھا "کیوں آئے ہو؟" حسین نے کہا "فیض صحبت کے لئے" فرمایا "اہل جنوں کا ہمارے ہاں کوئی کام نہیں۔ مجالست کے لئے صحت کی ضرورت ہے اور تمہیں صحت حاصل ہو گئی تو وہی کرو گے جو عبداللہ تستری اور عمرو نے کیا۔"

حسین بن منصور نے کہا: "یا شیخ! سکر و صحو دو انسانی صفات ہیں اور جب تک یہ فنا نہیں ہوتیں انسان حق تعالیٰ سے محجوب ہیں۔"

جنید نے فرمایا: "تم غلط کہہ رہے ہو۔ صحو باری تعالیٰ کے سامنے صحت حال کا نام ہے اور سکر فرط شوق اور غائت محبت کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں انسانی صفات میں شامل ہیں اور کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تمہارا کلام فضول اور بے معنی ہے۔" واللہ اعلم

فرقہ نوریہ

نوریہ مکتب تصوف کے پیروکار ابوالحسین احمد بن محمد نوری رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں جو علمائے تصوف کے مشہور و معروف سردار گذرے ہیں۔ روشن مناقب اور قاطع برہان رکھتے تھے۔ آپ کا مکتب تصوف پسندیدہ ہے۔ وہ تصوف کو فقر سے افضل سمجھتے تھے۔ آپ کے مکتب

کی نادر چیز یہ ہے کہ مجالست میں مصاحب کے حق کو برتر سمجھا جائے۔ وہ مجالست بے ایثار کو حرام قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مجالست درویشوں پر فرض ہے اور عزلت قابل گرفت ہے۔ نیز مجالست میں ایثار فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کا قول ہے: ''عزلت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ ابلیس سے ہم نشینی ہے۔ مجالست کو لازم سمجھو کیونکہ اس میں خدا کی خوشنودی ہے۔''

میں اب حقیقت ایثار کی تشریح کرتا ہوں۔ صحبت وعزلت کے باب میں ان سے متعلقہ رموز بیان کروں گا تاکہ سب مستفید ہوسکیں۔ انشاء اللہ عزوجل۔

ایثار

باری تعالیٰ نے فرمایا، وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: 9)

''وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔''

یہ آیت خاص طور پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے حق میں نازل ہوئی۔

ایثار کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ **الإيثار القيام بمعاونة الأغيار مع استعمال ما أمر الجبار لرسوله المختار** ''مصاحب کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ اپنے مطلب کو دوست کے مطلب سے فروتر رکھا جائے اور اس کی خوشی کے لئے خود تکلیف برداشت کی جائے۔ ایثار دوسروں کی مدد کرنے کا نام ہے اور حکم پر عمل کرنا ہے جو باری تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا۔ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾ (الاعراف)

''عفو سے کام لیں۔ امر معروف کا حکم دیں اور اہل جہالت سے دور رہیں۔

ایثار کی دو صورتیں ہیں: ا۔ ایثار مصاحبت، ۲۔ ایثار محبت۔

مصاحب سے ایثار کوشش اور تکلف چاہتا ہے مگر محبوب سے ایثار سر بسر مسرت ہوتی ہے۔

کہتے ہیں جب غلام الخلیل نے صوفیوں پر سختی کی اور ہر ایک کو اپنے جور وستم کا نشانہ بنایا تو نوری، رقام اور ابوحمزہ گرفتار ہو کر دربار خلافت میں پیش ہوئے۔ غلام الخلیل نے الزام لگایا کہ یہ لوگ اہل زندقہ میں شامل ہیں اور ان کے سرغنہ ہیں اگر ان کی گردنیں اڑا دی

جائیں تو زندقہ کی بیخ کنی ہو جائے گی۔ جو اس نیک کام کو سرانجام دے میں اس کے لئے اجر عظیم کا ضامن ہوں۔ خلیفہ نے فوراً قتل کا حکم صادر کر دیا۔ جلاد نے سب کے ہاتھ باندھ دیئے اور تلوار لے کر رقام کی طرف بڑھا۔ نوری فوراً مقتل میں مسکراتے ہوئے رقام کی جگہ پہنچ گئے لوگ حیران ہو گئے۔ جلاد نے پوچھا اے جواں مرد! یہ تلوار ایسی چیز نہیں کہ تو مسکراتا ہوا اس کی زد میں آئے حالانکہ تیری باری ابھی نہیں آئی۔ نوری نے جواب دیا "میرا مسلک ایثار ہے۔ دنیا میں عزیز ترین چیز زندگی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ باقی ماندہ چند سانس ان بھائیوں کے کام آ جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیوی زندگی کا ایک لمحہ دوسری دنیا کے ہزار سال سے بہتر ہے کیونکہ یہ مقام خدمت ہے اور وہ مقام قربت اور قربت خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔" قاصد نے یہ خبر خلیفہ کو پہنچائی اور وہ نوری کے کلام کی رقت اور نزاکت سے حیرت زدہ ہو گیا۔ اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے قتل کا حکم منسوخ کر کے معاملہ تحقیق کے لئے قاضی کے سپرد کر دیا۔ قاضی القضاۃ ابو العباس بن علی سب کو اپنے گھر لے گیا۔ شریعت و طریقت سے متعلق ان سے سوالات کئے۔ سب کو ہر پہلو سے کامل پایا اور اپنی غفلت پر نادم ہوا۔ نوری نے کہا: "قاضی صاحب! آپ نے جو کچھ پوچھا وہ گویا نہ پوچھنے کے برابر ہے۔ خدائے عزوجل جن کو بزرگی عطا فرماتے ہیں وہ خدا کے لئے کھاتے ہیں۔ خدا کے لئے پیتے ہیں۔ اسی کے لیے بیٹھتے ہیں اور اسی کے لئے کلام کرتے ہیں۔ ان کی حرکات ان کی سکنات غرض ان کی ہر چیز اسی کے لئے ہوتی ہے۔ وہ اسی کے مشاہدہ میں رہتے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے وہ مشاہدۂ حق سے محروم ہو جائیں تو بے قرار ہو جاتے ہیں۔"

قاضی بہت حیران ہوا اور اس نے خلیفہ کو لکھا کہ اگر یہ لوگ ملحد ہیں تو دنیا میں کوئی موحد نہیں۔ خلیفہ نے سب کو دربار میں طلب کیا اور کہا کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگو۔ سب نے کہا "صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہمیں فراموش کر دیں نہ اپنے تقرب سے سرفراز کریں نہ راندۂ درگاہ خیال کریں کیونکہ ہمارے نزدیک آپ کا تقرب اور آپ سے دوری برابر ہیں۔"

خلیفہ آبدیدہ ہو گیا اور ان کو عزت و آبرو سے رخصت کر دیا۔

نافع روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو مچھلی کی خواہش ہوئی۔ تمام شہر میں تلاش کی گئی مگر میسر نہ آئی۔ کئی دنوں کے بعد مجھے دستیاب ہوئی میں نے کباب بنوا کر پیش کیے۔ مچھلی کو دیکھ کر ابن عمر رضی اللہ عنہ ہشاش بشاش ہو گئے۔ اسی وقت کوئی سائل دروازے پر حاضر ہوا حکم دیا مچھلی سائل کو دے دو۔ غلام نے کہا حضور! اتنے روز کے بعد مچھلی دستیاب ہوئی ہے، اسے کیوں تقسیم کر رہے ہیں؟ اس کی بجائے سائل کو کوئی اور چیز دے دی جائے گی۔ فرمایا: نہیں یہ مجھ پر حرام ہے اور میرے دل سے اتر چکی ہے۔ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، اَيُّمَا امْرِیءٍ يَشْتَهِیْ شَهْوَةً فَرَدَّ شَهْوَتَهٗ وَ آثَرَ عَلٰى نَفْسِهٖ غُفِرَ لَهٗ(1) ''جس نے کسی چیز کی آرزو کی اور وہ اس کو مل گئی اور پھر اس نے کسی دوسرے کی خواہش کو اپنی آرزو سے فائق سمجھ کر اس کو دے دی تو وہ یقیناً بخشش کا مستحق ہے۔''

کہتے ہیں دس درویش ایک بیابان میں سفر کر رہے تھے۔ ان پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ صرف ایک پیالہ پانی تھا وہ ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتے رہے اور کسی نے پانی نہ پیا حتیٰ کہ ان میں سے نو جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ دسویں نے جب دیکھا کہ صرف وہی ایک باقی ہے تو اس نے پانی پی لیا اور سلامت واپس لوٹ آیا۔ کسی نے اس سے کہا ''بہتر یہی تھا کہ تو بھی پانی نہ پیتا۔'' درویش نے جواب دیا: ''تم شریعت سے بے خبر ہو اگر میں نہ پیتا تو خودکشی کا مرتکب ہوتا اور عذاب میں گرفتار ہو جاتا۔'' اس نے پھر پوچھا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی نو درویش خودکشی کے مرتکب ہوئے۔'' درویش نے کہا ''ہرگز نہیں وہ ایک دوسرے کے لئے ایثار کر رہے تھے۔ جب صرف میں باقی رہ گیا تو بحکم شرع پانی پینا مجھ پر واجب تھا۔

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر لیٹ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ مکہ معظمہ سے نکل کر غار میں رونق افروز ہو گئے۔ کفار مکہ نے قتل پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قصد کر رکھا تھا۔ باری تعالیٰ نے جبریل اور میکائیل کو

1۔ حلیۃ الاولیاء

فرمایا: تم دونوں میں بھائی چارہ ہے۔ ایک کی عمر دوسرے سے دراز ہے۔ تم میں سے کون دوسرے کو مقدم سمجھ کر پہلے موت کے لئے تیار ہوگا؟ دونوں میں سے کوئی تیار نہ ہوا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: "علی کا مقام دیکھو اس کے اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان برادری ہے۔ اس نے قتل و مرگ کو قبول کیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹ گیا۔ جان قربانی کے لئے پیش کی اور زندگی کا ایثار کیا۔۔ تم دونوں زمین پر جاؤ اور دشمنوں سے اس کی حفاظت کرو۔" حسب حکم دونوں زمین پر آئے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سرگاہ اور پائے گاہ کی جانب بیٹھ گئے۔۔ جبریل نے کہا: بَخٍ بَخٍ مَنْ مِثْلُکَ یَا ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُبَاهِیْ بِکَ عَلٰی مَلَائِکَتِهٖ "شاباش اے فرزند ابی طالب! تیرے برابر کون ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تیری فضیلت اپنے فرشتوں سے بیان کر رہا ہے۔" اور تو میٹھی نیند سویا ہوا ہے۔ اس وقت یہ آیت آپ کی شان میں نازل ہوئی۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝ (البقرہ) "لوگوں میں وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنی جان فروخت کر دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔"

جب غزوۂ احد میں مومنوں کی آزمائش ہو رہی تھی صالحات انصار میں سے ایک عورت نے ارادہ کیا کہ خود میدان کارزار میں جا کر سرفروشوں کو پانی پیش کرے۔ ایک صحابی زخموں سے نڈھال دم توڑ رہے تھے پانی کے لئے اشارہ کیا۔ جب پانی ان کو دیا جا رہا تھا ایک دوسرے زخمی نے کہا پانی مجھے دو۔ پہلے زخمی نے پانی پینے سے انکار کر دیا اور کہا دوسرے کے پاس لے جاؤ۔ جب اس کے پاس گئی تو تیسرے نے آواز دی پانی مجھے دو۔ دوسرے نے بھی پانی نہ پیا اور کہا تیسرے کے پاس لے جاؤ۔ اسی طرح سات مجروحین کو پانی پیش کیا گیا۔ ساتویں نے پانی پینا چاہا تو دم توڑ دیا۔ واپس ہوئی تو باقی چھ بھی جاں بحق ہو چکے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:9) "وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔"

بنی اسرائیل میں ایک عابد چار سو برس عبادت کرتا رہا ایک روز اس کی زبان سے نکلا:

''اے باری تعالیٰ! اگر تو یہ پہاڑ نہ بناتا تو تیرے بندوں پر سیر و سیاحت آسان ہو جاتی۔''
پیغمبر وقت کو حکم ہوا کہ اس عابد کو کہہ دے کہ خدائی میں تصرف کرنا اس کا کام نہیں۔ وہ چونکہ خیال تصرف کا مرتکب ہوا ہے، ہم نے اس کا نام اہل سعادت کی فہرست سے کاٹ کر اہل شقاوت کی فہرست میں لکھ دیا۔ عابد کا دل باغ باغ ہو گیا اور اس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ پیغمبر وقت نے کہا شقاوت پر سجدہ شکر واجب نہیں۔ عابد نے جواب دیا میرا سجدہ شقاوت پر نہیں بلکہ اس چیز کی مسرت پر ہے کہ آخر میرا نام کسی فہرست میں موجود تو ہے۔ پھر کہا میری ایک درخواست ہے، پیغمبر نے پوچھا کیا؟ آپ خدا سے استدعا کریں اگر میرے لئے جہنم ہے تو ساری جہنم میرے مقدر میں لکھ دی جائے تا کہ کسی اور گنہ گار موحد کے لئے جگہ باقی نہ رہے اور میرے سوا سب بہشت میں چلے جائیں۔'' فرمان خداوندی آیا:

''اس بندے سے کہو یہ صرف امتحان تھا۔ اہانت پیش نظر نہ تھی۔ دنیا اور عقبیٰ میں تو جس کی شفاعت کرے گا وہ بہشت میں جائے گا۔''

میں نے احمد بن حماد سرخسی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا'' آپ کی توبہ کی ابتدا کیسے ہوئی؟'' فرمایا: میں سرخس کے جنگل میں اونٹ چراتا تھا۔ ایک رات جنگل میں رہا۔ میری ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ خود بھوکا رہوں اور اپنا حصہ دوسروں کی نذر کروں۔ خدائے عزوجل کا یہ فرمان ہر وقت میرے سامنے ہوتا تھا۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: 9) ''وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔'' اہل طریقت سے مجھے ارادت تھی ایک دن ایک بھوکا شیر آیا اور اس نے میرا ایک اونٹ مار ڈالا۔ اس کے بعد وہ ایک بلندی پر چڑھ گیا اور زور سے دھاڑا۔ جنگل کے درندے اس کی آواز سن کر جمع ہو گئے۔ شیر نے نیچے اتر کر اونٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ سب درندوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ جب وہ چلے گئے تو شیر نے خود بھی کچھ کھانے کا ارادہ کیا۔ اسی وقت ایک پا شکستہ لومڑی دور سے آتی دکھائی دی شیر پھر بلندی پر چڑھ گیا۔ لومڑی نے بے خوف ہو کر کچھ کھایا اور واپس چلی گئی۔ شیر نے بھی اتر کر کچھ کھایا۔ میں نے سب کچھ دیکھا۔ واپس

لوٹتے ہوئے شیر نے فصیح زبان میں کہا: اے احمد! لقمے کا ایثار کتوں کا کام ہے۔ مردان ہمت جان و زندگانی ایثار کرتے ہیں۔ یہ دلیل بین دیکھ کر میں نے سب کچھ تیاگ دیا۔ یہ میری توبہ کی ابتدا تھی۔"

ابو جعفر خالدی بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ گوشہ خلوت میں مناجات کر رہے تھے۔ میرے دل میں آئی کہ کان لگا کر چپکے سے سنوں۔ مناجات میں عجیب فصاحت تھی۔ فرما رہے تھے "باری تعالیٰ! کیا تو اہل جہنم کو عذاب دے گا؟ حالانکہ سب مخلوق تیری ہے تیرے قدیم علم، قدرت اور ارادے سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اگر جہنم کو پر کرنا ہی ہے تو یہ تیری قدرت کاملہ سے بعید نہیں کہ صرف میرے ہی وجود سے ساری جہنم اور اس کے طبقات کو پر کر دے اور باقی سب کو بہشت میں بھیج دے۔" ابو جعفر کہتے ہیں کہ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اسی رات خواب میں ہاتف غیب نے مجھے حکم دیا کہ ابوالحسن نوری کو بشارت دے دو کہ اسے اس شفقت اور تعظیم کے طفیل بخش دیا گیا جو اس کے دل میں خدا کے بندوں کے لئے موجود ہے۔

ابوالحسن نوری کو نوری اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب وہ بات کرتے تھے تو اندھیرے گھر میں نور پھیل جاتا تھا اور وہ اس نور حق کے ذریعے مریدوں کے اسرار سے واقف ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنید آپ کو "جاسوس القلب" کہا کرتے تھے۔ یہ ہے ان کے مکتب تصوف کی خصوصیت اہل بصیرت کے نزدیک، اس کی بنیاد مضبوط اور معظم ہے۔

روحانی قربانی سے اور اپنے مقصود محبت سے دست بردار ہونے سے مشکل تر کوئی کام نہیں۔ باری تعالیٰ نے تمام خوبیوں کی کلید کا حق دار اسے ٹھہرایا جو اپنی محبوب چیز کو دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔ جیسا کہ فرمایا، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران: 92) "جب تک تم اپنی محبوب چیز کو راہ حق میں خرچ نہ کرو کسی نیکی کے حق دار نہیں ہو سکتے۔" جو انسان اپنی روح پیش کر سکتا ہے اس کی نظر میں مال، حال، لباس اور طعام کی کیا حقیقت ہے یہ طریقت کی بنیاد ہے۔

ایک شخص رویم کے پاس آیا اور وصیت کا طلب گار ہوا۔ فرمایا "بیٹا! یہ کام جان قربان کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر ہمت نہیں تو صوفیوں کی بے سروپا باتوں میں مت الجھ۔" اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ واہیات ہے۔

باری تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (آل عمران) "جو لوگ راہ حق میں قتل ہوئے انہیں مردہ مت تصور کرو۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں۔

اور نیز فرمایا، وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ (البقرہ:154) "راہ حق میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔" قرب جاودانی جان قربان کرنے، اپنا حصہ ترک کرنے اور دوستان حق کی پیروی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حق سے دوری ہو تو ایثار و اختیار تفرقہ ہے۔ قرب حق ہو تو ایثار درحقیقت ایثار ہے اور اپنے نصیب سے دست بردار ہونا گویا اپنا نصیب ہے۔ جب تک طالب کی روش اکتسابی جدوجہد تک محدود ہو وہ اس کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے جب جذب حقیقی کار فرما ہو تو اس کے جملہ افعال درہم برہم ہو جاتے ہیں اور اسے تاب اظہار نہیں رہتا۔ نہ اس کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے، نہ اسکی توضیح کی جا سکتی ہے اور نہ کسی چیز کو اس طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ بقول شبلی رحمۃ اللہ علیہ۔

غبت عنی فما احس بنفسی وتلاشت صفاتی الموصوفة

فأنا اليوم غائب عن جميع ليس إلا العبادة الملهوفة

"تو مجھ سے دور ہوا مجھے اپنی خبر نہ رہی۔ میری صفات فنا پذیر ہو گئیں۔ آج میں ہر چیز سے محروم ہوں اور بجز اظہار مجبوری کے میرے پاس کچھ بھی نہیں"۔

فرقہ سہیلیہ

اس مکتب تصوف کے لوگ سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا کرتے ہیں سہل ایک بزرگ اور قابل تعظیم صوفی تھے جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وہ اپنے وقت کے بادشاہ تھے اور

طریقت کے اہل بست وکشاد۔ ان کی کئی کرامات مشہور ہیں جن کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ ان کا طریق اجتہاد، مجاہدہ نفس اور ریاضت تھا وہ اپنے مریدوں کو مجاہدہ سے کمال پر پہنچا دیتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک مرید کو انہوں نے حکم دیا کہ ایک روز سارا دن اللہ اللہ کہتا رہ۔ دوسرے تیسرے روز بھی یہی حکم دیا۔ پھر کہا اب راتیں شامل کرو۔ مرید نے تعمیل کی یہاں تک کہ وہ سوتے میں بھی "اللہ اللہ" کا ذکر جاری رکھنے لگا اس کے بعد حکم دیا کہ اب ظاہر ذکر چھوڑ دو۔ صرف یاد رکھو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرید ہمہ تن ذکر ہو گیا۔ ایک دن اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لکڑی اس کے سر پر گری خون بہنے لگا اور جو قطرہ زمین پر گرا لفظ "اللہ" بن گیا۔

سہلی مکتب تصوف میں مریدوں کی تربیت مجاہدہ اور ریاضت سے کی جاتی تھی۔ خدمت درویشاں، حمد دینوں کے طریقوں کا احترام اور جنیدی طریق پر مراقبہ بھی شامل تربیت تھے۔ بعض فرماتے ہیں: ذکر اللسان غفلة و ذکر القلب قربة" زبان سے ذکر غفلت ہے اور دل کا باعث قرب ہے"۔

مجاہدہ اور ریاضت دراصل نفس کے خلاف چلنے کا نام ہے۔ ریاضت و مجاہدہ کی کوئی اہمیت نہیں جب تک معرفت نفس حاصل نہ ہو۔

اب میں معرفت نفس اور اس کی حقیقت بیان کروں گا۔ اس کے بعد مجاہدات کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام تحریر کروں گا تا کہ طالب کو کما حقہ علم حاصل ہو۔ باللہ التوفیق

حقیقت نفس

نفس کے لغوی معنی کسی چیز کی حقیقت اور اصلیت ہے۔ عام زبان میں یہ لفظ کئی مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً روح، انسانیت، جسم، خون وغیرہ۔ لیکن اہل تصوف کے نزدیک نفس ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں۔ اتفاق اس بات پر ہے کہ نفس منبع شر اور رہبر بدی ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے نفس بدن میں روح کی طرح ایک امانت ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے نفس انسانی قالب کی ایک صفت ہے جیسے حیات۔ یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ سب، برے اخلاق اور مذموم افعال کا سبب نفس ہے۔

مذموم افعال کی دوصورتیں ہیں: ۱۔ گناہ، ۲۔ اخلاق بد مثلاً غرور، حسد، بخل، غصہ و کینہ وغیرہ۔

جو شرعاً اور عقلاً مذموم ہیں۔ یہ چیزیں ریاضت سے دور ہو سکتی ہیں جیسے توبہ سے گناہ۔ گناہ ظاہری صفات میں شامل ہے اور مندرجہ بالا بدیاں باطنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح ریاضت ظاہری افعال میں شامل ہے اور توبہ ایک باطنی صفت ہے۔ باطنی برائیاں ظاہری وصفوں سے پاک ہو جاتی ہیں اور ظاہری گناہ باطنی صفت یعنی توبہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ نفس اور روح دونوں قالب انسانی میں نہایت نازک چیزیں ہیں اور ایسے ہی موجود ہیں جیسے کائنات میں شیاطین، ملائکہ، بہشت اور دوزخ۔ مگر ایک محل شر ہے اور دوسری محل خیر جیسے کہ آنکھ محل نظر ہے۔ کان محل سمع اور زبان محل ذائقہ یا دیگر عین اور صفات یعنی جوہر اور عرض جو انسانی طبیعت کو ودیعت ہیں۔

نفس کے خلاف چلنا سب عادتوں سے بالاتر ہے اور سب مجاہدوں کا نقطہ کمال ہے۔ مخالفت نفس کے بغیر راہ حق دستیاب نہیں ہوتی۔ نفس کی موافقت باعث ہلاکت اور اس کی مخالفت وجہ نجات ہے۔ باری تعالیٰ نے مخالفت نفس کا حکم دیا ہے۔ نفس کے خلاف چلنے والوں کی تعریف اور موافقت کرنیوالوں کو مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ (النازعات) ''جس نے نفسانی خواہش کو رد کیا اس کے لئے بہشت جائے آرام ہے۔'' پھر فرمایا: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ (البقرہ:87) ''جب تمہارے پاس کوئی رسول آیا اور اس نے تمہاری خواہش پر صاد نہ کیا تو تم اس کے خلاف متکبرانہ روش پر اتر آئے۔'' حضرت یوسف صدیق علیہ السلام نے کہا، وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف:53) ''میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں سمجھتا کیونکہ نفس برائی پر آمادہ کرتا ہے جب تک میرے رب کا رحم شامل حال نہ ہو۔'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِذَا اَرَادَ

اللّٰہُ بِعَبۡدٍ خَیۡرًا بَصَّرَہٗ بِعُیُوبِ نَفۡسِہٖ(1) ''جب باری تعالیٰ کو کسی بندے کی بہبود منظور ہوتی ہے تو وہ اس کو نفس کے عیب سے آگاہ کر دیتا ہے۔'' آثار نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے کہ حق تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا ''اے داؤد! اپنے نفس سے عداوت کر۔ میری دوستی اس کی عداوت میں ہے۔''

یہ سب اوصاف ہیں اور ہر وصف کے لئے موصوف کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وصف از خود قائم نہیں ہوتا۔ وصف کو سمجھنے کے لئے جملہ موصوف یعنی پورے قالب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کا طریق کار یہی ہے کہ انسانی جبلت اور اس کے عجائبات کو سمجھا جائے۔ یہ طالبان حق پر فرض ہے کیونکہ جو اپنی ذات کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ دوسرے کو کیا سمجھ سکے گا۔ جب انسان نے معرفت خداوندی کی طرف گامزن ہونا ہی ہے تو پہلے اس کو اپنی معرفت حاصل ہونی چاہئے تاکہ اپنے کو حادث دیکھ کر حق تعالیٰ کو قدیم دیکھ سکے اور اپنی فنا سے اس کی بقا کو سمجھ سکے۔ نص قرآنی اس بات پر شاہد ہے۔ حق تعالیٰ نے کفار کو اپنی ذات کی جہالت میں مبتلا کیا اور فرمایا: وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ (البقرہ:130) ''ابراہیم کی ملت سے وہی دست بردار ہوتا ہے جو اپنے نفس سے بے خبر ہے۔'' ایک پیر طریقت نے کہا ہے: من جھل نفسه فھو بالغیر أجھل ''جو اپنے نفس سے بے خبر ہو وہ ہر چیز سے بے خبر ہے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ عَرَفَ رَبَّہٗ أَیۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ بِالۡفَنَاءِ عَرَفَ رَبَّہٗ بِالۡبَقَاءِ وَیُقَالُ مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ بِالذُّلِّ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّہٗ بِعِزٍّ وَیُقَالُ مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ بِالۡعُبُوۡدِیَّۃِ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّہٗ بِالرَّبُوۡبِیَّۃِ(2) ''جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ جس نے اپنے نفس کو فانی جانا اس نے اپنے رب کو باقی جانا۔ بعض کہتے ہیں، جس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا اس نے اپنے رب کو عزیز دیکھا۔ بعض کہتے ہیں جس نے اپنے نفس کو عبودیت کے لئے سمجھا اس نے خدا کی ربوبیت کو سمجھا۔''

1۔ اللمع، احیاء العلوم 2۔ المقاصد الحسنہ

الغرض جو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ کسی چیز کو پہچاننے کے قابل نہیں ہوتا۔ واضح ہونا چاہئے کہ اس کلام میں معرفت نفس سے مراد جبلت انسانی (انسانیت) کی معرفت ہے۔

اہل قبلہ (مسلمانوں) کا ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان بجز روح کے کچھ بھی نہیں اور یہ جسم صرف زرہ یا ہیکل کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کا مقام اور پناہ گاہ ہے اور جس کے اندر وہ کائنات کے طبعی اثرات سے محفوظ ہے حس اور عقل اس کی صفات ہیں یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ لفظ ''انسان'' روح جدا ہونے کے بعد بھی عائد ہوتا ہے جب جسم میں جان ہو تو اسے زندہ انسان کہا جاتا ہے اور جب جان نکل جائے تو مردہ انسان۔ علاوہ ازیں بیل کے جسم میں بھی جان کی امانت رکھی گئی ہے مگر ہم بیل کو انسان نہیں کہتے۔ اگر انسانیت محض روح کا نام ہوتا تو یقیناً ہر ''روح والی'' (جاندار) کو انسان کہنا پڑتا) یہ اس نظریہ کے غلط ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لفظ انسان روح اور جسم دونوں پر حاوی ہے جب تک دونوں باہم ہیں۔ جب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو یہ لفظ عائد نہیں ہوتا جیسے سیاہ اور سفید دونوں رنگ گھوڑے میں موجود ہوں تو اس کو ابلق کہتے ہیں جدا ہوں تو ایک کو سیاہ اور ایک کو سفید کہیں گے۔ ابلق کا لفظ مفقود ہو جاتا ہے یہ چیز بھی غلط ہے کیونکہ باری تعالیٰ نے فرمایا، هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝ (الدہر) ''کیا انسان پر ایسا وقت نہیں گذرا۔ جب وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔'' یہاں انسان کی خاک بے جان کو انسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ ابھی جان اس کو ودیعت نہیں ہوئی تھی۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک ناقابل تجزیہ جزو ہے۔ دل اس کا مقام ہے اور تمام صفات انسانی کی بنیاد یہ چیز بھی غلط ہے اگر کسی کو مار کر اس کا دل علیحدہ کر دیا جائے تو انسان کا لفظ اس پر بدستور عائد ہوتا رہے گا۔ یہ تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ دل قالب انسان میں روح سے پہلے نہیں تھا۔ کچھ مدعیان تصوف نے اس معاملے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان وہ چیز نہیں جو کھاتی، پیتی ہے، بیمار ہوتی اور زوال پذیر ہوتی ہے۔ بلکہ انسان ایک ''سرِ حق'' ہے۔ یہ جسم اسی کا لباس ہے اور جو اتحاد جسم و روح اور امتزاج طبع میں ملفوف ہے۔

میں کہتا ہوں تمام عاقل، جنونی، کافر، فاسق اور جاہل انسان کہلاتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا ''سرِ حق'' موجود نہیں ہوتا۔ سب رو بہ تغیر ہیں، سب کھاتے ہیں سب پیتے ہیں۔ جسم کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ جسم زندہ ہو یا مردہ۔ باری تعالیٰ نے ان تمام ماہیتوں کو انسان کہا ہے جن سے ہمارے جسم مرکب ہیں بجز ان چیزوں کے جو بعض انسانوں میں مفقود ہوں۔ چنانچہ فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾ (المومنون) ''تحقیق ہم نے انسان کو کیچڑ کے حصے سے بنایا۔ پھر ہم نے اسے قطرۂ منی بنا کر ایک مقام پر رکھا۔ پھر نطفہ کو پارۂ خون بنایا۔ پھر پارۂ خون کو پارۂ گوشت بنایا۔ پھر پارۂ گوشت سے ہڈیوں کو ملبوس کیا۔ پھر اس کو صورت عطا کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بزرگ اور سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔''

خدائے عزوجل کے فرمان کے مطابق جو سب صادقوں کا صادق ہے، یہ پیکر خاص خاک سے بہ خاک گوناگوں تغیرات اور صورت آرائیوں کے باوجود انسان ہے۔ اہل سنت والجماعت کے ایک گروہ کا قول ہے کہ انسان ایک جاندار ہے جس کے پیکر خاص پر انسانیت کی صفت اس طرح مقرر ہے کہ موت بھی اس صفت کو جدا نہیں کر سکتی۔ اسے ظاہر میں انسانیت کے پیکر خاص اور باطن میں آلات مقررہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ''پیکر خاص'' تندرست یا بیمار ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ''آلات مقررہ'' دیوانگی اور ہوش سے متعلقہ ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جو چیز صحیح و تندرست ہوگی وہ فطرتاً مکمل ہوگی۔ اہل طریقت کے نقطۂ نظر سے انسان کامل کی ترکیب تین اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے: روح، نفس اور بدن۔ ان میں سے ہر ایک جزو کی ایک صفت ہے جو اپنے موصوف سے قائم ہے۔ روح کی صفت عقل، نفس کی ہوا اور جسم کی حس۔ انسان خلاصہ (نمونہ) ہے کل عالم کا۔ عالم سے مراد دو جہان ہیں۔ انسان میں دونوں جہان کے نشانات موجود ہیں۔ اس جہاں کے عناصر اربعہ پانی، خاک، ہوا

اور آتش اور ان سے متعلقہ اخلاط بلغم، خون، صفرا اور سودا ہیں۔ دوسرے جہان کے نشان بہشت، دوزخ اور میدان حشر ہیں۔ جان بوجہ لطافت کے بہشت کا نشان، نفس بوجہ آفت و وحشت جہنم کا اور جسم میدان حشر کا اور بہشت و دوزخ کی حقیقت قہر و موانست سے وابستہ ہے۔ بہشت خدائے عزوجل کی رضا اور جہنم اس کے غضب کا نتیجہ ہے۔ مومن کی روح حقیقت معرفت سے جلا پاتی ہے۔ نفس گمراہی اور حجاب سے مذموم ہوتا ہے۔ حشر میں جب تک مومن کو دوزخ سے نجات نہ ہوگی وہ بہشت میں داخل نہیں ہوگا، دیدار ربانی کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوگا اور صفائے محبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک بندہ دنیا میں نفس اور خواہشات نفسانی کے چنگل سے نہیں نکلتا وہ حقیقی ارادت کے قابل نہیں ہوتا اور قربت اور حقیقت معرفت سے سرفراز نہیں ہوتا۔ جو شخص دنیا میں اسکی معرفت حاصل کرے اور راہ شریعت پر گامزن ہو وہ روز قیامت جہنم اور پل صراط سے محفوظ رہے گا۔

الغرض روح اہل ایمان کو بہشت کی دعوت دیتی ہے اور نفس جہنم کی طرف بلاتا ہے۔ کیونکہ روح اور نفس بہشت اور جہنم کا نمونہ ہیں۔ بہشت کے لئے عقل کامل مدبر ہے اور جہنم کے لئے ہوا و ہوس ناقص رہبر ہے۔ عقل کامل کی تدبیر صواب اور ہوس ناقص کی رہبری خطا ہے۔ طالبان درگاہ حق کے لئے لازم ہے کہ ہمیشہ روش نفس کے خلاف راستہ اختیار کریں تاکہ روح و عقل کو معاونت ملے۔ یہ سر خدائے عزوجل کا مقام ہے۔ واللہ اعلم

فصل: نفس کیا ہے

مشائخ نے نفس کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **أشد الحجاب رؤية النفس وتدبيرها** سب سے بڑا حجاب نفس اور اس کی مکاریاں ہیں۔'' نفس کی متابعت دراصل حق کی مخالفت ہے اور حق کی مخالفت تمام حجابات سے بڑا حجاب ہے۔ ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **النفس صفة لا تسكن إلا بالباطل** ''نفس کو بجز باطل کے کسی چیز سے تسکین حاصل نہیں ہوتی۔'' یعنی وہ کبھی طریق حق اختیار نہیں کرتا۔ محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''تو چاہتا ہے

کہ تجھے نفس کے باوجود معرفت حق حاصل ہو حالانکہ تیرا نفس اپنی معرفت سے معذور ہے غیر کی معرفت تو در کنار"۔

یعنی نفس اپنی بقا کے عالم میں اپنے آپ سے محجوب ہے اسے مکاشفہ حق کیسے نصیب ہوسکتا ہے۔ جنید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اساس الکفر قیامک علی مراد نفسک "کفر کی بنیاد یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کے سانچے میں ڈھل جائے۔" نفس کو حقیقت اسلام سے دور کا رشتہ بھی نہیں اس لئے وہ مخالفت ایمان کی روش پر چلتا ہے، منکر ہوتا ہے اور منکر ہمیشہ بیگانہ ہوتا ہے۔ ابوسلمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، "نفس خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اور راہ حق سے روکتا ہے۔ بہترین عمل نفس کی مخالفت ہے۔"

کیونکہ امانت میں خیانت بیگانگی کے مترادف ہے اور ترک گمراہی کے برابر ہے۔ اہل تصوف کے اقوال اس بارے میں بے شمار ہیں۔ سب معرض بیان میں نہیں آسکتے۔ اب میں مجاہدہ نفس کی درستی، ریاضت اور اس کے طریق بیان کرتا ہوں تا کہ مقصد تحریر اور سہیلیہ مکتب تصوف کا نقطہ نظر صاف ہو جائے۔

مجاہدۂ نفس

باری تعالیٰ نے فرمایا، وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: 69) "جو ہمارے لئے جہاد کرتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی راہ دکھا دیتے ہیں۔" پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَه فِی طاعة اللّٰہِ(1) "مجاہد وہ ہے جس نے راہ حق میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔"

یعنی رضائے حق حاصل کرنے کے لئے خواہشات نفسانی کو روکا۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا: وَرَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ الْاَکْبَرِ "ہم نے جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف رجوع کیا۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ جہاد اکبر کیا ہے تو آپ نے فرمایا، مجاہدۂ نفس (2)۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے مجاہدۂ نفس کو جہاد بالکفار سے بڑا درجہ دیا

1۔ مسند احمد، مسند شہاب 2۔ الجامع الصغیر، احیاء العلوم

کیونکہ مجاہدۂ نفس زیادہ باعث تکلیف ہوتا ہے اور نفسانی خواہشات کو پامال کرنے کا نام ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تجھے مکرمت عطا کرے۔ طریق مجاہدۂ نفس اور اس کی عظمت بین اور قابل ستائش ہے۔ ہر مذہب وملت کے لوگ اس پر متفق ہیں۔ بالخصوص اہل تصوف اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔ مشائخ کبار نے اس بارے میں بہت سے رموز اور نکات بیان کئے ہیں۔ سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کو اس معاملے میں غلو ہے۔ مجاہدات پر انہوں نے بہت سے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ کہتے ہیں: ''وہ التزاماً پندرہویں روز کھانا کھایا کرتے تھے ان کی عمر بہت دراز ہوئی۔ کیونکہ ان کی خوراک بہت ہی کم تھی''۔

جملہ محققین نے مجاہدہ کی برتری ثابت کی ہے اور اسے مشاہدہ کا سبب کہا ہے۔ ایک بزرگ نے مجاہدہ کو مشاہدہ کا ذریعہ قرار دیا ہے اور طالب کے لئے حصول حق میں اس کی بہت تاثیر بیان کی ہے آخرت کی کامرانی کے لئے دنیا میں مجاہدہ کو فضیلت دی ہے کیونکہ عاقبت دنیا کا ثمرہ ہے اور ثمرہ بجز ریاضت وعبادت کے حاصل نہیں ہوتا۔ لازماً حصول مراد کے لئے ریاضت وکوشش کی ضرورت ہے تا کہ لطف خداوندی حاصل ہو۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ مشاہدۂ حق کے لئے علت کی ضرورت نہیں۔ مشاہدۂ حق فضل خداوندی ہے اور فضل خداوندی کے لئے علت وفعل لازم نہیں۔ مجاہدہ تہذیب نفس کا ذریعہ ہے اصلی قرب کا ذریعہ نہیں۔ کیونکہ مجاہدہ انسانی روش ہے اور مشاہدہ انعام باری تعالیٰ ہے۔ یہ غلط ہے کہ مجاہدہ کسی صورت میں بھی مشاہدۂ حق کا ذریعہ یا سبب بن سکتا ہے۔ سہل کی دلیل اس ارشاد باری تعالیٰ پر مبنی ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:69) ''جو لوگ ہمارے لئے جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ دکھاتے ہیں۔'' انبیاء علیہم السلام کی بعثت، ورود شریعت، نزول صحائف آسمانی اور احکام عبادات سب مجاہدہ کے ثبوت کی دلیل ہیں۔ اگر مجاہدہ باعث مشاہدہ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ تکلف بیکار تھا۔ دنیا اور عقبیٰ کے جملہ احوال حکم وعلت کے تابع ہیں۔ اگر علت یا سبب کو حکم سے علیحدہ کر دیا جائے تو تمام شرعی اور رسمی تقاضے ختم ہو کر رہ جائیں۔ نہ اصل میں تکلیف کی ضرورت رہے نہ فرع میں۔ نہ طعام پیٹ

بھرنے کا نہ لباس سردی سے بچنے کا ذریعہ سمجھا جا سکے۔

القصہ علت و معلول کو تسلیم کرنا اثبات توحید ہے اور انکار اس کا تعطل ہے۔ اس کے بین دلائل موجود ہیں اور ان کی تردید مشاہدہ سے روگردانی اور کج بحثی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضت سے گھوڑا ایک حیوان ہونے کے باوجود انسانی صفات کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کی حیوانی جبلت بدل جاتی ہے۔ وہ خود چابک اٹھا کر مالک کو دیتا ہے، گیند اچھالتا ہے وغیرہ۔ کم عقل عجمی بچہ ریاضت سے عربی زبان حاصل کر لیتا ہے اور اسکی طبیعت عجمی نہیں رہتی۔

وحشی جانور کو ریاضت سے اس درجہ سدھارتے ہیں کہ جب اسے چھوڑیں تو چلا جاتا ہے بلائیں تو واپس آجاتا ہے۔ قید کی تکلیف اسے آزادی سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ سگ پلید کو محنت سے ایسا کر لیا جاتا ہے کہ اس کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بے مجاہدہ اور ریاضت نا آشنا آدمی کا شکار حرام ہے۔ وقس علی ھذا القیاس۔

شرع اور رسم کا تمام تر انحصار کوشش پر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرب تام حاصل تھا۔ پاک دامانی، سلامتی اور عاقبت کی کامرانی مسلم تھی۔ تاہم ریاضت یعنی طویل فاقہ کشی مسلسل روزہ داری اور شب بیداری کا یہ عالم تھا کہ حق تعالیٰ عزوجل نے فرمایا، طٰهٰ ۚ ﴿١﴾ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ﴿٢﴾ (طٰہٰ) ”طٰہٰ قرآن ہم نے اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ خود کو مشقت میں ڈالیں۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعمیر مسجد کے دوران اینٹیں اٹھا رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ آپ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے فرمایئے میں اینٹیں اٹھاتا ہوں آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟“ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! تم دوسری اینٹیں اٹھاؤ۔ راحت دوسری دنیا میں ہے یہاں مشقت ہی مشقت ہے(1)۔“

حیان بن خارجہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

1۔ المقاصد الحسنہ

دریافت کیا: "غزوہ سے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟" فرمایا "اپنے نفس سے ابتدا کرو۔ اور اسے ریاضت کی عادت ڈالو۔ پھر اپنے نفس سے شروع کرو اسے لڑائی کے قابل بناؤ۔ اگر منہ پھیر کر بھاگتے ہوئے مارے گئے تو بھاگنے والوں میں حشر ہوگا اگر ثابت قدم ہو کر مارے گئے تو صبر کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ اگر تو دکھاوا کرنے کے لئے مارا جاتا ہے تو تیرا حشر دکھاوا کرنے والوں میں ہوگا۔"

مطالب و معانی بیان کرنے میں تالیف و ترکیب تحریر کو بڑا دخل ہے۔ اسی طرح مجاہدۂ نفس کی آراستگی اور پیراستگی کو وصول حقیقت میں بڑا دخل ہے۔ بغیر خوبی تحریر کے بیان بے معنی ہوتا ہے اور بغیر مجاہدۂ نفس حصول حقیقت محال ہوتا ہے جو اس کے خلاف دعویٰ کرتا ہے مبتلائے باطل ہے۔ کائنات معرفت خالق اکبر کی دلیل ہے۔ معرفت نفس اور مجاہدۂ نفس اس کے وصل کا نشان ہے۔

اب گروہ مخالف کا نقطہ نظر دیکھنا چاہئے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ نص قرآن کی تفسیر میں مقدم و مؤخر کا سوال ہے یعنی جو ہماری راہ میں کوشاں ہوئے ہم نے ان کو راہ ہدایت دکھائی یا جن کو ہم نے راہ ہدایت دکھائی وہ ہماری راہ میں کوشاں ہوئے۔" چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: لَنْ يَّنْجُوْ اَحَدَكُمْ بِعَمَلِهٖ(1) "تم لوگوں میں سے کوئی بھی صرف اعمال کی بناء پر نجات کا حق دار نہیں۔" لوگوں نے کہا "کیا آپ بھی؟" فرمایا: وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِىَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ(2) "ہاں میں بھی جب تک اس کی رحمت کامل شامل حال نہ ہو۔" مجاہدہ پر نہیں۔ اسی لئے باری تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:125) "اللہ جل شانہ جسے ہدایت سے مشرف کرنا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں اور جسے گمراہ رہنا ہے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا نقصان محسوس کرتا ہے۔" اور نیز فرمایا: تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل

1۔ صحیح بخاری و مسلم میں شاہد ہے۔ 2۔ صحیح مسلم، ابن ماجہ

عمران:26) "(کہو) باری تعالیٰ جسے تو چاہتا ہے حکومت نوازتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے۔" ظاہر ہے کہ سارے عالم کی ریاضت مشیت ایزدی کے سامنے ہیچ ہے۔ اگر مجاہدہ ہی ذریعہ حصول ہوتا تو ابلیس راندہ درگار نہ ہوتا اور اگر صرف ترک مجاہدہ باعث دوری حق ہوتا تو آدم علیہ السلام قبول بارگاہ نہ ہوتے اس کی مقدم عنایت ہے کثرت مجاہدہ نہیں زیادہ مجاہدہ کرنے والا زیادہ مقرب حق نہیں ہوتا بلکہ جس پر اس کی رحمت ہو وہ نزدیک تر ہوتا ہے خانقاہ کا عبادت گذار حق سے دور اور خرافات کا گنہ گار قریب ہوسکتا ہے۔ غیر مکلف بچہ صاحب ایمان اشرف ہے اور بعینہ دیوانہ صاحب ایمان اشرف ہے۔

جب ایمان اشرف بغیر مجاہدہ میسر آسکتا ہے تو اس سے کم درجہ چیز کے لئے مجاہدہ کو ذریعہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

میں علی بن عثمان کہتا ہوں کہ اس اختلاف کی دو صورتیں ہیں: ایک گروہ کہتا ہے: "جس نے ڈھونڈا اس نے پایا۔" دوسرا گروہ بضد ہے "جس نے پایا اس نے ڈھونڈا" پانے کے لئے طلب اور طلب کے لئے پانا ضروری ہوا ایک مجاہدہ کرتا ہے مشاہدہ کے لئے دوسرا مشاہدہ کرتا ہے مجاہدہ کے لئے۔ دراصل مشاہدہ کے سلسلے میں مجاہدہ کی وہی حیثیت ہے جو طاعت کے معاملہ میں توفیق کی۔ توفیق باری تعالیٰ سے ملتی ہے۔ حصول طاعت بجز توفیق کے ممکن نہیں اور توفیق بغیر طاعت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح مجاہدہ کی طاقت بھی بجز مشاہدہ کے میسر نہیں آتی اور مشاہدہ کی دولت بجز مجاہدہ کے ہاتھ نہیں آتی۔ جمال ایزدی کی ایک چمک مجاہدہ پر ابھاتی ہے۔ یہی چمک اس بات کی دلیل ہے کہ مشاہدہ اولیت کا مقام رکھتا ہے۔ سہل اور ان کے پیروکاروں کا استدلال یہ ہے کہ جو شخص مجاہدہ پر کاربند نہیں ہوتا وہ تمام انبیاء اور نزول کتب شرعیہ کا منکر ہوتا ہے۔ کیونکہ تکلف شریعت کا مدار مجاہدہ پر ہے۔ یہ استدلال کسی حد تک درست نہیں۔ تکلیف کا مدار ہدایت خداوندی پر ہے۔ مجاہدہ صرف اثبات حجت کے لئے ہے حصول مدعا کے لئے نہیں۔ خدائے عزوجل نے فرمایا: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا

لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (الانعام) ''اگر ہم فرشتوں کو بھی مامور کر دیتے اور مردے بھی ان سے ہم کلام ہو جاتے ہیں اور ان سے پہلے ہو گذرنے والی ہر چیز کا حشر بھی بپا ہو جاتا تو یہ لوگ بغیر ہمارے منشاء کے ایمان نہ لاتے ان میں اکثر جاہل ہیں۔'' کیونکہ ایمان کی بنیاد مشیت ایزدی ہے۔ لوگوں کے دلائل اور مجاہدہ پر نہیں۔

باری تعالیٰ نے نیز فرمایا، اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ (البقرہ) ''کفر کرنیوالوں کو (عذاب سے) خوف دلانا یا نہ دلانا برابر ہے یہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' کیونکہ وہ ازل سے خارج از ایمان ہیں اور بوجہ شقاوت کے ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں۔ ورود انبیاء، نزول کتب اور اثبات شریعت حصول مدعا کے اسباب ہیں، حصول مدعا کی علت نہیں۔ جہاں تک تکلیف احکام کا تعلق ہے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو جہل برابر تھے مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عدل و فضل کی بدولت منزل مقصود کو پالیا اور ابو جہل عدل بے فضل کی نحوست میں بھٹک گیا۔ ابو جہل کا فضل سے محروم عدل اس بات کا مقتضی تھا کہ اس کے لئے ذریعہ حصول مراد ہی عین مراد ہو کر رہ جائے طلب مراد کا ذکر ہی کیا۔ طالب و مطلوب اگر دونوں ایک ہوں تو طالب کامران ہوگا اور طالب نہیں رہے گا۔ کیونکہ مقصود کو پالینے والا راحت میں ہوتا ہے اور راحت طالب کو راس نہیں آتی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنِ اسْتَوىٰ يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ(1) ''جو شخص دو دن یکساں حالت پر رہا وہ زیاں کار ہے۔'' یعنی طالبان حق میں سے جس کسی نے بھی دو دن ایک ہی منہاج پر گذار دیئے وہ بین خسارے میں ہے۔ چاہئے کہ ہر روز میدان طلب میں قدم آگے بڑھتا رہے۔ یہ طالب کا مقام ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیز فرمایا: اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا(2) ''استقامت اختیار کرو مگر ایک ہی مقام پر اکتفا نہ کرو۔'' مختصر یہ کہ مجاہدہ کو سبب قرار دیا۔ سبب کو ثابت کیا اور پھر انعامات الٰہیہ کے حصول کے لئے سبب کی نفی کی۔

1۔ المقاصد الحسنہ، احیاء العلوم

2۔ مسند احمد، مستدرک حاکم

یہ جو کہا کہ محنت سے گھوڑے کی حیوانی صفات کو انسانی صفات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ گھوڑے میں ایک وصف پوشیدہ ہوتا ہے جسے محنت سے معرض اظہار میں لایا جاتا ہے جب تک محنت نہ کی جائے وہ وصف روبہ کار نہیں آتا۔ گدھے میں وہ وصف پوشیدہ نہیں اسے ہرگز گھوڑے کے مقام پر نہیں لایا جا سکتا۔ نہ گھوڑے کو محنت سے گدھا بنایا جا سکتا ہے اور نہ گدھے کو ریاضت سے گھوڑے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ جبلت کو تبدیل کرنے کے برابر ہے اور ناممکن ہے۔ جو چیز جبلت کو بدلنے سے قاصر ہے جناب حق میں ثابت نہیں ہو سکتی۔

پیر طریقت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ مبتلائے مجاہدہ تھے اور مجاہدہ سے آزاد تھے۔ عین مجاہدہ میں بھی اس کی کیفیت کو معرض بیان میں نہیں لا سکتے تھے یہ چیز قطعاً مختلف ہے۔ ان لوگوں سے جو مجاہدہ پر عبارت آرائی تو کرتے ہیں مگر عملاً بالکل کورے ہوتے ہیں۔ کتنا بڑا غضب ہے کہ جو چیز محض عمل سے متعلق ہو موضوع گفتگو ہو کر رہ جائے۔

الغرض مشائخ کبار مجاہدہ اور تہذیب نفس کے معاملے میں متفق ہیں مگر ان چیزوں کو مطمح نظر بنائے رکھنا غلط ہے۔ بالفاظ دیگر جو لوگ مجاہدۂ نفس کی نفی کرتے ہیں ان کا مطلب نفی مجاہدہ نہیں بلکہ پندار مجاہدہ کی تردید اور مذمت ہے۔ مجاہدہ انسانی کوشش ہے اور مشاہدہ انعام خداوندی ہے جب تک انعام خداوندی نہ ہو انسانی کوشش بارآور نہیں ہوتی۔

"تم زندگی سے دل برداشتہ نہیں اپنی آرائش میں اتنے مصروف ہو کہ اس کے فضل و کرم پر نظر نہیں رکھتے۔ اپنی کوشش اور ریاضت پر عبارت آرائی کر رہے ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے دوستوں کا مجاہدہ انعام خداوندی ہوتا ہے۔ ان کے اپنے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ طاری ہوتا ہے اور ان کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس اہل غفلت کا مجاہدہ ان کا اپنا فعل ہوتا ہے اور ان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اس مجاہدہ سے بجز پریشانی و پراگندگی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اپنے افعال اور مجاہدات کا ذکر مت کرو اور کسی حال میں بھی ایمائے نفس پر چلنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ حیات مستعار حجاب ہے۔ عام حالات میں اگر ایک

چیز حجاب بن جائے تو شاید دوسری اس حجاب کو دور کر سکے۔ مگر یہاں تو ساری زندگی مستقل حجاب ہے اور مقام بقا حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک مکمل فنا میسر نہ آئے۔ نفس باغی کتا ہے جس کا چمڑہ بغیر دباغت کے پاک نہیں ہوتا۔"

کہتے ہیں حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں محمد بن حسین علوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر مہمان تھے۔ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ بھی کوفہ آئے اور حسین بن منصور کی موجودگی کی خبر سن کر ان کے پاس پہنچے۔ حسین نے کہا، "ابراہیم! چالیس برس طریقت پر گامزن رہے کیا ہاتھ لگا؟" جواب دیا: "میں نے توکل کا مسلک اختیار کیا۔" حسین نے کہا: "اپنی عمر تزکیہ باطن میں صرف کر دی فنا فی التوحید کا کیا بنا؟" توکل ذات باری کے ساتھ معاملات کا نام ہے اور تزکیہ باطن خدا پر اعتماد کرنے کا نام ہے۔

اتنی عمر علاج باطن پر صرف کرنے کے بعد اتنی عمر اور چاہئے تا کہ علاج ظاہر بھی ہو سکے دو عمریں تلف ہو جائیں اور نشان حق سے بہرہ یابی ابھی باقی ہو۔

شیخ ابو علی سیاہ مروزی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں نے اپنے نفس کو دیکھا بالکل میری شکل کا تھا۔ کسی نے اس کو بالوں سے پکڑ کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے ایک درخت سے باندھ کر قتل کر دینے کا ارادہ کیا اس نے کہا تردد نہ کرو۔ میری حیثیت خدائی لشکر کی ہے، میں کم نہیں ہو سکتا۔"

محمد بن علیان نسوی رحمۃ اللہ علیہ جو جنید رحمۃ اللہ علیہ کے کبار اصحاب میں شامل تھے فرماتے ہیں کہ شروع میں جب مجھے آفات نفسیہ اور اس کے مکر و فریب کا علم ہوا میرے دل میں اس کی عداوت کا جذبہ موجزن ہوا ایک دن کوئی چیز لومڑی کے بچہ کے مشابہ میرے گلے سے باہر گری۔ بتائید ربانی میں نے سمجھ لیا کہ میرا نفس ہے۔ میں نے اسے پیروں میں کچلنے کی کوشش کی مگر وہ ہر ضرب پر بڑا ہوتا چلا گیا۔ میں نے کہا "ظالم! ہر چیز زخم کھا کر ہلاک ہو جاتی ہے مگر تو پھول رہا ہے۔" نفس نے جواب دیا: "میں فطرتاً ایسا ہوں۔ جو چیز اوروں کے لئے باعث تکلیف ہے میرے لئے عین راحت ہے اور جس چیز میں اوروں کو راحت

نظر آتی ہے مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔''

ابو العباس اشقانی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے وقت کے امام تھے فرماتے ہیں: میں ایک دن گھر لوٹا تو دیکھا کہ ایک زرد سگ میری جگہ پر سو رہا ہے خیال کیا محلے والوں کا کتا ہوگا۔ مار کر بھگانے کی کوشش کی مگر وہ میرے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت قطب عالم ہیں (اللہ ان کی عمر دراز کرے) فرماتے ہیں کہ میں نے نفس کو سانپ کی شکل میں دیکھا۔

ایک درویش نے نفس کو چوہے کی صورت میں دیکھا۔ پوچھا تو کون ہے؟ چوہے نے جواب دیا: ''میں غافلوں کی ہلاکت ہوں۔ ان کے فساد اور ان کی بدیوں کا چشمہ ہوں۔ دوستان حق کے لئے سرمایہ نجات ہوں۔ اگر ان کو میری آفات کا علم نہ ہو تو وہ اپنے تقدس پر اترانے لگیں اور اپنے افعال پر مغرور ہو جائیں۔ جب ان کی نظر اپنے دل کے تقدس، اپنی صفائی قلب، اپنے نور ولایت، اپنی استقامت اور اپنی عبادت پر پڑے تو تکبر میں مبتلا ہو جائیں مگر وہ مجھے دونوں پہلوؤں کے درمیان محسوس کرتے ہیں اور جملہ عیوب سے پاک ہو جاتے ہیں''۔

یہ سب حقائق اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس ایک عینی چیز ہے صنعتی نہیں اور اس کے اوصاف بین طور پر نظر آتے ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَعْدیٰ عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ(1) ''تیرا سب سے بڑا دشمن نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہے۔''

اگر تمہیں اپنے نفس کی معرفت نصیب ہو جائے تو تم یقیناً اس پر ریاضت سے قابو پا سکتے ہو۔ مگر اس کی اصل برباد نہیں ہو سکتی۔ معرفت نفس میسر ہو تو طالب حق اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے اور اسے نفس کی بقا سے کوئی گزند نہیں پہنچتی۔ إن النفس کلب نباح و إمساک الکلب بعد الریاضۃ مباح ''نفس بھونکنے والا کتا ہے اور کتے کو سدھارنے کے بعد رکھنا مباح ہے۔'' الغرض مجاہدۂ نفس اوصاف نفس کو ملیا میٹ کرنے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اس کی

1۔ بیہقی: کتاب الزہد، احیاء العلوم

ذات کو مٹانے کی خاطر نہیں۔ مشائخ کبار نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے مگر بخوف طول اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اب حقیقت ہوا اور ترک شہوات پر کچھ بیان کرنا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عزوجل باللہ التوفیق

حقیقت ہوا

خدا تجھے عزت و آبرو دے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ ایک جماعت ہوا کو صفت نفس تصور کرتی ہے۔ ایک دوسری جماعت کے خیال میں ہوا ارادت طبع کا نام ہے جسے نفس پر اختیار ہوتا ہے اور جو مد بر نفس ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے عقل پر روح کو اختیار ہوتا ہے۔ وہ روح جس کی بنیاد میں عقل شامل نہیں ناقص ہوتی ہے اور ہر نفس جو ہوا سے پرورش نہیں پاتا ناقص ہوتا ہے روح کا نقص مانع قربت ہوتا ہے اور نقص نفس عین قربت کا باعث ہوتا ہے۔ انسان کو دو گونہ دعوت ملتی ہے، ایک عقل کی طرف سے دوسری ہوا کی جانب سے۔ عقل کی دعوت قبول کرنے والا ایمان کی دولت حاصل کرتا ہے اور ہوا کا دلدادہ ضلالت اور کفر میں مبتلا ہوتا ہے۔

الغرض ہوا حجاب و گمراہی ہے۔ مریدوں کو صدر نشینی پر ابھارتی ہے۔ طالبان حق کے لئے قابل نفرت ہے آدمی کو اس کی مخالفت کا حکم ہے اور اس کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے۔ من رکبھا ھلک ومن خالفھا ملک "جس نے اسے اختیار کیا وہ ہلاک ہوا جو اس کا مخالف ہوا وہ حاکم بنا"۔ بقول خداوندی، وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ (النازعات) "جو خدا کے حضور خوف کے عالم میں کھڑا ہوا اور جس نے نفس کو ہوا کے تابع نہ کیا" اس کا مقام بہشت بریں ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَخوَفُ مَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِىْ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ(1) "زیادہ خوفناک چیز جس میں مجھے اپنی امت کے مبتلا ہونے کا ڈر ہے ہوا کی پیروی اور طول امل ہے۔" ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمان خدائے عزوجل اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (الجاثیہ:23) "کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے خواہش نفسانی کو اپنا معبود بنا

1۔ شعب الایمان

لیا۔'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ''افسوس ہے اس پر جس کا معبود اس کی خواہش نفسانی ہو۔''

خواہشات نفسانی (ہوا) کی دو قسمیں ہیں:

ایک ہوائے لذت وشہوات، دوسری ہوائے جاہ ومرتبہ وحکومت

لذت کا دلدادہ خرابات تک محدود ہوتا ہے اور عام لوگ اس کے شر سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہوائے جاہ وحکومت رکھنے والا خانقاہوں اور عبادت کدوں میں بھٹکتا ہے اور فتنہ وشر کا مرتکب ہوتا ہے۔ خود راہ راست سے دور، سرگرداں ہوتا ہے اور لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتا ہے۔ ''ہوا کی متابعت سے خدا کی پناہ۔'' جو کوئی بھی ہوا میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی متابعت میں سرگرم رہتا ہے راہ حق سے بھٹک کر رہ جاتا ہے چاہے آسمان پر پرواز کر رہا ہو جسے ہوا سے نجات حاصل ہو اور اس کی متابعت سے نفرت ہو قریب حق ہوتا ہے چاہے اس کا مقام خرابات ہی کیوں نہ ہو۔

ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا روم میں کوئی شخص ستر برس سے بتقاضائے رہبانیت دیر نشینی اختیار کئے ہوئے ہے میں نے سوچا رہبانیت کی شرط زیادہ سے زیادہ چالیس برس ہے یہ کس قماش کا انسان ہے کہ ستر برس سے دیر نشین ہے۔ دیکھنا چاہئے جب میں اس کے پاس پہنچا اس نے کھڑکی کھول کر کہا، ''ابراہیم! مجھے خبر ہے تم کیوں آئے ہو، میں یہاں ستر برس سے از راہ رہبانیت قیام پذیر نہیں ہوں۔ میرے پاس ایک کتا ہے جو ہوائے نفسانی میں باؤلا ہو چکا ہے۔ میں یہاں اس کتے کو روکے ہوئے ہوں تا کہ خلقت اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔''

میں نے یہ سن کر کہا الٰہی! تو قادر مطلق ہے۔ عین ضلالت میں راہ راست دکھانے والا ہے۔

دیر نشین نے مجھے پھر مخاطب کر کے کہا: ''ابراہیم! لوگوں کی تلاش چھوڑ کر اپنی تلاش کرو۔ جب خود کو پالو تو اس کی نگہبانی کرو۔ یاد رکھو ہوائے نفسانی ہر روز تین سو ساٹھ مختلف لباس معبودیت پہن کر گمراہی کی دعوت دیتی ہے۔ جب تک بندے کے دل میں گناہ اور

نافرمانی کی ہوا ظہور پذیر نہیں ہوتی شیطان اس کے باطن میں داخل نہیں ہوتا۔ ہوائے نفسانی رونما ہوتے ہی شیطان اسے سجا بنا کر پیش کرتا ہے اسے وسوسہ کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا ہوائے نفسانی سے ہوتی ہے اور ابتدا کی ذمہ دار چیز سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

جب ابلیس نے کہا: فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ (ص) ''میں سب کو گمراہ کروں گا۔'' تو حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (الاسراء:65) ''تجھے میرے بندوں پر کوئی تسلط نہیں حاصل ہوگا۔'' فی الحقیقت نفس اور ہوائے نفسانی انسان کے لئے ابلیس ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ غَلَبَهُ شَيْطَانُهُ اِلَّا عُمَرَ فَاِنَّهُ غَلَبَ شَيْطَانَهُ(1) ''کوئی آدمی نہیں جس پر ابلیس نے غلبہ نہیں کیا بجز عمر رضی اللہ عنہ کے انہوں نے ابلیس کو مغلوب کر دیا۔''

انسانی خمیر کی ترکیب میں ہوا شامل ہے اور فرزندان آدم کے لئے ریحان جان ہے جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا، اَلْهَوٰى وَالشَّهْوَةُ مَعْجُوْنَةٌ بِطِيْنَةِ ابْنِ اٰدَمَ(2) ''ہوا اور شہوت، انسانی خمیر میں گوندھی گئی ہیں'' ترک ہوا سے آدمی بلند مرتبہ ہوتا ہے اور مبتلائے ہوا ہونے سے اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ زلیخا مبتلائے ہوا ہو کر اسیر ہوئی اور یوسف علیہ السلام نے ترک ہوا سے کام لیا اور عالی مرتبہ پایا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا: ''وصل کیا ہے؟'' فرمایا ''ترک ہوا'' وصل حق سے مشرف ہونے کا طالب تارک ہوائے نفس ہوتا ہے۔ حصول تقرب حق کے لئے ترک ہوا سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں مگر یاد رکھو ناخن سے پہاڑ کھودنا آسان ہے اور ہوائے نفسانی کی مخالفت مشکل ہے۔ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آدمی کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ مقام کیسے حاصل ہوا اس نے کہا، میں نے اپنی ہوائے نفسانی کو پاؤں تلے روند دیا اور مجھے ہوا کے دوش پر جگہ مل گئی۔

محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے تعجب اس شخص پر ہے جو ہوائے نفس کے

1۔ صحیح بخاری و مسلم 2۔ سیوطی، اللآلی المصنوعہ

باوجود خانہ کعبہ کا قصد کرتا ہے اور زیارت کی تمنا رکھتا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ وہ اپنی ہوائے نفسانی کو کچل دے تاکہ خانہ کعبہ اسکی طرف آئے اور اس کی زیارت کرے۔

نفس انسانی کی ظاہر ترین صفت شہوت ہے جو تمام اعضائے انسانی پر محیط ہے اور حواس سے پرورش پاتی ہے اسی بناء پر انسان کو جملہ حواس کی حفاظت کا حکم ہے اور ہر ایک کے فعل پر اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آنکھ کی شہوت دیکھنا ہے، کان کی سننا، ناک کی سونگھنا، زبان کی بولنا، تالو کی چکھنا، جسم کی چھونا اور دل کی سوچنا۔ طالب حق کو چاہئے اپنا خود حاکم ہو اور دن رات ان تمام چیزوں پر نظر رکھے۔ اگر حواس میں شائبہ ہوائے نفسانی پیدا ہو تو اسے ختم کر دے اور دعا کرے کہ باری تعالیٰ اسے ایسی روش پر چلائے کہ شہوانی خروش اس کی طبیعت میں باقی نہ رہے جو دریائے ہوائے نفسانی میں پھنس جاتا ہے وہ ہر حقیقت سے محجوب ہو جاتا ہے البتہ کوشش و تکلف سے نجات حاصل کرنا کار دراز ہے۔ کیونکہ شہوات حلقہ بحلقہ پھیلتی جاتی ہیں۔ صحیح مسلک تسلیم ہے اور یہی راہ حصول مراد ہے۔

ابو علی سیاہ مروزی رحمۃ اللہ علیہ کسی حمام میں غسل فرما رہے تھے اور بطریق سنت موئے زہار صاف کرنے میں مشغول تھے۔ دل میں سوچا یہ عضو منبع شہوات ہے اور اس قدر آفات میں مبتلا کرنے کا باعث ہے۔ اسے کاٹ ہی کیوں نہ ڈالیں۔ ہاتف غیب نے کہا: اے ابو علی! ہمارے نظام حیات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ ہمارے نزدیک سب عضو برابر ہیں۔ ہمیں قسم ہے اپنی عزت کی اگر تو اس کو کاٹ دے تو تیرے جسم کے ہر بال میں اس سے زیادہ شہوت اور ہوا پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی مضمون میں کہا گیا ہے۔

أترک بخشو الله باذنجانک الإحسان دع إحسانک

انسان جسمانی ترکیب بدلنے پر قادر نہیں۔ البتہ صفات جسمانی کو توفیق خداوندی اور شیوۂ تسلیم اختیار کرنے سے اپنی طاقت اور قوت سے سرگردان ہو کر بدل سکتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب شیوۂ تسلیم اختیار کر لیا تو عصمت حق کی تائید سے شہوانی آفات سے بچ نکلنا بہ نسبت مجاہدہ کے آسان تر ہے۔ بقول کہے: ان نفی الذباب بالمکبة أیسر من نفیه

بالمزبۃ ''مکھی کو دور کرنے کے لئے لاٹھی سے جھاڑو زیادہ کارآمد ہے۔''

عصمت حق سب آفات سے محفوظ رکھتی ہے اور سب علل کو زائل کرتی ہے۔ انسان کو باری تعالیٰ سے کوئی مشارکت نہیں۔ اس کی سلطنت میں بجز فرمودۂ حق کے کوئی تصرف نہیں ہوسکتا۔ جب تک عصمت تائید حق حاصل نہ ہو کوئی شخص اپنی جدوجہد سے کسی شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جدوجہد پھر جدوجہد ہوتی ہے۔ جب تک احسان خداوندی نہ ہو انسانی جدوجہد بے کار ہے اور بندگی کی استطاعت سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر قسم کی جدوجہد یا کوشش دو پہلو رکھتی ہے، ایک یہ کوشش ہوتی ہے کہ تقدیر حق پلٹ جائے۔ دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تقدیر کے خلاف کوئی کارگر حربہ ہاتھ لگ جائے۔ یہ دونوں پہلو ناروا ہیں۔ تقدیر کوشش سے پلٹ نہیں سکتی اور کوئی چیز بجز تقدیر کے ظہور پذیر نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں شبلی صاحب فراش ہوگئے۔ طبیب ان کے پاس آیا اور کہا پرہیز کریں۔ پوچھا، ''کس چیز سے پرہیز کروں؟ اپنی مقررہ روزی سے یا اس چیز سے جو میری روزی میں شامل نہیں؟ اپنی روزی سے پرہیز بے معنی ہے اور جو میری روزی نہیں وہ مجھے مل ہی نہیں سکتی۔ پرہیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو چیز سامنے ہو اس کے لئے کوشش نہیں کی جاتی۔''

احتیاطاً اس مسئلہ کو اور جگہ بھی بیان کروں گا۔ انشاء اللہ عزوجل

فرقہ حکیمیہ

مکتب حکیمیہ کے لوگ ابو عبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ جملہ علوم ظاہری اور باطنی سے آراستہ۔ آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ آپ کے طریق اور تحریر کی بنیاد ولایت پر تھی جس کی حقیقت وہ بیان کیا کرتے تھے۔ اولیائے کرام کے درجات اور مراعات کا ذکر کرتے تھے جو بجائے خود عجائبات کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔

اس مکتب تصوف کو سمجھنے کے لئے ابتداً یہ جاننا ضروری ہے کہ خدائے عزوجل نے اولیائے کرام کو خلقت سے برگزیدہ مقام دیا ہے اور ان کو تعلقات زیست سے بے نیاز کر

کے تعلی نفس اور ہوا سے محفوظ کر رکھا ہے۔ ہر ولی کو ایک مقرر درجہ پر فائز کیا ہے اور حقیقت کے دروازے اس پر وا کر دیئے ہیں۔

اس موضوع پر بہت کچھ قابل بیان ہے مگر میں صرف چند بنیادی چیزوں کی تشریح کروں گا۔ اب مختصر طور پر اس بارے میں تحقیق شدہ چیزیں ظاہر کرتا ہوں اور ان کے اسباب واوصاف پر لوگوں کے اقوال نقل کرتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ باللہ التوفیق

اثبات ولایت

طریقت تصوف اور معرفت کی بنیاد اور اساس ولایت اور اس کے اثبات پر ہے جملہ مشائخ کبار اثبات ولایت پر متفق ہیں اگرچہ ہر کسی نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار مختلف طریقے سے کیا ہے۔ محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ حقیقت طریقت پر اس لفظ کے اطلاق کے بارے میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

لفظ ولایت (واؤ کی زبر کے ساتھ) از روئے لغت تصرف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ولایت (واؤ کی زیر کے ساتھ) امارت کے مفہوم پر حاوی ہے دونوں فعل ولیت کے مصدر بھی ہو سکتے ہیں اور یہ مانا جائے تو دلالت اور دلالت کے انداز پر دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے نیز ولایت بمعنی ربوبیت بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا، هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ (الکھف:44) "یہاں ولایت صرف اللہ کے لئے روا ہے۔" تاکہ کفار اسی کا سہارا تلاش کریں اسی کے ہو جائیں اور اپنے جھوٹے خداؤں سے بیزاری کا اظہار کریں۔ ولایت بمعنی محبت بھی مستعمل ہے۔ روا ہے کہ ولی "فعیل" بمعنی "مفعول" ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ (الاعراف) "وہ نیک بندوں کا دوست ہے۔" خدا اپنے بندوں کو ان کے افعال اور اوصاف میں غلطاں نہیں چھوڑتا بلکہ اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھتا ہے۔ روا یہی ہے کہ بندہ فاعل کے روبرو فعیل (بصیغہ مبالغہ) ہو اس کی اطاعت میں مشغول ہو۔ ہمیشہ اس کے حقوق کی پاسداری کرے اور غیر اللہ سے روگرداں رہے ایک مقام مرید کا ہے دوسرا مراد کا۔

یہ جملہ معانی روا ہیں چاہے انسان کا تعلق خدا سے زیر بحث ہو یا خدا کا تعلق انسان سے کیونکہ باری تعالیٰ اپنے دوستوں کا مددگار ہے جیسا کہ اصحاب پیغمبر کی نسبت وعدۂ نصرت فرمایا اور کہا، اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ (البقرہ) ''خبردار اللہ کی نصرت قریب ہے۔'' اور نیز فرمایا، وَ اَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (محمد) ''کفار کا کوئی مولا نہیں اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔'' اس کی ذات پاک کفار کی مددگار نہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل ایمان کی مددگار ہے۔ ان کے ادراک کی مدد کرتا ہے تا کہ وہ اس کی آیات کو استدلال سے پرکھ سکیں۔ ان کے دلوں پر بیان معانی کے لئے اسرار و دلائل کھل جائیں۔ وہ شیطان اور نفس کی مخالفت میں کامیاب ہوں اور اوامر خداوندی پر کاربند رہیں۔ یہ بھی روا ہوتا ہے کہ اس کی ذات پاک ان کو اپنی دوستی میں خاص درجات عطا کرے اور شیطان کی خصومت و عداوت سے انہیں اپنی حفاظت میں رکھے چنانچہ فرمایا، یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ:54) ''اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔'' وہ اس کی محبت میں سرشار اس سے محبت کرتے ہیں اور دنیا سے منہ پھیر کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ ان کا دوست ہوتا ہے اور وہ اس کے دوست ہوتے ہیں۔ روا ہے کہ وہ کسی کو طاعت میں استقامت کی بناء پر ولایت عطا کرے۔ اس کی طاعت کو اپنی امان میں رکھے تا کہ استقامت نصیب ہو۔ وہ مخالفت سے پرہیز کرے اور شیطان اس سے دور رہے۔ یہ بھی روا ہے کہ کسی کو ولایت سے سرفراز کرے اور بست و کشاد اس کے تصرف میں کر دے۔ اس کی دعائیں مستجاب ہوں اور اس کی ہر سانس مقبول ہو۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَهُ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ(1) ''بہت سے پریشان صورت لوگ ایسے ہیں جن کی لوگ پروا نہیں کرتے لیکن اگر وہ خدا کی قسم کھائیں تو خدا ان کی قسم پوری کرتا ہے۔''

مشہور ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں دریائے نیل اپنی عادت کے مطابق خشک ہو گیا۔ عہد جہالت میں ہر سال ایک خوبصورت لونڈی کو آراستہ کر کے دریا میں

1۔ مسند شہاب، مسند احمد

ڈالا کرتے تھے تا کہ پانی جاری ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک پارہ کاغذ پر تحریر کیا کہ "اے دریا! اگر تو از خود ٹھہر گیا ہے تو جائز نہیں۔ اگر بحکم خداوندی ساکت ہے تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حکم دیتا ہے کہ جاری ہو جا"۔ یہ رقعہ دریا میں ڈال دیا گیا۔ پانی جاری ہو گیا۔ یہ سچی امارت تھی۔

اثبات ولایت سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بات روشن کر دوں کہ ولی کا لفظ اسی شخص پر عائد ہوتا ہے جو مذکورہ معانی کا حامل ہو۔ صاحب حال ہو اور قال سے سروکار نہ رکھتا ہو اس سے قبل مشائخ کبار نے اس موضوع پر کتب تصنیف کی ہیں مگر وہ سرمایہ عزیز تلف ہو گیا۔ اب میں اس پیر بزرگ یعنی اس مکتب تصوف کے بانی کی عبارات کو معرض تحریر میں لاتا ہوں تا کہ تجھے اور ہر اس طالب حق کو جسے اس کتاب کو پڑھنے کی سعادت نصیب ہو پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ مجھے ان عبارات سے بہت عقیدت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

فصل: ثبوت ولات

خدا تجھے قوت دے۔ یہ لفظ (ولایت) عام طور پر مستعمل ہے اور کتاب وسنت اس پر ناطق ہے۔ خدا نے فرمایا، اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (یونس) "تحقیق دوستان حق (اولیاء) کے لئے نہ خوف ہے نہ حزن" نیز فرمایا، نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حم سجدہ:31) "ہم دنیوی اور اخروی زندگی میں تمہارے دوست (اولیاء) ہیں۔" ایک اور جگہ فرمایا، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ:257) "اللہ تعالیٰ دوست (ولی) ہیں اہل ایمان کے۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَعِبَادًا يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ قِيْلَ مَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْهُمْ لَنَا لَعَلَّنَا نُحِبُّهُمْ قَالَ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ اَمْوَالٍ وَلَا اِكْتِسَابٍ وُجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ لَا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ ثُمَّ تَلَا اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (1) "اللہ کے بندوں میں کچھ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح میں شاہد مذکور ہے۔

لوگ ایسے ہیں کہ نبی اور شہید ان کو رشک سے دیکھتے ہیں۔ پوچھا حضور وہ کون ہیں؟ ان کا نشان ارشاد فرمائیے تاکہ ہم ان سے محبت کریں۔ فرمایا وہ لوگ روح اللہ سے محبت کرتے ہیں بغیر مال و منال ان کے چہرے نور سے جگمگاتے ہیں۔ وہ نور کی بلندیوں پر سرفراز ہوں گے۔ لوگ خوفزدہ ہوں گے انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ لوگ مبتلائے حزن و ملال ہوں گے اور ان کو کوئی حزن نہیں ہوگا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: تحقیق وہ اللہ کے دوست (اولیاء) ہیں میں نہ خوف زدہ نہ محزون۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیز فرمایا: ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَنْ أَذٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِي (1) "جس نے میرے دوست (ولی) کو ایذا پہنچائی وہ میرے ساتھ لڑنے پر آمادہ ہوا۔"

مطلب یہ ہے کہ خدائے عزوجل کے ولی وہ ہیں جن کو دوستی اور ولایت سے سرفراز کیا گیا ہے جو اس قلمرو کے حاکم ہیں۔ برگزیدہ ہیں۔ آفات طبعی سے پاک ہیں۔ خدائی افعال کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ مختلف کرامات کی استطاعت رکھتے ہیں۔ متابعت نفس سے بری ہیں۔ جن کی ہمت بجز تائید حق کے نہیں اور جن کی روش بجز راہ حق کے نہیں۔ قبل ازیں اولیاء اللہ ہو گذرے ہیں، اب بھی ہیں اور قیامت تک رہیں گے کیونکہ باری تعالیٰ نے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرف عطا کیا ہے اور ضمانت دی ہے کہ شریعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگہداشت ہوتی رہے گی۔ جس طرح خبری اور عقلی دلائل علماء میں موجود ہیں۔ اسی طرح دلائل غیبی بھی اولیاء اور خاصان حق میں موجود ہونے ضروری ہیں۔

اس موضوع پر ہمارے مخالف دو گروہ ہیں: ۱۔ معتزلہ، ۲۔ حشویہ۔

معتزلہ گرویدگان حق میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت رکھنے (خاص ہونے) کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ولی کی فوقیت سے انکار نبوت سے انکار کرنے کے برابر ہے اور کفر ہے۔ حشویہ گروہ کے لوگ خاصان حق کا انکار تو نہیں کرتے مگر کہتے ہیں کہ خاصان حق ہو گذرے

1۔ اتحاف السادۃ المتقین

ہیں اب موجود نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ماضی اور مستقبل کا انکار برابر ہے۔ انکار کی ایک صورت، دوسری صورت سے زیادہ شدید نہیں ہوتی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے برہان نبوت کو دوام بخشا ہے اور اولیائے کرام کو ان کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آیات، دلائل اور صدق کو ظاہر کرتے رہتے ہیں وہ گویا والیان عالم ہیں۔ وہ صرف اسی ذات کے تابع فرمان ہیں اور متابعت نفس سے بری ہیں۔ ان کی برکت سے آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ ان کے صفائے باطن کے طفیل زمین سے نباتات پھوٹتی ہیں ان کی توجہ سے مسلمان کفار پر فتح یاب ہوتے ہیں۔

ان اولیائے کرام میں چار ہزار روپوش ہیں وہ ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں وہ اپنی خوبی باطن سے بھی آگاہ نہیں۔ ہر حال میں روپوش رہتے ہیں۔ اس پر احادیث نبوی بھی وارد ہیں اور اقوال اولیائے کرام بھی بالتواتر موجود ہیں۔ باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے اس معاملے میں خبر عیاں میسر آئی۔

اہل بست وکشاد اور درگاہ حق کے پہریدار تین سو ہیں اور اخیار کہلاتے ہیں۔ چالیس اور ہیں جن کو ابدال کہتے ہیں۔ سات اور ہیں جو ابرار مشہور ہیں۔ چار اور ہیں جنہیں اوتاد کہتے ہیں۔ تین اور جو نقیب کہلاتے ہیں اور ایک اور جسے قطب یا غوث کہتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور کاروبار میں ایک دوسرے سے اجازت کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ احادیث اور روایات اس پر ناطق ہیں۔ اہل حقیقت اس کی صحت پر متفق ہیں۔ یہاں مقصد یہ نہیں کہ اس کی طویل تشریح کی جائے۔

عام اعتراض یہ ہے کہ جب وہ ایک دوسرے کو پہچانتے اور جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر فرد ولی ہے تو ان سب کو اپنی عاقبت سے مطمئن اور بے نیاز ہونا چاہئے۔ لیکن یہ امر محال ہے کہ ولایت کی پہچان عاقبت سے مطمئن کر دے۔ جب یہ روا ہے کہ مومن کو اپنے ایمان کی خبر ہوتی ہے اور وہ مطمئن اور بے نیاز نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ازراہ کرامت باری تعالیٰ ولی کو اس کی نیک عاقبت سے آگاہ کر دے۔ جہاں تک اس صورت حال اور مخالفت

سے حفاظت کا تعلق ہے اس نقطہ پر مشائخ میں اختلاف ہے اور میں نے وجہ اختلاف ظاہر کر دی ہے۔

ایک گروہ ان چار ہزار روپوش اولیاء سے متعلق معرفت ولایت کو روا نہیں سمجھتے دوسرا گروہ معرفت ولایت کا قائل ہے۔ اہل فقہ و کلام بھی کچھ قائل ہیں کچھ نہیں۔ ابو اسحاق اسفرائنی اور متقدمین کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ ولی اپنی ولایت سے بے علم ہوتا ہے۔ استاد ابو بکر بن فورک اور کچھ متقدین کا خیال ہے کہ ولی خود کو ولی جانتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ولی اگر خود کو ولی جانتا ہو تو اس میں کیا نقصان یا مصیبت ہے؟ اس گروہ کا قول ہے کہ ولی خود کو ولی سمجھ کر پندار میں مبتلا ہو سکتا ہے اور شرط ولایت حفاظت حق ہے اور جب کوئی آفت سے محفوظ ہو وہ سزاوار ولایت نہیں ہو سکتا۔ یہ بات نہایت عامیانہ ہے۔ یہ کیا کہ کوئی ولی ہو، اس سے کرامات اور خوارق عادات ظاہر ہوں اور وہ خود کرامت سے بے خبر ہو۔ کچھ لوگ ایک گروہ کی تقلید کرتے ہیں۔ کچھ دوسرے کی۔ ان میں کسی کی بات معتبر نہیں۔

معتزلہ کسی بندے کے خاص ہونے یا کرامت کے سرے سے منکر ہیں اور ولایت کی بنیاد ہی کرامت اور خصوصیت پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان تابع فرمان خداوندی ہوں تو سب اولیاء ہیں۔ جو کوئی احکام خداوندی کے مطابق ایمان قائم کرے۔ خدائی صفات اور رویت باری کا منکر ہو۔ مومن کے لئے بھی خلود دوزخ روا سمجھے جواز شریعت کو بلا واسطہ رسل ونزول کتب محض عقل کی کسوٹی پر پرکھے وہ ولی ہوتا ہے۔ درست ہے! سب مسلمانوں کے نزدیک وہ ولی ہوتا ہے مگر ''شیطان کا ولی۔'' معتزلہ کہتے ہیں اگر ولایت کے لئے کرامت واجب ہوتی تو چاہئے یہ تھا کہ ہر مومن سے کرامت ظاہر ہوتی کیونکہ سب مسلمان ایمان میں مشترک ہیں اور اگر اشتراک اصل موجود ہے تو اشتراک فرع بھی ہونا چاہئے۔ پھر کہتے ہیں کہ مومن اور کافر دونوں کے لئے کرامت روا ہے مثلاً سفر میں کوئی بھوکا ہے اس کے لئے کوئی میزبان سامنے آجائے یا کوئی تھکا ماندہ ہے اسے سواری کے لئے جانور مل جائے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ سفر ایک رات میں کٹ جائے تو پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قصد مکہ (مدینہ منورہ سے)

کے موقع پر خداوند تبارک وتعالیٰ یہ نہ فرماتا: وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (النحل:7) ''اٹھاتے ہیں تمہارے بوجھ کو اس شہر تک کہ تم بلا مشقت نفس پہنچ نہیں سکتے۔''

معتزلہ جھوٹے ہیں کیونکہ خدائے عزوجل نے فرمایا، سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (الاسراء:1) ''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کرائی خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ تک جس کا ماحول برکت سے معمور ہے۔'' بوجھ اٹھانے اور مکہ سے جانے کے لئے صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کے جمع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ کرامت خاص تھی کرامت عام نہ تھی۔ اگر سب کے سب از راہ کرامت مکہ جاتے تو کرامت عام ہو جاتی اور ایمان غیبی ایمان غیبی ہو جاتا اور ایمان غیبی کے جملہ احکام ساقط ہو جاتے۔ ایمان عمومیت کا پہلو رکھتا ہے اور اس میں مطیع اور عاصی سب شامل ہیں۔ ولایت ایک خاص چیز ہے۔ باری تعالیٰ کا حکم عام تھا اس لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سب کی معیت میں بوجھ اٹھانے کا حکم فرمایا۔ جب امر خاص کا وقت تھا تو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک رات میں مکہ سے بیت المقدس تک پہنچایا اور وہاں سے ''قاب قوسین'' کے مقام پر سرفراز فرمایا اور عالم کے سب زاویئے اور گوشے دکھائے جب واپس آئے تو بہت سی رات ابھی باقی تھی۔

الغرض ایمان کا مقام عام ہے اور ولایت کا خاص، خصوصیت کا انکار صریح کج بحثی ہے۔ شاہی دربار میں چوکیدار، دربان، اردلی اور وزیر ہوتے ہیں۔ نوکر ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہوتے ہیں مگر مقام سب کا جداگانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح حقیقت میں مومن یکساں ہوتے ہیں لیکن کچھ گنہگار، کچھ طاعت گذار، کچھ عالم و عابد، کچھ جاہل و کاہل۔ ظاہر ہے کہ خصوصیت کا انکار ہر چیز سے منکر ہونے کے برابر ہے۔ واللہ اعلم

فصل: رموز ولایت

مشائخ کرام نے حقیقت ولایت کے بہت سے رموز بیان کئے ہیں۔ جو کچھ ان

بیانات سے مختصراً ممکن ہے بیان کرتا ہوں تا کہ پڑھنے والے مستفید ہو سکیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ

ابو علی جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: الولی هو الفانی فی حاله الباقی فی مشاهدة الحق لم یکن عن نفسه إخبار ولا مع غیر الله قرار ''ولی وہ ہے جو خود میں فانی ہو اور مشاہدۂ حق میں باقی۔ اسے اپنی ذات کی خبر نہ ہو اور بجز ذات خدا کے کسی چیز سے سکون قلب نہ پا سکے۔'' بندہ ہمیشہ اپنی ذات سے متعلق گفتگو کرتا ہے جب اپنی ذات فنا ہو جائے تو خود سے متعلق ذکر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غیر اللہ سے مانوس ہو کر حال دل کہنا راز حبیب کو فاش کرنے کے برابر ہے راز حبیب غیر حبیب کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں مشاہدۂ حق کے عالم میں نظر سوئے غیر اٹھ ہی نہیں سکتی اور غیر حق کی طرف نظر تک بھی نہ اٹھے تو غیر سے سکون قلب کی تلاش بے معنی ہے۔

جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا'' ولی وہ ہے جسے کوئی خوف لاحق نہ ہو کیونکہ خوف اس چیز کا ہوتا ہے جس کے احتمال سے دل میں کراہت ہو یا اس خیال سے ہوتا ہے کہ محبوب جواب سامنے ہے۔ غم فراق میں مبتلا نہ چھوڑ جائے۔ ولی صاحب وقت ہوتا ہے۔ اس کے لئے کوئی مستقبل باعث ہراس نہیں ہو سکتا۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (یونس) '' اولیاء اللہ کے لئے کوئی حزن و ملال نہیں۔'' خوف کی طرح ولی اللہ مبتلائے رجا بھی نہیں ہوتا۔ رجا مستقبل میں وصل محبوب کا نام ہے یا یہ کوئی مکروہ چیز دفع ہو جائے گی۔ ولی کو کوئی اندوہ دامن گیر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اندوہ و کدورت وقت سے جنم لیتا ہے جس کا مقام فردوس رضا اور گلشن موافقت ہو اسے اندوہ کہاں؟ عوام الناس کا خیال ہے کہ جب خوف ورجا اور اندوہ نہ ہو تو امن ہو گا۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ امن ان لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے جو اپنی بشریت سے بے نیاز ہوتے ہیں اور صفات سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ خوف ورجا اور امن و اندوہ کا تعلق نفس انسانی سے ہے۔ جب یہ فنا ہو جائیں تو رضا انسانی صفت ہو جاتی ہے۔ جب رضا حاصل ہو جائے تو سالک مستقیم الحال ہو کر خالق حالات (محول) میں محو ہو جاتا اور حالات سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس وقت کشف ولایت

ہوتا ہے اور اس کی حقیقت ولی کے باطن پر منکشف ہوتی ہے۔

ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "ولی دنیا میں مشہور ہوتا ہے لیکن دنیا سے محبت نہیں رکھتا۔" ایک اور بزرگ نے کہا: **الولی قد یکون مشهورا ولا یکون مفتونا** "ولی مستور ہوتا ہے مشہور نہیں ہوتا۔"

مطلب یہ کہ ولی وہ ہوتا ہے جس نے شہرت سے پرہیز کیا اور صرف اس بناء پر کہ شہرت فتنہ پرور ہوتی ہے۔ بقول ابو عثمان: شہرت روا ہے اگر باعث فتنہ نہ ہو۔ فتنے کی بناء کذب پر ہے۔ ولی اللہ کذب سے پاک ہوتا ہے اور اپنی ولایت میں صادق ہوتا ہے۔ لفظ ولی کاذب پر چسپاں ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کرامت کاذب سے ظہور پذیر ہو ہی نہیں سکتی اور فتنہ کاذب کی زندگی سے خارج ہو ہی نہیں سکتا۔

حاصل کلام وہی اختلاف ہے کہ کیا ولی کو اپنی ولایت کا علم ہوتا ہے؟ اگر علم ہو تو وہ مشہور ہے اگر علم نہ ہو تو مفتون ہے۔ "اس کی شرح بڑی طویل ہے۔"

کہتے ہیں ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے کسی شخص سے پوچھا "کیا تو ولی اللہ ہونا چاہتا ہے؟" آپ نے جواب دیا "ہاں" آپ نے فرمایا "دنیا اور عاقبت کی کسی چیز سے وابستگی پیدا نہ کر اپنے نفس کو فارغ کر اور اپنے سامنے اسی کی ذات پاک کو رکھ۔" حق تعالیٰ سے منہ پھیر کر دنیا سے رغبت کرنا فانی چیز میں الجھنے کے برابر ہے۔ عاقبت کی تمنا حق سے باقی چیز کی طرف روگردان ہونے کے مترادف ہے۔ فانی چیز فنا ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ روگردانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی چیز کی طرف سے روگردانی کو بقا ہے۔ باقی چیز کو فنا نہیں۔ اس سے روگردانی کو بھی فنا نہیں اور نیز کہا اپنی ذات کو خدا کی دوستی کے لئے فارغ کر۔ دنیا اور عاقبت کی ہوس سے پاک ہو۔ بجان و دل خدا کی طرف رجوع کر۔ اگر یہ اوصاف موجود ہیں تو ولایت کا مقام کچھ دور نہیں۔

ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ ولی کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا "ولی اسے کہتے ہیں جو باری تعالیٰ کے امر و نہی پر قائم رہے۔" حق تعالیٰ کی دوستی نصیب ہو تو اس

کے احکام کی تعظیم دل میں زیادہ ہوتی ہے اور نواہی سے جسم زیادہ دور رہتا ہے۔

ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے بیان کیا کہ فلاں شہر میں ایک ولی اللہ ہے۔ آپ نے اس کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب اس کی مسجد میں پہنچے تو وہ شخص گھر سے نکل کر مسجد میں آیا اور آتے ہی تھوک دیا۔ آپ اس کو سلام کئے بغیر واپس پلٹ آئے اور کہا کہ ولی شریعت کا پاسدار ہوتا ہے تا کہ باری تعالیٰ اس کا مقام برقرار رکھیں۔ اگر یہ شخص واقعی ولی ہوتا تو مسجد میں تھوکنے کا مرتکب نہ ہوتا۔ اپنی عزت کا لحاظ رکھتا۔ اپنے مقام کا حق ادا کرتا اور صحیح کرامت کے لائق ہوتا۔ اسی رات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا "اے ابو یزید! جو تو نے کیا خدا تجھے اس کی برکات سے نوازے" ابو یزید کہتے ہیں کہ دوسرے ہی روز مجھے وہ مقام نصیب ہوا جس پر فائز مجھے لوگ دیکھتے ہیں۔

کہتے ہیں ایک شخص ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ اس نے اپنا بایاں پاؤں پہلے مسجد میں رکھا۔ شیخ نے اسے ہٹا دیا اور کہا جو شخص دوست کے گھر داخل ہونے کے آداب سے ناواقف ہو وہ ہماری مجلس کے قابل نہیں۔

ملحدوں کا ایک گروہ صوفیائے کرام میں شامل ہو گیا۔ اس گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ اتنی خدمت کرو کہ ولایت حاصل ہو جائے۔ جب ولایت حاصل ہو گئی۔ خدمت کی ضرورت نہیں۔ یہ صریح گمراہی ہے۔ راہ حق میں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں خدمت (طاعت) کا کوئی رکن ساقط ہو جائے۔ مناسب جگہ اس کا مکمل ذکر ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

کرامت خرق عادت ہے جو تکلیف شرعی کے دائرے میں رہ کر ولی کے ہاتھوں معرض ظہور میں آئے وہ مرد حق بھی ولی ہوتا ہے جو خدا کے بخشے ہوئے علم کی بدولت از راہ استدلال صداقت کو کذب سے علیحدہ کر سکے۔ بعض اہل سنت و جماعت کا خیال ہے کہ کرامت ہو تو سکتی ہے مگر معجزہ کی حد تک نہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خلاف عادت دعاؤں کا قبول وغیرہ کرامت کے احاطہ سے باہر ہے میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی ولی کے ہاتھوں دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے کوئی خلاف عادت کرامت ظہور پذیر ہو جائے تو اس میں کیا چیز

قابل اعتراض ہے؟ اگر وہ یہ جواب دیں کہ کرامات تقدیر خداوندی سے باہر ہوتی ہیں تو یہ چیز سراسر غلط ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہوتی تو عین تقدیر کے مطابق ہیں مگر ولی کے ہاتھوں ان کا ظہور منصب نبوت کی تعریض ہے اور انبیاء کی خصوصیت کا انکار۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال بھی غلط ہے کیونکہ ولی کی خصوصیت کرامت ہے اور نبی کی معجزہ۔ ولی ولی ہوتا ہے اور نبی نبی۔ ان میں کسی مشابہت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس سے احتراز کیا جائے۔ پیغمبروں کا شرف و مرتبہ ان کے علو ہمت اور صفائے عصمت کی وجہ سے ہوتا ہے معجزہ، کرامت یا ناقص عادت فعل کی وجہ سے نہیں۔ بنیادی طور پر سب معجزات برابر ہیں اور درجات میں ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو سکتی ہے جب خوارق عادت کے اصلاً متساوی ہونے کے باوجود انبیاء علیہم السلام میں فرق مراتب موجود ہے تو کیوں اولیائے کرام سے ظہور کرامت روا نہ سمجھا جائے اور انبیاء کا مرتبہ ان سے بلند تر ہے۔ جب انبیائے کرام کے لئے معجزہ یا ناقص عادت فعل باعث خصوصیت اور وجہ مرتبت نہیں تو اولیاء کرام سے ناقص عادت فعل (کرامت) کا ظہور نبی کے مقابل ولی کی خصوصیت کا باعث کیسے ہو سکتا ہے؟ اور وہ نبی کی برابری کیسے کر سکتا ہے؟ جو کوئی اہل خرد اس استدلال کو سمجھ لے یقیناً اس کے دل سے ہر شبہ دور ہو جائے گا۔ اگر کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ ولی ناقص عادت فعل پر قادر ہوتے ہوئے نبوت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے تو یہ چیز محال ہے کیونکہ ولایت کی شرط اہم صداقت ہے حقیقت کے خلاف دعویٰ کرنا کذب ہے اور کاذب ولی نہیں ہو سکتا۔ ولی کا دعویٰ نبوت معجزہ پر دست اندازی کے برابر ہے اور یہ کفر ہے۔

کرامت بجز مومن مطیع کے کسی سے معرض ظہور میں نہیں آتی۔ جھوٹ طاعت نہیں بلکہ گناہ ہوتا ہے۔ اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو ولی اللہ کی کرامت اثبات حجت نبوت کے موافق ہوتی ہے۔ محض نکتہ چینی سے معجزہ اور کرامت میں اشتباہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معجزات سے اثبات نبوت کرتے ہیں، ولی اللہ کرامت سے اثبات نبوت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ اثبات ولایت بھی کرتا ہے۔ ولی بنام ولایت وہی کہتا ہے جو نبی بزور

نبوت ولی کی کرامت عین معجزۂ نبی ہوتی ہے۔ مومن کا ایمان ولی کی کرامت دیکھ کر نبی کی صداقت پر پختہ تر ہو جاتا ہے اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

نبی اور ولی کی دعوت میں کوئی چیز متضاد نہیں ہوتی جو ایک دوسرے کی نفی کرے۔ فی الحقیقت ولایت نبوت کی عین تائید ہوتی ہے۔ جیسے شریعت میں ورثہ کے معاملے میں جب ایک گروہ کے تمام افراد اپنے دعویٰ میں اتفاق رائے رکھتے ہوں تو ایک فرد کی اثبات حجت سب پر یکساں عائد ہوتی ہے۔ اگر دعویٰ متضاد ہو تو ایک کا فیصلہ دوسروں کے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ نبی معجزہ کی دلیل پر مدعی نبوت ہوتا ہے اور ولی کرامت کی بناء پر اس کی تصدیق کرتا ہے۔ دونوں میں کسی اشتباہ کا احتمال رونما نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

معجزہ اور کرامت

یہ بات ثابت شدہ ہے کہ معجزہ یا کرامت جھوٹے مدعی کے ہاتھوں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ اب ان کا فرق بیان کرنا ضروری ہے تاکہ بات صاف اور واضح ہو جائے۔

معجزہ کی شرط یہ ہے کہ وہ ظاہر ہو۔ کرامت کے لئے اخفاء ضروری ہے کیونکہ معجزہ کا نتیجہ اوروں کے لئے ہوتا ہے اور کرامت کا صاحب کرامت کے لئے۔ علاوہ ازیں صاحب معجزہ کو معجزہ کا علم ہوتا ہے ولی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ظہور پذیر ہونے والا فعل کرامت ہے یا استدراج۔ نبی حکم خداوندی کے تحت شریعت میں تصرف کرتا ہے اور حکم خداوندی کے تحت اسے مرتب کرتے ہوئے استدراج کی نفی یا اثبات کرتا ہے۔ صاحب کرامت کو بجز تسلیم اور قبول احکام کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ولی کی کرامت کسی حالت میں بھی شریعت نبوی کے منافی نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے اپنے قول کے مطابق معجزہ خرق عادت ہے اور نبی کی صداقت کی دلیل ہے اور پھر تمہارے ہی خیال کے مطابق خرق عادت ولی کے لئے بھی روا ہے تو یہ ایک عامیانہ بات ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ معجزہ کی حقیقت کا ثبوت کرامت کی حقیقت کی دلیل کو از خود قطع کر دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ معاملہ یہ نہیں۔ کرامت ولی معجزۂ نبی کی ہم شکل

ہوتی ہے۔ دونوں ایک ہی قسم کے اعجاز کا مظہر ہیں اور اعجاز منافی اعجاز نہیں ہوسکتا۔

جب کفار مکہ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دار پر لٹکا رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے صورت حال دیکھ لی اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مطلع کر دیا۔ خدائے عزوجل نے خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے۔ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا اور سلام عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام سنا اور دعائے خیر کی۔ خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو بہ قبلہ ہو گئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منور میں تھے۔ انہوں نے خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا۔ یہ خرق عادت معجزہ تھا۔ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ معظمہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا۔ یہ ان کی کرامت تھی۔ یہ رویت غیب بھی خرق عادت تھی۔ غیبت مکانی اور غیبت زمانی میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ کرامت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے عالم میں ظہور پذیر ہوئی جب وہ مکانی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور تھے۔ یہ فرق بین ہے اور ظاہر دلیل ہے کہ کرامت پیغمبر کے معجزہ کے منافی نہیں ہوسکتی۔ کرامت کو کرامت نہیں کہہ سکتے جب تک وہ صاحب معجزہ پیغمبر کی تصدیق نہ کرے اور ایسے ولی کے ہاتھوں ظہور پذیر نہ ہو جو طاعت گزار اور صاحب ایمان ہو۔ کرامت دراصل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیر معمولی معجزہ ہے۔ ان کی شریعت مستقل ہے اور اسی بناء پر ان کی حجت نبوت بھی مستقل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب نبوت کے اولیائے کرام گواہ ہیں اور غیر ممکن ہے کہ کرامت کسی بیگانہ کے ہاتھوں معرض ظہور میں آئے۔

یہاں ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنی عادت کے مطابق گوشہ نشینی کی نیت سے جنگل میں گیا۔ گوشہ جنگل سے ایک شخص نمودار ہوا اور مجھ سے مجالست کا خواہش مند ہوا۔ میں نے اس کو دیکھا تو میرے دل میں کراہت پیدا ہوئی اس نے کہا اے ابراہیم! آزردہ دل نہ ہو۔ میں عیسائی ہوں۔ ان کے صابیوں میں شمار ہوتا ہوں اور بلاد روم کے نواح سے آیا ہوں اور صرف تیری مجلس میں باریابی کی خواہش ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بیگانہ ہے تو میرے دل کو قدرے تسکین ہوئی اور اس کے ساتھ

مجالست کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے کہا "اے راہب! میرے پاس کھانا پینا نہیں تجھے تکلیف ہو گی۔" اس نے جواب دیا: "افسوس ہے ابراہیم! تو اقصائے عالم میں اتنا مشہور ہے مگر ابھی تک تجھے کھانے پینے کا غم ہے۔"

راہب کی خوش کلامی اور معقول گوئی سے ابراہیم متعجب ہوئے اور از راہ آزمائش اس کی مجالست پر راضی ہو گئے تا کہ اس کی بساط اور اس کا مقام دیکھ سکیں۔ سات شبانہ روز چلنے کے بعد پیاس نے غلبہ کیا۔ عیسائی ٹھہر گیا اور بولا "اے ابراہیم! دنیا میں تیرے نام کے اتنے ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ بارگاہ حق میں جو اعزاز تجھے حاصل ہے بروئے کار لا، میں پیاس کی شدت برداشت نہیں کر سکتا۔" ابراہیم نے سر بسجدہ ہو کر پکارا: "اے باری تعالیٰ! مجھے اس کافر کے سامنے رسوا ہونے سے بچا۔ اسے باوجود بیگانہ ہونے کے میرے متعلق خوش فہمی ہے۔ الٰہی اس کی خوش فہمی میں فرق نہ آنے دے۔" اس دعا کے بعد ابراہیم نے سر اٹھایا تو ایک طباق سامنے تھا جس میں دو روٹیاں اور دو پیالے شربت موجود تھے۔ دونوں کھا پی کر پھر چل پڑے۔ سات شبانہ روز اور گذر گئے۔ ابراہیم نے سوچا کہ اس عیسائی کی آزمائش کرنی چاہئے کہ اسے اپنی بے مائیگی کا احساس ہو جائے اور وہ بار دیگر امتحان کرنے کی غرض سے معارض نہ ہو۔ کہا "اے راہب نصاریٰ! اب تیری باری ہے تیرے مجاہدہ کا کوئی ثمرہ ہے تو سامنے لا۔" اس نے بھی سر زمین پر رکھ کر کچھ کہا۔ ایک طشت سامنے آیا جس میں چار روٹیاں اور چار پیالے شربت رکھے ہوئے تھے۔ ابراہیم کو سخت تعجب ہوا۔ کبیدہ خاطر ہوئے اور اپنے حال سے ناامیدی کے عالم میں بولے: "میں یہ نہیں کھاؤں گا۔" یہ طعام کافر کے لئے ظاہر ہوا ہے اور وہ از راہ اعانت پیش کر رہا ہے۔" راہب نے کہا "کھایئے۔" ابراہیم نے فرمایا "میں نہیں کھا سکتا۔ تو اس کا سزاوار نہیں یہ چیز تیرے بس کی نہیں۔ مجھے حیرت ہے۔ کرامت خیال نہیں کر سکتا کیونکہ کرامت کافر کے ہاتھوں ظہور پذیر نہیں ہو سکتی اور اگر تیری طرف سے اعانت سمجھ کر قبول کروں تو تجھے مدعی صادق تصور کرنے میں مجھے عار ہے۔" راہب نے پھر کہا: "آپ کھائیں، میں آپ کو دو چیزوں کی بشارت

دیتا ہوں۔ ایک تو میں مسلمان ہوتا ہوں۔ (کلمہ شہادت پڑھا) دوسرے یہ کہ جناب ربانی میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے۔'' پوچھا کیسے، کہا'' ہم لوگ ایسی چیزوں کے سزاوار نہیں۔ میں آپ سے شرم محسوس کرتے ہوئے سر بسجدہ ہوا تھا اور دعا کی تھی کہ اے خدا! اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین سچا اور پسندیدہ ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو پیالہ شربت عطا فرما اور اگر ابراہیم خواص حقیقتاً ولی ہے تو دیگر دو روٹیاں اور دو پیالہ شربت مرحمت فرما۔ جب سر اٹھایا تو یہ طشت موجود پایا۔'' ابراہیم نے اس طعام سے نوش کیا۔ اس راہب جوانمرد نے بزرگان دین میں جگہ پائی۔

یہ عین معجزہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا جو کرامت ولی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک نبی کی عدم موجودگی میں کوئی عام آدمی نبوت کی دلیل پیش کرے اور ولی کی موجودگی میں کوئی غیر ولی کرامت ولی کا حقدار بن جائے۔ فی الحقیقت انتہائے ولایت ابتدائے نبوت ہے۔ وہ راہب فرعون کے جادوگروں کی طرح مخفی طور پر صاحب ایمان تھا۔ ابراہیم نے اعجاز نبوت کی صداقت ثابت کی۔ راہب بھی صداقت اور توقیر ولایت کا دلدادہ تھا۔ خدائے بزرگ نے اسے بھی دولت مقصود سے سرفراز فرمایا یہ ہے فرق کرامت ولی اور اعجاز نبی میں۔

اس بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر کتاب میں گنجائش نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اولیاء کے لئے اظہار کرامات بھی کرامت ہے اور اس کے لئے اخفا شرط ہے اظہار بہ تکلف روا نہیں۔ میرے پیر طریقت کا قول ہے کہ اگر ولی اظہار ولایت کرے اور اس کا دعویدار ہو تو یہ اس کی صحت حال کے لئے نقصان دہ نہیں۔ البتہ تکلفاً اظہار ولایت کرنا رعونت ہے۔ واللہ اعلم

مدعی الوہیت کے خوارق

مشائخ کبار اور جملہ اہل سنت و جماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خوارق عادات از قسم معجزہ و کرامت کافر کے ہاتھوں بھی رونما ہو سکتے ہیں تا کہ اسباب اشباہ ختم ہو جائیں اور کسی کو ان کے جھوٹ ہونے سے متعلق کوئی شبہ نہ رہے۔ ظہور ہی جھوٹ کو ثابت کرتا ہے مثلاً

فرعون نے چار سو سال عمر پائی اور اس عرصے میں کوئی بیماری اس کے نزدیک نہ آئی۔ پانی اس کے عقب میں بلندی پر چڑھ جاتا تھا۔ وہ ٹھہرتا تو پانی بھی تھم جاتا تھا اس کی رفتار کے ساتھ ساتھ پانی بھی رواں رہتا تھا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود کسی اہل خرد کو اس کے دعوائے الوہیت کے لچر ہونے میں شبہ نہیں کیونکہ اہل ہوش جانتے ہیں کہ خدائے عزوجل کی ذات اقدس مجسم و مرکب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شداد (صاحب ارم) اور نمرود سے متعلق محیر العقول باتیں مشہور ہیں۔ ثقہ روایات کی بناء پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرب قیامت میں دجال رونما ہو گا اور دعوائے الوہیت کرے گا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر پہاڑ ہوں گے۔ دائیں ہاتھ کا پہاڑ مقام راحت ہو گا اور بائیں ہاتھ کا جائے عذاب۔ وہ لوگوں کو دعوت دے گا اور اطاعت نہ کرنے والوں کو سزا دے گا۔ لیکن وہ ہزار حیرت انگیز مظاہروں کے باوجود اہل نظر کے لئے مفتری اور کاذب ہو گا کیونکہ خدا گدھے پر سواری نہیں کرتا اور آنکھ سے اندھا نہیں۔ یہ جملہ چیزیں استدراج کے تحت آتی ہیں۔ اسی طرح نبوت کا مدعی کاذب بھی غیر معمولی افعال کی نمائش کر سکتا ہے مگر اس کی نمائش اس کے جھوٹ کو ثابت کرتی ہے جس طرح سچے نبی کے معجزات اس کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ خوارق عادات ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔ اگر اشباہ کا احتمال ہو اور صداقت کو کذب سے تمیز کرنے میں کسی دقت کا سامنا ہو، یہ صورت نہ ہو تو یقیناً اصول بیعت پر حرف آتا ہے کیونکہ طالب نہیں جانتا کہ کسے سچا سمجھے اور کسے جھوٹا۔

یہ روا ہے کہ مدعی ولایت کے ہاتھوں از قسم کرامت کوئی چیز ظہور پذیر ہو گو بظاہر اس کے معاملات درست نہ ہوں کیونکہ اظہار کرامت سے وہ صداقت نبوت کو ثابت کرتا ہے اور اس فضل و مکرمت کو نمایاں کرتا ہے جو بارگاہ حق سے اسے ارزاں ہوئے ہوں۔ اسے اپنی طاقت اور قدرت کا مظاہرہ مدنظر نہیں ہوتا۔ جو شخص ایمان کے معاملے میں بلا اظہار خوارق سچا ہو وہ ولایت کے معاملے میں اظہار خوارق کے ساتھ بھی سچا ہی ہو گا۔ کیونکہ اس کا اعتقاد ولی کے اعتقاد کے ہم پایہ ہوتا ہے اگرچہ اس کے اعمال ظاہر اس کے اعتقاد کے عین مطابق

نہیں ہوتے۔ اعمال ظاہر کی خرابی اس کی ولایت کی نفی نہیں کرتی جس طرح یہ چیز ایمان کی نفی نہیں کرتی۔ دراصل کرامت اور ولایت انعام خداوندی ہیں، مکاسب انسانی نہیں۔ کسب انسانی حقیقت ہدایت کا سبب نہیں ہوسکتا۔

میں قبل ازیں کہہ چکا ہوں کہ ولی گناہوں سے پاک نہیں۔ کیونکہ گناہوں سے پاک ہونا صرف نبوت کی شرط ہے۔ تاہم اولیاء ہر اس آفت سے کترا کر نکلتے ہیں جو نفی ولایت کی مقتضی ہو۔ ولایت منقطع ہوتی ہے مگر صرف سقوط ایمان اور ارتداد سے، گناہ سے نہیں یہ محمد بن علی حکیم ترمذی، جنید، ابوالحسن نوری اور حارث محاسبی رضی اللہ عنہم کا مکتب خیال ہے۔ اہل معاملات جیسے سہل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان دارانی ابوحمدون قصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مطابق دوام طاعت شرط ولایت ہے۔ ارتکاب گناہ کبیرہ سے ولایت چھن جاتی ہے۔

جیسے اوپر بیان ہوا باتفاق آئمہ کرام گناہ کی وجہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ ایک ولایت کو دوسری ولایت پر فوقیت نہیں ہوتی۔ جب ولایت معرفت جو سب کرامات کا سرچشمہ ہے، گناہ سے ساقط نہیں ہوتی تو یہ امر محال ہے کہ شرف ومکرمت میں کمتر چیز گناہ سے ساقط ہو جائے۔ مشائخ کبار میں صرف اس موضوع پر طویل اختلافات ہیں۔ میں سب کو معرض بیان میں نہیں لانا چاہتا۔ اس معاملے میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ یقینی طور پر اس بات کا علم ہو کہ صاحب ولایت سے کرامت کس عالم میں ظہور پذیر ہوئی ہے صحو میں یا سکر میں، غلبہ یا تمکین میں۔ صحو وسکر کی مکمل تشریح مکتب ابویزید کے تحت کی جاچکی ہے۔

ابویزید، ذوالنون مصری، محمد بن خفیف، حسین بن منصور، یحییٰ بن معاذ رازی رضی اللہ عنہم اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ولی کا اظہار کرامت حالت سکر (مستی و بے ہوشی) میں ہوتا ہے۔ عالم صحو میں صرف معجزۂ نبی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک کرامت اور معجزہ میں یہی واضح فرق ہوتا ہے کہ ولی اظہار کرامت کے وقت حالت سکر میں ہوتا ہے۔ مغلوب الحال ہونے کی وجہ سے دعوت سے معذور ہوتا ہے۔ نبی کا معجزہ عالم صحو میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ غالب ہوتا ہے اور لوگوں کو دعوت معارضہ دیتا ہے اسے معجزہ کو

پردۂ اخفا میں رکھنے یا ظاہر کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اولیاء کرام کو یہ مقام نہیں ملتا۔ ان کو کرامت پر اختیار نہیں۔ بعض اوقات وہ ظہور کرامت چاہتے ہیں مگر ظاہر نہیں ہوتی اور بعض اوقات وہ کرامت نہیں چاہتے مگر وہ معرض ظہور میں آ جاتی ہے۔ ولی کے لئے دعوت لازمی نہیں ہوتی تا کہ اس کے اوصاف قائم رہیں وہ پردۂ اخفا میں ہوتا ہے اور اس کی صحیح حالت یہی ہے کہ اس کے اوصاف روبہ فنا ہوں۔

نبی صاحب شریعت ہوتا ہے اور ولی صاحب دل اور اس لئے ولی سے کرامت ظہور میں نہیں آتی جب تک اس پر عالم بےخودی طاری نہ ہو اور وہ کلیتہً تصرف حق میں نہ ہو۔ اس حالت میں اس کی جملہ گفتار گویا تالیف حق ہوتی ہے۔ صفت بشریت کی درستی یا لاہی کو ہوتی ہے یا ساہی کو یا مطلق الٰہی کو نبی نہ لاہی ہوتے ہیں نہ ساہی۔ بجز انبیاء کے کوئی مطلق الٰہی نہیں ہوتا۔ بجز اولیاء کے کوئی لاہی نہیں ہوتا۔ جب تک اولیاء کی بشریت قائم ہو وہ محجوب ہوتے ہیں جب عالم کشف میں ہوں تو مدہوش و متحیر ہو جاتے ہیں۔ الطاف خداوندی کے پیش نظر۔ اظہار کرامت حالت کشف کے بغیر درست نہیں کیونکہ یہ مقام قرب ہے اور اس وقت حاصل ہوتا ہے جب پتھر اور سونا دل کے نزدیک برابر ہوں۔ یہ مقام صرف انبیاء کرام کا ہے۔ اوروں کو عارضی طور پر ارزاں ہوتا ہے اور وہ بھی صرف عالم سکر (مستی) میں۔

چنانچہ ایک روز حارثہ اس دنیا سے منقطع اور دوسری دنیا سے دوچار تھے۔ آپ نے کہا: "میں نے اپنے آپ کو اس دنیا سے منقطع کر لیا۔ اس کے پتھر، سونا، چاندی اور مٹی میرے لئے برابر ہیں۔" دوسرے روز لوگوں نے آپ کو خرما کے درخت پر کام کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ کیا؟ حارثہ نے جواب دیا: "طلب روزی میں مصروف ہوں اس کے بغیر چارہ نہیں۔" پہلے مقام کی وہ کیفیت تھی اور دوسرے کی یہ۔

المختصر صحو اولیاء کے لئے ایک عام کیفیت ہے اور سکر مقام انبیاء ہے وہ حالات سکر میں راجع بحق ہوتے ہیں اور جب پلٹتے ہیں تو عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا سکر سنورتا ہے اور وہ حق کے لئے سنورتے ہیں۔ سب عالم ان کے لئے سونا ہو جاتا ہے۔ بقول شبلی

رحمۃ اللہ علیہ

ذهب أينما ذهبنا ودر حيث درنا و فضة في الفضاء

''ہم جہاں گئے سونا ہی سونا پایا'' جدھر قدم اٹھاتے موتی ہی موتی نظر آئے تمام فضا میں چاندی پھیلی ہوئی تھی''۔

استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے طائدانی سے ابتدائے حال سے متعلق دریافت کیا طائدانی نے بیان کیا'' مجھے ایک پتھر کی ضرورت تھی میں سرخس میں دریا کی وادی میں تلاش کر رہا تھا مگر جس پتھر کو اٹھاتا وہ موتی ہوتا۔'' اس کی وجہ یہ تھی کہ پتھر اور موتی اسکی نظر میں یکساں تھے بلکہ موتی کم قیمت تھے کیونکہ اسے ان کی ضرورت نہ تھی۔

مجھے سرخس میں امام خوارزمی نے کہا، میں لڑکپن میں ایک دفعہ ریشم کے کیڑوں کے لئے شہتوت کے پتے تلاش کرتے ہوئے جنگل میں گیا اور ایک درخت پر چڑھ گیا اور پتے جھاڑنے لگا۔ شیخ ابوالفضل بن حسن رحمۃ اللہ علیہ ادھر سے گذرے۔ میں شہتوت پر تھا۔ ان کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ میں سمجھا کہ وہ خود سے غائب ہیں اور مشغول بحق ہیں۔ انہوں نے عالم انبساط میں سر اٹھایا اور کہا:'' باری تعالیٰ! ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا۔ مجھے بال کٹوانے کے لئے چاندی کا ایک سکہ عطا نہیں ہوا کیا تو دوستوں کے ساتھ یہی کچھ روا رکھتا ہے''۔ میں نے دیکھا یکبارگی سے درختوں کے سب پتے، شاخیں اور تنے سونے کے ہو گئے۔ شیخ ابوالفضل نے کہا'' واہ واہ ہم کنایتاً بھی کچھ کہہ دیں تو گویا راہ وفا سے پرے ہٹ گئے۔ تیرے حضور کشائش دل کے لئے بھی لب کشائی نہیں ہو سکتی۔''

شبلی سے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے چار ہزار دینار دریائے دجلہ میں ڈال دیئے لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا پتھر کو پانی ہی میں ڈالنا چاہئے۔'' لوگوں نے کہا آپ نے کسی اور کو دے دیئے ہوتے۔ فرمایا، خدا کی پناہ! کیا وہ سامان حجاب جو مجھے اپنے لئے گوارا نہیں اپنے برادران اسلام کے دلوں پر مسلط کر دوں۔ خدا کو کیا جواب دوں گا؟ کسی مسلمان بھائی

کو اپنے سے کمتر سمجھنا شرط اسلام نہیں"۔ یہ سب حالت سکر کا معاملہ ہے اور اس کی تشریح ہو چکی ہے۔ یہاں مدنظر اثبات کرامت ہے۔

جنید، ابو العباس سیاری، ابوبکر واسطی اور محمد بن علی ترمذی رضی اللہ عنہم جملہ بزرگان دین کا خیال ہے کہ کرامت عالم صحو و تمکین میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور سکر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں اولیائے کرام حاکمان وقت ہوتے ہیں۔ خدائے عزوجل ان کو جہان کا کارپرداز اور والی بناتا ہے۔ بندوبست عالم ان کی تحویل میں دے دیتا ہے۔ کوائف حیات ان کی ہمت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لازماً ان کی رائے تمام آراء سے محکم ترین ہوتی ہے ان کے دل تمام دلوں سے شفیق ترین ہوتے ہیں اور وہ درجہ کمال پر متمکن ہوتے ہیں۔ شور و مستی ابتدائے حال میں رونما ہوتی ہے کمال کو پہنچ کر شور مبدل بہ تمکین ہو جاتا ہے وہ صحیح ولایت پر فائز ہو جاتے ہیں۔

اہل تصوف میں مشہور ہے کہ اوتاد کو ہر شب جہان کے گرد چکر لگانا ہوتا ہے اگر کوئی جگہ نظر انداز ہو جائے اور وہاں خلل رونما ہو تو یہ قطب کو اطلاع دیتے ہیں تاکہ وہ توجہ دے اور اس کی برکت سے وہ خلل یا فساد رفع ہو جائے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ سونا اور مٹی ان کے نزدیک یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ علامت سکر ہے اور کوتاہی نظر پر مبنی ہے اس کی کوئی توقیر نہیں۔ توقیر اسی میں ہے کہ سونے کو سونا اور مٹی کو مٹی سمجھا جائے اور ان کے شر سے کماحقہ واقفیت ہو۔ بقول کسے: یا صفراء یا بیضاء غری غیری "اے زرد اے سفید! میرے سوا کسی اور کو فریب دے۔" یعنی اے زر اور سیم سفید فریب کسی اور کو دے۔ میں تجھے دیکھ کر مغرور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تیرے شر کا مجھے علم ہے۔

جو کوئی بھی سیم و زر کے شر سے آشنا ہوتا ہے وہ دونوں کو باعث حجاب سمجھتا ہے اور دونوں کو ترک کرنے کی دعوت دے کر ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ جس کی نظر میں زر مٹی کے برابر ہو وہ مٹی کو ترک کرنے کی تلقین نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حارثہ نے عالم سکر میں کہا کہ سونا، پتھر، چاندی اور مٹی سب برابر ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ صاحب صحو تھے۔ مال و

منال دنیا کو قبضہ اختیار میں رکھنے کی آفت سے واقف تھے۔ صحیح روش سے آشنا تھے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: ما خلفت لعیالک فقال اللہ ورسولہ (1) ''اپنے اہل وعیال کے لئے کیا رکھا؟'' عرض کی ''خدا اور خدا کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ابوبکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک روز مجھے محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ''اے ابوبکر! آج ہم تمہیں ایک جگہ لے جائیں گے'' میں نے عرض کی ''جیسا حکم۔'' ہم چلے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے سامنے ایک سنسان جنگل تھا۔ دیکھا کہ ایک سرسبز درخت کے نیچے تخت بچھا ہوا ہے پاس ہی ایک چشمہ آب رواں ہے۔ ایک آدمی تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ جب محمد بن علی قریب پہنچے تو وہ آدمی کھڑا ہو گیا اور تخت ان کے لئے خالی کر دیا۔ تھوڑی دیر میں چاروں طرف سے لوگ آنے شروع ہوئے۔ جب چالیس کے قریب جمع ہو گئے۔ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ طعام نازل ہوا۔ ہم سب نے مل کر کھایا۔ محمد بن علی نے کوئی سوال پوچھا، اس بزرگ نے اس کے جواب میں بہت کچھ کہا مگر میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا۔ کچھ دیر کے بعد اجازت طلب کی۔ مجھ سے کہا جاؤ۔ تمہیں سعادت نصیب ہوئی۔ ترمذ واپس پہنچ کر میں نے پوچھا: ''یہ جگہ کیا تھی اور یہ شخص کون تھا؟'' فرمایا: ''یہ تیہ بنی اسرائیل تھا اور وہ شخص قطب المدار تھا۔'' میں نے پھر پوچھا: ''یا شیخ! ہم اتنے عرصے میں تیہ بنی اسرائیل کیسے پہنچ گئے۔'' فرمایا ''تمہیں پہنچنا تھا پوچھنے سے کیا مطلب؟ اور اس کی کیفیت دریافت کرنے سے کیا غرض۔''

یہ علامات صحت حال ہیں۔ سکر کو ان میں دخل نہیں۔ میں اب بیان کو مختصر کرتا ہوں کیونکہ اگر پوری تفصیل کو سامنے لاؤں تو کتاب طویل ہو جائے گی اور مطلب فوت ہو جائے گا۔ میں (علی بن عثمان) صرف چند دلائل جو اس کتاب سے متعلقہ ہیں اور اولیاء کی کرامات و حکایات سے وابستہ ہیں، پر اکتفا کروں گا تا کہ مطالعہ سے مریدوں کو آگاہی حاصل ہو۔ عالموں کی راحت، محققین کی یادداشت اور عوام کا یقین زیادہ ہو۔ شک و شبہ کی

1۔ سنن ترمذی، ابوداؤد

گنجائش باقی نہ رہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

کرامات اولیائے کرام

صحت کرامات عقلی دلائل سے ثابت ہو چکی اور منطقیانہ ثبوت بہم پہنچا دیا گیا۔ اب ضروری ہے کہ کتابی دلائل بھی سامنے آجائیں اور وہ کچھ بھی بیان کیا جائے جو صحیح احادیث میں موجود ہے۔

کرامات اور اہل ولایت سے ظہور خوارق عادت سے متعلق قرآن وحدیث ناطق ہیں اوران کا انکار گویا نص قرآنی سے منکر ہونا ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدائے عزوجل نے قرآن میں فرمایا: وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى (البقرہ: 57) "ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور تمہارے لئے من وسلویٰ نازل ہو گیا۔" اگر کوئی منکر یہ کہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا تو ہم کہیں گے بالکل بجا ہے۔ کیونکہ کرامات اولیاء بھی جملہ معجزات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور پھر اگر کوئی یہ کہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو موجود تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت موجود نہیں اس لئے کوئی کرامت ان کا معجزہ نہیں ہو سکتی۔ ہم کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام موجود نہیں تھے اور طور پر چلے گئے تو اے برادر! من وسلویٰ کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ غیبت مکانی اور غیبت زمانی میں کوئی فرق نہیں اگر غیبت مکانی میں معجزہ روا تھا تو غیبت زمانی میں ناروا نہیں ہو سکتا۔

دوسرا ہم آصف بن برخیا کی کرامت سے متعلق جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ بلقیس کا تخت اس کی آمد سے پہلے سامنے آجائے۔ حق تعالیٰ کا بھی ایماء تھا کہ آصف کا شرف اہل علم پر ظاہر ہو نیز اور لوگ جان جائیں کہ اولیائے کرام سے ظہور کرامت جائز ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کون ہے جو بلقیس کا تخت اس کی آمد سے پہلے حاضر کر سکتا ہے؟ باری تعالیٰ فرماتے ہیں۔ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (النمل: 39) "عفریت نے کہا میں حاضر کرتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔" سلیمان علیہ السلام نے فرمایا "اس سے بھی جلد

تر" آصف نے کہا: قبل اس کے آپ آنکھ جھپکیں تخت حاضر کرتا ہوں۔" یہی ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام برآشفتہ نہیں ہوئے، انکار نہیں کیا اور اس چیز کو محال نہیں سمجھا۔

یہ معجزہ نہیں تھا کیونکہ آصف پیغمبر نہیں تھا۔ لامحالہ کرامت تھی جو آصف کے ہاتھوں معرض ظہور میں آئی اگر معجزہ ہوتا تو خود حضرت سلیمان علیہ السلام سرانجام دیتے۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آتے تو موسم گرما میں سرما کا اور موسم سرما میں گرما کا میوہ موجود پاتے۔ پوچھتے: "مریم! تیرے لئے کہاں سے آیا؟" حضرت مریم علیہا السلام فرماتی "یہ حق تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔" یہ بات مسلم ہے کہ حضرت مریم پیغمبر نہیں تھیں۔ نیز ان کی نسبت اللہ تبارک تعالیٰ نے صریح الفاظ میں فرمایا: وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۱۵﴾ (مریم) "کھجور کے سوکھے تنے کو ہلاتا کہ تازہ کھجور تیرے لئے گرے۔" علاوہ ازیں اصحاب کہف کا واقعہ، کتے کا کلام کرنا، اصحاب کہف کا سونا، ان کا غار میں دائیں بائیں کروٹ لینا۔ "ہم ان کی دائیں بائیں کروٹ بدلتے ہیں اور ان کا کتا چوکھٹ پر کھڑا ہے۔"

یہ جملہ چیزیں خرق عادات میں شامل ہیں۔ معجزہ کے تحت تو آتی نہیں لامحالہ کرامات کہلائیں امور موہومہ کے حاصل ہونے کے لئے تکلیف کے وقت دعا کی قبولیت بھی کرامات کی ایک شکل ہے۔ لمبی مسافت چشم زدن میں طے ہو جانا۔ غیر معلوم مقام سے طعام کا نازل ہونا۔ خلقت کے اندیشہائے نہانی سے واقف ہونا وغیرہ کرامات میں شامل ہیں۔ احادیث صحیحہ میں حدیث غار قابل غور ہے۔ صحابہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استدعا کی: "یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گذشتہ امتوں کا کوئی عجیب واقعہ بیان فرمائیے۔" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کسی زمانے میں تین آدمی کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ جب رات ہوئی تو وہ ایک غار میں شب بسری کے لئے چلے گئے۔ تھوڑی رات گذری تو ایک پتھر پہاڑ پر سے سرک کر غار کے منہ پر آ گیا۔ تینوں کے تینوں پریشان ہو گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے اس غار سے رہائی ناممکن ہے۔ آؤ اپنے بے ریا کاموں کی شفاعت تلاش کریں ایک نے کہا

''میرے ماں باپ زندہ تھے۔ میری بساط صرف ایک بکری تھی جس کا دودھ اپنے ماں باپ کو پلا دیتا تھا۔ ہر روز لکڑیوں کا ایک گٹھا لاتا تھا اس کے دام سے ان کے طعام کا انتظام کرتا تھا۔ ایک رات مجھے دیر ہوگئی۔ بکری کا دودھ دوہ کر ان کے لئے کھانا تیار کیا۔ اتنی دیر میں وہ سو گئے میں دودھ کا پیالہ اور کھانا لئے کھڑا رہا۔ صبح کے وقت وہ بیدار ہوئے۔ جب وہ کھا چکے تب بیٹھا۔'' یہ بیان کر کے اس شخص نے دعا کی کہ اے باری تعالیٰ! اگر یہ واقعہ میں نے سچ کہا ہے تو غار کے منہ سے اس پتھر کو سرکا دے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ پتھر کو حرکت ہوئی اور تھوڑا سا راستہ بن گیا۔ دوسرے آدمی نے کہا ''میرے چچا کی ایک صاحب جمال لڑکی تھی۔ میرا دل ہمیشہ اس کی طرف مائل تھا۔ میں اسے ترغیب ملاقات دیتا رہا مگر وہ کسی طرح ملتفت نہ ہوئی۔ آخر میں نے اسے ایک سو بیس دینار پیش کئے اور ایک رات کی خلوت کے لئے استدعا کی۔ جب وہ میرے پاس آئی تو حق تعالیٰ کا خوف میرے دل پر مسلط ہو گیا۔ میں نے اس سے پرہیز کیا اور وہ رقم بھی اس کے پاس رہنے دی۔'' یہ بیان کر کے اس شخص نے دعا کی، ''اے باری تعالیٰ! اگر یہ واقعہ میں نے سچ کہا ہے تو اس سوراخ کو فراخی عطا فرما۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ پتھر نے ایک اور جنبش کی اور سوراخ زیادہ ہو گیا مگر ابھی اتنا نہیں تھا کہ وہ غار سے باہر نکل سکیں۔ تیسرے آدمی نے کہا ''میرے پاس مزدوروں کا ایک گروہ کام کیا کرتا تھا۔ سب نے اپنی اپنی اجرت وصول کی مگر ایک مزدور کہیں غائب ہو گیا۔ میں نے اس کی اجرت سے ایک بکری خریدی۔ دوسرے سال دو اور تیسرے سال چار بکریاں ہو گئیں اور اسی طرح سال بسال بڑھتی گئیں۔ چند سال کے اندر بہت سا مال جمع ہو گیا۔ وہ مزدور واپس آیا اور اپنی اجرت طلب کی۔ میں نے کہا وہ سب بکریاں تیرا مال اور ملکیت ہیں۔ اس نے مذاق سمجھا مگر میں نے سب کچھ اسے دے دیا۔'' یہ کہنے کے بعد اس شخص نے دعا مانگی: ''یارب العزت! اگر یہ واقعہ میں نے من وعن سچ بیان کیا ہے تو اس سوراخ کو اور فراخ فرما۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ اسی وقت پتھر غار کے دہانے سے سرک

گیا اور تینوں مسافر باہر نکل آئے۔ یہ چیز بھی خارق عادت تھی۔(1)

جریج راہب سے متعلق پیغمبر ﷺ کی حدیث مشہور ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ طفولیت کے جھولے میں صرف تین اشخاص نے گفتگو کی ایک جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ دوسرا ایک اسرائیلی راہب جریج نامی تھا۔ مرد مجتہد تھا۔ اس کی والدہ پردہ نشین تھی ایک روز اپنے بیٹے سے ملنے آئی وہ عبادت میں مشغول تھا۔ اس نے ہیکل کا دروازہ نہ کھولا۔ دوسرے دن پھر آئی۔ پھر وہی ہوا۔ تیسرے دن اور پھر چوتھے دن وہی ہوا۔ آخر ماں نے کہا اے خدا! میرے اس بیٹے کو رسوا کر اور میری وجہ سے اسے گرفت میں لے لے۔ اس زمانہ میں ایک فاحشہ عورت تھی اس نے دعویٰ کیا کہ میں جریج کو گمراہ کر سکتی ہوں۔ چنانچہ اس کے عبادت کدے میں گئی۔ جریج نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ واپس پلٹتے ہوئے وہ ایک گڈریئے سے ہم صحبت ہوئی اور اسے حمل قرار پایا۔ اس نے شہر میں مشہور کر دیا کہ اسے جریج سے حمل ہوا ہے جب بچہ جنا تو اسے جریج کے پاس لے گئی۔ جریج دربار شاہی میں پیش ہوا اور بچے کو مخاطب کر کے پوچھا، "تیرا باپ کون ہے؟" بچے نے جواب دیا۔ "اے جریج! میری ماں تہمت تراش رہی ہے میرا باپ تو ایک گڈریا ہے۔"

ایک اور خاتون اپنے بچے کو گود میں لئے گھر میں بیٹھی تھی۔ ایک خوش پوش خوبرو سوار پاس سے گذرا۔ خاتون نے کہا، "باری تعالیٰ! میرے بچے کو ایسا جوان کرنا۔" بچے نے کہا "اے خدا مجھے ایسا نہ بنائیو۔" تھوڑی دیر کے بعد ایک بدنام عورت پاس سے گذری۔ اس خاتون نے کہا، "اے خدا! میرے بچے کو اس عورت جیسا نہ بنانا۔" بچے نے پھر کہا "اے خدا! مجھے اس عورت جیسا بنانا۔" خاتون کو سخت تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا، "بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو؟" بچے نے جواب دیا "یہ جوان رعنا ظالم ہے، یہ عورت صالحہ ہے لوگ اسے برا کہتے ہیں اور اسے نہیں جانتے۔ میں ظالموں میں شمار نہیں ہونا چاہتا مجھے صالحین میں شامل ہونے

1۔ دیکھئے امام نووی کی ریاض الصالحین

کی تمنا ہے۔"

زایدہ کنیزہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق روایت ہے کہ وہ ایک روز حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو کر سلام بجا لائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "اے زایدہ! اتنے عرصہ کے بعد کیوں آئی ہو تم بڑی نیکوکار ہو اور ہم تمہیں عزیز سمجھتے ہیں۔" عرض کی "یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج ایک عجیب واقعہ بیان کرنے آئی ہوں۔" پوچھا "کیا؟" عرض کی "صبح لکڑی کی تلاش میں باہر نکلی۔ جب میں نے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اٹھانے کے لئے ایک پتھر پر رکھا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سوار آسمان سے زمین پر نازل ہوا۔ مجھے سلام کہہ کر بولا، "اے زایدہ! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رضوان، خازن بہشت کی طرف سے سلام پہنچا کر کہنا کہ حضور! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی امت کے تین گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ بلا حساب داخل بہشت ہوگا۔ دوسرے گروہ کا حساب آسان کر دیا جائے گا اور تیسرا گروہ آپ کی شفاعت سے بخش دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ سوار پھر روبہ آسمان ہوا بلندی پر جا کر پھر میری طرف دیکھا۔ میں گٹھے کو اکٹھا کر رہی تھی مگر اٹھانے سے قاصر تھی۔ سوار نے کہا، "زایدہ! لکڑیوں کا گٹھا اس پتھر پر رکھ دے۔" پھر پتھر سے کہا "یہ گٹھا زایدہ کے ساتھ عمر کے گھر تک پہنچاؤ۔" پتھر اپنی جگہ سے ہلا اور گٹھا اس کے ساتھ عمر کے دروازے تک آ گیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ اٹھے اور حضرت عمر کے دروازے تک پتھر کے آنے جانے کے نشانات دیکھے اور فرمایا: "الحمد للہ! دنیا سے رخصت ہونے سے قبل مجھے رضوان کی طرف سے اپنی امت سے متعلق بشارت ملی اور باری تعالیٰ نے میری امت میں سے ایک خاتون کو مریم کا درجہ عطا کیا"۔

مشہور ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علاء حضرمی کو ایک لڑائی پر بھیجا۔ راستے میں ایک بڑے دریا کا حصہ حائل تھا۔ سب پانی پر چلنے لگے اور سب پار ہو گئے اور کسی کا پاؤں تر نہ ہوا۔

عبداللہ بن عمر سے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک مقام پر سڑک کے کنارے کھڑے ہیں۔ ایک شیر نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ عبداللہ بن عمر نے آگے بڑھ کر کہا "اے کتے! اگر فرمان خداوندی ہے تو اپنا کام کر ورنہ

راستہ دے۔" شیر اپنی جگہ سے اٹھا اور لجاجت کرتا ہوا راستہ چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیم نے ایک شخص کو ہوا میں معلق بیٹھے ہوئے دیکھا۔ "پوچھا اے مرد حق! یہ مقام کس طرح حاصل کیا؟" اس نے جواب دیا، "بالکل ذرا سی چیز سے میں دنیا سے روگراں ہو کر راہ حق پر گامزن ہوا۔ مجھ سے پوچھا گیا تیری کیا خواہش ہے؟ میں نے کہا مجھے ہوا میں جگہ ملنی چاہئے تاکہ میرا دل اہل دنیا سے منقطع ہو جائے۔"

ایک عجمی جوان قتل عمر کے ارادہ سے مدینہ منورہ آیا۔ اسے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی جنگل میں سو رہے ہوں گے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد دیکھا کہ وہ خاک پر کوڑا زیر سر رکھے ہوئے سو رہے ہیں۔ سوچا سارے جہان میں فتنہ اسی کی وجہ سے ہے اب اسے قتل کرنا آسان ہے تلوار نکالی۔ دفعتہً دو شیر نمودار ہوئے اور اس پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے چیخ و پکار کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیدار ہوئے۔ عجمی جوان نے ساری واردات بیان کی اور مشرف بہ اسلام ہوا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں عراق کے علاقہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تحائف میں ایک ڈبیا آئی اور آپ کو بتایا گیا کہ اس ڈبیا میں وہ زہر قاتل ہے جو کسی بادشاہ وقت کے خزانہ میں نہیں۔ خالد رضی اللہ عنہ نے وہ ڈبیا کھولی۔ زہر نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور بسم اللہ پڑھ کر منہ میں ڈال لیا کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور بہت سے راہ ہدایت پر آ گئے۔

خواجہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ عبادان میں ایک بادیہ نشین حبشی تھا۔ ایک روز میں نے بازار سے کچھ خریدا اور اس کے پاس لے گیا۔ اس نے پوچھا کیا ہے؟ میں نے کہا تیرے کھانے کے لئے کچھ لایا ہوں۔ شاید تجھے ضرورت ہو۔ وہ مجھ پر ہنسا اور ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔ صحرا کے سب پتھر اور کنکر سونا ہو گئے۔ میں سخت شرمندہ ہوا اور سب کچھ چھوڑ کر دہشت سے بھاگا۔

ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں ایک خرقہ پوش سے ملا۔ مجھے پیاس تھی پانی

طلب کیا اس نے کہا میرے پاس پانی بھی ہے اور دودھ بھی۔ میں نے کہا مجھے پانی کی ضرورت ہے۔ وہ خرقہ پوش اٹھا اور اس نے پتھر پر عصا مارا۔ پتھر سے صاف اور شیریں پانی جاری ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ گدڑی پوش نے کہا، حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ جب بندہ فرمان حق کے تابع ہو تو سب جہان اس کے تابع فرمان ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ابو الدرداء اور سلمان رضی اللہ عنہما باہم بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور پیالہ سے تسبیح کی آواز آ رہی تھی۔

سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مدت تین دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتا رہا۔ صحرا میں تھا۔ تیسرے روز مجھے محسوس ہوا۔ طبیعت کو عادت کے مطابق طلب ہوئی مگر کچھ کھانے کو میسر نہ آیا۔ مجبور ہو کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ہاتف غیب نے آواز دی: ''اے ابوسعید! بے طعام دفع ضعف کی ضرورت ہے یا طعام کی یا صرف قوت کی۔'' میں نے کہا مجھے قوت چاہئے۔ میں نے قوت محسوس کی اور بارہ منزل اور بغیر خورد و نوش کے طے کر گیا۔

مشہور ہے کہ آج کل تستر میں سہل بن عبداللہ کے گھر کو بیت السباع کہتے ہیں اور تستر کے باشندے بالاتفاق کہتے ہیں کہ بیت السباع میں درندے (شیر وغیرہ) آتے ہیں۔ سہل انہیں کھانے کو دیتے اور ان کی رکھوالی کرتے ہیں۔

ابوالقاسم مروزی بیان کرتے ہین کہ میں ایک روز ابوسعید خرازی کے ہمراہ جا رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک خرقہ پوش جوان نظر آیا۔ جس کے ہاتھ میں کاسہ تھا اور کاسہ کے ساتھ ایک دوات آویختہ تھی۔ ابوسعید نے کہا کہ اس جوان کی پیشانی عابدانہ ہے اور صاحب معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر دوات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مقام طلب میں ہے۔ آؤ ذرا دریافت کریں۔ خرازی نے بڑھ کر پوچھا، ''خدا تک پہنچنے کی راہ کون سی ہے؟'' بولا دو راہیں ہیں، ایک عوام کے لئے دوسری خواص کے لئے۔ خواص کی راہ کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ البتہ عوام کی راہ میں ہو بڑھے چلو۔ اپنے معاملہ کو اللہ سے ملنے کی سبیل سمجھو اور دوات کو آلہ حجاب نہ بناؤ۔

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ کچھ لوگوں کے ساتھ کشتی پر مصر سے جدہ جارہا تھا۔ ایک خرقہ پوش جوان کشتی میں سوار تھا۔ میرے دل میں ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس کا رعب اس قدر تھا کہ مجھے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ صاحب وقت تھا اور کسی حال میں عبادت سے فارغ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک دن کسی شخص کی جواہرات کی تھیلی گم ہوگئی۔ مالک نے اس درویش پر تہمت تراش دی۔ لوگ اسے سزا دینے کے درپے ہو گئے۔ میں نے کہا کہ اس پر سختی نہ کرو۔ مجھے پوچھنے دو۔ میں اس کے قریب گیا اور نرم لہجے میں کہا یہ لوگ تمہارے متعلق چوری کا گمان کرتے ہیں اور سختی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں روکا ہے۔ بتاؤ کیا کروں؟ درویش نے روبہ آسمان ہو کر چپکے سے کچھ کہا، میں نے دیکھا مچھلیاں سطح آب پر آگئیں۔ ہر ایک کے منہ میں ایک موتی تھا۔ درویش نے ایک موتی تھام کر اس شخص کو دے دیا۔ لوگ ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ سطح آب پر اتر گیا اور چلتا ہوا دور نکل گیا۔ تھیلی چرانے والا کشتی میں موجود تھا اس نے تھیلی پانی میں پھینک دی کشتی والے سخت نادم ہوئے۔

ابراہیم رقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابتدائے حال میں مسلم مغربی کی زیارت کا ارادہ کیا۔ مسجد میں پہنچا تو وہ امامت فرما رہے تھے مگر سورۂ فاتحہ کی قرأت غلط تھی۔ اپنی محنت اور تکلیف اکارت جانے کا احساس ہوا۔ وہ رات وہیں گذاری۔ دوسرے روز قصد طہارت سے دریائے فرات کی طرف جارہا تھا۔ راہ میں ایک شیر سوتا ہوا نظر آیا میں واپس لوٹ آیا مگر ایک اور شیر میرے پیچھے لپک پڑا۔ میں زور سے چلایا، مسلم اپنی عبادت گاہ سے باہر آئے۔ شیروں نے انہیں دیکھ کر گردنیں ڈال دیں۔ انہوں نے سب کی گوشمالی کی اور فرمایا: ”خدائی کتو! میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ میرے مہمانوں کو تنگ نہ کیا کرو“۔ پھر مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”بھئی! تم لوگ خلقت کا ظاہر درست کرنے میں مشغول ہو اس لئے خلقت سے ڈرتے ہو۔ ہم بنام حق باطن کی درستی پر مامور ہیں اس لئے خلقت ہم سے خوف کھاتی ہے“۔

ایک روز میں اپنے پیر طریقت کے ہمراہ بیت الجن سے دمشق جا رہا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور کیچڑ کے باعث بمشکل چلا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پیر صاحب کے کپڑے اور جوتا خشک ہے۔ میں نے پوچھا تو فرمایا ہاں میں نے اپنی ہمت کے بجائے توکل کا سہارا لیا اور باطن کو حرص وہوا سے پاک کیا میرے مولا نے مجھے کیچڑ سے محفوظ فرمایا۔

مجھے ایک مشکل درپیش تھی جس کا حل میرے لئے دشوار تھا۔ میں شیخ ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے طوس پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں اور عالم تنہائی میں میرا حال ایک ستون سے کہہ رہے ہیں۔ مجھے بغیر سوال کئے جواب مل گیا۔ میں نے پوچھا: ''جناب شیخ! یہ آپ کسے فرما رہے ہیں؟'' فرمایا: ''ابھی ابھی اللہ تعالیٰ نے اس ستون کو زبان دی اور اس نے مجھ سے یہ سوال پوچھا۔''

فرغانہ کے ایک گاؤں شلاتک میں اوتادالارض میں سے ایک پیر بزرگ رہتے تھے۔ لوگ انہیں باب عمرو کہتے تھے اس علاقے میں سب درویش مشائخ بزرگ کو باب کہتے ہیں۔ ان کی رفیقہ حیات ایک عفیفہ فاطمہ نام کی تھیں۔ میں ان کی زیارت کے لئے گیا۔ جب قریب پہنچا تو پوچھا کیوں آئے ہو۔ عرض کی ''شیخ کی زیارت کے لئے اور اس امید پر کہ مجھ پر نگاہ شفقت ہو۔'' فرمایا: ''میں خود فلاں دن سے تیرے لئے چشم براہ تھا تاکہ میں تجھے دیکھ لوں اور تو ادھر ادھر نہ ہو جائے''۔ میں نے حساب لگایا تو یہ دن میری ابتدائے توبہ کا دن تھا۔ پھر فرمایا: ''سفر بچوں کا کھیل ہے۔ اب آنا ہو تو ہمت (تصور) سے آؤ۔ کسی شیخ کی زیارت کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حضور اشباح (جسمانی قرب) بیکار چیز ہے''۔ پھر فرمایا: ''فاطمہ! جو موجود ہو۔ لے آؤ تاکہ یہ درویش کھائے۔'' ایک طبق تازہ انگور (حالانکہ انگور کا موسم نہیں تھا) اور تازہ کھجور (فرغانہ میں کھجور نہیں ہوتی) میرے سامنے آ گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میہنہ میں ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حسب عادت تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سفید کبوتر آیا اور قبر کے غلاف کے اندر چلا گیا۔ میں سمجھا کسی کا پالتو کبوتر اڑ کر چلا آیا ہے۔ غلاف اٹھا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی

واقعہ پیش آیا۔ مجھے سخت تعجب ہوا۔ ایک رات شیخ مجھے خواب میں نظر آئے میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: "کبوتر میری صفائے معاملات ہے جو ہر روز میری ہم نشینی کے لئے زیر لحد آتا ہے۔"

ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک روز محمد بن علی حکیم ترمذی نے اپنی تصانیف سے چند جزو نکال کر مجھے دیئے اور فرمایا کہ یہ دریائے جیحون میں ڈال دو۔ میں نے باہر آ کر دیکھا تو عجیب و غریب تحریر تھی۔ دریا میں ڈالنے کو طبیعت نہ چاہی۔ میں نے وہ جزو اپنے گھر میں رکھ لئے اور واپس پلٹ کر کہہ دیا کہ دریا میں ڈال آیا ہوں۔ انہوں نے پوچھا، کیا دیکھا؟ میں نے کہا، کچھ بھی نہیں۔ فرمایا: وہ جزو تم نے دریا میں نہیں ڈالے۔ جاؤ ڈال کر آؤ۔ میں نے کہا یک نہ شد دو شد۔ بھلا یہ کیوں کہتے ہیں کہ دریا میں ڈال دو اور دریا میں ڈال دوں گا تو کیا کرامت رونما ہوگی؟ طوعاً و کرہاً میں واپس ہوا۔ وہ جزو اٹھائے اور بادل ناخواستہ دریائے جیحون میں ڈال دیئے۔ پانی کا دھارا پھٹ گیا اور ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا اٹھا ہوا تھا۔ جزو اس کے اندر چلے گئے۔ ڈھکنا بند ہو گیا اور پانی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ میں حکیم ترمذی کے پاس واپس آیا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ بولے، اب تم نے واقعی دریا برد کیے ہیں۔ میں نے کہا، "یا شیخ! خدا کے لئے مجھے بتایئے یہ کیا راز ہے؟" فرمایا "میں نے تصوف پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ہر آدمی کے لئے اسے سمجھنا دشوار تھا۔ خضر علیہ السلام نے مجھ سے طلب کی۔ وہ صندوق ان کے حکم کے مطابق مچھلی لائی تھی۔ اللہ نے پانی کو حکم دیا کہ صندوق خضر علیہ السلام کو پہنچا دے۔"

اسی طرح کی اور بہت سی حکایات بھی بیان کردوں تو طبیعت سیر نہیں ہوگی۔ میری مراد اس کتاب میں تصوف کے اصول کو ثابت کرنا ہے۔ فروعات اور معاملات پر ناقلین آثار بہت کچھ لکھ چکے ہیں جو منبروں پر واعظ لوگ بیان کرتے رہتے ہیں۔

میں اب ایک دو فصلوں میں چند ایسے نکات کی تشریح کروں گا جو اس موضوع سے پیوستہ ہیں تا کہ پھر اس کی طرف لوٹنے کی ضرورت نہ پڑے۔ واللہ اعلم بالصواب

انبیاء کی اولیاء پر فضیلت

تمام صوفی مشائخ کبار اس امر پر متفق ہیں کہ اولیاء ہر حال اور ہر صورت میں انبیاء کے تابع اور ان کی دعوت کی تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اولیاء سے افضل ہوتے ہیں کیونکہ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ولیوں میں کوئی نبی نہیں ہوتا۔ انبیاء انسانی کمزوریوں سے مستقلاً پاک ہوتے ہیں اور اولیاء صرف عارضی طور پر۔ اولیاء کا احوال طاری اور انبیاء کا قیام مستقل ہوتا ہے اور جو اولیاء کے لئے مقام ہوتا ہے وہ انبیاء کے لئے حجاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اہل سنت صوفیائے کرام کا متفقہ فیصلہ ہے۔

حشویہ کا ایک گروہ یعنی مکتب خراسان اس کے خلاف ہے۔ یہ لوگ اصول توحید پر متناقض کلامی سے کام لیتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو ولی سمجھتے ہیں۔ ہاں ولی وہ ہوں گے مگر شیطان کے ولی۔ کہتے ہیں کہ اولیاء انبیاء سے فاضل تر ہیں۔ یہ ضلالت ہی ان کے لئے کافی ہے کہ جاہل کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا بے ہودہ عقیدہ مشتبہ جماعت کے لوگوں کا ہے جو صوفی کہلاتے ہیں اور ذات باری سے متعلق ازراہ انتقال حلول ونزول پر یقین رکھتے ہیں۔ تجزیہ ذات حق کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اس مکتب کی دو جماعتیں ہیں جن سے متعلق میں نے اس کتاب میں تفصیلاً ذکر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہ مذکورہ جماعتیں دعوائے اسلام کرتی ہیں مگر انبیائے کرام کی تخصیص کے معاملے میں برہمنوں کی ہم خیال ہیں۔ تخصیص انبیاء کا منکر کافر ہوتا ہے۔

انبیائے کرام دعوت دینے والے اور امام ہوتے ہیں۔ اولیاء ان کے مقتدی ہوتے ہیں۔ یہ محال ہے کہ مقتدی امام سے فاضل تر ہو۔ مختصر یہ کہ اگر جملہ اولیائے کرام کے احوال، انفاس وروزگار کو ایک جگہ رکھ کر نبی کے ایک گام صدق سے مقابلہ کیا جائے تو جملہ احوال وانفاس پراگندہ نظر آئیں گے کیونکہ اولیاء طلب میں گامزن ہوتے ہیں اور انبیاء منزل پر پہنچ کر گوہر مقصود حاصل کر چکے ہوتے ہیں اور اس کے بعد دعوت سے خلقت کو راہ حق دکھاتے ہیں۔ ان ملحدوں میں سے اگر کوئی ملعون یہ کہے کہ قاعدہ یہ ہے کہ کسی ملک سے

بھیجا ہوا سفیر مرسل الیہ سے فاضل تر نہیں ہوتا۔ چنانچہ جبریل پیغمبروں کے پاس آتے مگر پیغمبروں کا مقام جبریل سے بلند تر تھا۔ ان لوگوں کی یہ خیال آرائی غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ایک سفیر ایک آدمی کی طرف بھیجا جائے تو یقیناً مرسل الیہ فاضل تر ہوگا۔ جبریل ایک ایک پیغمبر کے پاس آئے ہر پیغمبر جبریل سے فاضل تر ہوا۔ لیکن جب رسول ایک جماعت یا قوم کی طرف بھیجا جائے تو لامحالہ وہ اس قوم سے فاضل تر ہوگا جیسے ہر امت کا پیغمبر۔ اس معاملے میں کسی ذی ہوش کو مغالطہ نہیں ہوسکتا۔ الغرض نبی کا ایک سانس ولی کی ساری زندگی سے فاضل تر ہے۔ جب ولی اپنے باطنی مجاہدے اور ظاہری عبادت سے درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو مقام مشاہدہ پر فائز ہوتا ہے اور حجاب بشریت سے نجات پاتا ہے۔ حالانکہ وہ عین بشریت میں مبتلا رہتا ہے اس کے برعکس رسول کا پہلا قدم مشاہدہ ہوتا ہے۔ رسول کی ابتدا ولی کی انتہا ہوتی ہے اس لئے ایک سے دوسرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

تم جانتے ہو کہ سب طالبان حق بالاتفاق کہتے ہیں کہ کمال ولایت تفریق سے منقطع ہو کر جمع کے مقام کو حاصل کرنا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بندہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں غلبہ دوستی کے باعث عقل کا دستور نظر باطل ہو جاتا ہے اور ہر چیز میں فاعل کل نظر آتا ہے۔ چنانچہ ابو علی رود باری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اگر ہم اس کی رویت سے محروم ہو جائیں تو ہماری عبادت بیکار ہو جائے کیونکہ اس کی عبادت کا شرف اس کی رویت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔''

یہ حقیقت انبیاء کے لئے ابتدائے حال ہوتی ہے۔ ان کے روزگار میں کوئی تفرقہ صورت پذیر نہیں ہوتا۔ نفی، اثبات، مسلک، انقطاع، اقبال، اعراض، بدایت اور نہایت سب عین جمع کے عالم میں ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتدائے حال میں سورج کو دیکھ کر فرمایا ''یہ میرا رب ہے۔'' جب چاند ستارے کو دیکھا تو فرمایا۔ ''یہ میرا رب ہے۔'' کیونکہ ان کا دل غلبہ حق سے مغلوب تھا۔ وہ عین جمع کے مقام پر تھے۔ انہوں نے کسی غیر چیز کو نہیں دیکھا اور اگر دیکھا تو جمع کی نظر سے دیکھا عین دیدار حق میں محو ہو کر تاب دیدار

سے بیزاری کی حالت میں فرمایا "میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" ابتدا بھی جمع انتہا بھی جمع۔

ولایت کے لئے ابتدا اور انتہا ہے نبوت کے لئے نہیں۔ انبیاء جب تک تھے نبوت پر فائز تھے جب تک ان کو رہنا تھا نبوت پر سرفراز رہنا تھا۔ بعثت سے پہلے بھی اللہ کے علم اور ارادے کے مطابق وہ صاحب نبوت تھے۔

ابویزید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا آپ انبیاء کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا، "خدا نہ کرے! ہم انبیاء کے بارے میں فیصلے نہیں دے سکتے۔ ان کی نسبت ہمارے تصورات ہماری ذاتی بساط کے مطابق ہوتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے ان کی نفی اور اثبات ایسے مقام پر رکھے ہیں جہاں انسانی نظر قاصر رہ جاتی ہے۔ جیسے اولیاء کا مرتبہ لوگوں کی نظر سے پنہاں ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا مقام اولیاء کے دائرہ تصرف سے باہر ہے۔"

ابویزید برہان روزگار تھے آپ نے فرمایا،

"میں نے دیکھا فرشتے میری روح کو آسمان پر لے گئے۔ اس نے کسی طرف توجہ نہ دی۔ گو دوزخ اور بہشت اس کے سامنے رونما ہوئے۔ وہ حادثات اور حجابات سے معرا تھی۔ پھر میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم وحدانیت تھا اور جس کے بازو ابدیت تھے۔ میں فضائے ہویت میں اڑا گیا۔ یہاں تک کہ فضائے ازلیت میں داخل ہوا اور شجر احدیت کو دیکھا۔ غور کیا تو سب کچھ میں ہی تھا۔ میں پکارا خدایا! جب تک میری انا موجود ہے تیری طرف راستہ ملنا محال ہے۔ مجھے انا سے رستگاری نہیں، بتا میں کیا کروں؟" حکم ہوا: "اے ابویزید! انا سے رستگاری ہمارے دوست کی متابعت سے وابستہ ہے۔ اس کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا اور اس کی تابعداری میں بسر کر۔"

یہ داستان بڑی طویل ہے۔ اہل طریقت اسے معراج بویزید کہتے ہیں۔ معراج سے مراد قرب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا معراج جسمانی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اولیائے کرام کا معراج ہمت اور روح سے متعلق ہے۔ انبیاء کا جسم صفا اور پاکیزگی میں قرب کے معاملے

میں اولیاء کے دل اور ان کی روح کی مانند ہوتا ہے۔ یہ بظاہر فضیلت کی دلیل ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ولی عالم سکر میں اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے اور روحانی درجات سے گزر کر قرب حق کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جب عالم صحو میں واپس پلٹتا ہے تو تمام دلائل اس کے دل پر نقش ہوتے ہیں اور ان کا علم اسے حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسمانی معراج اور اس فکری معراج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

انبیاء و اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت

جملہ اہل سنت و جماعت اور مشائخ طریقت متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ انبیاء اور وہ تمام اولیاء جو آفات سے محفوظ ہیں، فرشتوں پر برتری رکھتے ہیں۔ صرف معتزلہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل تر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتوں کا رتبہ زیادہ ہے اور وہ پیدائشی طور پر لطیف واقع ہوئے ہیں۔ بالخصوص وہ باری تعالیٰ کی زیادہ طاعت کرتے ہیں اس لئے ان کا مقام بلند تر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حقیقت اس موہومہ صورت سے بالکل مختلف ہے۔ جسمانی طاعت، مقامی بلندی، اور پیدائشی لطافت فضل خداوندی کی مقررہ علت نہیں۔ یہ تمام چیزیں تو ابلیس میں بھی موجود تھیں مگر سب مانتے ہیں کہ وہ ملعون اور ذلیل ہوا۔ فضل خداوندی اسی کے لئے ہوتا ہے جسے باری تعالیٰ خود ارزاں فرمائے اور جسے خود اس کی رحمت منتخب کرے۔ انبیاء کی فضیلت کے لئے دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ یہ امر مسلم ہے کہ مسجود ساجد سے بالاتر ہوتا ہے۔ اگر اس کے خلاف یہ کہا جائے کہ خانہ کعبہ بے جان پتھر کا بنا ہوا ہے۔ مومن کا مقام بلند تر ہے مگر وہ اسے سجدہ کرتا ہے۔ اسی طرح فرشتے آدم کو سجدہ کرنے کے باوجود فاضل تر ہیں تو میں کہوں گا کہ کسی ہوشمند کے نزدیک مومن دیوار، محراب یا پتھر کو سجدہ نہیں کرتا سجدہ صرف خدا کے لئے کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ ملائکہ نے سجدہ صرف آدم کو کیا جیسا کہ حکم باری تعالیٰ میں مذکور ہے۔ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (البقرہ:34) ''آدم کو سجدہ کرو۔'' مومنوں کے سجدہ کے ذکر میں فرمایا: وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (الحج:77) ''سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو۔''

خانہ کعبہ آدم کی طرح نہیں ہو سکتا۔ سوار جب نماز ادا کرتا ہے تو اس کا منہ خانہ کعبہ کی طرف نہیں ہوتا اور وہ معذور ہوتا ہے۔ جب کسی جنگل میں جہت قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جدھر بھی منہ کر لیا جائے نماز ہو جاتی ہے۔ ملائکہ کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ ایک نے عذر تراشا اور ملعون و خوار ہو گیا۔ اہل بصیرت کے لئے یہی دلائل واضح اور روشن ہیں۔

علاوہ ازیں ملائکہ صرف اس بناء پر کیسے افضل تر ہو سکتے ہیں کہ وہ حق معرفت میں بلند تر ہیں۔ ان کی تو جبلت ہی شہوات سے معرا ہے۔ ان کے دل حرص و آفت سے ناآشنا ہیں۔ ان کی طبیعت مکروفریب سے پاک ہے۔ ان کی غذا اطاعت خداوندی ہے اور ان کا مشرب فرمان حق کی بجا آوری ہے۔ اس کے برعکس انسانی طینت شہوات کا مرکب ہے، گناہوں کا مرتکب ہونا انسانی کمزوری ہے۔ زینت دنیوی کی طلب اس کے دل پر طاری رہتی ہے۔ حرص و حیلہ اس کی طبع ثانی ہے۔ شیطان اس پر اس قدر مسلط ہے کہ گویا اس کے رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ نفس امارہ جو جملہ شر کا منبع ہے، اس کے قریب ہے۔ جس کے وجود میں یہ تمام چیزیں ہوں اور وہ غلبہ شہوات کے باوجود فسق و فجور سے پرہیز کرے۔ حرص و ہوا کے باوصف دنیا سے روگرداں ہو۔ شیطانی وسوسوں کے ہوتے ہوئے گناہوں سے بچے۔ نفسانی آفات سے دور رہے۔ عبادت، طاعت، مجاہدۂ نفس اور مخالفت شیطان میں مشغول ہو۔ یقیناً ایسی مخلوق سے افضل تر ہے جس کی طبیعت میں شہوات کی کشمکش نہ ہو۔ جو غذا کی ضرورت اور لذت سے ناواقف ہو۔ جسے زن و فرزند کا غم نہ ہو۔ جسے خویش و اقارب سے تعلق نہ ہو۔ جو اسباب و آلات کی محتاج نہ ہو اور امید و بیم میں مبتلا نہ ہو۔

بخدا مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو افعال میں فضیلت تلاش کرتا ہے جمال میں عزت طلب کرتا ہے اور مال جمع کرنے میں بزرگی کی تمنا رکھتا ہے۔ عنقریب یہ جاہ و منال زوال پذیر ہوگا۔ رب قدیر کے فضل پر نظر رکھنی چاہئے۔ رضائے حق کو عزت سمجھنا چاہئے۔ معرفت اور ایمان میں بزرگی تلاش کرنی چاہئے تاکہ دوام نعمت نصیب ہو اور دونوں جہان کی دولت

سے شادمانی حاصل ہو۔

جبریل انتظار خلعت میں کئی ہزار سال عبادت کرتا رہا۔ خلعت کیا تھی؟ حضور ﷺ کی غلامی شب معراج ان کی سواری کی خدمت، بھلا وہ کیسے افضل تر ہو سکتا ہے اس ذات گرامی سے جس نے دنیا میں نفس کو عبادت شبانہ روز میں مشغول رکھا، مجاہدہ کیا اور باری تعالیٰ نے ازراہ کرم اسے اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور تمام آفات سے محفوظ کیا۔ جب ملائکہ نے از خود نخوت کا اظہار کیا اور ہر ایک نے اپنی صفائے معاملت کو بر سبیل دلیل پیش کیا اور انسان پر زبان درازی کی تو حق تعالیٰ نے ان کی صحیح کیفیت ان پر آشکارا کر دی چنانچہ فرمایا کہ اپنے گروہ میں تین افراد ایسے منتخب کرو جن پر تمہیں پورا اعتماد ہو۔ دو زمین پر جائیں۔ فرائض خلافت بجا لائیں۔ لوگوں کو راہ راست دکھائیں اور عدل و انصاف کی داد دیں۔ تین فرشتے منتخب کئے گئے۔ ایک نے تو اسی وقت مصیبت کا اندازہ کر لیا اور معذرت چاہی۔ باقی دو زمین پر آئے حق تعالیٰ نے ان کی جبلت بدل دی اور وہ طعام و شراب کے آرزو مند ہوئے۔ شہوت کا رجحان پیدا ہوا اور مستوجب سزا ہوئے۔ تمام ملائکہ کو انسانی فضیلت کا قائل ہونا پڑا۔

اہل ایمان میں سے خاص لوگ ملائکہ سے افضل ہیں اور اسی طرح عام مومن عام ملائکہ پر فضیلت رکھتے ہیں۔ معصوم تر اور محفوظ تر آدمی جبریل اور میکائیل سے افضل ہیں جو معصوم ہیں وہ حفظہ اور کراماً کاتبین سے بہتر ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

اس معاملے پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ مشائخ کبار میں سے ہر ایک نے کچھ نہ کچھ ضرور فرمایا ہے باری تعالیٰ جسے چاہے اوروں پر فضیلت عطا کرتا ہے۔ باللہ التوفیق

یہ ہیں حکیمیہ مکتب تصوف اور اہل تصوف کے اختلافات جو مختصراً معرض بیان میں آئے ہیں۔ یاد رکھو کہ ولایت اسرار حق تعالیٰ میں شامل ہے اور سلوک طریقت کے بغیر ظاہر نہیں ہوتی۔ صرف ولی ہی ولی کو پہچان سکتا ہے۔ اگر ہر کس و ناکس دانندۂ راز ہوتا تو دوست کی دشمن سے اور واصل کی غافل سے تمیز نہ ہو سکتی۔ مشیت ایزدی کا بھی تقاضا ہے کہ

اس کی دوستی کا موتی ملامت کے صدف میں جانستاں سمندر کی تہ میں چھپا رہے۔ اس کا طالب اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ بحر تلاطم انگیز میں اترے یا اپنا مقصود حاصل کرے یا جان پر کھیل جائے۔

خیال تھا کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھوں مگر قاری کے ملال اور کراہت طبع کے خیال سے دست بردار ہوتا ہوں۔ طریقت کے مبتدی کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

خرازیہ

اس مکتب تصوف کے لوگ ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں۔ طریقت پر ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ وہ تجرید اور انقطاع میں بڑی منزلت رکھتے ہیں۔ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے فنا اور بقا پر عبارت آرائی کی اور اپنے مکتب تصوف کو ان دو الفاظ کی تشریح میں سمویا۔

اب میں ان کے معانی بیان کرتا ہوں اور اس گروہ کی غلطیاں ظاہر کرتا ہوں تا کہ قاری کو اس مکتب فکر سے متعلق واقفیت حاصل ہو اور وہ سمجھ پائے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے۔

فنا اور بقاء

باری تعالیٰ نے فرمایا، مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل:96) "تمہارے پاس جو کچھ ہے زوال پذیر ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے اسے بقا ہے۔" دوسری جگہ فرمایا، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ (الرحمٰن) "ہر چیز فنا ہونے والی ہے صرف جلال و اکرام والے رب کی ذات کے لئے بقا ہے۔"

معلوم ہونا چاہئے کہ لغوی طور پر فنا اور بقا کا مطلب کچھ اور ہے۔ حال کے نقطہ نظر سے کچھ اور۔ اہل طریقت صرف ان دو لفظوں پر عبارت آرائی میں اتنا کھوئے ہیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔

علمی زبان میں لغوی حیثیت سے بقا کی تین صورتیں ہیں: اول وہ بقا جس کا اول و آخر فنا ہو۔ جیسے یہ جہان گذران جو ابتدا میں کچھ نہیں تھا اور بالآخر کچھ نہیں رہے گا۔ گو کہ فی الحال

موجود ہے۔ دوسری وہ بقا جو کبھی نہ تھی، معرض وجود میں آئی اور پھر کبھی فنا نہیں ہوگی مثلاً بہشت و دوزخ کا جہان اور اس جہان والے۔ تیسری وہ بقا جو کسی وقت بھی معرض وجود میں نہیں آئی اور کسی وقت بھی ختم نہیں ہوگی یہ بقائے حق تعالیٰ اور اس کی صفات لم یزل ولا یزال کی بقا ہے۔ وہ ذات پاک جو اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور جس کی بقا سے مراد اس کا دوام وجود ہے جس کی صفات میں کوئی شریک نہیں۔ فنا کا علم یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھا جائے اور بقاء کا علم یہ ہے کہ عقبیٰ کو باقی تصور کیا جائے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۷﴾ (الاعلی) ”عاقبت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔“ یہاں لفظ ابقیٰ بصورت مبالغہ استعمال ہوا ہے، دوسرے جہان میں بقائے عمر کے لئے فنا نہیں۔

حال کی رو سے فنا اور بقا کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جب جہالت فنا ہوتی ہے تو لامحالہ علم بقا پذیر ہوتا ہے۔ جب معصیت فنا ہوتی ہے تو طاعت بقا کا جامہ پہنتی ہے۔ جب انسان اطاعت اور علم سے بہرہ ور ہوتا ہے تو ذکر حق سے غفلت فنا ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر جب انسان کو معرفت حق نصیب ہوتی ہے اور وہ معرفت حق میں بقا حاصل کر لیتا ہے تو اس کی غفلت فنا ہو جاتی ہے یعنی وہ کسی حال میں حق سے غافل نہیں رہتا اور یہ غفلت کی فنا ذکر حق میں بقا کا سبب بنتی ہے۔ اس میں صفات قبیحہ سے دست بردار ہو کر صفات حسنہ کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔

خواصان اہل تصوف کو اس میں اختلاف ہے۔ وہ فنا اور بقا کو علم یا حال سے منسوب نہیں کرتے بلکہ دونوں لفظوں کو کمال درجہ ولایت کے ضمن میں استعمال کرتے ہیں یعنی اولیائے کرام کے لئے جو تکلیف مجاہدہ سے فارغ ہو چکے ہوں، مقامات و تغیر حال سے آزاد ہوں۔ جنہوں نے میدان طلب میں مقام مقصود پا لیا ہو۔ ہر دیکھنے والی چیز دیکھ لی ہو۔ ہر سننے والی چیز سن لی ہو۔ ہر جاننے والی چیز جان لی ہو۔ ہر پانے والی چیز پا لی ہو۔ اور پانے کے بعد حصول کی بے مائیگی دیکھ لی ہو۔ ہر سمت سے روگرداں ہو چکے ہوں۔ تکمیل مراد کے لئے اپنے قصد اور ارادے سے ہاتھ دھو لئے ہوں۔ گامزن ہوں۔ ہر دعویٰ سے بیزار

ہوں۔ اصل سے منقطع ہوں۔ کرامات کو حجاب سمجھتے ہوں۔ جن کی نظر سے ہر مقام گذر چکا ہو۔ جو لباس آفت زیب تن کئے ہوئے ہوں۔ جو مراد کو پہنچ کر نامراد ہوں۔ ہر مشرب سے روگرداں ہوں۔ ہر تعلق سے بے تعلق ہوں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ (الانفال:42) ''جو ہلاک ہوا مشاہدہ سے ہوا اور جو زندہ ہوا مشاہدہ سے۔'' میں اسی موضوع پر کہتا ہوں ؎

فنیت فنائی بفقد هوائی فصار هوائی فی الامور هواک

میں نے فنا کو اپنی خواہشات کو مٹا کر فنا کیا۔ میری ہر خواہش تیری خواہش ہوگئی۔

جس کسی نے اپنے ذاتی اوصاف کو فنا کیا تو گویا اس نے بقائے کامل حاصل کر لی۔

جب آدمی عالم وجود میں ذاتی اوصاف کو نذر فنا کر دیتا ہے تو فنائے مراد کی بدولت بقائے مراد سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر نہ قرب رہتا ہے نہ بعد۔ نہ وحشت نہ انس، نہ صحو نہ سکر، نہ فراق نہ وصال، نہ ہلاکت نہ بیخ کنی۔ نہ نام نہ نشان۔ نہ کوئی سمت نہ تحریر۔ بقول ایک شیخ کے

وطاح مقامی والرسوم کلاهما فلست أری فی الوقت قربا ولا بعدا

فنیت به غنی فنازلنی به فهذا ظهور الحق عند الفناء قصدا

''میرا مقام اور رسم و راہ پامال ہو گئے۔ کوئی قرب اور فاصلہ نہ رہا۔ میں اپنی ذات سے اس میں فنا ہو گیا۔ مجھے ہدایت ملی جو ظہور حق ہے، جو قصد فنا سے رونما ہوا۔''

المختصر کسی چیز سے صحیح طور پر فنا ہونا یہ ہے کہ اس چیز کے ناقص ہونے کا مکمل احساس ہو جائے اور اس کی خواہش باقی نہ رہے۔ صرف یہ کافی نہیں کہ کسی چیز سے رغبت ہو اور آدمی کہے ''میں اس چیز سے باقی ہوں۔'' یا کسی چیز سے نفرت ہو اور آدمی کہے ''میں اس چیز سے فانی ہوں۔'' رغبت اور نفرت دو ایسی چیزیں تو ایسے لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں جو ابھی جویان منزل ہوں۔ فنا میں کوئی رغبت و نفرت نہیں ہوتی۔ بقا میں کوئی فراق و وصال کا امتیاز نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ غلط طور پہ یہ سمجھتے ہیں کہ فنا کا مطلب فقدان ذات اور ازالہ شخصیت ہے بقائے حق میں پیوست ہو جانے کو بقا کہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ دونوں چیزیں محال ہیں۔

ہندوستان میں مجھے ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا جو علم تفسیر وغیرہ میں کامل سمجھا جاتا تھا۔ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ فنا اور بقا کی حقیقت سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ حدوث وقدم کی تفریق سے ناآشنا تھا۔ بہت سے مجہول صوفیاء فنائے کلی کے قائل ہیں۔ یہ فاش غلطی ہے کیونکہ طینت کے اجزاء کی فنا اوران کا انقطاع محال ہے۔ میں غلط رو جہلاء سے پوچھتا ہوں کہ اس فنا سے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر ان کا مطلب فنائے عین ہے تو یہ ناممکن ہے۔ اگر فنائے صفات ہے تو اسکی صورت صرف یہ ہے کہ ایک صفت کی فنا کسی دوسری صفت کی بقا سے وابستہ ہو اور دونوں صفتیں صفات انسانی میں شامل ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی کسی غیر کی صفت پر فائز ہو۔ رومیوں میں نسطوری کا نصاریٰ کا مذہب یہ ہے کہ مریم رضی اللہ عنہا بزور مجاہدہ تمام ناسوتی اوصاف سے فانی ہوگئیں۔ ان کو بقائے لاہوتی حاصل ہوئی اور اس بقا سے بقائے خداوندی میں شامل ہوگئیں۔ اس کا نتیجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، جن کی ترکیب اصلیت انسانیت سے بالاتر تھی۔ کیونکہ ان کی بقا درحقیقت بقائے الٰہی سے پیوستہ تھی۔ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ان کی والدہ اور حق تعالیٰ ایک ہی قسم کی بقا میں شامل ہیں یعنی بقائے قدیم میں جو صرف خدائے عزوجل کی صفت ہے یہ سب کچھ حشوی مجسمہ اور مشبہ لوگوں کے قول سے موافق ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ذات خداوندی محل حوادث ہے اور قدیم کے لئے صفت محدث جائز ہے میں ایسے اعتقادات میں مبتلا تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا فرق ہے اس بات میں کہ قدیم محل حوادث ہے اور حوادث محل قدیم ہیں اور اس بات میں کہ قدیم صفات حوادث سے آراستہ ہے اور حوادث صفات قدیم سے مزین ہیں؟

یہ اعتقاد دہریت پر مبنی ہے اور حدوث عالم کی حقیقت کے منافی ہے۔ اسے سامنے رکھ کر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوق اور خالق قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں قدیم ہیں یا دونوں محدث ہیں۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا ''نامخلوق'' کا مخلوق سے ملاپ ہے یا ''نامخلوق'' مخلوق میں حلول کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بے سود اعتقاد انہیں کیوں پسند ہے؟ قدیم کو محل حوادث کہیں یا حادث کو محل قدیم ہر دو صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ صفت اور صانع دونوں

قدیم ہیں یا برائے دلیل۔ اگر صفت حادث کو قدیم کہا جائے یا قدیم کو حادث تصور کیا جائے یہ صریح گمراہی ہے۔ ہم جانتے ہیں ہیں کہ جو چیزیں ایک دوسرے سے پیوست، ملی جلی اور قریب ہوتی ہیں وہ باہم یکساں ہوتی ہیں۔ ہماری بقا ہماری صفت ہے۔ ہماری فنا ہمارا وصف ہے دونوں ہمارے اوصاف میں شامل ہیں اور یہی چیز دونوں میں قدر مشترک ہے۔ فنا کسی ایک وصف کی فنا ہے جو کسی اور وصف کی بقا سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ فنا بغیر بقا اور بقا بغیر فنا بھی ہو سکتی ہے اس تصور کے پیش نظر فنا سے مراد فنائے ذکر غیر ہے اور بقا کا مطلب بقائے ذکر حق ہے۔ بقول کسے: من فنی من المراد بقی بالمراد ''جو شخص اپنی مراد سے فانی ہوا اور مراد حق سے باقی ہوا۔''

کیونکہ انسانی مراد فانی ہے اور مراد حق باقی ہے۔ جب انسان اپنی فانی مراد پر قائم رہا تو قیامت فنا پر ہوگی۔ جب مراد حق پر رہا تو گویا مراد باقی پر رہا اور قیامت بقا پر ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ جو چیز بڑھکتی ہوئی آگ میں گرتی ہے وہ اس کے التہاب کا وصف اختیار کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آگ کی طاقت اپنے لپیٹ میں آئی ہوئی چیز کا وصف بدل سکتی ہے تو ارادت حق کی قوت تو آگ سے بہت زیادہ ہے۔ مگر یاد رکھو یہ آگ کا تصرف صرف لوہے کے وصف تک محدود ہے اس کی ذات نہیں بدلتی یعنی لوہا کبھی آگ نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم

فصل: فنا و بقا کے اسرار و رموز

مشائخ کبار نے اس موضوع پر بہت باریک رموز بیان کئے ہیں۔ ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ جو اس مکتب کے امام ہیں، فرماتے ہیں: الفناء فناء العبد عن رؤیة العبودیة والبقاء بقاء العبد بشاھد انظر الإلٰھیة'' فنا احساس عبودیت کی فنا کا نام ہے بقا مشاہدہ حق سے باقی ہونے کو کہتے ہیں۔'' یعنی اپنے افعال پر نظر رکھنا خام کاری کی دلیل ہے۔ بندگی کا صحیح مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی کارگذاری کو نظر انداز کر دے اور اس کی طرف سے اپنے آپ کو فانی سمجھے۔ صرف فعل خداوندی پر نظر رکھے اور اس

سے خود کو باقی تصور کرے۔ اپنے معاملہ کو خود سے نہیں بلکہ اس کی ذات سے منسوب کرے کیونکہ ہر انسانی چیز ناقص ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو حق تعالیٰ سے موصول ہو کامل ہوتی ہے الغرض آدمی اپنے جملہ متعلقات سے فانی ہو کر ہی الٰہیت حق کے جمال سے باقی ہو سکتا ہے۔

ابو اسحٰق نہر جوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ''صحیح عبودیت فنا و بقا میں ہے۔'' یعنی جب تک بندہ اپنی تمام پونجی سے بیزار نہ ہو صحیح اور مخلص بندگی کے قابل نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ سرمایہ آدمیت سے دست بردار ہونا فنا ہے اور عبودیت میں مخلص ہونا بقا ہے۔

ابراہیم بن شیبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''علم فنا و بقا کی بنیاد اخلاص، وحدانیت اور صحیح عبودیت پر ہے۔ باقی سب کچھ خطا و الحاد ہے۔'' جب انسان توحید خداوندی کا اقرار کرتا ہے تو اپنے آپ کو حکم حق تعالیٰ کے سامنے مغلوب و مقہور پاتا ہے۔ مغلوب ہمیشہ غالب کے سامنے فانی ہوتا ہے وہ اپنی فنا کو صحیح سمجھ کر اپنے عجز کو محسوس کرتا ہے اور اسے بجز بندگی چارۂ کار نہیں رہتا اور وہ جادۂ رضا پر گامزن ہو جاتا ہے۔ پس فنا و بقا کے یہی معنی ہیں جو کوئی اس کے خلاف کہتا ہے یعنی یہ کہتا ہے کہ فنا کا مطلب فنائے ذات ہے اور بقا کے معنی بقائے خداوندی ہے وہ زندقہ کا مرتکب ہے اور عیسائیت کا علمبردار جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ اقوال از روئے معانی برابر ہیں، گو کہ از روئے عبارت مختلف نظر آتے ہیں۔ مختصراً مطلب یہ ہے کہ فنا حق تعالیٰ کے جلال کی روایت اور اس کے کشف عظمت سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بندہ اس کے غلبہ جلال کے سامنے دنیا و عقبیٰ کو فراموش کر دیتا ہے۔ احوال و مقام اس کی ہمت کے سامنے حقیر ہو جاتے ہیں۔ کرامات ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ عقل و نفس سے فانی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے اور اس حقیقی فنا کے عالم میں وہ زبان فنا سے اعلان حق کرتا ہے اور اس کی جان اور اس کا تن سراپا خشیت و طاعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے اولاد آدم، پشت سے پاک و منزہ نکلی تھی اور سر تا بقدم پیکر عبودیت تھی۔ اسی موضوع پر ایک بزرگ نے فرمایا ہے،

لا کنت أن کنت أدری کیف السبیل إلیک

أفنيتني عن جميعي فصرت أبكي عليك

''اگر مجھے تیری ذات تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہوتا تو میں اپنی ذات سے فنا ہو کر تیرے ذکر میں روتا رہتا۔'' ایک اور بزرگ نے فرمایا،

ففي فنائي فنا فنائي وفي فنائي وجدت أنت

محوت رسمي ورسم جسمي سألت عني فقلت انت

''میری فنا میں میری فنا کی فنا ہے۔ میں نے اپنی فنا کو سودمند پایا۔ میں نے اپنا نام و نشان مٹا دیا۔ تو نے پوچھا تو کون ہے، میں نے کہا تو ہی تو ہے۔''

یہ ہیں احکام فنا و بقا تصوف اور فقر کے نقطۂ نظر سے جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے۔ اس کتاب میں جہاں کہیں فنا و بقا کا ذکر ہو گا یہی کچھ مراد ہو گا۔ یہ خرازیوں کے مکتب کا بنیادی اصول ہے جو تمام تر روشن اور بین ہے۔ فی الحقیقت جو فراق وصل کی دلیل ہو وہ بے بنیاد نہیں ہوتا۔ اس طائفہ میں یہ بات زبان زد عام ہے واللہ اعلم بالصواب

خفیفیہ

خفیفی مکتب فکر کے لوگ ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں اور وہ اس مکتب کے بزرگ سربراہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے میں صاحب عزت و توقیر تھے۔ علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے۔ ان کی تصانیف مشہور و معروف ہیں۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مختصر یہ کہ عزیز روزگار تھے اور نہایت درجہ پاکیزہ نفس تھے۔ شہوات نفسانی سے روگردانی ان کی خصوصیت تھی۔

سنا ہے کہ انہوں نے چار سو عورتوں سے نکاح کیے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب توبہ کی ابتدا ہوئی تو اہل شیراز نے بے حد ارادت کا اظہار کیا۔ جب بلند حال ہوئے تو شہزادیوں اور رئیس زادیوں نے تبرکاً آپ کے ساتھ رشتہ زوجیت استوار کرنا چاہا۔ تاہم آپ ابتلاء سے بچے اور ہر ایک کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی۔ البتہ چالیس عورتیں ایسی تھیں جو مختلف اوقات میں دو دو، تین تین آپ

کے حلقہ زوجیت میں رہیں۔ ایک مکمل چالیس برس تک آپ کے ساتھ رہی وہ کسی وزیر کی لڑکی تھی۔ میں نے شیخ ابوالحسن علی بکران شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک روز آپ سے متعلقہ کچھ عورتیں ایک جگہ جمع تھیں اور باہم گفتگو کر رہی تھیں سب کی سب اس بات پر متفق تھیں۔ کہ ان میں سے کسی نے بھی خلوت میں شیخ کو عالم شہوت میں نہیں دیکھا۔ ہر ایک کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا اور وہ سخت متعجب ہوئیں۔ قبل ازیں ہر ایک اپنی جگہ یہ سمجھتی تھی کہ شیخ کا میلان طبع دوسری طرف مائل ہے۔ سب نے سوچا کہ وزیرزادی کے سوا کوئی اس راز سے واقف نہیں ہوسکتا۔ وہ سالہا سال سے ان کی صحبت میں رہی ہے۔ سب نے مشورہ کیا اور اتفاق رائے سے دو کو وزیرزادی کے پاس بھیجا تا کہ صحیح صورت حال معلوم ہو سکے۔ وزیر زادی نے بیان کیا، شیخ کے حلقہ زوجیت میں آنے کے بعد مجھے پیغام پہنچا کہ آج رات شیخ میرے ہاں بسر کریں گے۔ میں نے خوب کھانے تیار کئے، خوب بناؤ سنگھار کیا۔ وہ تشریف لائے۔ دستر خوان لگ چکا تو مجھے طلب کیا۔ ایک نظر مجھے دیکھا۔ ایک نظر دستر خوان پر ڈالی۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین میں لے گئے۔ میں نے دیکھا تو سینہ سے ناف تک پیٹ پر پندرہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر فرمایا، ''اے وزیرزادی! یہ گرہیں اس سختی اور صبر کا نتیجہ ہیں جو میں اس حسن اور طعام سے روگرداں ہو کر برداشت کرتا رہا ہوں''۔

شیخ نے صرف قدر گفتگو کی اور اٹھ کر چلے گئے یہ ہمارے تعلق کی انتہا تھی۔

تصوف میں ان کے مکتب کا بنیادی تصور غیبت و حضور سے وابستہ ہے اس پر انہوں نے عبارت آرائی کی ہے۔ میں اس موضوع پر جو ممکن ہے، بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز

غیبت و حضور

یہ الفاظ حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ گو بظاہر متضاد دکھائی دیتے ہیں، اہل زبان اور اہل حقیقت کے ہاں مروج و مستعمل ہیں۔ حضور سے مراد حضور دل ہے جو دلیل یقین ہے یعنی جو آنکھوں سے نہاں ہے اس کی حیثیت ایسی چیز کی ہے جو آنکھوں کے سامنے عیاں ہے۔ غیبت سے مراد غیر اللہ سے دل کی غیبت ہے یہاں تک کہ دل خود سے

اور اپنی غیبت سے بھی غائب ہو جائے۔ اپنی اہمیت قطعاً موقوف ہو جائے۔ اس کی علامت رسمی تکلفات سے قطع تعلق ہے۔ نبی کی طرح جو تائید ربانی سے معصوم ہوتا ہے۔

چنانچہ اپنی ذات سے غیبت حضور حق اور حضور حق اپنی ذات سے غیبت کا نام ہے۔ جو اپنی ذات سے غائب ہو وہ صاحب حضور حق ہوتا ہے اور جو صاحب حضور حق ہو وہ اپنی ذات سے غائب ہوتا ہے۔ مالک القلوب ذات باری ہے۔ جب جذب حق دل پر غالب ہوتا ہے تو دل کی غیبت طالب کے لئے حضور حق کے برابر ہوتی ہے۔ شرکت اور تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور خودی کا تصور مٹ جاتا ہے۔ بقول شیخ،

ولی فؤاد وأنت مالکه بلا شریک فکیف ینقسم

"تو بلا شرکت غیر میرے دل کا مالک ہے اس کو تقسیم کیسے کیا جا سکتا ہے۔"

ذات حق مالک القلوب ہے اور اسی کو دلوں کی غیبت اور حضور پر پوری قدرت ہے۔ یہ ہے دراصل جملہ منطق کا لب لباب۔ مگر فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے مشائخ کبار کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت حضور کو غیبت پر ترجیح دیتی ہے اور دوسری غیبت کو حضور پر۔ اس بحث کی نوعیت صحو و سکر کی سی ہے جو اس سے پہلے معرض بیان میں آچکی ہے مگر صحو و سکر بقائے اوصاف انسانی کی علامات ہیں اور غیبت و حضور فنائے اوصاف کی۔ اس لئے غیبت و حضور درحقیقت لطیف ہیں۔ غیبت کو حضور پر مقدم رکھنے والوں میں ابن عطا، حسین بن منصور، ابوبکر شبلی، بندار بن حسین، ابوحمزہ بغدادی، سمنون محبؒ رضی اللہ عنہم اجمعین اور کئی دوسرے عراقی مشائخ شامل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: "خدا اور تیرے درمیان سب سے بڑا حجاب تیری اپنی ذات ہے۔ جب تو اپنی ذات سے غائب ہو جاتا ہے تو تیرے جبلی عیوب ختم ہو جاتے ہیں۔ تیری ذات میں ایک بنیادی انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ مریدوں کے مقامات تیرے لئے حجاب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ طالبوں کے احوال سامان آفت بن جاتے ہیں۔ تیری اپنی ذات اور ہر غیر اللہ چیز تیری نگاہ میں ناپید ہو جاتی ہے۔ تیری انسانی صفات شعلہ قربت سے جل کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ یہی غیبت کا عالم ہے جس میں باری تعالیٰ نے تجھے

پشت آدم سے پیدا کیا۔ اپنا مقدس کلام تجھے سنوایا۔ خلعت توحید اور لباس مشاہدہ سے سرفراز کیا۔ جب تک تو اپنی ذات سے غائب تھا حضور حق سے سرفراز تھا۔ جب اپنی صفات انسانی میں حاضر ہوا قربت حق سے غائب ہو گیا۔ تیرا حضور تیرے لئے باعث ہلاکت ہے۔ یہ مطلب ہے اس قول خداوندی کا، وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (الانعام:92) ''اب تم ہماری طرف تنہا آ رہے ہو۔ جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔

دوسری طرف حارث محاسبی، جنید، سہل بن عبداللہ تستری، ابو حفص حداد، حمدون قصار، ابو محمد جریری، حصری، بانی مکتب محمد خفیف رضی اللہ عنہم اجمعین اور کئی ایک دوسرے مشائخ حضور کو غیبت پر مقدم سمجھتے ہیں کیونکہ سب خوبیاں حضور سے متعلق ہیں۔ اپنی ذات سے غائب ہونا حضور حق کی راہ ہے۔ اگر منزل پر پہنچ جائے یعنی حضور حاصل ہو جائے تو راہ درکار نہیں ہوتی۔ جو خود سے غائب ہو وہ لامحالہ حاضر بحق ہوتا ہے۔ غیبت کا حال صاحب حضور ہے اور غیبت بے حضور بے کار ہے۔ غفلت سے دست بردار ہونا ضروری ہے، غیبت حضور کیلئے ذریعہ کار ہے اور حصول مقصد کے بعد کار کے ذریعے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ۔

''وہ غائب نہیں ہوتا جو اپنے شہر سے غائب ہو۔ غائب وہ ہے جو ہر آرزو سے غائب ہو حاضر وہ نہیں جس کی کوئی آرزو نہ ہو۔ حاضر وہ ہے جس کے دل میں دورنگی نہ ہو اور اس کی آرزو صرف ذات باری ہو۔''

مشہور ہے کہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید نے ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ ان کے عبادت خانہ کے دروازہ پر آ کر دستک دی۔ ابو یزید نے اندر سے پوچھا ''کون ہے، کس کی تلاش ہے؟'' مرید نے جواب دیا، میں ابو یزید سے ملنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا: ''ابو یزید کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ میں مدت سے اس کی تلاش میں ہوں مجھے آج تک نہیں ملا۔'' مرید نے واپس آ کر تمام واقعہ ذوالنون سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: ''میرا بھائی ابو یزید حق تعالیٰ کی طرف جانے والوں میں چلا گیا۔''

ایک شخص جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ایک لمحہ مجھے

توجہ دیجئے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ جنید نے فرمایا: ''اے جوانمرد! تو مجھ سے وہ چیز طلب کر رہا ہے جس کا میں خود مدت سے طالب ہوں۔ سالہا سال گذر گئے ہیں۔ حضور حق کے لئے کوشاں ہوں مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت میں تیرے سامنے کیسے حاضر ہوسکتا ہوں۔''

الغرض غیبت میں حجاب کا خوف ہوتا ہے اور حضور میں کشف کی مسرت۔ حجاب کسی شکل میں بھی کشف کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اسی مضمون پر شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

تقشع غیم الهجر عن قمر الحب وأسفر نور الصبح عن ظلمة العتب

''ماہتاب محبت سے فراق کے بادل دور ہوگئے۔ ظلمت غیب سے نورانی صبح ضوفشاں ہوگئی۔''

یہ تفریق جو مشائخ کبار نے بیان کی ہے، حال سے تعلق رکھتی ہے۔ سطحی طور پر صرف اقوال کا فرق ہے ورنہ دونوں صورتیں کم وبیش برابر ہیں۔ حضور حق اور خود سے غیبت۔ دونوں میں کیا فرق ہے؟ جو خود غائب ہے وہ حاضر بحق نہیں ہوسکتا۔ جو حاضر بحق ہے وہ لازماً خود سے غائب ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب صلوات اللہ علیہ نے درد وکرب میں جو پکار کی وہ ان کے ذاتی اختیار سے باہر تھی کیونکہ وہ خود سے غائب تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس پکار کو صبر کے منافی نہ کہا۔ جب ایوب صلوات اللہ علیہ نے فرمایا: اَنِّیْ مَسَّنِیَ (الانبیاء:83) ''مجھے تکلیف ہوئی۔'' باری تعالیٰ نے فرمایا، انا وجدنا صابرا (ص:66) ''وہ صبر کرنے والا تھا۔'' اس حکایت سے موضوع سخن کی مکمل وضاحت ہوتی ہے۔ غور وتامل کی ضرورت ہے۔

جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''ایک ایسا وقت تھا کہ اہل آسمان اور ساکنان زمین میرے عالم حیرت پر گریاں تھے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مجھے ان کی غیبت پر رونا پڑا اب یہ عالم ہے کہ نہ مجھے زمین وآسمان کی خبر ہے اور نہ اپنا پتا ہے۔'' یہ موضوع حضور پر ایک حسین اشارہ ہے۔

یہ ہیں معانی غیبت وحضور کے جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے ہیں تاکہ خفیفیہ مکتب کا

مسلک ظاہر ہو جائے اور غیبت وحضور سے جو ان کی مراد ہے وہ سامنے آجائے۔ مزید شرح و بسط کتاب کو طویل کر دے گی اور میرا طریق تحریر اختصار ہے رحمۃ اللہ علیہ وباللہ التوفیق

سیاریہ

سیاری مکتب کے لوگ ابوالعباس سیاری رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے جو مرو میں تمام علوم کے امام تسلیم کئے گئے ہیں۔ یہ ابوبکر واسطی کے مصاحب تھے۔ آج بھی نساء اور مرو میں ایک کثیر جماعت ان کے اصحاب کی موجود ہے۔ شاید یہی ایک مکتب تصوف ہے جو آج تک اپنی اصلی صورت پر قائم ہے۔ مرو اور نساء میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی رہنما موجود رہا ہے جس نے اس مکتب کے پیروکاروں کو آج تک اقامت کا سبق دیا۔ اہل نساء اور اہل مرو کے درمیان کئی لطیف رسائل ہیں جو مکتوبات کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ میں نے خود چند مکتوبات دیکھے۔ نہایت خوبصورت زیادہ تر عبارات جمع وتفرقہ کے موضوع پر ہیں۔ یہ الفاظ اہل علم میں مشترک ہیں۔ ہر گروہ اپنے موضوع علم کے مطابق ان الفاظ کو مفہوم بیان کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مراد سب کی جداگانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حساب دان جمع وتفرقہ سے اجتماع وافتراق اعداد مراد لیتے ہیں۔ نحوی لوگ لغوی طور پر اسماء کا اتفاق اور ان کے معانی کا فرق سمجھتے ہیں۔ فقہاء جمع قیاس اور تفرقہ صفات نص یا جمع نص اور تفرقہ قیاس کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اہل اصول جمع صفات ذات اور تفرقہ صفات فعل پر چسپاں کرتے ہیں۔ اس مکتب تصوف میں یہ الفاظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتے۔

میں اب اس جماعت کا مقصود اور ان کے مشائخ کے اختلافات بیان کرتا ہوں تاکہ اصل حقیقت روشن ہو جائے اور مشائخ کے ہر گروہ کا مقصود جمع وتفرقہ سے متعلق واضح ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

جمع وتفرقہ

جہاں تک دعوت کا تعلق ہے حق تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو خطاب کیا اور فرمایا،
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس:25) ”اللہ تمہیں مقام سلامتی کی طرف بلاتا ہے۔“

ہدایت کے لئے فرق ظاہر کیا اور فرمایا، یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (یونس) اللہ جسے چاہتا ہے راہ ہدایت دکھاتا ہے۔" ظاہر ہے کہ دعوت سب کو دی یعنی دعوت میں سب جمع تھے مگر اپنی مشیت کے مطابق ایک گروہ کو رد فرمایا یعنی تفریق فرمائی۔ سب کو ایک جا کیا۔ حکم دیا۔ تفریق فرمائی۔ ایک گروہ کو مردود کر کے بے سہارا چھوڑ دیا۔ دوسرے گروہ کو شرف قبولیت عطا کیا اور تائید ربانی سے سرفراز فرمایا۔ پھر دوبارہ ایک تعداد کو جمع کیا۔ تفریق فرمائی۔ ایک گروہ کو معصیت سے آزاد فرمایا۔ دوسرے گروہ کو مائل بہ کج روی چھوڑ دیا۔

المختصر جمع دراصل حق تبارک وتعالیٰ کا علم اور اس کا حکم ہے اور تفرقہ امر و نہی کا اظہار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اسماعیل کو ذبح کرے مگر یہ نہ چاہا کہ اسماعیل علیہ السلام ذبح ہو جائیں ابلیس کو حکم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے مگر نہ چاہا کہ ایسا ہو۔ آدم علیہ السلام کو دانہ گندم چکھنے سے منع فرمایا مگر چاہا کہ چکھے وغیرہ جمع وہ ہے جو وہ اپنی صفات سے یکجا کرے اور تفرقہ وہ جو احکام سے جدا جدا کر دے۔ یہ دراصل انسانی تصرف وارادت کا انقطاع اور ارادت حق کا اثبات ہے جو کچھ جمع و تفرقہ کی نسبت بیان ہوا اس پر بجز معتزلہ کے تمام اہل سنت و جماعت مکتب فکر کے مشائخ کبار متفق ہیں۔ اس سے آگے اختلاف ہے۔ کچھ توحید سے منسوب کرتے ہیں کچھ اوصاف سے اور کچھ افعال سے۔

توحید سے نسبت دینے والوں کا قول ہے کہ جمع کے دو درجے ہیں: ۱۔ جمع اوصاف حق، ۲۔ جمع اوصاف بندہ

اول الذکر سر توحید ہے جس میں کسب انسانی کو کوئی دخل نہیں۔ مؤخر الذکر توحید سے متعلق صدق اعتقاد اور صحت عزم کا نام ہے۔ یہ ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ ہے۔

جمع و تفرقہ کو اوصاف سے منسوب کرنے والے کہتے ہیں کہ جمع حق تعالیٰ کی صفت ہے اور تفرقہ اسی ذات کا فعل ہے جس میں انسان کو دخل نہیں کیونکہ خدائی میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔ جمع کو صرف ذات حق اور صفات حق سے متعلق سمجھنا چاہئے کیونکہ جمع تسویت اصل کا

نام ہے اور ابدیت میں بجز ذات وصفات حق کے کوئی دو چیزیں مساوی نہیں ہو سکتیں۔ جمع ہرگز جمع نہیں اگر تفصیل وتجزیہ میں ذات وصفات کو جدا جدا کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات ازل سے ابد تک اس کی ذات سے وابستہ وموجود ہیں۔ ذات حق اور اس کی صفات علیحدہ اور مختلف نہیں ہیں کیونکہ وحدانیت میں تفریق واعداد کا وجود نہیں ہوتا۔ اس نقطۂ نظر سے جمع صرف مذکورہ صورت میں ممکن ہے۔

تفرقہ فی الحکم کی نسبت افعال خداوندی سے ہے جو مختلف الانواع ہوا کرتے ہیں۔ ایک کے لئے حکم وجود ہے۔ دوسرے کے لئے حکم عدم۔ مگر وہ عدم جس کے لئے وجود بھی ممکن ہو۔ ایک طرف حکم بقا ہے دوسری طرف حکم فنا۔

پھر ایک اور گروہ ہے جو ان الفاظ کا اطلاق علم پر کرتا ہے۔ بقول اس گروہ کے ''جمع علم توحید اور تفرقہ علم احکام'' کا نام ہے۔ الغرض علم جمع کی اصل اور تفرقہ شاخوں کی مانند ہے۔ اسی سلسلہ میں کسی شیخ بزرگ کا قول ہے: ''جس چیز پر اہل علم متفق ہوں وہ جمع اور جس چیز سے متعلق اختلاف ہو وہ تفرقہ ہے''۔

جملہ محققین تصوف اپنے اقوال اور اپنی عبارات میں لفظ تفرقہ کو انسانی افعال (مکاسب) کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور جمع سے انعامات خداوندی (مواہب) مراد لیتے ہیں۔ یعنی مجاہدہ ومشاہدہ۔ جو کچھ آدمی بزور مجاہدہ حاصل کرے وہ باعث پریشانی ہے اور جو محض عنایت وہدایت خداوندی سے میسر آئے وہ باعث اطمینان ہے۔ یہ آدمی کے لئے موجب افتخار ہے کہ وہ اپنے افعال ومجاہدہ کی امکانی آفات سے جمال حق کی بدولت محفوظ رہے۔ اپنے فعل کو فضل حق میں مستغرق سمجھے۔ اپنے مجاہدہ کو ہدایت حق کے سامنے ہیچ تصور کرے۔ کلی طور پر خدا پر توکل ہو اپنے تمام اوصاف کو وکالت حق کے سپرد کر دے اور اپنے جملہ افعال کو اسی کی ذات اقدس سے منسوب کرے۔ یہاں تک کہ اس کے مکاسب کو اس کی اپنی ذات سے کوئی نسبت نہ رہے۔ جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا: ''جب بندہ مجاہدہ سے ہمارا تقرب تلاش کرتا ہے ہم

اسے اپنی محبت سے نوازتے ہیں۔ جب ہماری محبت کی نوازش ہوتی ہے تو ہم اس کے کان، آنکھ، اس کے ہاتھ اور اس کا دل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمارے ذریعہ سے سنتا ہے، دیکھتا ہے، بولتا ہے اور بست و کشاد کرتا ہے (1)۔" یعنی ہمارا ذکر کرتے ہوئے وہ ذکر میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس کے ذاتی مکاسب فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ خود فراموشی کے عالم میں فقط ہمارے ذکر میں ڈوب جاتا ہے۔ انسان ہونے کا احساس مٹ جاتا ہے اور وہ کیفیت وجد میں ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کی طرح پکار اٹھتا ہے۔ **سبحانی ما اعظم شانی** "میں پاک ہوں میں پاک ہوں۔ میری شان کتنی بلند ہے۔" ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ گفتار کا ظاہری لباس تھے بولنے والے حق تعالیٰ تھے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اَلْحَقُّ يَنْطِقُ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ "حق عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے گویا ہے (2)۔" اصل حقیقت یہ ہے کہ جب جلال حق انسانی قلب پر غلبہ کرتا ہے تو انسان اپنی ذات سے فنا ہو جاتا ہے اور اس کی گفتار حق تعالیٰ کی گفتار ہو جاتی ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کو مخلوقات یا مصنوعات سے امتزاج یا اتحاد ہو جائے یا وہ کسی چیز میں حلول کر جائے۔ اس کی ذات اس سے بہت بلند ہے اور بہت اونچی ہے ان چیزوں سے جو ملاحدہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ جب عشق حق انسان پر غلبہ کرتا ہے اور اس کے دل و دماغ اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے تو اسے اپنے کسب پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس حالت کو جمع کہتے ہیں مثلاً حضور ﷺ مستغرق و مغلوب تھے۔ آپ سے ایک فعل ظہور پذیر ہوا۔ حق تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا یہ میرا فعل تھا۔ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: 17) "اے محمد (ﷺ) وہ خزف ریزے تو نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکے" حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی اسی قسم کا فعل ظہور پذیر ہوا۔ اس پر فرمایا: قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ (البقرہ: 251) "داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔" یہ تفرقہ کی حالت تھی۔

1۔ صحیح بخاری 2۔ مشکوۃ المصابیح

کسی کے فعل کو اسی سے منسوب کرنے اور اپنی ذات سے منسوب کرنے میں بہت فرق ہے۔ انسان محل آفات وحوادث ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات اقدس قدیم و بے آفت ہے۔ جب فعل حق انسان کے ہاتھوں ظاہر ہو اور انسانی امکان سے باہر ہو تو لامحالہ فعل حق متصور ہوگا۔ اعجاز کرامات کا یہی مقام ہے۔

جملہ منہاج معمول پر سرانجام پانے والے کام تفرقہ کے تحت آتے ہیں اور جملہ خوارق عادات جمع کے۔ ایک شب میں ''قاب قوسین'' کو پہنچنا فعل معمول نہیں اسے فعل حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسی طرح کسی غیر موجود سے بات کرنا فعل معمول نہیں فعل حق متصور ہوگا۔ آگ سے بے گزند گزر جانا معمول نہیں فعل حق سمجھا جائے گا۔ حق تعالیٰ معجزات اور کرامات اپنے پیغمبروں اور ولیوں کو عطا کرتا ہے اپنے افعال کو ان سے اور ان کے افعال کو خود سے منسوب کرتا ہے جیسا کہ فرمایا، اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح:10) ''بیشک جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔'' پھر فرمایا، مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:80) ''اور جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانبردار اللہ کا فرمانبردار ہے۔''

اولیائے اللہ اسرار کے معاملے میں مجتمع اور ظاہری اطوار میں متفرق ہوتے ہیں۔ محبت حق جمع باطن سے مضبوط ہوتی ہے اور حقوق عبودیت تفرقہ ظاہر سے پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ کسی شیخ کبیر کا قول ہے:

''میں نے اپنے اندرونی اسرار کو سمجھا اور تیرے ساتھ خفیہ طور پر گفتگو کی۔ ایک صورت سے ہم مجتمع ہیں اور ایک صورت سے متفرق۔''

''تیرے جلال نے تجھے میری مشتاق نگاہوں سے چھپا رکھا ہے۔ مگر عالم کیف میں تجھے دل کی گہرائیوں میں دیکھ رہا ہوں۔''

یہاں باطنی طور پر مجتمع ہونے کو جمع کہا گیا ہے اور خفیہ گفتگو (مناجات) کو تفرقہ۔ پھر جمع وتفرقہ دونوں کی اپنے اندر نشان دہی کی ہے اور ان کی بنیاد اپنی ذات کو قرار دیا ہے۔ یہ

نہایت نازک نکتہ ہے۔ وباللہ التوفیق الاعلیٰ

فصل: ایک متنازع فیہ مسئلہ

یہاں ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بیان کرنا ضروری ہے۔ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب جمع کا ظہور ہو جائے تو تفرقہ کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ متضاد چیزیں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت من اللہ کے سامنے کسب و مجاہدہ ساقط ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ تابہ امکان توانائی کسب و مجاہدہ سے مفر نہیں۔ جمع اور تفرقہ الگ الگ نہیں کئے جا سکتے۔ جیسے نور آفتاب سے، عرض جوہر سے اور صفت موصوف سے وابستہ ہے اسی طرح مجاہدہ ہدایت سے، شریعت حقیقت سے اور یافت طلب سے وابستہ ہے۔ البتہ مجاہدہ مقدم و مؤخر ہو سکتا ہے۔ جہاں مقدم ہو وہاں غیبت کے پیش نظر زیادہ مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجاہدہ موخر ہو تو بوجہ حضوری رنج و کلفت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ جس کے اعمال کی بنیادی نفی پر ہو اور اس کی نگاہوں میں نفی عین عمل ہوا کرتی ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انسان ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں اسے اپنی تمام عمدہ صفات نامکمل اور ناقص دکھائی دیں اور جب اچھی صفات نامکمل اور ناقص نظر آئیں گی تو یقیناً بری صفات ناقص تر دکھائی دیں گی۔ یہ چیز میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ جہالت میں مبتلا بعض لوگ ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں جو الحاد سے بہت قریب ہے وہ سمجھتے ہیں کہ کوشش سے کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہماری طاعت ناقص اور ہمارے اعمال معیوب ہیں۔ ناقص مجاہدہ نہ کرنا مجاہدہ کرنے سے بہتر ہے یہ استدلال باطل ہے۔ کیونکہ بالاتفاق مانا گیا ہے کہ کردار کی بنیاد فعل پر ہے۔ اگر فعل کو مرکز علت و آفت تصور کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہو کہ ناکردہ کو بھی بنیادی فعل کی ضرورت ہے تو ہر دو جانب بنیادی طور پر فعل کارفرما ہونا چاہئے۔ فعل دونوں جانب علت و آفت ہے تو ناکردہ کو کردہ پر کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ بین غلطی اور واضح بے راہروی ہے۔ کفر اور ایمان میں یہی نمایاں فرق ہے۔ مومن و کافر متفق ہیں کہ افعال محل علت ہیں۔ مومن حسب حکم کردہ کو ناکردہ پر ترجیح دیتا ہے اور کافر اپنی نافرمانی کی بناء پر ناکردہ کو کردہ

سے بہتر سمجھتا ہے۔ فی الحقیقت جمع یہ ہے کہ آفت تفرقہ کے باوجود حکم تفرقہ کو ساقط نہ سمجھا جائے اور تفرقہ یہ ہے کہ جمع کے پردے میں تفرقہ بھی جمع متصور ہو۔

اسی مضمون پر مزین کبیر فرماتے ہیں: ''جمع مقام خصوصیت ہے اور تفرقہ عبودیت یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے سے کلیتہً وابستہ ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ عبودیت کے فرائض کو سرانجام دینا خاصان حق کا کام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرض کو کماحقہ سرانجام دینے والے کے لئے محنت و مشقت کو آسان کر دیا جائے مگر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ مجاہدۂ نفس کے آئین کو ساقط کر دیا جائے جب تک شرعاً جائز تسلیم کئے جانے والی شکل موجود نہ ہو۔ یہاں قدرے تشریح کی ضرورت ہے تاکہ بات قابل فہم ہو جائے۔ جمع کی دو صورتیں ہیں: ا۔ جمع سلامت، ۲۔ جمع تکسیر۔

جمع سلامت وہ ہے جو غلبہ حال، شدت وجد، قلق اور شوق کے عالم میں ظہور میں آئے۔ حق تعالیٰ بندہ کی حفاظت کرے اس کے ظاہر کو سلامت رکھے۔ امر ادا کرنے کی توفیق عطا کرے اور مجاہدہ پر استقامت دے۔ سہل بن عبداللہ، ابوحفص حداد، ابوالعباس سیاری امام مرو صاحب مکتب سیاریہ، ابویزید بسطامی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن حصری، اور مشائخ کبار کی ایک کثیر جماعت قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم مغلوب رہا کرتے تھے جب تک وقت نماز کا وقت نہ آجاتا۔ نماز کے وقت اپنے حال پر پلٹ آتے تھے۔ نماز ادا کر چکنے کے بعد پھر مغلوبیت طاری ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ عالم تفرقہ میں کوئی شخص احساس خودی سے خالی نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے تکمیل امر لازم ہے۔ عالم جذب میں یہ حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ بندے کو خلاف امر سے محفوظ رکھے تاکہ اس کا نسان عبودیت برقرار رہے اور باری تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حفاظت وہ خود کرتا ہے۔

جمع تکسیر میں انسان مدہوش ہو جاتا ہے اور اس کی قوت فیصلہ دیوانوں کی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حالت میں انسان معذور ہوتا ہے یا مشکور۔ مشکور کا درجہ معذور سے بلند تر ہے۔

الغرض جمع کسی خاص مقام یا خاص حال کا نام نہیں جمع سے مراد اپنے مطلوب کے لئے

اپنی ہمت کو مرکوز کرنا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقامات میں شامل ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ احوال سے متعلق ہے۔ بہر حال صاحب جمع کو مراد نفی مراد سے حاصل ہوتی ہے۔ ''تفرقہ جدائی اور جمع وصل ہے۔'' یہ چیز ہر مقام پر درست اترتی ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی ہمت یوسف علیہ السلام پر مرکوز رہی اور ان کے تصور میں اس کے سوا کوئی نہ رہا۔ مجنوں کی ہمت لیلیٰ پر مرکوز ہوئی تو اسے دنیا میں لیلیٰ کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ہر چیز نے لیلیٰ کی شکل اختیار کر لی۔

ایسی اور بہت سی چیزیں ہیں۔ ابویزید رحمۃ اللہ علیہ اپنے عبادت کدہ میں مقیم تھے۔ کسی نے آ کر آواز دی: ''کیا ابویزید گھر میں ہے۔'' ابویزید نے جواب دیا: ''بجز ذات خدا کے گھر میں کوئی نہیں۔''

ایک شیخ بزرگ نے بیان کیا ہے کہ کوئی درویش مکہ معظّمہ میں وارد ہوا اور خانہ کعبہ کے سامنے ایک سال تک بیٹھا رہا۔ نہ اس نے کھایا نہ پیا۔ نہ وہ سویا اور نہ رفع حاجت کیلئے اٹھا۔ اس کی ہمت رویت خانہ خدا پر جمع تھی اور خانہ خدا اس کے تن اور اس کی روح کے لئے سامان خورد و نوش بن گیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنی محبت کو جو اصل میں ایک ہی جوہر سے منسوب ہے، ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اپنے دوستوں میں ہر ایک کے ظرف اور اشتیاق کے مطابق تقسیم فرمایا پھر اس پر انسانیت کی زرہ، طبیعت کا لباس، مزاج کا پردہ اور روح کا حجاب ڈال دیا تاکہ وہ ریزۂ محبت اپنی قوت سے تمام اجزائے انسانی کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔ نتیجتاً محبت کرنے والا سراپا محبت ہو گیا اور اس کی تمام حرکات و سکنات شرائط محبت ہو کر رہ گئے۔ اسی بناء پر ارباب معانی اور اہل زبان نے جمع کا لفظ وضع کیا۔ اس مضمون پر حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ۔

''اے میرے آقا! میں حاضر ہوں اے میرے مالک! میں حاضر ہوں اے میرے مقصد! اے میرے معنی! میں حاضر ہوں۔ اے میری روح رواں! اے میری منزل مقصود! اے میری عبارت! اے میری اشارت! اے میری کلیت کے کل! اے میری قوت سمع! اے

میری طاقت دید! میری جملگی، میرے عناصر، میرے اجزاء''

الغرض جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ اس کے ذاتی اوصاف مستعار ہیں تو اسکی نظر میں اپنی ہستی باعث عار ہو جاتی ہے۔ کونین کی طرف نگاہ التفات کرنا شرک کے برابر ہو جاتا ہے عالم موجودات کی ہر شے بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے۔

بعض اہل زبان کلام کی نزاکت اور عبارت کی باریکی کے لئے جمع الجمع کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ کلمہ عبارت آرائی کے لئے خوب ہے۔ مگر معنوی اعتبار سے بہتر یہی ہے کہ جمع کی جمع نہ بنائی جائے کیونکہ جمع کے لئے تفرقہ ضروری ہے۔ جمع موجود ہے تو اس پر اور جمع مسلط نہیں کی جاسکتی۔ اس کلمہ کا غلط مفہوم لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صاحب جمع کی نظر تحت و فوق سے بے نیاز ہوتی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شب معراج ہر دو عالم دکھائے گئے۔ آپ نے کسی طرف نگاہ التفات نہ فرمائی۔ آپ مجتمع تھے اور مجتمع کی نظر تفرقہ پر نہیں پڑا کرتی۔ اسی واسطے باری تعالیٰ نے فرمایا، مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ (النجم) ''نہ نظر کسی طرف مائل ہوئی نہ تجاوز کیا۔''

اوائل ایام میں اسی موضوع پر میں نے ایک کتاب ترتیب دی تھی اور اس کا نام ''البیان لاہل العیان'' رکھا تھا ''بحر القلوب'' میں بھی جمع کے تحت اس مضمون پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اب اختصار کے طور پر جو بیان کیا کافی ہے۔

یہ ہے مکتب سیاریہ کا طریق۔ اور اسی پر ان مکاتب تصوف کا احوال ختم ہوتا ہے جو مقبول ہیں اور صحیح تصوف کے علمبردار ہیں اب مجھے کچھ ان ملحدوں سے متعلق بیان کرنا ہے جو صوفیائے کرام کے گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اقوال کو اپنے الحاد کا جامہ پہناتے ہیں اور اپنی تذلیل کو ان کی عزت و توقیر میں چھپاتے ہیں۔ میرا مقصد ایسے لوگوں کے مکر و ریا کو بے نقاب کرنا ہے تاکہ عوام الناس ان سے دور رہیں۔ انشاء اللہ العزیز

حلولیہ (لعنہم اللہ)

باری تعالیٰ نے فرمایا، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس: 32) ''صداقت کے بعد

گمراہی کے سوا کیا رکھا ہے۔''

دو مردود گروہ ہیں جو صوفیائے کرام سے منسلک ہو کر اپنی گمراہیوں کا تعلق ان سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ ابی حلمان دمشقی کا اتباع کرتا ہے اور اس کے متعلق ایسی حکایات بیان کرتا ہے جو مصدقہ کتب سے مختلف ہیں۔ اہل تصوف حلمان کو منجملہ صوفیائے کرام سمجھتے ہیں مگر یہ ملحدوں کا گروہ حلول، امتزاج اور تناسخ ارواح کے مسائل اس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ میں نے یہ مقدسی میں پڑھا۔ جس میں ابی حلمان پر اعتراض کیا گیا ہے۔ دیگر علمائے اصول کا بھی یہی زاویہ نظر ہے۔ تاہم اصل حقیقت کا علم صرف باری تعالیٰ کو ہے۔

دوسرا وہ مردود ہے جو اپنی تعلیمات کو فارس سے منسوب کرتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ طریق حسین بن منصور (حلاج) کا ہے مگر حلاج کا اتباع کرنے والوں میں صرف فارس ہی اس چیز کا مدعی ہے۔ میں نے ابو جعفر صیدلانی سے ملاقات کی۔ ان کے چار ہزار مرید جو سب کے سب حلاجی تھے عراق میں پھیلے ہوئے تھے، سب کے سب فارس کو ملعون سمجھتے تھے علاوہ ازیں حلاج کی اپنی تصنیفات میں بجز صحیح کے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کہ فارس اور حلمان کون تھے اور انہوں نے کیا کہا؟ جو کوئی بھی کسی ایسی چیز کا قائل ہو جو توحید اور تصوف کے منافی ہے وہ دین سے بے بہرہ ہے۔ دین جڑ ہے۔ اگر جڑ کمزور ہے تو تصوف جسکی حیثیت شاخ کی ہے کبھی مضبوط نہیں ہو سکتا۔ کرامت، کشف اور معجزہ صرف اہل دین اور اہل توحید کے لئے ہیں۔ یہ غلط انگاری روح کے معاملے میں ہے اور میں اب روح سے متعلق جملہ احکام قانون سنت و مقالات کے مطابق بیان کرتا ہوں اور ملحدوں کی اغلاط اور ان کے شبہات کا ذکر کرتا ہوں تاکہ تیرے ایمان کو تقویت ہو۔

بیان روح

معلوم ہونا چاہئے کہ روح سے متعلق علم کی ضرورت ہے مگر اس کی ماہیت سمجھنے سے عقل

انسانی عاجز ہے۔ علماء، حکماء اور حکیمان امت نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس موضوع پر قیاس آرائی کی ہے۔ اکثر کفار نے بھی روح کو موضوع بحث بنایا ہے۔ جب کفار قریش نے یہودیوں کی انگیخت پر نضر بن حارث کو رسول اللہ ﷺ کے پاس کیفیت روح کی نسبت سوال کرنے کے لئے بھیجا تو حق تعالیٰ نے پہلے ازراہ اثبات حقیقت روح فرمایا، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (الاسراء:85) ''وہ لوگ آپ ﷺ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔'' اور پھر قدم روح کی نفی کرتے ہوئے فرمایا، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (اسرائیل:85) ''آپ فرمادیں کہ روح امر ربی ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا، اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ(1) ''ارواح کی مثال لشکروں کی سی ہے جو ایک جگہ مجتمع ہوں متعارف روحوں میں اتفاق اور غیر متعارف میں اختلاف ہوتا ہے۔'' اسی طرح حقیقت روح کے اثبات پر بہت سے اقوال ہیں مگر ماہیت روح سے متعلق کوئی ثقہ چیز موجود نہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے: روح ایک حیات ہے جس سے جسم زندہ ہیں۔'' متکلمین بیشتر اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق روح کی حیثیت ''عرض'' کی ہے جو فرمان خداوندی کے تحت جسم کو زندہ رکھتا ہے جو جنس تالیف اور حرکت اجتماع کا باعث ہے اور ان تمام عرضی صفات کا موجب ہے جو جسم کو مختلف صورتوں میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے: ''روح حیات نہیں اگرچہ حیات اس کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جسم کی عدم موجودگی میں روح کا ہونا ممکن نہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے جیسے درد اور درد کے علم کا۔'' اس حیثیت سے روح کو زندگی کی طرح ''عرض'' ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

بیشتر اہل سنت والجماعت اور جمہور مشائخ کے مطابق روح بذات خود ایک حقیقت ہے، صفت نہیں۔ جب تک جسم میں موجود ہے حکم خداوندی سے حیات آفریں ہے۔ زندگی آدمی کی صفت ہے اور اس سے زندہ ہے۔ روح جسم میں ودیعت ہے روح جدا بھی ہوجائے

1۔ بخاری: الأدب المفرد

تو وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ عالم خواب میں روح موجود نہیں ہوتی مگر انسان زندہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روح کی عدم موجودگی میں عقل وعلم مفقود ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''شہیدوں کی روحیں پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں''۔ یہ عین ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے ارواح کو لشکر کہا۔ لشکر باقی ہوتے ہیں۔ عرض کو بقا نہیں۔ عرض خود بخود قائم نہیں ہوتا۔ روح ایک جسم لطیف ہے جو بحکم خداوندی آتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''میں نے شب معراج آدم صفی اللہ، یوسف صدیق، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ اور ابراہیم صلوٰۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آسمانوں پر دیکھا''۔ یقیناً یہ ان کی روحیں ہوں گی۔ اگر روح ''عرض'' ہی ہوتی تو بذات خود قائم ہو کر نظر نہ آتی۔ کیونکہ دکھائی دینے کے لئے جوہر (محل) کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ ''جوہر'' یا محل روح جس کا ''عرض'' ہو۔ لامحالہ ''جوہر'' لطیف نہیں بلکہ کثیف ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ روح جسم ہے اور جسم لطیف رکھتی ہے۔ جسیم ہونے کی وجہ سے نظر آسکتی ہے مگر صرف چشم دل کو بقول پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: روحیں پرندوں کے اندر رہ سکتی ہیں اور ان کو لشکروں کی مثال کہا جا سکتا ہے۔

یہاں ہمیں اختلاف ہے ان ملحدوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ روح قدیم ہے۔ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کو ہر چیز کا فاعل اور مدبر سمجھتے ہیں۔ خدائے لم یزل کی طرح اس کو غیر مخلوق تصور کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جس قدر خلقت اس گمراہی میں مبتلا ہے شاید ہی کسی اور گمراہی میں ہوئی ہو۔ یہ عقیدہ عیسائیوں کا ہے گو وہ بیان کرتے وقت مختلف انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔ ہند، تبت، چین ماچین میں یہی عقیدہ مروج ہے۔ شیعہ، قرامطہ، اور باطنیہ کا بھی اسی پر اجماع ہے۔ مذکورہ بالا دو باطل گروہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان راہ گم کردہ جماعتوں کے چند مفروضات ہیں جن کی بناء پر وہ دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔ میں ان سے ایک سوال کرتا ہوں۔ ''قدم سے تمہاری مراد کیا ہے؟ اس کا مطلب محدث قبل از وجود ہے یا قدیم

ازلی ہے؟ اگر مطلب ''محدث قبل از وجود'' ہے تو اصولاً کوئی فرق نہ رہا۔ کیونکہ ہم بھی روح کو ایسا محدث سمجھتے ہیں جس کا وجود شخصی وجود سے پہلے معرض وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا، یقیناً اللہ تعالیٰ عزوجل نے ارواح کو اجساد سے پہلے پیدا کیا۔'' روح ایک قسم کی مخلوق خدا ہے وہ اسے ایک دوسری قسم کی مخلوق سے پیوند کر دیتا ہے اور اس طرح پیوند کرنے میں اپنی قدرت سے زندگی پیدا کرتا ہے مگر روح ایک جسمانی قالب سے دوسرے جسمانی قالب میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس طرح جسم کے لئے دو زندگیاں نہیں ہو سکتیں روح کے لئے دو جسم نہیں ہو سکتے۔ اگر اس حقیقت پر پیغمبر ﷺ کی احادیث ناطق نہ ہوتیں اور پیغمبر ﷺ کی صداقت مسلمہ نہ ہوتی تو عقلی نقطۂ نظر سے روح کو صرف زندگی کہا جا سکتا۔ اس کی حیثیت ایک صفت کی ہوتی اور وہ غیبی حیثیت سے خارج سمجھی جاتی۔

اگر یہ لوگ میرے سوال کے جواب میں یہ کہیں کہ قدم سے ان کا مطلب ''قدم ازلی'' ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ قدم بذات خود قائم ہے یا کسی اور چیز کے سہارے؟ اگر جواب یہ ہے کہ قدم سے مراد وہ قدیم ہے جو بذات خود قائم ہے تو میں پوچھتا ہوں کیا وہ خداوند عالم ہے؟ اگر جواب یہ ہے کہ وہ خداوند عالم نہیں تو یہ ایک اور قدیم ثبوت ہے۔ یہ صورت نامعقول ہے کہ قدیم محدود ہو اور ایک قدیم کا وجود اور اس کی ذات دوسرے قدیم کی حد ہو کر رہ جائے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ان کے تصور کا ''بذات خود قائم'' قدیم خداوند عالم ہے تو میں کہوں گا خداوند عالم قدیم ہے اور مخلوق محدث یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قدیم محدث سے پیوند ہو جائے۔ اس سے امتزاج یا اتحاد پیدا کرے یا اس میں حلول کر جائے۔ نہ محدث حامل قدیم ہو سکتا ہے اور نہ قدیم حامل محدث۔ ہر چیز اپنی جنس سے پیوند ہوا کرتی ہے۔ وصل و فصل محدثات کے لئے ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ ''قدم'' سے مراد وہ قدیم ہے جو بذات خود نہیں بلکہ کسی اور چیز کے سہارے قائم ہے تو اس صورت میں روح یا ''صفت'' ہو سکتی ہے یا ''عرض۔'' اگر ''عرض'' ہے تو یا اس کا کوئی محل ہے یا وہ لامحل ہے۔ اگر محل ہے تو محل کی ماہیت بھی وہی ہونی چاہئے جو

اس کی ہے یعنی دونوں میں سے کوئی بھی قدیم نہیں۔ لامحل ہونے کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے کیونکہ ''عرض'' بغیر محل نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ یہ کہیں کہ روح ایک ''صفت قدیم'' ہے (یہ حلولیہ اور اہل تناسخ کا مذہب ہے۔) تو میں کہوں گا کہ حق تعالیٰ کی کوئی صفت قدیم اس کی مخلوق کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر حیات حق صفات خلق میں شمار ہو سکتی ہے تو اس کی قدرت بھی خلق ہونی چاہئے۔ رابطہ صفت و موصوف صرف اسی صورت میں قائم سمجھا جا سکتا ہے مگر قدیم کو محدث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس معاملے میں ملحدوں کے اقوال باطل ہیں۔ روح مخلوق ہے۔ تابع فرمان حق ہے اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والے صریحاً غلط راستے پر ہیں اور قدم و حدوث میں تمیز نہیں کر سکتے۔ کوئی ولی اگر اس کی ولایت صحیح ہے صفات خداوندی سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بدعات اور خطرات سے محفوظ فرمایا۔ ہمیں عقل ارزاں فرمائی جس کے ساتھ ہم نے غور و استدلال کیا۔ ہمیں ایمان عطا فرمایا جس کے ساتھ ہم نے اسے پہچانا۔ حمد اسی کے لئے ہے اور حمد بھی بے حد، بے انتہا کیونکہ محدود حمد اس کی لامتناہی نعمتوں کے مقابل مقبول نہیں ہو سکتی۔

جب ظاہر بین لوگوں نے اس قسم کی حکایات اہل اصول سے سنیں تو خیال کیا کہ سب اہل تصوف کا یہی عقیدہ ہے۔ وہ سخت غلطی کا شکار ہوئے اور انہیں صریح دھوکا ہوا۔ علم تصوف کا نور ان سے مستور رہا۔ اولیائے اللہ کا جمال ان سے روپوش رہا۔ نور حق کی چمک انہیں نظر نہ آ سکی۔ یہ یاد رہے کہ بزرگان حق اور سادات قوم کے لئے عوام الناس کا رد و قبول یکساں حیثیت رکھتا ہے۔

فصل: ارواح کے مقامات

مشائخ میں سے ایک بزرگ کا قول ہے: ''روح جسم میں اس طرح ہے جیسے کوئلے کے اندر آگ۔ آگ مخلوق ہے اور کوئلہ مصنوعی چیز۔'' قدم صرف ذات حق کے لئے ہے۔ ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے روح سے متعلق بہت کچھ کہا ہے بقول ان کے ارواح کے لئے

دس مقامات ہیں۔

۱۔ مخلصین کی ارواح ظلمت میں مقید ہیں اور اپنے انجام سے ناواقف ہیں۔

۲۔ پارساؤں کی ارواح کا مقام آسمانوں پر ہے اور وہ اپنے اعمال کے اجر پر خوش ہیں اپنی طاعت سے مطمئن ہیں اور اسی کی قوت سے گامزن ہیں۔

۳۔ مریدان صادق کی ارواح چوتھے آسمان پر لذت صدق اور اپنے سایہ اعمال میں ملائکہ کے ساتھ ہیں۔

۴۔ اہل مروت واحسان کی ارواح عرش کی نورانی شمعوں میں ہیں۔ رحمت حق ان کی غذا اور لطف وقربت حق ان کا شرب ہے۔

۵۔ اہل وفا کی ارواح صفا کے پردوں میں بلندی کے مقام پر خوش وخرم ہیں۔

۶۔ شہداء کی ارواح باغ جنان میں طیور کے پوٹوں میں مقیم ہیں اور ہر جگہ آزادی کے ساتھ اڑتی پھرتی ہیں۔

۷۔ مشتاقوں کی ارواح انوار صفات کے پردوں میں بساط ادب پر قیام پذیر ہیں۔

۸۔ عارفوں کی ارواح جو قرب حق میں صبح ومسا کلام حق سے گوش آسودہ ہیں اور دنیا وجنت میں ان کا مقام ان کی نظر کے سامنے ہے۔

۹۔ دوستوں کی ارواح مشاہدہ جمال میں مقام کشف پر مستغرق ہیں بجز حق کے ان کی کوئی آرزو نہیں اور بجز حق کے انہیں کسی چیز سے اطمینان نہیں۔

۱۰۔ درویشوں کی ارواح مقام فنا پر قرار پذیر ہیں۔ ان کے اوصاف واحوال مبدل ہو چکے ہیں۔

مشائخ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ارواح کو متشکل دیکھا ہے۔ یہ ممکن ہے کیونکہ جیسے اوپر بیان ہوا ہے کہ روح موجود ہے اور جسیم ہے خدا جس شکل میں چاہے دکھا سکتا ہے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ ہماری زندگی حق تعالیٰ کی عطا ہے۔ پائندگی صرف اسی ذات پاک کے لئے ہے۔ ہمیں زندہ رکھنا فعل حق ہے ہم اسکی قدرت سے

بحیثیت مخلوق زندہ ہیں۔ اس کی ذات، صفات میں شامل نہیں روحیان کی تعلیم قطعاً باطل ہے۔ قدم روح کا عقیدہ صریح غلطی ہے اور اس گمراہی میں صرف غلط رو مبتلا ہوتے ہیں۔ مختلف الفاظ تراشی محض الحاد کو چھپانے کے لئے کی جاتی ہے۔ روح و مادہ، نور و ظلمت یا بھٹکے ہوئے گروہ صوفیاء کی اصطلاحات فنا و بقا، جمع و تفرقہ سب کفر و الحاد کو لپیٹ کر پیش کرنے کا ذریعہ اظہار ہیں صحیح تصوف کے علمبرداران سے بیزار ہیں کیونکہ اثبات ولایت اور محبت حق کی حقیقت کا انحصار معرفت پر ہے۔ جو قدم و حدوث میں تمیز نہیں کر سکتا وہ محض مجہولانہ گفتار کا مرتکب ہوتا ہے اور اہل دانش جہلاء کی گفتگو پر کان نہیں دھرا کرتے۔ ان دو باطل گروہوں سے متعلق جو ضروری تھا بیان کر دیا اگر کچھ اس سے زیادہ چاہیے تو میری دوسری کتابوں میں تلاش کریں۔ اس جگہ ہمارا مقصد کتاب کو طول دینا نہیں۔

اب میں کشف حجابات کی طرف توجہ دیتا ہوں اور اہل تصوف کے معاملات حقائق و براہین ظاہرہ کی روشنی میں بیان کرتا ہوں تاکہ حصول مقصد کا راستہ ہموار ہو جائے اور وہ منکر لوگ جو صاحب بصیرت ہوں راہ راست پر آئیں۔ میرے لئے دعا کریں تاکہ مجھے ثواب ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ

پہلا کشف حجاب، معرفت حق

حق تعالیٰ نے فرمایا، مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (الانعام:91) ''اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا، لَوْ عَرَفْتُمُ اللّٰهَ حَقَّ مَعْرَفَتِهٖ لَمَشَيْتُمْ عَلَى الْبُحُوْرِ وَ زُلْزِلَتْ بِدُعَائِكُمُ الْجِبَالُ(1) ''اگر تم خدا کو جاننے کی طرح جانو تو پانی پر چل سکتے ہو اور پہاڑ تمہارے حکم پر حرکت میں آ سکتے ہیں۔''

معرفت حق کی دو صورتیں ہیں: ۱۔ معرفت علمی، ۲۔ معرفت حالی

معرفت علمی دنیا و عقبیٰ کی تمام نیکیوں کی بنیاد ہے اور آدمی کے لئے ہر حال میں اور ہر مقام پر اہم ترین چیز ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا

1۔ حلیۃ الاولیاء، علی متقی: کنز العمال

لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ (الذاریات) ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا۔'' یعنی یہ کہ وہ مجھے پہچانیں۔ بیشتر لوگ اس فرض سے غافل رہتے ہیں۔ صرف وہی لوگ بروئے کار آتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ منتخب فرمائے اور جن کے دلوں کو وہ اپنے نور سے منور کر دے اور جو اس کے فضل و کرم سے دنیا کی تاریکیوں سے نجات پالیں جس طرح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے لئے باری تعالیٰ نے فرمایا، وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (الانعام:122) ''ہم نے اس کے لئے نور بنایا جس میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے۔'' اور كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ (الانعام:122) ''اور کیا وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو ظلمت میں ہے۔'' یعنی ابو جہل لعنتہ اللہ علیہ۔ معرفت دل کی حیات ہے اور ماسوی اللہ سے منہ پھیرنے کا نام ہے۔ ہر شخص کی قدر و قیمت معرفت سے ہے اور بغیر معرفت کوئی شخص قابل منزلت نہیں۔

علماء اور فقہاء خداوند عز و جل کے صحیح علم کو معرفت کہتے ہیں۔ اہل تصوف صحت حال کو معرفت کا نام دیتے ہیں اور اسی بناء پر معرفت کو علم سے فاضل تر سمجھتے ہیں کیونکہ صحت حال بجز صحت علم کے نہیں ہوتی مگر صحت علم صحت حال کی ضامن نہیں ہوتی۔ یعنی عارف عارف ہی نہیں ہوتا جب تک وہ عالم حق نہ ہو مگر یہ ہوسکتا ہے کہ عالم عارف نہ ہو۔ جو اس نکتہ سے نابلد تھے باہم بے کار مناظرے کرتے رہے اور ایک دوسرے کی تردید کرتے رہے اب میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہوں تاکہ دونوں گروہ مستفید ہوسکیں۔ انشاء اللہ العزیز

فصل: معرفت اور علم

خدا تجھے سعادت دے تو یہ چیز سمجھ کہ لوگوں میں معرفت حق اور صحت علم کے معاملے میں بہت اختلاف ہے۔ معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ معرفت حق کی بنیاد عقل پر ہے اور بدون عقل کے معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ دیوانے جو حلقہ اسلام میں ہوں، معرفت کے حامل ہوسکتے ہیں اور بچے جو عاقل نہ ہوں صاحب ایمان تصور ہوسکتے ہیں۔ اگر معرفت کی کسوٹی عقل ہی ہو تو ان کو معرفت کا اہل قرار نہیں دیا جاسکتا اور اسی طرح

صاحب عقل کفار دائرہ کفر میں نہیں رہ سکتے۔ اگر عقل ہی معرفت کی علت ہوتی تو چاہئے تھا کہ ہر صاحب عقل عارف ہوتا اور ہر بے عقل معرفت حق سے عاری ہوتا مگر یہ بین طور پر مضحکہ خیز بات ہے۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ معرفت حق کی علت استدلال ہے اور سوائے استدلالیوں کے کوئی معرفت حق سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا۔ یہ قول بھی باطل ہے۔ ابلیس کو دیکھو کہ بہشت، دوزخ، عرش، کرسی اور دیگر آیات دیکھنے کے باوجود معرفت سے بے نصیب رہا۔ باری تعالیٰ نے فرمایا، وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (الانعام:111) ''اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیں اور مردوں کو تکلم دے دیں ہر شے کا حشر ان کے روبرو بیان کر دیں اور وہ ایمان نہیں لائیں گے بجز ایمائے حق کے۔''

اگر ان چیزوں کی رویت اور استدلال علت معرفت حق ہوتا تو باری تعالیٰ ایمائے حق پر حصر نہ کرتا۔ اہل سنت و جماعت کے نزدیک صحت عقل اور رویت آیت معرفت کا سبب ہو سکتے ہیں علت نہیں ہو سکتے۔ علت صرف مشیت ایزدی ہے کیونکہ اس کی عنایت کے بغیر عقل اندھی ہے۔ عقل کو خود اپنا علم نہیں کسی اور کا علم تو در کنار۔ ہر قسم کے ملحد استدلال کو بروئے کار لاتے ہیں اور بیشتر معرفت حق سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مشیت حق شامل حال ہو تو بندگان حق کی سب حرکات نشان معرفت ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا استدلال ''طلب'' اور ترک استدلال ''تسلیم'' ہوتا ہے۔ کمال معرفت کیلئے تسلیم، طلب سے بہتر نہیں کیونکہ طلب کے اصول کو کسی حالت میں بھی پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا اور ''تسلیم'' اصولاً فقدان اضطراب کی دلیل ہے۔ تاہم یاد رہے کہ ان دو اصولوں کی حقیقت بھی معرفت نہیں۔ صحیح رہنما اور دل کشا صرف ذات حق ہے۔ عقل و دلائل کا وجود امکان ہدایت کو روبکار نہیں لاتا۔ اس کی واضح تر دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے فرمایا، وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام:28) ''اگر کفار (بار دیگر بھی دنیا میں آجائیں) تو (اپنے کفر کی طرف ہی) لوٹیں

گے جس سے انہیں روکا گیا۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے معرفت سے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "میں نے اللہ کو اللہ سے پہچانا اور جو ماسویٰ اللہ تھا اسے اللہ کے نور سے دیکھا۔" اللہ نے جسم کی تخلیق کی اور اس کی زندگی روح کے سپرد کر دی۔ اس نے دل پیدا کیا اور اس کی زندگی کو اپنی تحویل میں رکھا۔ جب عقل، انسانی صفات اور آیات جسم کو زندگی نہیں دے سکتیں روح کو زندگی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا، اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام:122) "جو مردہ تھا اسے ہم نے زندہ کیا۔" یہاں حیات کو اپنی طرف منسوب کیا۔ پھر فرمایا، وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (الانعام:122) "ہم نے اس کے لئے نور بنایا جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا ہے۔" یعنی نور کا پیدا کرنے والا میں ہوں۔ پھر فرمایا، اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الزمر:22) "جس کا سینہ اسلام کے لئے کھولا وہ اپنے رب کی طرف سے نور میں ہے۔" دل کے کھولنے اور بند کرنے کو بھی اپنی طرف نسبت دی اور فرمایا، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ:6) "ان کے دلوں اور ان کے کانوں کو سر بمہر کر دیا اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔" پھر فرمایا: وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف:28) "اور اس کا اتباع مت کرو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔"

پس ثابت ہوا کہ دل کی بست وکشاد، شرح اور ختم باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ قطعاً محال ہے کہ اس کے سوا کوئی رہنما ہو۔ جو کچھ ماسویٰ اللہ ہے وہ علت اور سبب سے زیادہ نہیں اور علت اور سبب بجز رضائے مسبب کے رہنما نہیں ہو سکتے۔ حجاب کی حیثیت رہزن کی ہوتی ہے، رہنما کی نہیں۔ نیز باری تعالیٰ نے فرمایا، وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:7) "اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کیا۔" یہاں زینت اور محبت کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ تقویٰ عائد ہونا جسے حقیقت معرفت کہنا چاہئے اسی کی عطا ہے۔ متقی کو راہ تقویٰ اختیار کرنے

یا چھوڑ دینے پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی تعریف وتوصیف کے سوا معرفت کا حصہ انسان کے لیے بجز عجز کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس کے سوا کوئی دلوں کا رہبر نہیں۔ طلب علم صرف صحت بندگی کیلئے ہے۔'' یادرکھو مخلوقات میں کسی کو طاقت نہیں کہ حق تعالیٰ تک رسائی بہم پہنچا سکے۔ استدلال پر تکیہ کرنے والے ابوطالب سے زیادہ صاحب فہم نہیں ہو سکتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی رہنما نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ ابوطالب کی شقاوت کا حکم لگ چکا تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی سے وہ مستفید نہ ہو سکے۔ استدلال کا پہلا قدم خدا سے روگردانی ہے۔ کیونکہ پہلے خیال غیر اللہ کی طرف جاتا ہے۔ برخلاف اس کے معرفت ماسویٰ اللہ سے کلیتہً منہ پھیر لینے کا نام ہے بالعموم ہر مطلوب شے استدلال کے دائرے میں سما جاتی ہے مگر معرفت حق عمومی مطلوبات میں شامل نہیں۔ معرفت عقل کی لامتناہی حیرت سے حاصل ہوتی ہے۔ انسانی اکتساب کو اس میں دخل نہیں۔ بجز ذات حق کے کوئی رہنما نہیں۔ معرفت شرح قلوب ہے اور خزانہ غیب سے ملتی ہے۔ ہر غیر اللہ چیز محدث ہے۔ ایک محدث دوسرے محدث کو پا سکتا ہے مگر خالق کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ جب کوئی چیز حاصل کرنے والا غالب سمجھا جاتا ہے اور حاصل کو مغلوب خیال کیا جاتا ہے تو کوئی کرامت نہیں کہ عقل استدلال سے مستدل کے وجود کو غافل ثابت کردے۔ کرامت یہ ہے کہ ولی نور حق کے سامنے اپنی ہستی کی نفی کرے پہلی صورت میں معرفت صرف منطق ہے۔ دوسری صورت میں دلی کیفیت ہے۔

عقل کو معرفت کی علت سمجھنے والوں کو دیکھنا چاہئے کہ عقل ان کے دل میں حقیقت معرفت کا کیا تصور پیدا کرتی ہے؟ معرفت دراصل ہر اس چیز کی نفی ہے جسے عقل ثابت کرے یعنی ذات حق ہر اس تصور سے بالاتر ہے جو عقل کے دائرہ امکان میں آسکے۔ ان حالات میں عقل کا استدلال کس طرح ذریعہ معرفت بن سکتا ہے؟ عقل اور وہم دونوں ہم جنس ہیں اور جہاں جنس ثابت ہوئی معرفت کی نفی ہوگئی۔ عقلی دلائل سے خدا کی ہستی کو ثابت کرنا تشبیہ سے زیادہ نہیں اور اسی قسم کی منطق سے اس کا انکار کرنا تعطیل کے برابر ہے۔ عقل

ان دونوں صورتوں سے باہر نہیں جاسکتی اور دونوں صورتیں معرفت کے معاملے میں انکار حقیقت کے برابر ہیں کیونکہ مشبہ اور معطلہ دونوں غیر موحد ہیں۔

جب عقل امکانی کوشش کر چکتی ہے اور اس کے چاہنے والوں کو اس کی تلاش کا سودا دامن گیر ہوتا ہے تو وہ درگاہ عجز پر سرنگوں ٹھہر جاتے ہیں۔ مضطرب الحال ہو کر گریہ وزاری سے دست طلب دراز کرتے ہیں اور دلہائے مجروح کے لئے مرہم کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ حتی المقدور کوشش کر کے تھک جاتے ہیں تو قدرت حق ان کی ہمت افزائی کرتی ہے اور وہ اس کی عنایت سے اس کا راستہ پالیتے ہیں۔ اذیت فراق ختم ہو جاتی ہے اور وہ ریاض معرفت میں باریاب ہو کر آسودہ ہو جاتے ہیں۔ جب عقل دلوں کو اس طرح کامران اور بامراد دیکھتی ہے تو اپنا تصرف کرنا چاہتی ہے مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ناکام ہو کر متحیر ہوتی ہے متحیر ہو کر بے کار ہو جاتی ہے جب بے کار ہو جائے تو حق تعالیٰ اسے لباس بندگی پہنا کر فرماتا ہے۔ ”تو جب تک آزاد تھی اپنے تصرف اور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مستور تھی۔ جب تیرا تصرف اور تیری طاقت لوٹ گئی تجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ناکام ہو کر تجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔“ پس دل کو قرابت اور عقل کو بندگی نصیب ہوئی۔ حق تعالیٰ انسان کو اپنی معرفت خود عطا کرتا ہے اور یہ معرفت کسی انسانی طاقت سے منسلک نہیں ہوتی۔ انسان کے اپنی حیثیت سراسر بے حقیقت ہوتی ہے۔ اہل معرفت کے لئے خودستائی خیانت کے برابر ہے۔ وہ یادحق سے کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتے ان کا ہر لحہ مقدس ہوتا ہے۔ معرفت ان کے لئے خالی لفظ تراشی نہیں بلکہ صحیح کیفیت قلبی ہوتی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو معرفت کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ معرفت کی صداقت و بطلان کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور اہل الہام کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک کہتا ہے میں الہاماً جانتا ہوں کہ حق تعالیٰ ”مکان“ میں محدود ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں الہاماً سمجھتا ہوں کہ وہ ”لامکان“ ہے۔ ان میں صرف ایک بات درست ہو سکتی ہے دونوں طرف الہام کے مدعی ہیں۔ فرق سمجھنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل کا

سہارا الہام کا بطلان ہے۔ یہ عقیدہ براہمہ اور الہامیہ کا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اس زمانے کے کچھ لوگ اس معاملے میں نہایت درجہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور پارسائی کا جامہ پہنے پھرتے ہیں سب گمراہ ہیں اور ان کا عقیدہ ہر صاحب عقل کے لئے کافر ہو یا مسلمان، قابل مذمت ہے۔ دس مدعیان الہام دس متناقض چیزوں کا دعویٰ کرتے ہیں ایک ہی بات پر سب غلط ہوتے ہیں اور کسی میں ذرہ برابر صداقت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ الہام وہی ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو تو کہنے والا سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ جب حکم شریعت ہی الہام کے صدق و کذب کی کسوٹی ہے تو معرفت کے شرعی، نبوتی اور ہدائتی، الہامی ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو معرفت کو فطری (ضروری) سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے اگر معرفت فطری طور پر حاصل ہو سکتی تو سب اہل دانش کو برابر طور پر اہل معرفت ہونا چاہئے تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے اہل دانش حق تعالیٰ کی ہستی ہی کے منکر ہیں اور شبیہ اور تعطیل ایسے عقائد کے علمبردار ہیں۔ علاوہ ازیں اگر معرفت حق تعالیٰ فطری (ضروری) ہوتی تو ''تکلیف'' بے کار تھی۔ کیونکہ جب کسی چیز کا علم فطری (ضروری) ہو تو اس کی معرفت کے معاملے میں تکلیف چہ معنی دارد۔ انسان کا اپنی ذات سے متعلق علم، آسمان اور زمین، دن اور رات، مسرت اور غم وغیرہ کا علم ایسا ہے جس سے کوئی ذی شعور بے بہرہ نہیں ہو سکتا۔ اور کسی کو بھی اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی چاہے بھی کہ ان چیزوں کے علم سے منہ پھیر لے تو نہیں پھیر سکتا۔ البتہ کچھ صوفیائے کرام نے اپنے ایقان کے پیش نظر معرفت حق کو فطری (ضروری) قرار دیا ہے۔ ان کے دلوں میں کوئی شک یا وسوسہ موجود نہ تھا۔ انہوں نے اپنے یقین کا نام ضرورت (فطرت) رکھ دیا۔ بنیادی طور پر وہ غلط نہیں تھے مگر عبارتاً خطا کر گئے کیونکہ فطری (ضروری) علم صرف ایک طبقے کے لئے مختص نہیں ہو سکتا۔ تمام اہل دانش کی حیثیت یکساں تسلیم کرنا پڑے گی۔ علاوہ ازیں فطری (ضروری) علم دل میں بے سبب و بے دلیل پیدا ہوتا ہے اور معرفت حق بلا سبب حاصل نہیں ہوتی۔

استاد ابوعلی دقاق، شیخ ابوسہل صعلوکی اور آپ کے والد جو نیشاپور کے رئیس اور امام تھے، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ابتدائے معرفت کی بنیاد استدلال ہے اور انتہائے معرفت فطری (ضروری) ہو جاتی ہے جیسے کہ فنی وصنعتی علم شروع میں اکتسابی ہوتا ہے اور بالآخر فطری (ضروری) ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہشت میں معرفت حق فطری (ضروری) ہوگی اگر وہاں ضروری ہوگی تو کیا وجہ ہے کہ اس دنیا میں ضروری نہ ہو۔ پیغمبران صلوات اللہ علیہم نے جب پیام حق سنا بالواسطہ یا بلاواسطہ تو اسے فطری (ضروری) سمجھا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل بہشت کی معرفت فطری ہوگی۔ کیونکہ وہاں شرعی تکلیف کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ پیغمبران صلوات اللہ علیہم مامون العاقبت ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ سے ان کا سلسلہ منقطع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا اس لئے ان کے لئے معرفت اہل بہشت کی طرح فطری (ضروری) ہوتی ہے۔

ایمان اور معرفت کی خوبی یہ ہے کہ ان کا تعلق (غیب) سے ہوتا ہے اگر مدعائے ایمان ومعرفت سامنے ہے تو ''جبر'' کی صورت پیدا ہوگئی اور ''اختیار'' معدوم ہو گیا۔ شرعی احکام کی کوئی وقعت نہ رہی۔ اصول الحاد معطل ہو گیا۔ بلعم باعور، ابلیس اور برصیما کی تکفیر بے معنی ہوگئی۔ کیونکہ وہ عارف تو تھے جیسا کہ ابلیس سے متعلق باری تعالیٰ نے بیان فرمایا اور اس کے ردور جم کا ذکر کیا۔ بقول حق تعالیٰ ابلیس نے کہا۔ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۸۲﴾ (ص) ''مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔'' ظاہر ہے کہ مکالمہ معرفت کی سند ہے۔ عارف جب تک عارف ہے حق تعالیٰ سے منقطع نہیں ہوتا۔ منقطع ہونے کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معرفت میں زوال رونما ہو۔ علم ضروری (فطری) میں زوال ناممکن ہے۔

یہ مسئلہ عام لوگوں کے لئے بہت پیچیدہ ہے۔ یہ کافی ہے کہ تو صرف اس قدر ذہن نشین کرلے کہ بندہ کو علم اور معرفت حق بجز ہدایت خداوندی کے حاصل نہیں ہوتی۔ انسان کے دل میں یقین معرفت کم وبیش ہو سکتا ہے مگر حقیقت معرفت کم وبیش نہیں ہوتی کیونکہ کمی اور

بیشی دونوں نقصان معرفت کا پیش خیمہ ہیں۔ کورانہ تقلید کو معرفت حق میں دخل نہیں۔ اس کی شناخت اس کی صفات کمال سے ہوتی ہے اور محض اس کی رعایت اور عنایت سے حاصل ہوتی ہے۔ دلیل اور عقل اسی کی ملکیت ہیں اور ہر چیز پر اسی کا تصرف ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے کسی فعل کو بھی انسان کے لئے دلیل راہ بنا دے اور اسے منزل آشنا کر دے اور اگر چاہے تو اسی فعل کو حجاب کی شکل دے دے اور انسان منزل سے بھٹک جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک جماعت کے لئے رہبر معرفت تھے اور دوسری جماعت کے لئے حجاب معرفت۔ ایک جماعت نے ان کو بندۂ خدا سمجھا اور دوسری نے ابن خدا۔ بت، آفتاب، چاند وغیرہ اسی قبیل میں شامل ہیں۔ کچھ لوگ ان کو دیکھ کر معرفت حق کی راہ پا لیتے ہیں اور کچھ گمراہ ہو جاتے ہیں۔

اگر استدلال ہی معرفت کی بنیاد ہوتا تو ہر منطقی کو عارف ہونا چاہئے تھا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ باری تعالیٰ ایک شخصیت کو چن لیتا ہے اور باقیوں کی رہنمائی اس کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اسی کے سبب منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ رہنما سبب بنتے ہیں علت معرفت نہیں ہوتے۔ مسبب الاسباب کی نظر میں ایک سبب دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا۔ عارف کے لئے اثبات سبب خدا کے لئے عدیل تلاش کرنے کے برابر ہے اور غیر اللہ کی طرف التفات شرک کے مترادف ہے۔ مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ (الاعراف:186) ''جس کو اللہ گمراہی میں مبتلا کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے۔'' جب لوح محفوظ پر رقم ہو کہ کسی شخص کا مقدر بجز شقاوت کے نہیں دلیل و استدلال کس طرح اسے راہ ہدایت پر لا سکتے ہیں۔ جس کسی نے غیر اللہ کی طرف توجہ دی وہ معرفت میں تعدیل کا مرتکب ہوا۔ جو انسان قہر خداوندی میں پراگندہ اور غلطاں ہو اس کی کون رہنمائی کر سکتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام دن کے وقت غار سے باہر نکلے تو انہوں نے کسی چیز کی طرف التفات نہیں کیا حالانکہ دن کی روشنی میں بیشتر براہان و دلائل رونما ہوتے ہیں اور بزرگ صاحب کرامت لوگوں کے لئے بین آیات موجود ہوتے ہیں۔ رات ہوئی تو آپ

نے ستاروں کو دیکھا اگر ان کی معرفت کا انحصار دلائل پر ہوتا تو ظاہر ہے دن کے وقت بیشتر دلائل روبرو تھے۔

مختصر یہ کہ حق تعالیٰ جس کو بھی چاہے جس طرح بھی چاہے اپنا راستہ دکھا دیتا ہے اور اس کے لئے اپنی معرفت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہاں تک کہ معرفت کا وہ مقام میسر آجاتا ہے کہ خود حقیقت معرفت ہی غیر نظر آنے لگتی ہے۔ صفت معرفت آفت ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ معروف سے محجوب ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں حقیقت معرفت کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ معرفت بجائے خود ایک کھوکھلا دعویٰ نظر آتی ہے۔ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''ہوشیار! معرفت کا دعویٰ نہ کر۔''

''عارف معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں میں اقرار جہل کرتا ہوں یہ میری معرفت ہے''۔ تجھے چاہئے کہ معرفت کا دعویٰ نہ کرے مبادا وہ تیری ہلاکت کا باعث بن جائے۔ معرفت کی حقیقت سے تعلق پیدا کرتا کہ تجھے نجات نصیب ہو۔ جب کسی کو جلال حق کے کشف کا اعزاز ملتا ہے تو اس کی ہستی وبال ہو جاتی ہے اور اس کی تمام صفات اس کے لئے آفت کا سرمایہ بن جاتی ہیں جس کا خدا ہو اور وہ خدا کا ہو وہ دونوں عالم کی کسی چیز سے تعلق نہیں رکھتا معرفت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بادشاہی حق تسلیم کی جائے جب اس کی بادشاہت تسلیم ہو اور بادشاہت غیر کے تصرف سے پاک سمجھی جائے تو مخلوق سے کیا تعلق؟ خلقت عارف اور خدا کے درمیان کیوں حائل ہو؟ یہ حائل ہونے والے حجابات جہل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جب جہل اٹھ گیا تو حجاب ختم ہو گئے اور دنیا و عقبیٰ میں کوئی فرق نہ رہا۔

فصل: رموز معرفت

مشائخ کرام رحمہم اللہ نے اس معاملے میں بہت سے رموز بیان فرمائے ہیں۔ میں تیرے حصول فائدہ کے لئے کچھ اقوال بیان کرتا ہوں۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''معرفت کسی چیز پر متعجب نہ ہونے کا نام ہے۔'' کیونکہ تعجب اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کام کرنے والا اپنے مقدور سے تجاوز کر

جائے۔ حق تعالیٰ قادر مطلق ہے اس لئے اس کے کاموں پر صاحب معرفت کو کسی حالت میں تعجب نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ چیز قابل تعجب ہے کہ اس نے ایک مشت خاک کو وہ سرفرازی عطا فرمائی کہ وہ اس کے احکام کے قابل ہو گئی۔ ایک قطرۂ خون کو وہ منزلت عطا کی کہ وہ اس کی محبت اور اس کی معرفت کا ذکر کرنے لگا۔ اس کے دیدار کا طالب اور اس کے قرب کا مشتاق ہوا۔

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''معرفت درحقیقت وہ علم ہے جو حق تعالیٰ اپنے لطائف انوار سے دلوں میں ودیعت کرے۔'' یعنی جب تک حق تعالیٰ اپنی عنایت بے غایت سے انسان کے دل کو روشنی نہیں بخشتا اور اسے آفات سے مصون نہیں فرماتا یہاں تک کہ دنیا و مافیہا کی قدر و قیمت اس کے سامنے رائی کے دانے کے برابر ہو جائے اس وقت تک باطنی اور ظاہری اسرار کے مشاہدے کا غلبہ نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو غیب و شہود کا تفرقہ ختم ہو جاتا ہے۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''معرفت دوام حیرت کا نام ہے۔'' حیرت دو قسم کی ہے: ۱۔ حیرت ہستی سے متعلق ہے، ۲۔ حیرت کیفیت سے متعلق

حیرت ہستی سے متعلق شرک اور کفر کے برابر ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی ہستی سے متعلق عارف کو کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ حیرت کی کیفیت لازماً ہونی چاہئے کیونکہ ذات حق کی کیفیت کو سمجھنا عقل کی مجال سے باہر ہے۔ اس واسطے کسی نے کہا ہے: ''اے متحیر دلوں کے رہنما! میری حیرت کو اور زیادہ کر۔'' یہاں پہلے ہستی حق اور کمال صفات کا اقرار ہے اس بات کے علم کا اظہار ہے کہ اس کی ذات پاک مقصود خلق ہے۔ وہی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے وہی متحیروں کو حیرت دینے والا ہے۔ اس کے بعد زیادتی حیرت کی التجا کی گئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ راہ مطلوب میں عقل کے لئے بجز حیرت و سر گردانی کے کوئی شریک کار اور کوئی مقام نہیں۔ یہ نکتہ نہایت لطیف ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ عرفان ہستی حق انسان کو اپنی ہستی سے متعلق معرض حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ جب بندہ خدا کو پہچانتا ہے،

اپنے آپ کو اس کی قدرت مطلق کے حلقہ اختیار میں دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان کا عدم و وجود سکون و حرکت سب اس کے قبضہ اختیار میں ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور سوچتا ہے: "میں کون ہوں اور کیا ہوں۔" اسی واسطے پیغمبر ﷺ نے فرمایا مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (1) "جس نے اپنے آپ کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا۔" یعنی جسے اپنی فنا کا علم ہوتا ہے اسے بقائے حق کا عرفان ہوتا ہے۔ فنا، عقل اور دیگر انسانی صفات کو ختم کر دیتی ہے اور جب کسی چیز کی حقیقت مفقود ہو جائے تو وہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "معرفت اس بات کا علم ہے کہ انسانی سکون و حرکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔" یعنی اس کے حکم کے بغیر اس کی بادشاہت میں کسی کو دخل نہیں۔ جب تک وہ کسی کام کے کرنے کی توفیق عطا نہ کرے اور دل میں کام کرنے کا ارادہ مرحمت نہ فرمائے کوئی آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ حقیقت اسی کے کرم سے حقیقت ہے۔ اثر اسی سے اثر ہے۔ صفت اسی سے صفت ہے۔ ساکن اسی سے ساکن اور متحرک اسی سے متحرک ہے۔ ہر انسانی فعل مجازی ہے اور حقیقت کو نسبت اسی کی ذات پاک سے ہے۔

محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ عارف کے متعلق فرماتے ہیں: "عارف وہ ہے جس کا کلام مختصر ہو اور حیرت دوامی ہو۔" کیونکہ بیان اسی چیز کا ہو سکتا ہے جو معرض بیان میں آسکے۔ اصولاً بیان ایک حد تک ہی ہو سکتا ہے اور اگر وہ جس کا بیان کرنا مقصود ہے غیر محدود ہے تو محدود بیان کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب بیان سے مقصد حاصل نہ ہو تو انسان بے بس ہوتا ہے اور سوائے دائمی حیرت و استعجاب کے چارہ نہیں رہتا۔

شبلی نے فرمایا: "حقیقی معرفت معرفت حق سے معذوری کا نام ہے۔" جس چیز کے عرفان سے بندہ عاجز ہو اس کے ادراک کا دعویٰ بے کار ہوتا ہے۔ عجز بدون طلب کے ہوتا ہے۔ جب تک طالب خود کو آلہ کار سمجھتا ہے اور صفات بشری پر قائم ہے لفظ "عجز" کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ جب یہ "آلیت و صفات" ختم ہو جائیں تو وہ عجز نہیں بلکہ فنا کا مقام ہوگا۔

1۔ المقاصد الحسنہ

بعض مدعی صفات بشری کا اثبات بھی کرتے ہیں۔ صحت خطاب کی ذمہ داری بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قیام حجت حق کے بھی قائل ہیں اور یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ معرفت عجز ہے۔ ہم عاجز ہو گئے ہیں اور کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ ضلالت اور خسران ہے۔ میں پوچھتا ہوں کس چیز کی طلب میں عاجز ہو گئے ہو۔ ''عجز'' کے دو نشان ہیں اور دونوں میں سے تمہارے پاس ایک بھی نہیں۔ ایک نشان تو طلب اور ذریعہ حصول طلب کی فنا ہے اور دوسرا اظہار تجلی ہے۔ جہاں ذریعہ حصول طلب کی فنا واقع ہو جاتی ہے وہاں عبارت آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عجز پر عبارت آرائی اظہار عجز کے سوا کیا ہوگا؟ جہاں اظہار تجلی ہو وہاں سب نشان مٹ جاتے ہیں اور کوئی تفرقہ باقی نہیں رہتا۔ عاجز یہ نہیں جانتا کہ یہ عاجز ہے اور جو کچھ اس سے منسوب کیا جاتا ہے اس کا نام ''عجز'' ہے ورنہ ''عجز'' بذات خود غیر ہے اور اثبات غیر معرفت نہیں ہوتی۔ جب تک دل میں غیر کے لئے جگہ ہے معرفت صحیح نہیں ہوتی۔ عارف جب تک غیر سے کنارہ کش نہ ہو عارف نہیں ہو سکتا۔

ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''جب مجھے معرفت نصیب ہوئی حق و باطل کا گذر میرے دل میں ختم ہو گیا۔'' جب کوئی ہوس و ہوا میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنے دل کی طرف رجوع کرتا ہے دل اس کی رہنمائی نفس کی طرف کرتا ہے جو محل باطل ہے۔ اسی طرح جب دلیل معرفت میسر آتی ہے انسان دل کی طرف رجوع کرتا ہے اور دل اس کو روح کی طرف لے جاتا ہے جو منبع حق و حقیقت ہے۔ اگر دل میں کسی غیر اللہ کا گذر ہو اور عارف اس کی طرف مائل ہو تو یہ بطلان معرفت ہے۔

القصہ دلیل معرفت کا مقام دل ہے اور اسی طرح ہوس و ہوا کی منزل دل ہے۔ اہل معرفت ہوا و ہوس سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ دل کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ بجز حق کے کسی چیز سے راحت حاصل نہیں کرتے اور ان کا رجوع ہمیشہ دل کی طرف نہیں بلکہ حق کی طرف ہوتا ہے اور یہی شان دلیل معرفت ہے۔ بہت فرق ہے دل کی طرف رجوع کرنے والے میں اور حق کی طرف راجع ہونے والے میں۔

ابو بکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، جس نے حق تعالیٰ کو پہچانا اور ہر چیز سے منقطع ہوا بلکہ گونگا اور مفلوج ہو گیا۔" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ (1) "ہم تیرے اوصاف شمار نہیں کر سکتے۔" جسے معرفت حاصل ہوئی وہ عبارات کے معاملے میں گونگا ہوا اور اپنے سب اوصاف سے فانی ہوا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت غیبت میں عرب کے فصیح ترین سردار تھے۔ چنانچہ فرمایا: "عرب اور عجم میں کوئی میری فصاحت کی برابری نہیں کر سکتا۔" جب آپ حضور حق باریاب ہوئے تو اقرار کیا: "میری زبان کو تیری ثناء ادا کرنے کا یارا نہیں۔" میں کیا کہوں؟ میری زبان معذور ہے۔ میں حال سے بے حال ہوں تو خود ہی میری گفتار ہے۔ اگر میں اپنی طرف خطاب کروں تو میری گفتار ہی میرا حجاب ہے۔ اگر روئے سخن تیری طرف ہو تو تیری قربت کی حقیقت پر حرف آتا ہے۔ کیسے زبان کھولوں۔ حکم ہوا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو ثنا گو ہے۔ میں تمام اجزائے عالم کو تیرا نائب بناتا ہوں کہ وہ میری ثنا کریں اور وہ ثنا تیری طرف سے شمار ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

دوسرا کشف حجاب۔ توحید

باری تعالیٰ نے فرمایا، وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (البقرہ: 163) "تمہارا خدا، خدائے واحد ہے۔" پھر فرمایا، قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (اخلاص) "کہو اللہ واحد ہے۔" نیز فرمایا، لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النحل: 51) "دو معبود نہ ٹھیراؤ۔ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم سے پہلے ایک شخص ہو گذرا ہے۔ اس کا کوئی عمل نیک نہیں تھا مگر وہ توحید پر قائم تھا۔ جب وہ قریب مرگ ہوا تو اہل خانہ سے کہا تم لوگ میری موت کے بعد مجھے جلا ڈالنا اور میری راکھ کو پیس کر جس دن تیز ہوا چلے آدھی دریا میں ڈال دینا اور آدھی ہوا میں اڑا دینا تاکہ میرا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ پس ماندگان نے ایسے ہی کیا۔ باری تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا کہ اس کی راکھ کو روز حشر تک محفوظ رکھیں۔ جب قیامت کے

1۔ صحیح مسلم

روز سالم ہو کر حضور داور پیش ہو گا تو اس سے پوچھا جائے گا۔ ''تو نے ایسا کیوں کیا؟'' عرض کرے گا: ''میں شرم سار تھا۔'' اس کو بخش دیا جائے گا۔

فی الحقیقت توحید کسی چیز کے یگانہ ہونے کا اقرار اور اس کی یگانگی سے متعلق علم ہونے کا نام ہے۔ چونکہ ذات حق ایک ہے۔ اپنی ذات وصفات میں تقسیم سے بالاتر ہے۔ بے مثال ہے۔ لاثانی ہے اور اپنے افعال میں لاشریک ہے۔ موحدوں نے اسے یگانہ سمجھا ہے۔ اس علم یگانگی کو توحید کہتے ہیں۔ توحید کے تین مختلف پہلو ہیں:

۱۔ توحید حق برائے حق یعنی حق تعالیٰ کا علم اپنی یگانگی سے متعلق

۲۔ توحید حق برائے خلق یعنی حکم حق کہ بندہ اس کی توحید کا اقرار کرے اور اس کے دل میں توحید حق کا تصور جاگزین ہو

۳۔ توحید خلق برائے حق یعنی حق تعالیٰ کی وحدانیت سے متعلق مخلوق کا علم

عارف حق وحدانیت کا اقرار کرتا ہے کہ حق تعالیٰ ایک ہے۔ وصل وفصل سے آزاد ہے۔ دوئی اس کے لئے روا نہیں۔ اس کی یگانگی عدد کی نہیں۔ وہ محدود نہیں کہ شش جہات میں گھرا ہوا ہو اور ہر جہت کے لئے ایک اور جہت ہو۔ وہ کسی مکان میں مکین نہیں اگر اس کا مکان ہوتا تو مکان کے لئے بھی مخصوص مکان کی ضرورت تھی اور فعل وفاعل اور قدیم ومحدث کا حکم باطل ہو جاتا ہے۔ وہ عرض نہیں کہ اسے جوہر کی ضرورت ہو۔ وہ جوہر نہیں کہ اپنی قبیل کی کسی اور چیز کا محتاج ہو۔ طبعی نہیں کہ حرکت وسکون کا مبداء ہو۔ روح نہیں کہ جسم کی ضرورت ہو، جسم نہیں کہ اس کی تالیف اجزاء سے ہو۔ وہ کسی چیز میں مدغم نہیں کہ اس چیز کا جزو جنسی بن جائے۔ کسی چیز کو اس سے رشتہ نہیں کہ اس کا جزو بن کر رہ جائے۔ ہر نقصان سے بری ہے۔ ہر نقص سے پاک ہے۔ سب آفات وعیوب سے مصون ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں کہ اپنی مثل سے مل کر دوئی کا مظہر ہو۔ اس کا کوئی فرزند نہیں کہ وہ اصل جد کہلائے۔ اس کی ذات وصفات میں تغیر نہیں کہ اس کا وجود متغیر ہو جائے۔ وہ ان صفات وکمال کا مالک ہے جو اہل معرفت اپنی بصیرت سے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو

اس نے خود بیان فرمائی ہیں۔ وہ بری ہے ان صفات سے جو ملحد اپنی خواہشات کے مطابق اس سے منسوب کرتے ہیں اور جو اس نے خود بیان نہیں فرمائیں۔ حی و علیم ہے۔ رؤف و رحیم ہے۔ مرید و قدیر ہے۔ سمیع و بصیر ہے۔ متکلم و باقی ہے۔ اس کا علم اس کے لئے مقام اور حال نہیں۔ اس کی قدرت و طاقت اس پر سختی سے مسلط نہیں۔ اس کا سمع و بصر تجدد کا محتاج نہیں۔ اس کا کلام اس سے جدا اور کٹا ہوا نہیں۔ وہ اپنی قدیمی صفات پر قائم ہے۔ معلومات اس کے علم سے باہر نہیں۔ موجودات اس کے ارادوں کے سامنے بے چارہ ہیں۔ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ وہی چاہتا ہے جو جانتا ہے۔ کسی مخلوق کو اس کے حضور اختیار نہیں۔ اس کے احکام اٹل ہیں اور اس کے دوستوں کو بجز تسلیم کے چارۂ کار نہیں۔ وہی خیر و شر کی قدریں قائم کرتا ہے۔ امید و بیم اسی سے ہے۔ نفع و ضرر کا خالق وہی ہے۔ صرف اسی کا حکم رواں ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ قضا و قدر کا وہی مالک ہے کوئی اس کے وصل کی خوشبو سے سرفراز نہیں۔ کسی کو اس تک پہنچنے کا یارا نہیں۔ اس کا دیدار اہل بہشت کے لئے ہے۔ اس کے چہرے کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ اسے بالمقابل اور آمنے سامنے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولیاء کے لئے دنیا میں اس کا ''مشاہدہ'' جائز ہے۔ مشاہدے کا انکار صحیح نہیں۔ جو اسے اس طرح سمجھتے ہیں وہ منقطع ہونے والے نہیں اور جو اس کے خلاف سمجھتے ہیں وہ دیانت دار نہیں۔

اس امر میں اور بہت سی اصولی اور وصولی چیزیں ہیں مگر بخوف طوالت اختصار کرتا ہوں۔ میں (علی بن عثمان جلابی) نے اس فصل کے شروع میں کہا تھا کہ توحید کسی چیز کی وحدانیت کے اقرار کا نام ہے۔ اقرار بجز علم کے نہیں ہوسکتا۔ اہل سنت و جماعت نے اقرار وحدانیت کی بنیاد تحقیق پر رکھی۔ ہمارے سامنے کارخانہ کائنات ہے جس میں بے حد و بے شمار بدیع، عجیب اور لطیف چیزیں موجود ہیں۔ یہ از خود معرض وجود میں نہیں آگئیں۔ ہر چیز میں علامات حدث موجود ہیں۔ لامحالہ ان کا کوئی فاعل ہونا چاہئے جس نے ان کو عدم سے وجود کی صورت دی۔ زمین، آسمان، آفتاب، ماہتاب، خشکی، (زمین) سمندر، پہاڑ، صحرا، اشکال،

حرکت، سکون، نطق، موت، حیات الغرض سب چیزوں کے لئے صنعت گر لازمی ہے اور صنعت گر بھی دو تین نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک حی، ایک عالم قادر، لاشریک، شرکائے کار سے بے نیاز صانع کامل ہو سکتا ہے۔ فعل کے لئے صرف ایک فاعل ہونا چاہئے۔ اگر ایک سے زائد فاعل ہوں تو ایک دوسرے کے دست نگر ہوں گے۔ بے شک، بلاریب، باہمہ علم الیقین صرف ایک فاعل ہو سکتا ہے۔ یہاں ہمیں اختلاف ہے ثنویوں سے جو اثبات نور وظلمت کرتے ہیں۔ گبر پرستوں سے جو اثبات یزداں و اہرمن میں مبتلا ہیں۔ طباعیوں سے جو اثبات طبیعت کے دلدادہ ہیں۔ فلکیوں سے جنہیں اثبات ہفت ستارہ کی دھن ہے۔ معتزلیوں سے جو کئی خالق اور کئی صانع مانتے ہیں۔ میں نے سب کے رد میں مختصر دلیل سے کام لیا ہے کیونکہ اس کتاب میں ان کی جملہ بکواس پر تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ طالب علم کو اس مسئلہ پر مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے میری ایک دوسری کتاب "الرعایۃ بحقوق اللہ" سے استفادہ کرنا چاہئے یا دیگر متقدمین کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اب میں وہ رموز بیان کرتا ہوں جو توحید کے بارے میں مشائخ کبار سے مروی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ

فصل: رموز توحید

مشہور ہے کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "توحید قدیم کو حوادث سے جدا رکھنے کا نام ہے"۔ "قدیم" محل حوادث نہیں سمجھنا چاہئے اور حوادث محل قدیم نہیں ہو سکتے۔ صرف ذات حق قدیم ہے ہم محدث ہیں۔ ہماری کوئی چیز اس سے پیوند نہیں ہو سکتی اور اس کی کسی صفت کو ہم جذب نہیں کر سکتے۔ قدیم کو محدث سے کوئی جنسیت نہیں۔ قدیم وجود حوادث سے پہلے تھا اور جس طرح اسے حوادث کے وجود سے قبل حوادث سے کوئی تعلق نہ تھا اسی طرح حوادث کا وجود ختم ہونے کے بعد بھی وہ بے نیاز ہوگا۔ یہ چیز ان لوگوں کے خلاف ہے جو روح کو قدیم سمجھتے ہیں اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب قدیم کو حدوث میں شریک سمجھا جائے تو قدم حق اور حدوث عالم سے متعلق کوئی دلیل باقی نہیں رہتی اور یہ دہریوں کا مذہب ہے۔ (خدا ان کی برائیوں سے محفوظ رکھے)۔

جملہ محدثات کی حرکات دلائل توحید ہیں۔ قدرت حق تعالیٰ پر گواہ ہیں اور اس کے قدم کا ثبوت ہیں۔ مگر انسان غافل ہے کہ اپنے دل میں غیر کو جگہ دیتا ہے اور غیر کے ذکر سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یاد رکھو جب انسانی مرگ وحیات کو روبکار لانے میں ذات حق کا کوئی شریک نہیں تو انسانی تربیت و پرورش میں بھی کوئی اس کا شریک کار نہیں ہو سکتا۔

حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''توحید میں پہلا قدم تفرید کو ختم کر دینا ہے''۔ ''تفرید'' آفات سے جدا ہونے کا نام اور ''توحید'' وحدانیت کا اقرار ہے۔ ''فرید'' ہونا یا فردیت غیر اللہ کے لئے بھی ثابت ہو سکتی ہے اور اس صفت کو اوروں کی طرف بھی منسوب کر سکتے ہیں'' وحدانیت'' میں غیر کا تصور نہیں سما سکتا اور بجز ذات حق کے کوئی اس صفت کا موصوف نہیں ہو سکتا۔

المختصر ''تفرید'' عبارتاً مشترک طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ ''توحید'' صرف شرک کی نفی کرنے کا نام ہے۔ پس ''توحید'' میں پہلا قدم شریک حق کی نفی کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ طریق حق پر متفرقات سے دست بردار ہونا ضروری ہے کیونکہ متفرق تصورات کو لے کر راہ اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی چراغ لے کر راستہ تلاش کر رہا ہو۔

حصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ''توحید میں ہمارے اصول پانچ چیزوں پر مشتمل ہیں:
ا۔نفی حدث، ۲۔اثبات قدم، ۳۔ہجر وطن، ۴۔مفارقت برادران، ۵۔نسیان علم اور جہل

نفی حدث کا مطلب یہ ہے کہ عرفان توحید کے پیش نظر جملہ محدثات کی نفی کی جائے اور ذات حق پر وقوع محدثات کو ناممکن سمجھا جائے۔

اثبات قدم سے مراد ذات حق کے قدیم ہونے کا ایقان ہے۔ اس چیز کی تشریح جنید رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں ہو چکی ہے۔

ہجر وطن نفسانی طور پر مرغوب، دل کو تسکین دینے والی چیزوں کو چھوڑ دینے اور ایسے مقامات سے روگرداں ہونے کا نام ہے جہاں آسائش و راحت کی امید ہو۔ اہل حق کے لئے دنیوی رسوم سے دستبردار ہونا بھی ہجر وطن ہے۔

مفارقت پر ادران کے معنی مخلوق سے روگردانی اور حق تعالیٰ کی طرف یکسوئی ہے۔ غیر کے تصور سے موحد کا دل محجوب ہوتا ہے۔ جس قدر تصور غیر غالب ہو اسی قدر حجاب مسلط رہتا ہے۔ اتفاق آراء اسی پر ہے کہ جب توحید ذہنی قویٰ کو حق پر مرکوز کرنے کا نام ہے تو تصور غیر سے تسکین حاصل کرنا ہمت کو متفرق کر دینے کے مترادف ہے۔

نسیان علم و جہل کو یوں سمجھنا چاہئے کہ انسانی علم یا ماہیت و کیفیت اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے یا جنس و طبیعت سے متعلق ہوتا ہے۔ مگر انسانی علم جو کچھ توحید حق کے بارے میں ثابت کرتا ہے توحید اس کی نفی کرتی ہے اور جس چیز کو جہالت ثابت کرے وہ بذاتہ منافی علم ہوتی ہے۔ کیونکہ جہالت کو توحید سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقی توحید کا علم تصرف غیر کو ختم کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور انسانی علم اور جہل تصرف غیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بصیرت پر غلبہ ہو تو علم حاصل ہوتا ہے لیکن انسان پر غفلت کا غلبہ ہو جائے تو وہ جاہل رہتا ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ میں حصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر تھا۔ مجھ پر نیند نے غلبہ کیا۔ میں نے خواب میں دیکھا، دو فرشتے آسمان سے آئے اور کچھ دیر تک حصری کو گفتگو کرتے ہوئے سنتے رہے پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ جو کچھ حصری فرما رہے ہیں وہ توحید کا علم ہے، عین توحید نہیں۔ جب میں بیدار ہوا تو حصری نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: ''میں بجز علم توحید کے اور کچھ بیان نہیں کر سکتا۔''

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: ''توحید کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حق تعالیٰ کے سامنے اپنے اختیار اور ارادے سے قطعاً دست بردار ہو جائے۔ اس پر توحید کے بحر بے کراں میں سے قدرت حق کے صرف احکام مسلط ہوں اور صرف اسی کی تدبیر روبکار ہو۔ وہ قرب حق اور حقیقت توحید سے سرشار ہو۔ اپنے نفس اور خلقت کی آواز سے بے نیاز ہو۔ اس مقام فنا کے حصول کے بعد اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہے اور وہ ایسے نقطہ پر پہنچ جائے جہاں اس کا اول و آخر ہمکنار ہو جائے یعنی ایسا ہو جائے جیسا دنیا میں آنے سے قبل تھا۔''
مطلب یہ کہ اہل توحید کو اختیار باری تعالیٰ میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طرف نہیں دیکھتے

کیونکہ قرب میں وہ اپنا آپ کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی اپنی کوئی حس وحرکت باقی نہیں رہتی جو حق تعالیٰ چاہے ان پر طاری کرے۔ حتیٰ کہ حیثیت اس ذرہ ناچیز کی وہی ہو جاتی ہے جو یوم الست تھی یعنی سوال کرنے والا بھی حق اور جواب دینے والا بھی حق۔ گو بظاہر نشان اسی ذرے کا تھا۔ اس عالم میں مخلوق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ کوئی چیز دعوت نظارہ نہیں دیتی اور توحید کا علمبردار کسی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔

اس قول میں صفات بشری کی فنا اور غلبہ کشف جلال حق کے سامنے صحیح تسلیم و رضا کی طرف اشارہ ہے۔ انسان کے اپنے اوصاف فنا ہو جاتے ہیں۔ اس کی حیثیت فقط ایک آلہ کار کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا جوہر لطیف بن جاتا ہے کہ اگر اس کے جگر پر نیزہ لگے تو اسے احساس نہ ہو۔ ایسا نیزہ جو مسیلمہ (کذاب) کی پیٹھ پر لگے تو اسے دو پارہ کر دے۔

القصہ اس کی تمام صفات فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا جسم اسرار الٰہی کا مظہر ہو جاتا ہے۔ اس کی گفتگو کا تعلق بھی ذات حق سے ہوتا ہے اس کے افعال کی نسبت بھی اسی سے اور اس کی ہر صفت کا قیام بھی اسی سے۔ شریعت کا حکم اس پر اتمام حجت کیلئے رہ جاتا ہے ورنہ وہ خود کسی چیز کو دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔

یہ عالم رسول ﷺ کا تھا۔ آپ شب معراج مقام قرب پر تشریف فرما ہوئے۔ اس قرب کے لئے مسافت تھی مگر آپ کو قرب بے مسافت حاصل ہوا۔ یہ مقام انسانی عقل و دانش سے بالاتر اور وہم وقیاس کی حدود سے باہر تھا۔ عالم امکان نے آپ کو گم کر دیا اور آپ فنائے صفات بشری میں گم ہو گئے۔ فنائے صفات میں آپ متحیر تھے۔ طبعی ترتیب اور اعتدال مزاج پریشان ہو گیا۔ نفس دل کے، دل جان کے، جان باطن کے اور باطن قرب حق کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔ آپ ہر چیز کی موجودگی میں ہر چیز سے آزاد ہو گئے۔ آپ نے چاہا کہ وجود کا جامہ اتار دیں۔ مگر باری تعالیٰ کو اتمام حجت مدنظر تھا۔ حکم ہوا اپنے حال پر قائم رہیے۔ یہ حکم وجہ قوت ہوا۔ اس قوت نے آپ کو سہارا دیا۔ اپنی فنا سے بقا باللہ سے سرفراز ہوئے۔ واپس

آئے اور فرمایا: اِنِّی لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ اِنِّی اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّی فَیُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ (1) ''میں تم لوگوں جیسا نہیں ہوں۔ میں حضور حق میں شب گزاری کرتا ہوں وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔'' یعنی میری زندگی اور بقا اسی سے وابستہ ہے۔ نیز فرمایا: لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا یَسَعُ مَعِیْ فِیْهِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ (2) ''مجھے حضور حق ایک ایسا وقت میسر آتا ہے کہ اس وقت کوئی مقرب فرشتہ یا نبی مرسل درمیان میں حائل نہیں ہوتا۔''

سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''حق تعالیٰ علم کی صفت سے موصوف ہے مگر اس کا ادراک حواس ظاہری باطنی سے نہیں ہوسکتا۔ نظر اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ حقیقت ایمان میں بے حد حلول و دریافت موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو اپنی ذات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رکھا ہے اور اپنی قدرت کے دلائل کو مخلوق کی رہبری کا ذریعہ بنایا ہے۔ اہل عرفان کے دل اس کو جانتے ہیں۔ عقل معلوم نہیں کرسکتی۔ اہل ایمان قیامت کے دن ذات باری کی نہایت غایت جانے بغیر اس کا دیدار کریں گے۔'' یہ جملہ توحید کے جملہ احکام کا نچوڑ ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''توحید حق سے متعلق سب سے مستحکم اور پر حکمت قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے: ''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت کے لئے بندوں کے واسطے بجز اظہار عجز کے کوئی راستہ نہیں رکھا۔'' عام لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے متعلق غلطی کے مرتکب ہو جایا کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ معرفت سے عاجز ہو جانا گویا معرفت کے نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ ناممکن ہے کیونکہ عاجز ہونا موجود ہونے سے وابستہ ہے معدوم سے اس کا تعلق نہیں ہوسکتا۔ مردہ حیات سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے کیونکہ اس کی قوت کو عجز کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح اندھا بینائی سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ بینائی کے عالم میں نابینائی سے عاجز ہوتا ہے۔ اپاہج ایستادہ ہونے سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ بیٹھے ہوئے بیٹھنے سے عاجز

1۔ صحیح بخاری 2۔ المقاصد الحسنہ

ہوتا ہے اور اس عالم میں حصول معرفت ایک احتیاج کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول کم وبیش وہی ہے جو ابو سہل صعلوکی اور ابو علی دقاق رحمہما اللہ نے بیان کیا یعنی معرفت ابتداً کسبی ہوتی ہے اور بالآخر ضروری ہو جاتی ہے۔ علم ضروری وہی ہوتا ہے جو موجود ہو تو اسے حاصل کرنے یا اسے ٹال دینے پر صاحب علم قادر نہ ہو۔ پس اس قول کے مطابق توحید قلب انسانی میں فعل حق تعالیٰ ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''توحید جمال احدیت اور موحد کے درمیان پردہ ہوتی ہے۔'' کیونکہ توحید کو فعل بندہ کہیں تو فعل بندہ مشاہدۂ حق کی علت نہیں ہوسکتا اور عین مشاہدہ میں جو چیز علت مشاہدہ نہ ہو وہ حجاب ہے۔ بندہ اپنے کل اوصاف کے ساتھ غیر اللہ ہوتا ہے کیونکہ جب بندے کی کسی صفت کو جزو حق سمجھا جائے تو لامحالہ خود بندے کو بھی حق سمجھنا پڑے گا۔ اس صورت میں موحد، توحید اور احد تینوں ایک دوسرے کی علت ہو جائیں گے اور یہ بالکل نصاریٰ کا عقیدہ تین میں تیسرا'' ہو کر رہ جائے گا۔ جو صفت طالب کے لئے راہ توحید میں مانع فنا ہو وہ صفت حجاب ہے اور طالب موحد نہیں۔ جب یہ ثابت ہے کہ ذات حق کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ خود طالب ذات حق کے سوا ہے۔ اس لئے اس کی جملہ صفات مشاہدۂ جمال حق میں باطل ہیں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی یہی تفسیر ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کوفہ گئے۔ حسین نے پوچھا: ''اے ابراہیم! تم نے اپنا وقت کس طرح گزارا؟'' انہوں نے فرمایا: ''میں نے اپنے آپ کو توکل پر چھوڑ دیا۔'' حسین نے کہا: ''ابراہیم! تم نے اپنی عمر باطن کو آباد کرنے میں برباد کر دی۔ طریق توحید حق پر تیری فنا کہاں گئی؟'' یعنی تجھے توحید میں فنا ہو جانا چاہئے تھا۔

توحید کی تعبیرات میں بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ اسے بقا کا نام دیتا ہے کیونکہ صفت بجز بقا کے موجود نہیں ہوتی۔ دوسرا گروہ سمجھتا ہے کہ فنا کے سوا توحید کی کوئی صفت نہیں ہوسکتی۔ ان اقوال کو ''جمع وتفرقہ'' کے زاویہ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ (بقائے بندہ جمع اور

فنائے بندہ تفرقہ ہے) میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ توحید کے اسرار عطائے حق ہیں جو معرض بیان میں نہیں آسکتے اور کوئی شخص انہیں عبارت آرائی سے ظاہر نہیں کرسکتا کیونکہ عبارت اور معبر ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہیں۔ غیر کو ثابت کرنا شریک کو ثابت کرنے کے برابر ہے۔ یہ تو تماشا بن کر رہ جائے گا اور موحد بندۂ حق ہوتا ہے کھیل تماشا دیکھنے والا نہیں ہوتا۔

توحید کے احکام اور اہل معرفت کے اقوال یہی ہیں جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے۔

واللہ اعلم بالصواب

تیسرا کشف حجاب: ایمان

حق تبارک و تعالیٰ نے فرمایا، یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النساء:134) ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔'' کئی دوسرے مقامات پر مخاطب فرمایا، یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ''اے ایمان والو۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تم حق تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لاؤ۔'' ازروئے سنت ایمان دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے۔ شریعت میں ایمان سے متعلق مختلف لوگوں کے مختلف اقوال ہیں۔ معتزلہ کے مطابق سب علمی اور عملی عبادات جزو ایمان ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق گناہ کبیرہ کا مرتکب خارج از ایمان ہو جاتا ہے۔ خارجی لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے وہ ہر اس آدمی کو جس سے گناہ سرزد ہو، کافر قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسرا گروہ ایمان کو صرف قول تک محدود سمجھتا ہے۔ ایک اور گروہ صرف معرفت کو ایمان سمجھتا ہے۔ اہل سنت و جماعت کے متکلمین کی ایک جماعت مطلق تصدیق قلب کو ایمان کہتی ہے۔ ان کے مطابق ایمان ایک وسیع کیفیت قلب ہے اور یہی کیفیت اقرار و عمل میں کارفرما ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایمان سے متعلق ایک کتاب سپرد قلم کی ہے۔ مگر یہاں صرف صوفیاء و مشائخ کبار کے اعتقاد کا بیان مقصود ہے۔

مشائخ صوفیہ کے دو گروہ ہیں: ایک کہتا ہے کہ ایمان قول، تصدیق اور عمل پر مشتمل ہوتا

ہے۔ فضیل بن عیاض، بشر حافی، خیر النساج، سمنون المحب، ابوحمزہ بغدادی، احمد، جریری اور دیگر بہت سے بزرگ، فقہاء اور اہل یقین رضی اللہ عنہم اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ سمجھتا ہے کہ ایمان قول وتصدیق کا نام ہے۔ ابراہیم بن ادھم، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، ابوسلیمان دارانی، حارث محاسبی، جنید بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، شفیق بلخی، حاتم اصم، محمد بن فضل بلخی رضی اللہ عنہم، اس مکتب کے بزرگ ہیں۔

ان کے علاوہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم پہلے گروہ کے ہم خیال ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء مثلاً امام ابو یوسف، محمد بن حسن اور داؤد طائی رضی اللہ عنہم دوسرے مکتب کے مطابق ہیں۔ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہے معنوی طور پر کوئی اختلاف نہیں۔ اب میں ایمان کے معنی مختصراً بیان کرتا ہوں تا کہ حقیقت آشکار ہو اور ایمان میں اصل کے خلاف نہ سمجھا جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ وباللہ التوفیق

فصل: ایمان کی اصل

معلوم ہونا چاہئے کہ جملہ اہل سنت والجماعت اور اہل تصوف ومعرفت اس بات پر متفق ہیں کہ ایمان کی ''اصل'' بھی ہے اور ''فرع'' بھی۔ ایمان کی اصل تصدیق بالقلب ہے اور اس کی فرع احکامات حق کی پیروی۔ عام طور پر فرع کو استعارہ کے طور پر اصل کا نام دے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب کے نور کو آفتاب ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عبادت کو ایمان کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر عذاب سے مفر نہیں۔

جب تک احکامات حق بجا نہ لائے جائیں محض تصدیق بالقلب کافی نہیں جس کی عبادت زیادہ ہوگی وہ عذاب سے زیادہ محفوظ ہوگا چونکہ عبادت تصدیق کے ساتھ عذاب سے محفوظ رکھنے کی علت ہے اس لئے ایک گروہ نے عبادت ہی کو ایمان کہہ دیا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ عذاب سے محفوظ رہنے کی وجہ عبادت نہیں معرفت ہے کیونکہ اگر عبادت موجود ہو اور معرفت نہ ہو تو عبادت ہرگز کارآمد نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس اگر معرفت موجود ہو اور عبادت نہ ہو تو بندہ بالآخر نجات پالے گا۔ کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے ان لغزشوں سے درگذر

فرما دے۔ یا پیغمبر ﷺ کی شفاعت بروئے کار آوے یا اسے گناہ کے برابر سزا دے کر جہنم سے نجات دے دے اور وہ بہشت میں پہنچ جاوے۔ اہل معرفت خطا کار بھی ہوں تو معرفت کی بدولت ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ اہل عمل صرف عمل کی بناء پر بغیر معرفت حق داخل بہشت نہیں ہوں گے اس سے ثابت ہوا کہ عبادت عذاب سے نجات کی علت نہیں۔

اس موضوع پر ایک حدیث بھی ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: لَنْ یَنْجُوَ اَحَدُکُمْ بِعَمَلِهٖ وَقِیْلَ اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ ''تم میں سے کوئی صرف اپنے عمل کی بناء پر نجات نہیں پائے گا۔''

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی ''یا رسول اللہ (ﷺ) کیا آپ بھی؟''

ارشاد ہوا: ''ہاں میں بھی مگر یہ کہ حق تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے (1)۔''

پس ظاہر ہوا کہ ایمان دراصل معرفت حق، اقرار اور اعمال کے قابل قبول ہونے کا نام ہے۔ اس پر ہر گروہ کا اتفاق ہے۔ معرفت حق صفات حق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ صفات حق خاص طور پر تین صورتوں میں نمایاں ہوتی ہیں: اول وہ صفات جو اس کے جمال سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوم وہ جو جلال سے اور سوم وہ جو کمال سے۔ کمال تک کوئی راستہ نہیں ہاں اس قدر ہے کہ اس کے کمال کا اعتراف کریں اور نقائص کی اس سے نفی کریں۔ رہا جلال اور جمال۔ تو جس کے سامنے جمال حق ہے وہ ہمیشہ طالب دیدار رہتا ہے جس کا شاہد معرفت میں جلال ہے وہ ہمیشہ اپنی صفات سے متنفر رہتا ہے اور اس کا دل ہمیشہ خوف و ہیبت میں مبتلا رہتا ہے۔ شوق محبت کا اثر ہوتا ہے۔ نفرت صفات بشری میں شامل ہے۔ اسی لئے حجاب بشری کے کشف کے لئے محبت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ ایمان و معرفت محبت پر منحصر ہے اور محبت کا تقاضا طاعت ہے۔ کیونکہ جب دل میں دوستی جاگزیں ہو، آنکھ باریاب دیدار ہو، جان مقام عبرت بلکہ دل محل مشاہدہ ہو تو جسم کے لئے لابدی ہے کہ ترک احکام نہ کرے۔ اگر کوئی اس کے برعکس کہتا ہے اور تارک اوامر ہے وہ معرفت سے قطعاً نابلد ہے۔

1۔ صحیح بخاری

اس زمانے میں یہ فتنہ صوفیاء میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لوگوں نے جن کی روش ملحدانہ تھی اس قسم کے صوفیاء کی ظاہری بزرگی اور قدر و منزلت کو دیکھا اور اپنے آپ کو ان کے راستہ پر ڈال دیا اور کہا کہ طاعت کی تکلیف اسی وقت تک ہے کہ معرفت حاصل نہ ہو۔ جب معرفت حاصل ہو گئی تو دل کو مقام شوق حاصل ہو گیا اور طاعت کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ معرفت حاصل ہو تو چاہئے کہ دل میں شوق جاگزیں ہو اور اوامر کی تکریم اور زیادہ ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ طاعت گزار ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ طاعت اس کے لئے باعث تکلیف نہ رہے مگر اس طرح کہ توفیق طاعت زیادہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ تعمیل احکام میں جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ تکلیف نہ رہے مگر یہ چیز ایک والہانہ شوق کے سوا حاصل نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ ایمان کو کلیتہً من اللہ سمجھتے ہیں اور کچھ صرف بندے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ماوراء النہر کے علاقے میں یہ اختلاف بہت زیادہ رونما ہوا ہے۔ یاد رکھو ایمان کو من اللہ سمجھنا مکمل جبر کا اقرار کرنا ہے۔ کیونکہ بندہ مجبور محض ہو کر رہ جائے گا۔ اسی طرح اگر ایمان فقط بندے کی طرف منسوب کیا جائے تو یہ اثبات قدر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان بغیر حق تعالیٰ کی رہنمائی کے عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔ دراصل توحید کا راستہ جبر سے باہر اور قدر سے بالاتر ہے۔ ایمان بندے کا فعل ہے جو ہدایت حق کے تحت ظہور پذیر ہوتا ہے کیونکہ جسے حق تعالیٰ گم کردۂ منزل چھوڑ دے اسے کوئی راہ نہیں دکھا سکتا اور جسے وہ راہ راست دکھا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا چنانچہ فرمایا، فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:125) ''جس کے مقدر میں ہدایت ہو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھل جاتا ہے جسے گمراہ کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے سینہ میں تنگی اور صلابت آجاتی ہے۔''

پس ایمان اور راہ سلامتی کی آرزو حق تعالیٰ کا انعام ہے اور آرزو کرنا بندے کا فعل ہے۔ دل میں آرزوئے ہدایت کا نشان توحید حق پر اعتقاد رکھنا ہے۔ آنکھ کا حرام چیزوں

سے بچنا اور دلائل قدرت دیکھ کر عبرت حاصل کرنا۔ کان کا کلام حق سننا۔ معدے کا حرام غذا سے خالی ہونا۔ زبان کا سچ بولنا اور جسم کا حرام باتوں سے پرہیز کرنا یہ اس لئے ہے کہ اعتقاد، دعوائے اعتقاد کے دوش بدوش رہے یعنی جو دعویٰ زبان نے ایمان سے متعلق کیا ہے وہ عملاً پورا ہو۔ یہ لوگ (جبر وقدر کے قائل) ایمان اور معرفت میں کمی بیشی کے قائل ہیں۔ حالانکہ یہ چیز بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہے کہ معرفت حق کم یا بیش ہونے سے آزاد ہے کیونکہ معرفت زیادہ ہوسکتی یا اسے نقصان کا احتمال ہوتا تو لازمی تھا کہ معروف بھی زیادتی اور نقصان کا محتمل ہوتا۔ معروف اس چیز سے بری ہے اس لئے معرفت بھی بری ہے۔ ناقص معرفت تو معرفت ہی نہیں۔ البتہ عمل وفرع میں کمی وبیشی ممکن ہے اور چنانچہ بالاتفاق طاعت میں کمی بیشی روا ہے۔

حشوی مکتب کے لوگ جو ان دونوں فریقوں سے نسبت کے دعویدار ہیں یہ مسئلہ گوارا نہیں کرتے کیونکہ حشویوں کی ایک جماعت طاعت کو منجملہ ایمان سمجھتی ہے اور دوسری ایمان کو صرف قول مجرد کی حیثیت دیتی ہے۔ یہ دونوں رخ انصاف کے منافی ہیں۔

ایمان دراصل بندے کی تمام صفات کا طلب حق میں صرف ہو جانے کا نام ہے۔ سب طالبان حق کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ سلطان معرفت جب غالب آتا ہے تو ناشناسی (نکارت) مفقود ہو جاتی ہے۔ جہاں ایمان ہے وہاں ناشناسی کا کیا کام۔ بزرگوں نے کہا ہے: ''جب صبح ہوئی چراغ بے کار ہو گیا۔'' یعنی گویا اس نے دلیل صبح پیش کر دی۔ گفتگو کا مقام نہیں تھا۔ کیونکہ روز روشن کے لئے دلیل آرائی بے معنی ہے۔

باری تعالیٰ نے فرمایا، اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا (النمل:34) ''جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ وبرباد کر دیتے ہیں۔'' مطلب یہ کہ جب عارف کا دل نور معرفت سے جگمگا اٹھتا ہے تو ناشناسی، وہم، ظن اور گمان ختم ہو جاتے ہیں اور انتہائی معرفت حواس اور خواہشات کو مسخر کر لیتی ہے چنانچہ نہ ہونے والے کام وہ کر لیتا ہے اور نہ کہی جاسکنے والی باتیں وہ کہہ دیتا ہے۔ سب کچھ دائرہ معرفت میں ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے ایمان کی حقیقت سے متعلق سوال کیا گیا۔ فرمایا: ''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میری تقریر محض عبارت آرائی ہوگی۔ جواب صرف عمل سے دیا جا سکتا ہے۔ میں مکہ معظمہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تمہارا ارادہ بھی ہو تو میرے ساتھ رہو تا کہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل سکے۔'' سائل نے ایسا ہی کیا جب جنگل میں پہنچے تو یہ ہوا کہ ہر رات دو روٹیاں اور دو پیالے پانی کے نازل ہوتے ایک وہ خود اٹھا لیتے اور دوسرا سائل کو مل جاتا۔ ایک دن ایک بوڑھا گھڑ سوار نمودار ہوا۔ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر وہ گھوڑے سے اترا۔ دونوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد وہ مسافر پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور چلا گیا۔ سائل نے پوچھا: ''یہ بوڑھا سوار کون تھا؟'' فرمایا ''تیرے سوال کا جواب'' عرض کی ''کیسے؟'' فرمایا: یہ خضر علیہ السلام تھے اور مجھے اپنا ہم نشین بنانا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ان کی ہم نشینی میں کہیں حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان پر بھروسہ نہ کرنے لگوں اور میرا توکل برباد نہ ہو جائے۔'' حقیقت ایمان توکل کی حفاظت کرنا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا، وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ (المائدہ) ''حق تعالیٰ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان دار ہو۔''

حضرت محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ایمان اس چیز کو باور کرنے کا نام ہے جو غیب سے دل پر ظاہر ہو۔'' کیونکہ صحیح ایمان غیب ہی پر ایمان لانا ہے۔ حق تعالیٰ کو ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے اور بجز تائید حق کے ہمارا ایمان قائم نہیں ہو سکتا۔ عارفوں کی معرفت اور عالموں کو علم صرف اس کی آگاہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی نے دلوں کو عرفان اور علم مرحمت فرمایا ہے علم و معرفت کسب انسانی میں داخل نہیں۔ جو آدمی معرفت حق سے دل میں یقین پیدا کرتا ہے وہ صحیح معنوں میں مومن ہے اور واصل باللہ ہے۔

اس موضوع پر میں اپنی کسی اور کتاب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ یہاں اسی پر اکتفا کرتا ہوں تا کہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ اب میں معاملت (اعمال) کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اس کے پردے ہٹاتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز

چوتھا کشف حجاب: طہارت

ایمان کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندۂ حق پر فرض ہوتی ہے وہ نماز کے لئے طہارت ہے جس کا مطلب بدن کو نجاست اور جنابت سے پاک کرنا ہے اور جسم کے تین اعضاء کو دھونا اور سر پر مسح کرنا ہے حسب احکام شریعت یا اگر پانی نہ ہو یا شدت مرض ہو تو تیمّم کرنا۔ اس کے متعلق جملہ احکام سب کو معلوم ہیں۔

طہارت کی دو صورتیں ہیں: ایک جسم کی طہارت ہے اور دوسری دل کی۔ طہارت بدن کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی اور اسی طرح دل کی طہارت بغیر معرفت کے درست نہیں ہوتی۔ طہارت تن کے لئے صاف پانی کی ضرورت ہے۔ گدلا اور مستعمل پانی درکار نہیں ہوتا۔ اسی طرح دل کی طہارت کے لئے خالص توحید حق کی ضرورت ہے متفرق اور پریشان اعتقاد درکار ہیں۔ صوفیہ کرام ہمیشہ بدنی طہارت کے علاوہ باطنی طہارت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا: ”ہمیشہ باوضو رہو تا کہ دونوں محافظ فرشتے تمہیں دوست رکھیں۔ باری تعالیٰ نے فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ (البقرہ) ”حق تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرا رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“ پس جو ظاہری طہارت پر مداومت کرتا ہے ملائکہ اس کی دوستی کا دم بھرتے ہیں جو باطنی طہارت یعنی توحید حق پر قائم ہے حق تعالیٰ اسے دوست رکھتے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ دعا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِیْ عَنِ النِّفَاقِ (1) ”اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک فرما۔“ حالانکہ آپ کے قلب مبارک میں نفاق کسی شکل میں بھی متمکن نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن اپنی کرامت کا احساس ہی اثبات غیر کے برابر محسوس ہوتا ہے اور اثبات غیر محل توحید میں نفاق پیدا کرنے والا ہے۔

ہر چند مشائخ کرام کی کرامات کا ہر پہلو مریدوں کے لئے بصیرت افروز ہوتا ہے۔ تاہم یہی پہلو کمال کے نقطۂ نظر سے حق تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک ثقیل پردے کی

1۔ کنز العمال

شکل میں حائل ہو جاتا ہے کیونکہ غیر اللہ کی طرف التفات آفت کے برابر ہے۔ اسی بناء پر حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اہل معرفت کا نفاق اہل عشق (اہل طلب) کے اخلاص سے بہتر ہے۔'' یعنی جو مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کا حجاب ہوتا ہے۔ کیونکہ مرید کرامت حاصل کرنے کے در پے ہوتا ہے اور کامل کرامت عطا کرنے والے یعنی ذات حق کا طالب ہوتا ہے۔ الغرض اثبات کرامات، اہل حق کے لئے نفاق کے برابر ہے اور یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس کا دیکھنا غیر اللہ کی طرف نظر کرنے کے مترادف ہو۔ پس دوستان حق پر آفت سب عاصیوں کے لئے معاصی سے نجات ہے۔ عاصیوں پر آفت جملہ اہل ضلالت کے لئے ضلالت سے نجات ہے کیونکہ اگر کفار کو معلوم ہو کہ ان کا کفر حق تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ جیسا کہ گنہگار جانتے ہیں تو وہ کفر کے چنگل سے نکل جائیں اگر گنہ گاروں کو یہ علم ہو کہ ان کے سب عمل نقصان کا عمل ہیں جیسے کہ دوستان حق کو علم ہے تو وہ سب گناہوں سے نجات پا جائیں اور سب آفتوں اور برائیوں سے پاک ہو جائیں۔ پس ظاہری طہارت اور باطنی طہارت کو ہم رکاب ہونا چاہئے۔ یعنی جب ہاتھ دھوئے تو دل کو بھی دنیا کی محبت سے پاک کرے۔ جب منہ میں پانی ڈالے تو منہ کو ذکر غیر سے خالی کرے۔ جب ناک میں پانی ڈالے تو نفسانی خوہشات اپنے اوپر حرام کرے۔ منہ دھوئے تو جملہ مالوفات سے یکبارگی اعراض کرے اور روبحق ہو جائے۔ جب ہاتھ دھوئے تو اپنے جملہ دنیوی نصیب سے دستبردار ہو جائے۔ جب مسح کرے تو اپنے تمام امور کو سپرد خدا کرے اور جب پاؤں دھوئے تو جب تک احکام خدا کے مطابق نہ دھوئے نماز کے لئے کھڑا نہ ہوتا کہ دوگونہ طہارت نصیب ہو۔ کیونکہ شریعت کے جملہ احکام ظاہری امور باطنی سے وابستہ ہیں۔ ایمان زبان کا اقرار ہے مگر تصدیق دل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ شریعت میں عبادت کے احکام بدن پر نیت قلب کے ساتھ مربوط ہیں۔ دل کی طہارت دنیا کی برائیوں پر غور وفکر کرنے اور دنیا کو ایک عالم غدار اور مقام فنا سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دل دنیا سے خالی ہونا چاہئے اور یہ مقام سخت مجاہدہ سے ملتا ہے اور سب سے زیادہ اہم مجاہدہ آداب ظاہر کو ملحوظ

رکھنا اور اس طریق کار پر مداومت کرنا ہے۔

ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے حیات ابدی چاہئے۔ اگر سب لوگ نعیم دنیا میں مستغرق ہو کر حق تعالیٰ کو فراموش کر دیں تو میں اس مصیبت کے گھر یعنی دنیا میں آداب شریعت بجالاتا رہوں اور حق تعالیٰ کو یاد رکھوں۔

کہتے ہیں کہ ابو طاہر حرمی رحمۃ اللہ علیہ چالیس برس تک حرم مکہ میں مقیم رہے مگر حرم کے اندر طہارت نہیں کی۔ ہر بار حرم سے باہر جاتے اور فرماتے جس زمین کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے اپنا مستعمل پانی اس پر نہیں گرا سکتا۔ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ آپ رے کی جامع مسجد میں بعارضہ پیچش مبتلا تھے۔ ایک دن رات میں آپ کو ساٹھ بار غسل کرنا پڑا اور بالآخر آپ کی وفات بھی پانی ہی میں ہوئی۔

ابو علی رود باری رحمۃ اللہ علیہ کچھ مدت طہارت کے معاملے میں شک میں مبتلا رہے کہتے ہیں ایک دن میں علی الصباح دریا میں اتر گیا اور سورج نکلنے تک پانی میں رہا۔ دل کو تکلیف ہوئی فریاد کی اے رب العزت! مجھے عافیت عطا فرما۔ ہاتف غیب نے آواز دی۔ ''عافیت علم میں ہے۔''

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ بیماری کے عالم میں آپ نے وفات کے دن ساٹھ بار طہارت فرمائی اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ حکم حق آئے تو میں باطہارت لبیک کہوں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ وضو کر کے مسجد میں داخل ہو رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی: ''تو نے ظاہر کو پاک کر لیا، باطن کی صفائی کہاں ہے؟'' آپ وہیں سے واپس ہو گئے۔ سب مال و دولت راہ خدا میں تقسیم کر دی اور ایک سال تک صرف اتنے کپڑے پر اکتفا کیا کہ جو نماز کے لئے کافی تھا۔ آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا ''کیا خوب طہارت تھی جو آپ نے کی۔ خدا آپ کو ہمیشہ پاک رکھے۔'' اس کے بعد آپ کبھی بے طہارت نہیں رہے جب آپ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو وضو ٹوٹ گیا۔ ایک

مرید کو اشارہ کیا۔ اس نے وضو کروایا۔ مگر ریش مبارک میں خلال کرنا بھول گیا۔ آپ بولنے سے قاصر تھے۔ مرید کا ہاتھ پکڑ کر اشارہ کیا اور مرید نے خلال کیا۔ آپ نے فرمایا ہے: ''میں نے طہارت کے آداب میں سے کبھی کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔ سوائے اس وقت کے کہ میرے باطن میں کوئی پندار جاگزیں ہو۔''

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''جب کبھی میرے دل میں کوئی دنیوی خیال گزرتا ہے۔ میں وضو کر لیتا ہوں اور عقبیٰ کا خیال آتا ہے تو غسل کر لیتا ہوں کیونکہ دنیا محدث ہے۔ اس کا خیال بھی حدث ہے عقبیٰ محل غیبت و آرام ہے اور اس کا خیال بمنزلہ جنابت ہے۔ حدث سے صرف وضو لازم آتا ہے اور جنابت سے غسل۔''

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ وضو کر کے مسجد میں داخل ہوئے دل میں آواز محسوس کی: ''کیا تیری طہارت اس قابل ہے کہ تو ہمارے دربار میں حاضر ہو؟'' یہ سن کر آپ واپس ہوئے تو پھر آواز آئی: ''ہماری درگاہ سے پلٹ کر کہاں جاؤ گے؟'' آپ نے نعرہ بلند کیا آواز آئی: ''کیا ہمارے اوپر طعنہ زنی کرتے ہو؟'' آپ اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے پھر آواز آئی: ''کیا ہماری برافروختگی کے تحمل کا بھی دعویٰ ہے؟'' حضرت شبلی نے عرض کی: ''میرے مالک میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

طہارت سے متعلق مشائخ کبار کے بہت سے اقوال ہیں۔ سب نے اپنے مریدوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے وقت ظاہر و باطن کی طہارت پر مداومت کا حکم دیا ہے جو کوئی عمل ظاہر کا قصد کرے تو لازمی ہے کہ وہ ظاہر کی طہارت کرے۔ جب باطن میں قرب حق کا قصد کرے تو چاہئے کہ باطن کی طہارت کرے۔ ظاہر کی طہارت پانی سے ہوتی ہے اور باطن کی توبہ اور رجوع الی اللہ سے۔

اب میں توبہ اور اس سے متعلقہ امور کا حجاب اٹھاتا ہوں تا کہ اس کی حقیقت بھی نمایاں ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز

پندرہواں باب

توبہ اور متعلقات

سالکان حق کا پہلا قدم توبہ ہے۔ جیسے داعیان عمل کا پہلا درجہ طہارت ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا، یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا (التحریم:8) ''اے ایمان والو! حق تعالیٰ کے حضور سچی توبہ کرو۔'' اور نیز فرمایا: تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ (النور) ''اے ایمان والو! سب اللہ کے حضور توبہ کرو تاکہ بہبود پاؤ۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مَا مِنْ شَیْءٍ أَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ شَابٍ تَائِبٍ(1) ''حق تعالیٰ کو توبہ کرنے والا نوجوان سب سے عزیز ہے۔'' اور نیز فرمایا: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ(2) ''توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔'' پھر آپ نے فرمایا: أَذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدًا لَمْ یَضِرَّہٗ ذَنْبٌ(3) ''جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوست رکھتا ہے تو گناہ سے اس کو نقصان نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾ (البقرہ) ''اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔'' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا ''توبہ کی کیا علامت ہے؟'' فرمایا ''ندامت و پشیمانی۔'' اور آپ نے یہ جو فرمایا کہ گناہ دوستان حق کو نقصان نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ گناہ سے کافر نہیں ہوتا اور اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ایسا نقصان جس کا انجام نجات ہو، فی الحقیقت نقصان نہیں ہوتا۔

توبہ کے لغوی معنی رجوع کرنا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں: تاب یعنی اس نے رجوع کیا نہی سے یعنی ایسی چیز سے جسے کرنے سے حق تعالیٰ نے منع فرمایا، محض حق تعالیٰ کے خوف سے باز آجانا توبہ کی حقیقت ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: ''فعل بد سے پشیمانی توبہ

1۔ المعجم الکبیر، شعب الایمان 2۔ احیاء العلوم 3۔ ابن عدی، الکامل

ہے۔'' اس قول میں توبہ کی جملہ شرطیں موجود ہیں۔ ایک شرط حق تعالیٰ کے احکام کی مخالفت سے پشیمانی ہے دوسری شرط مخالفت احکام کو فوراً چھوڑ دینا ہے اور تیسری شرط گناہ کی طرف دوبارہ نہ لوٹنے کا ارادہ ہے۔ یہ تینوں شرطیں ندامت میں مضمر ہیں۔ کیونکہ جب لغزش پر ندامت ہو تو باقی دو شرطیں از خود پوری ہو جاتی ہیں۔ لغزش پر ندامت کے تین اسباب ہیں جیسا کہ توبہ کی تین شرطیں ہیں:

۱۔ عذاب کا خوف دل پر طاری ہو جائے۔ برے فعل کی وجہ سے دل مغموم ہو جائے اور اس طرح ندامت کا احساس پیدا ہو جائے۔

۲۔ نعمت کی خواہش ہو اور یہ احساس ہو کہ برے فعل اور نافرمانی سے نعمت حاصل نہیں ہوگی اور اس کا نتیجہ ندامت ہو۔

۳۔ روز قیامت کی رسوائی کا خوف ہو اور اس خوف کی وجہ سے انسان نادم ہو جائے۔

پہلی صورت میں توبہ کرنے والا ''تائب'' کہلاتا ہے۔ دوسری صورت میں ''منیب'' اور تیسری میں ''اواب۔''

اسی طرح توبہ کے تین مقام ہیں: توبہ، انابت اور اوبت۔ توبہ خوف عذاب سے، انابت طلب ثواب سے اور اوبت تعظیم فرمان حق سے وابستہ ہوتی ہے۔ توبہ عام اہل ایمان کے لئے ہے اور کبیرہ گناہوں سے متعلق ہوتی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (التحریم: 8) ''اے ایمان والو! خدا کے حضور صحیح اور پکی توبہ کرو۔'' انابت اولیاء اور مقربان حق کا شیوہ ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِ (ق) ''جو شخص خدائے رحیم سے بن دیکھے ڈرے گا اور جس کے پہلو میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا دل ہے۔'' اوبت انبیاء اور مرسلین کا مقام ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (ص) ''بہت اچھا ہے وہ بندہ جو اللہ کی طرف بہت رجوع کرے۔'' پس توبہ گناہ کبیرہ سے اللہ کی فرمانبرداری میں دستبردار ہونا ہے۔ انابت گناہ صغیرہ سے اللہ کی محبت میں اس کی

طرف رجوع کرنا ہے اور اوبت اپنے آپ سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے۔ احکام حق کے پیش نظر فواحش سے روگرداں ہونے والے صغیرہ گناہوں اور غلط خیالات سے بچ کر حق تعالیٰ کی محبت میں توبہ کرنے والے اور خودی کو ترک کر کے ذات حق کی طرف رجوع کرنے والے میں بڑا فرق ہے۔ اصل توبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تنبیہات ہیں۔ خواب غفلت سے دل کی بیداری ہے اور اپنے عیوب پر نظر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے برے احوال و افعال پر نظر کرتا ہے اور ان سے نجات کا متمنی ہوتا ہے تو باری تعالیٰ اسباب توبہ آسان فرما دیتا ہے۔ گناہوں کی سیاہ بختی سے بچا کر اسے اطاعت کی حلاوتوں سے آشنا کر دیتا ہے۔

اہل سنت والجماعت اور جملہ مشائخ معرفت کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرے اور دوسرے گناہوں میں مبتلا رہے تو حق تعالیٰ اسے اس ایک گناہ سے بچنے کا ثواب عطا کرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسی کی برکت سے وہ باقی گناہوں سے بھی نجات حاصل کر لے۔ مثلاً ایک شخص شراب نوشی کرتا ہے اور زانی بھی ہے۔ وہ زنا سے تائب ہو جاتا ہے مگر شراب نوشی کو ترک نہیں کرتا۔ اس کی توبہ روا ہے۔ باوجودیکہ دوسرے گناہ کا ارتکاب ابھی اس سے ہو رہا ہے۔

معتزلہ کا ایک فریق کہتا ہے کہ جب تک ایک ہی بار جملہ گناہ کبیرہ سے توبہ نہ کی جائے تو یہ بے کار ہے۔ بعض گناہوں سے توبہ کرنا اور بعض میں مبتلا رہنا توبہ کی توہین ہے۔ یہ چیز محال ہے، کیونکہ انسان جملہ گناہوں کے لئے قابل مواخذہ ہے۔ جب ایک گناہ سے تائب ہو جائے (اس کا مرتکب نہ ہو) تو اس پر کوئی مواخذہ اس گناہ سے متعلق نہیں ہو سکتا اور یہی چیز اس کی توبہ کی محرک ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کچھ فرائض ادا کرتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ یقیناً اسے ادا کردہ فرائض کا ثواب ہوگا جس طرح ادا نا کردہ فرائض کے بدلے وہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ اگر کسی گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو یا اس کے اسباب ہی موجود نہ ہوں مگر بندہ توبہ کرے تو وہ تائب کہلائے گا۔ کیونکہ توبہ کا ایک رکن پشیمانی ہے اس توبہ سے اسے

گذشتہ پر ندامت ہوگی۔ فی الحال وہ اس گناہ سے اعراض کرتا ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اسباب میسر بھی ہوں تو وہ ہرگز گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

وصف توبہ اور صحت توبہ سے متعلق مشائخ میں اختلاف ہے۔ سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال ہے "توبہ یہ ہے کہ جو گناہ سرزد ہو چکا ہو وہ ہمیشہ یاد رہے۔ یعنی انسان ہمیشہ اس سے متعلق پشیمان رہے۔ اگر بہت سے نیک عمل موجود ہیں تو ان کی وجہ سے طبیعت میں عجب پیدا نہ ہو۔ برے کام پر ندامت اور پشیمانی نیک اعمال سے زیادہ اہم ہوتی ہے جو شخص معاصی کو فراموش نہیں کرتا۔ اپنے نیک اعمال پر کبھی مغرور نہیں ہوسکتا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت کا یہ خیال ہے: "توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے۔" کیونکہ تائب محبّ حق ہوتا ہے اور محبّ حق ہونے کی وجہ سے صاحب مشاہدہ ہوتا ہے اور مشاہدہ میں گناہ کی یاد ظلم ہے۔ یہ کیا کہ کچھ جفا (گناہ) میں گزر گئی کچھ یاد جفا (یاد گناہ) میں۔ وفا (مشاہدہ) میں جفا (یاد گناہ) حجاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس اختلاف کا تعلق مجاہدہ اور مشاہدہ کے اختلاف سے ہے اور اس کا مفصل ذکر مکتبہ سہیلیہ کے بیان میں ملے گا۔ جب تائب کو قائم بخود سمجھا جائے تو نسیان گناہ غفلت پر محمول کرنا پڑے گا۔ اگر تائب قائم بحق ہو تو یاد گناہ بمنزلہ شرک ہے۔

الغرض تائب باقی الصفت ہے تو اس کے اسرار کا عقدہ ابھی حل نہیں ہوا۔ اگر فانی الصفت ہے تو اپنی صفت کا بیان روا نہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے باقی الصفت ہونے کے عالم میں کہا "میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔" اور پیغمبر ﷺ نے فانی الصفت ہو کر کہا: "میں تیری ثنا بیان نہیں کرسکتا۔" مقصود یہ ہے کہ قرب حق میں وحشت کا ذکر تمام تر وحشت ہے۔ تائب کو تو خودی سے بھی دستبردار ہو جانا چاہئے یاد گناہ کا کیا ذکر؟ فی الحقیقت یاد گناہ خود گناہ ہے کیونکہ جب گناہ باعث اعراض ہے تو اس کی یاد بھی باعث اعراض ہونی چاہئے۔ اسی طرح غیر اللہ کا ذکر بھی حق تعالیٰ سے اعراض کرنا ہے۔ جس طرح جرم کا ذکر جرم

ہے اسی طرح جرم کو فراموش کر دینا بھی جرم ہے۔ بھول جانے اور یاد رکھنے کا تعلق انسان سے ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا مگر اس بیت سے بڑھ کر مجھے کسی چیز نے فائدہ نہیں دیا۔

> ''جب میں نے اپنے حبیب سے کہا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا (تو جواب ملا) تیری زندگی خود اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے مقابل کسی اور جرم کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔''

جب دوستی کے مقام پر دوستی کا دم بھرنے والے کا وجود ہی گناہ ہو تو اس کی صفات کا کیا ذکر؟ الغرض توبہ تائید ربانی اور گناہ فعل جسمانی ہے۔ جب ندامت دل میں جاگزین ہو جاتی ہے تو جسم کو اس ندامت کے ختم کر دینے پر قدرت نہیں ہوتی۔ جب ابتدائے فعل میں اس کی ندامت توبہ کو روک نہیں سکتی تو انتہائے فعل میں بھی توبہ کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ باری تعالیٰ نے فرمایا، فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ (البقرہ) ''اس کی (آدم کی) توبہ قبول کی بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا رحم والا ہے۔'' کتاب اللہ میں اس کی نظیریں بہت ہیں اور اتنی مشہور ہیں کہ یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس توبہ کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ توبہ گناہ سے نیکی کی طرف، ۲۔ توبہ نیکی سے بلند تر نیکی کی طرف اور ۳۔ توبہ خودی سے حق تعالیٰ کی طرف

خطا سے نیکی کی طرف توبہ کی مثال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (آل عمران: 135) ''اور وہ لوگ جن سے کوئی فعل بد سرزد ہوا یا انہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا پھر حق تعالیٰ کو یاد کیا اور گناہوں کی معافی مانگی۔'' نیکی سے بلند تر نیکی کی توبہ کی مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، تبت الیک ''میں نے تیری طرف رجوع کیا۔'' اور خودی سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ کی مثال یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وَاِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ كُنْتُ

لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّةً(1) ''اور میرے دل پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور میں ہر روز ستر بار حق تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں۔''

خطا کا مرتکب ہونا مذموم ہے۔ خطا سے نیکی کی طرف رجوع کرنا قابل ستائش ہے۔ یہ توبہ عام ہے اور اس کے احکام ظاہر ہیں۔ بلند تر نیکی کو حاصل کرنا چاہئے۔ کیونکہ معمولی نیکی پر تھم جانا راستے میں ٹھہر جانے کے برابر اور ایک پردۂ حائل ہے۔ نیکی سے بلند تر نیکی کی طرف رجوع کرنا اہل ہمت اور اولیاء کے طریق میں نہایت درجہ قابل ستائش ہے۔ یہ خاص توبہ ہے۔ حق تعالیٰ کے خاص بندے گناہ سے کیا توبہ کریں گے وہ تو گناہ کے مرتکب ہی نہیں ہوتے۔

معلوم ہے کہ سارا عالم رویت باری کے لئے بے قرار ہے اور موسیٰ علیہ السلام رویت سے توبہ فرما رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ انہوں نے دیدار کو اپنے اختیارات سے طلب کیا۔ محبت میں اپنا اختیار حیرانی ہے اور حیرانی کو ترک کرنا حق کو اختیار کرنا ہے۔ اس لئے انہوں نے دیدار حق کو ترک کر دیا۔ خود کو ترک کر کے رجوع الی اللہ کرنا محبت کا درجہ ہے۔ بلند تر مقام کے حصول پر پس ماندہ بلند مقام سے اور تمام مقامات واحوال سے توبہ لازم ہے۔ حضور ﷺ کے مقامات واحوال سے توبہ لازم ہے۔ حضور ﷺ کے مقامات ہمیشہ روبہ ترقی تھے۔ جب آپ بلند تر مقام پر پہنچتے تو اس سے پچھلے مقام سے استغفار اور اس کو دیکھنے سے توبہ فرماتے۔ واللہ اعلم

فصل: توبہ کا ثواب

معلوم ہونا چاہئے کہ معصیت سے بچنے کا عزم راسخ کرنے کے بعد ضروری نہیں کہ تائب توبہ پر قائم رہ سکے۔ اگر توبہ کے بعد توبہ میں فتور واقع ہو جائے اور عزم راسخ کے باوجود انسان معصیت میں الجھ جائے تو توبہ کا ثواب فسخ نہیں ہوتا۔ اہل تصوف میں کچھ مبتدی سالکان طریقت ایسے گذرے ہیں جو توبہ کرنے کے بعد لغزش کے مرتکب ہوئے۔

1۔ صحیح مسلم

گناہ میں الجھ گئے اور پھر کسی تنبیہ پر درگاہ حق کی طرف لوٹ آئے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ میں نے ستر بار توبہ کی اور ہر بار معصیت کا شکار ہوا۔ اکہترویں بار میری توبہ کو استقامت نصیب ہوئی۔ حضرت ابو عمر جنید بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں نے توبہ حضرت عثمان حیری کی محفل میں کی۔ کچھ عرصہ اپنی توبہ پر قائم رہا۔ میرے دل میں خواہش گناہ نے پھر سر اٹھایا اور میں لغزش کا مرتکب ہوا۔ اس کے بعد میں عثمان حیری کی مجلس سے گریز کرتا رہا۔ جہاں کہیں بھی وہ دور سے نظر آتے میں ندامت سے راہ فرار اختیار کر لیتا۔ ایک روز سامنا ہو ہی گیا۔ آپ نے فرمایا: ''بیٹا! دشمنوں کی صحبت اختیار کرنے سے کیا حاصل جب تک گناہوں سے دامن پاک نہ ہو۔ دشمن تو ہمیشہ عیب ڈھونڈتا ہے اگر تو عیب میں ملوث ہے تو دشمن خوش ہوگا۔ اگر تو عیوب سے پاک ہوگا تو اسے تکلیف ہوگی۔ اگر گناہوں کا مرتکب ہونا ہی ہے تو ہمارے پاس آ۔ تیری مصیبت ہم برداشت کر لیں گے۔ دشمن کی خواہش کے مطابق خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' حضرت جنید فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے کبھی گناہ کی رغبت نہیں ہوئی اور میری توبہ کو استقامت مل گئی۔

میں نے سنا ہے کہ کسی شخص نے توبہ کی۔ پھر گناہ کا مرتکب ہوا اور پشیمان ہوا۔ ایک روز دل میں سوچا اگر اب درگاہ حق میں جاؤں تو میرا کیا حال ہوگا۔ ہاتف غیب نے کہا: ''تو ہمارا فرمانبردار تھا تو ہم نے تجھے شرف قبولیت بخشا۔ تو فرمانبردار ہوا تو ہم نے تجھے مہلت دی۔ اگر اب بھی تو ہماری طرف آئے گا تو ہم تجھے قبول کریں گے۔''

اب ہم توبہ سے متعلق مشائخ کبار کے اقوال بیان کرتے ہیں۔

فصل: مشائخ کی آراء

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''عام لوگ معصیت سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے۔'' مطلب یہ کہ عوام سے ظاہر کے متعلق سوال ہوگا اور خواص سے اعمال کی حقیقت سے متعلق باز پرس ہوگی۔ کیونکہ غفلت عوام کے لئے نعمت اور خواص کے لئے حجاب ہوتی ہے۔

حضرت ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "توبہ میں بندے کا اپنا کچھ اختیار نہیں ہوتا کیونکہ توبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے (اس کا انعام ہے) بندے کی طرف سے نہیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ انسان کی اپنی سعی کا نتیجہ نہ ہو بلکہ حق تعالیٰ کی عطا ہو۔ یہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا طریق ہے۔

ابوالحسن بوشنجی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: "اگر گناہ کی یاد میں لذت نہ رہے تو یہ توبہ ہے۔ گناہ کی یاد یا تو ندامت کی وجہ سے ہوتی ہے یا دل کی خواہش کی وجہ سے۔ جب ندامت کی وجہ سے ہو تو انسان تائب ہوتا ہے جب ارادت سے یاد آئے تو گناہ ہے۔ گناہ کے مرتکب ہونے میں وہ آفت نہیں جو اس کی ارادت میں ہے۔ کیونکہ ارتکاب تو ایک بار ہو چکتا ہے مگر ارادت مستقل طور پر دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ گھڑی بھر جسم سے گناہ کرنا اتنا سنگین نہیں جتنا کہ رات دن ارادت گناہ میں منہمک رہنا ہے۔

حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "توبہ دو قسم کی ہے، ایک توبہ انابت یعنی خوف عذاب سے توبہ کرنا۔ دوسری توبہ استحیاء یعنی شرمسار ہو کر توبہ کرنا۔" توبہ جس کی بناء خوف پر ہو کشف جلال حق سے حاصل ہوتی ہے اور وہ توبہ جو شرمساری سے جنم لیتی ہے۔ جمال حق کے مشاہدہ پر منحصر ہے۔ ایک جلال حق کے سامنے خوف کی آگ میں جلتا ہے۔ دوسرا جمال حق میں حیا کے نور سے روشن ہوتا ہے گویا ایک مست (سکر میں) ہوتا ہے اور دوسرا مدہوش۔ اہل حیا اصحاب سکر ہوتے ہیں اور اصحاب خوف اہل صحو، بات بہت طویل ہے مگر میں نے مختصراً بیان کر دی۔ وباللہ التوفیق الاعلیٰ

پانچواں کشف حجاب: نماز

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (البقرہ:43) "نماز قائم کرو۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نماز اور جو کچھ ملک میں ہے اس کا خیال کرو۔" لغت کے لحاظ سے نماز، ذکر اور دعا ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں وہ مخصوص عبادت حق ہے جو ہر روز خاص احکام کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مقررہ وقت پر روزانہ پانچ نمازیں ادا کرو۔ نماز ادا

کرنے سے قبل کچھ شرائط ہیں:

۱۔ جسم کی طہارت، ظاہر میں نجاست اور باطن میں ہوا و ہوس سے۔

۲۔ لباس کی طہارت، ظاہر میں نجاست اور باطن میں مال حرام سے۔

۳۔ مکان کی طہارت، ظاہر میں گندگی سے اور باطن میں فساد و معصیت سے۔

۴۔ قبلہ رو ہونا، ظاہر کا قبلہ کعبہ معظم ہے اور باطن کا عرش اعظم یعنی سر مشاہدۂ حق۔

۵۔ قیام، ظاہر حسب طاقت اور باطن روضہ قرب حق۔ قیام ظاہر مقررہ وقت کی حدود میں اور قیام باطن ہمیشہ مقام حقیقت پر۔

۶۔ نیت بطیب توجہ۔

۷۔ خوف حق اور فنائے صفات بشری کے مقام پر تکبیر پڑھنا۔ وصل کے مقام پر قیام کرنا اور ترتیل کے ساتھ قرأت کرنا۔ گڑگڑا کر رکوع، عجز و انکسار کے ساتھ سجود۔ اطمینان دل کے ساتھ تشہد ادا کرنا اور بشری صفات کی فنا پر سلام پھیرنا۔

احادیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے تو ان کے باطن میں اس دیگ کی طرح جوش ہوتا تھا جس کے نیچے آگ جل رہی ہو۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نماز کا قصد فرماتے تھے تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور فرماتے تھے: اس امانت کو ادا کرنے کا وقت آ گیا جسے اٹھانے سے زمین و آسمان عاجز تھے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں: میں نے حاتم اصم سے پوچھا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ فرمایا: جب وقت نماز ہو تو ایک ظاہری وضو کرتا ہوں اور دوسرا باطنی۔ ظاہری وضو پانی سے اور باطنی توبہ سے۔ پھر مسجد میں داخل ہوتا ہوں۔ بیت الحرام میرے سامنے ہوتا ہے، مقام ابراہیم دونوں ابروؤں کے درمیان ہوتا ہے۔ بہشت دائیں، جہنم بائیں، صراط تحت قدم فرشتہ موت کو اپنے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ پھر نہایت تعظیم و احترام کے ساتھ تکبیر پڑھتا ہوں۔ حرمت کے ساتھ قیام، خوف کے عالم میں قرأت، انکساری کے ساتھ رکوع، تضرع کے ساتھ سجود، حلم و وقار کے ساتھ جلوس اور شکر کے ساتھ سلام توفیق اللہ کی طرف سے ہے

اور وہ صحیح جاننے والا ہے۔

فصل: اسرار نماز

یاد رکھو نماز ایک ایسی عبادت ہے جو ابتدا سے انتہا تک راہ حق پر اہل طلب کی رہنمائی کرتی ہے وہ ہمیشہ اسی میں مشغول رہتے ہیں اور ان کے مقامات اسی میں کشف ہوتے ہیں۔ طالبان حق کے لئے طہارت توبہ، روبقبلہ ہونا پیر طریقت سے تعلق، قیام مجاہدۂ نفس، قرأت ذکر دوام، رکوع تواضع، سجود معرفت نفس، تشہد انس حق، سلام دنیا سے علیحدگی اور مقامات کی قید سے باہر نکلنے کا نام ہے۔ اسی لئے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیوی تعلقات سے منقطع ہوتے، کمال حیرت کے مقام پر طالب دید ہوتے اور صرف ذات حق سے تعلق رہ جاتا تو فرماتے: ''اے بلال! ہمیں نماز سے راحت دے۔'' یعنی اذان دے تا کہ نماز ادا کر کے راحت قلب حاصل ہو۔

اس امر سے متعلق مشائخ کے مختلف اقوال ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ پر قابل قدر ہیں۔ مشائخ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز درگاہ حق میں حاضر ہونے کا ذریعہ ہے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ نماز خود سے غائب ہو جانے کا نام ہے۔ جو لوگ غائب ہوتے ہیں وہ نماز میں حاضر ہوتے ہیں اور جو پہلے حاضر ہوں وہ نماز میں غائب ہو جاتے ہیں جیسا کہ قیامت میں رویت باری کے مقام پر جو لوگ رویت سے بہرہ یاب ہوں گے وہ پہلے غائب ہوں گے تو حاضر ہو جائیں گے جو حاضر ہونگے وہ غائب ہو جائیں گے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ نماز حکم حق ہے نہ حاضری کا سبب ہے نہ غائب ہونے کا ذریعہ۔ حکم حق کسی چیز کا آلہ کار نہیں ہوتا۔ حضور کا سبب عین حضور ہے اور اسی طرح غیبت کی علت عین غیبت ہے۔ حکم حق کسی شکل میں بھی ناقص نہیں ہوتا اگر نماز آلہ حضور ہوتی تو یقیناً نماز کے سوا کوئی چیز حضور حق حاضر نہ کر سکتی اور اسی طرح اگر نماز وجہ غیبت ہو تو ''غائب'' ترک نماز سے بھی حضور حق سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ جب حاضر اور غائب دونوں میں سے کوئی نماز ادا کرنے سے معذور نہیں ہو سکتا تو نماز بنفسہ ایک قوت ہے۔ غیبت

اور حضور سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اہل مجاہدہ اور صاحبان استقامت نماز میں کثرت کرتے ہیں اور دوسروں کو حکم دیتے ہیں۔ مشائخ اپنے مریدوں کو شبانہ روز چار سو رکعات ادا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تا کہ جسم کو عبادت کی عادت ہو جائے۔ اہل استقامت بھی بہت نماز ادا کرتے ہیں تا کہ حضور حق شکر قبولیت ادا کریں۔ باقی رہے "اہل احوال" ان کے دو گروہ ہیں: ایک وہ لوگ ہیں جن کی نماز کمال سلوک اور محویت کے سبب "جمع" کے مقام پر ہوتی ہے اور وہ اپنی نماز میں "مجتمع" ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی نماز قطع سلوک فقدان محویت کے عالم میں "تفرقہ" کے مقام پر ہوتی ہے، وہ اس "تفرقہ" سے دو چار ہوتے ہیں۔ مجتمع لوگ شبانہ روز نماز میں مصروف رہتے ہیں اور فرائض وسنن کے علاوہ نوافل کثرت سے ادا کرتے ہیں۔ اہل تفرقہ فرائض وسنن ادا کرتے ہیں۔ نوافل کم پڑھتے ہیں پیغمبر ﷺ نے فرمایا: قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ جُعِلَتْ (1) "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔" یعنی میری جملہ راحت نماز میں ہے۔ اہل استقامت کا طریق نماز میں مشغول رہنا ہے۔

پیغمبر ﷺ شب معراج قرب حق میں باریاب ہوئے تو آپ پندار عالم کون وفساد سے آزاد ہو گئے اور حضور حق میں ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ نفس کو دل کا درجہ مل گیا، دل کو جان کا، جان کو باطن کا اور باطن درجات سے فانی اور مقامات سے محو ہو کر "شان بے شان" ہو گیا۔ آپ عین مشاہدہ میں مشاہدہ سے غائب اور عین دید میں دید سے الگ تھے۔ انسانی خواص ختم ہو گئے۔ مادۂ نفسانی بھسم ہو گیا۔ طبعی رجحان نیست و نابود ہو گیا۔ شواہد حق اپنی سلطانی میں عیاں ہوئے۔ خود سے بے خود ہو گئے۔ حقیقت حقیقت سے مل گئی۔ مشاہدۂ لم یزلی میں محو ہو گئے۔ کمال شوق سے بے اختیار ہو کر عرض کی "بار خدایا! اب مجھے اس مصیبت کدہ (دنیا) میں نہ ڈال اور طبعی ہوا و ہوس کی قید سے آزاد رکھ۔" حکم ہوا "ہمارا حکم یہی ہے کہ آپ دنیا میں قیام شریعت کے لئے واپس جائیں جو کچھ ہم نے عالم ملکوت میں آپ کو

1۔ سنن نسائی، مستدرک حاکم

مرحمت کیا ہے وہ دنیا کو عطا کریں۔" چنانچہ جب حضور ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو جب کبھی دل میں معراج کا شوق ہوا تو آپ نے فرمایا: أَرِحْنَا يَا بَلَالُ بِالصَّلٰوةِ(1) "اے بلال! ہمیں نماز سے راحت دے۔" ہر نماز آپ کے لئے معراج تھی اور ایک نئے تقرب کا باعث تھی۔ لوگ آپ کو مصروف نماز دیکھتے تھے۔ آپ کی جان نماز میں ہوتی تھی، دل محو نیاز، باطن سرگرم راز اور نفس مبتلائے گداز ہوتا تھا حتیٰ کہ نماز آنکھوں کا نور ہو جاتی تھی۔ آپ کا جسم دنیا میں مگر جان عالم ملکوت میں ہوتی تھی آپ کا بدن بظاہر انسانوں کی معیت میں ہوتا تھا مگر روح مبارک انس حق کے مقام پر ہوتی تھی۔

سہل بن عبداللہ نے فرمایا: "صدق کی یہ علامت ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر ایک فرشتہ مقرر ہو۔ جب نماز کا وقت آئے وہ اس کو اٹھا دے یا وہ سو رہا ہو تو اس کو جگا دے۔" یہ چیز سہل بن عبداللہ پر طاری تھی آپ بوڑھے اور معذور ہو چکے تھے مگر ہنگام نماز ٹھیک ہو جاتے تھے اور نماز کے بعد پھر معذور کھڑے رہ جاتے تھے۔

مشائخ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں: "نماز ادا کرنے والا چار چیزوں کا حاجت مند ہوتا ہے: فنائے نفس، تحلیل طبع، صفائی باطن اور کمال مشاہدہ۔" نماز فنائے نفس کے بغیر بے کار ہے اور یہ چیز جمع ہمت سے حاصل ہوتی ہے۔ جمع ہمت ہو تو غلبہ نفس ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نفس کی بنیاد تفرقہ پر ہے اور تفرقہ جمع اور مشاہدہ حق کی تاب نہیں لا سکتا۔ تحلیل طبع کے لئے اثبات جلال حق تعالیٰ ضروری ہے۔ کیونکہ جلال حق زوال غیر کا باعث ہوتا ہے۔ صفائی باطن محبت حق تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے اور کمال مشاہدہ جذبہ صفائی باطن نصیب نہیں ہوتا۔

سنا ہے کہ حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ شب و روز چار سو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا آپ کا مقام اتنا بلند ہے آپ کیوں اس قدر مشقت اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "یہ مشقت و راحت تم لوگوں کے لئے ہے۔ سالکان حق فانی الصفت ہوتے ہیں نہ وہ مشقت محسوس کرتے ہیں نہ راحت۔ خبردار کہیں کاہل کو حق رسیدہ اور حریص کو طالب حق

1۔ مسند احمد

نہ کہہ دینا"۔

ایک شخص نے بیان کیا کہ میں حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے نماز ادا کر رہا تھا۔ ہنگام تکبیر جب آپ نے "اللہ اکبر" کہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روح جسم سے پرواز کر گئی ہے اور بدن میں کوئی حس باقی نہیں رہی۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ عالم پیری میں جوانی کے تمام اوراد و وظائف دہرایا کرتے تھے۔ کسی نے کہا اب آپ ضعیف ہو گئے ہیں ان اوراد کو مختصر کر لیجئے۔ آپ نے فرمایا: "ابتدائے سلوک میں سب کچھ انہی اوراد کی بدولت پایا محال ہے کہ انتہائے سلوک میں ان سے دستبردار ہو جاؤں۔"

فرشتے ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ عبادت ہی ان کا کھانا پینا ہے اور عبادت ہی ان کی غذا ہے کیونکہ وہ روحانی ہیں۔ نفس سے بری ہوتے ہیں۔ نفس امارہ ہی طاعت میں سدراہ ہوتا ہے جتنا نفس امارہ کو زیر کیا جائے اتنا ہی طاعت کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ نفس فنا ہو جائے تو فرشتوں کی طرح عبادت ہی شرب اور عبادت ہی غذا ہو جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے لڑکپن میں ایک عبادت گزار عورت کو دیکھا۔ وہ نماز میں تھی کہ بچھو نے اسے چالیس مرتبہ کاٹا اس پر کسی قسم کا تغیر رونما نہ ہوا۔ وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے پوچھا: "مادر من! تو نے اس بچھو کو کیوں نہ ہٹایا؟" عابدہ نے جواب دیا: "بیٹا! تو نہیں سمجھتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کا کام کرتے ہوئے میں اپنے کام کی طرف رجوع کر لیتی۔"

ابوالخیر اقطع رحمۃ اللہ علیہ کے پاؤں میں آکلہ کی بیماری تھی۔ اطباء نے پاؤں کاٹ دینے کا فیصلہ کیا مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ مریدوں نے مشورہ کیا کہ دوران نماز پاؤں کاٹ دیا جائے۔ کیونکہ نماز میں ان کو اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پاؤں کٹا ہوا تھا۔

صحابہ کرام کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات

کے وقت قرآن آہستہ آواز سے پڑھتے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلند آواز سے۔ پیغمبر ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں عرض کی میں حسن قرأت سے راز و نیاز کی بات کرتا ہوں۔ سننے والا سنتا ہے خواہ آہستہ پڑھوں خواہ بلند آواز سے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کی میں سونے والے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابوبکر! تم ذرا بلند آواز سے پڑھا کرو اور عمر تم ذرا آہستہ آواز میں پڑھا کرو تاکہ عادت بدل جائے۔

صوفیائے کبار میں سے کچھ لوگ فرائض تو ظاہری طور پر ادا کرتے ہیں مگر نوافل مخفی طور پر۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ریاکاری شائبہ نہ رہے۔ اعمال میں نمائش کا پہلو ہو اور خلقت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی آرزو ہو تو ریاکاری ہے۔ چاہے یہ کہا جائے کہ ہم تو عبادت کر رہے ہیں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی ریا ہے۔ کچھ اور لوگ فرائض اور نوافل آشکارا ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ریا ایک باطل چیز ہے اور عبادت طاعت حق ہے۔ یہ غلط ہے کہ باطل کے لئے حق کو چھپایا جائے۔ ریا دل سے نکلنی چاہئے عبادت کہیں بھی ہو سکتی ہے۔

مشائخ کبار آداب عبادت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں اور اس کے لئے مریدوں پر زور دیتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں میں نے چالیس برس سفر کیا مگر کوئی نماز بغیر جماعت کے نہیں ادا کی۔ ہر جمعہ کے دن میں کسی نہ کسی قصبہ میں ہوتا تھا۔

نماز کے احکام معرض حصر میں نہیں آسکے۔ مقامات سے جن کا تعلق نماز سے ہے وہ محبت حق ہے۔ اب محبت کے احکام بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

سولہواں باب

محبت اور متعلقات

حق تعالیٰ نے فرمایا، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ:53) ''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص مرتد ہو جائے قریب ہے اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم پیدا کر دے جس کا وہ دوست ہو اور وہ اس کی دوست ہو۔'' نیز فرمایا، وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (البقرہ:145) ''بعض انسان ایسے ہیں کہ اللہ کے سوا کو معبود بنا لیتے ہیں اور ان سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے کرنی چاہئے۔ اہل ایمان اللہ سے شدت کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جبریل علیہ السلام سے سنا کہ خدائے عزوجل نے فرمایا: مَنْ أَهَانَ وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَةِ وَمَا تَرَدَّدْتُ فِیْ شَیْءٍ کَتَرَدُّدِیْ فِیْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِیْ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَکْرَهُ مَسَاءَتَهٗ وَلَا بُدَّلَهٗ مِنْهُ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُ کُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَ بَصَرًا اَوْ یَدًا مُؤَیِّدًا (1) ''جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ لڑائی کی۔ مجھے ایک صاحب ایمان کی روح قبض کرنے میں سب سے زیادہ تردد ہوتا ہے کیونکہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے ایذا دینا پسند نہیں کرتا، حالانکہ موت اس کے لئے لابدی ہے۔ ادائے فرض سے کوئی چیز زیادہ عزیز نہیں جو میرے قرب کا باعث ہو۔ میرا بندہ ہمیشہ نوافل ادا کر کے میرا قرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب یہ عالم ہو تو میں اس کا کان، اس کی آنکھ، اس کا ہاتھ اور اس کی زبان بن

1۔ مسند شہاب، حلیۃ الاولیاء

جاتا ہوں۔" اور نیز فرمایا، مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَائَهٗ "جسے اللہ تعالیٰ سے ملنے کی خواہش ہو اللہ تعالیٰ اس کو ملنا پسند کرتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ کو ملنا ناپسند ہو اللہ تعالیٰ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرَئِيْلَ يَا جِبْرَئِيْلُ اِنِّيْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ فَيُحِبُّهٗ جِبْرَئِيْلُ ثُمَّ يَقُوْلُ جِبْرَئِيْلُ لِاَهْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يَضَعُ لَهُ الْقَبُوْلَ فِي الْاَرْضِ فَيُحِبُّهٗ اَهْلُ الْاَرْضِ وَ فِي الْبُغْضِ مِثْلُ ذٰلِكَ(1) "جب حق تعالیٰ کسی کو دوست رکھتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام سے فرماتا ہے میں فلاں شخص کو دوست رکھتا ہوں تو بھی اس کو دوست رکھ جبرائیل اس کو دوست رکھتا ہے اور اہل آسمان سے کہتا ہے فلاں شخص اللہ کا دوست ہے تم بھی اسے دوست بناؤ۔ اہل آسمان اسے دوست بنا لیتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس بندہ کو اہل زمین میں مقبولیت عطا کرتا ہے۔ اہل زمین بھی اسے محبت کرتے ہیں۔ بغض اللہ کی مثال بھی یونہی سمجھنی چاہئے"۔

حق تعالیٰ کی محبت بندہ کے لئے اور بندہ کی حق تعالیٰ کے لئے درست ہے۔ کتاب اور سنت اس پر ناطق و شاہد ہیں اور ساری امت کا اس پر اتفاق ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات پاک میں ایسے اوصاف ہیں کہ اولیاء اس کو دوست رکھتے ہیں اور وہ اولیاء کو۔

لغت کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ لفظ "حب" حبہ (حاء کی زیر) سے ماخوذ ہے۔ حبہ اس بیج کے دانہ کو کہتے ہیں جو صحرا میں پڑا ہو۔ لوگوں نے محبت کے لئے لفظ حب وضع کر لیا۔ صحرا میں گرے ہوئے بیج میں اصل حیات موجود ہوتا ہے۔ دیگر نباتات کے بیجوں کی طرح وہ صحرا میں مٹی میں دفن ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ آفتاب چمکتا ہے۔ سردی اور گرمی ہوتی ہے مگر وہ تمام تغیرات سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب اس کا وقت آتا ہے تو وہ پھوٹ پڑتا ہے اور پھولتا پھلتا ہے۔ اسی طرح محبت دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ حضور، غیب، بلا، محنت، راحت، لذت، فراق، وصال وہ کسی چیز سے متغیر نہیں ہوتی۔ اس مفہوم کو کسی شاعر

1۔ صحیح بخاری

نے یوں ادا کیا ہے۔

یا من سقام جفونہ لسقام عاشقہ طبیب
حزت المودۃ فاستوی عندی حضورک والمغیب

"اے کہ تیری چشم بیمار عاشق کی بیماریوں کا علاج ہے۔ تو نے دل میں محبت کا بیج بویا۔ تیرا حضور وغیب میرے لئے برابر ہے۔"

یہ بھی کہتے ہیں کہ لفظ حب (محبت) حب سے ماخوذ جس کے معنی گڑھا ہے۔ جس میں پانی بہت ہو۔ پانی نظر کی راہ میں حائل ہو اور آنکھ اس میں دیکھ نہ سکتی ہو۔ اسی طرح جب محبت دل میں جاگزیں ہو کر دل کو لبریز کر دیتی ہے تو اس میں بجز محبوب کے کسی چیز کے لئے جگہ نہیں رہتی۔ جب حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو اپنی محبت کی خلعت سے سرفراز فرمایا تو وہ محض طاعت حق کے لئے دنیا سے الگ ہو گئے اور سب اہل عالم ان کے سامنے ایک پردۂ حائل کی شکل ہو کر رہ گئے۔ آپ اس پردۂ حائل سے بیزار تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کے حال اور ان کے مقام کو یوں بیان فرمایا، فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (شعراء) "بلاشبہ حق تعالیٰ کے سوا سب میرے دشمن ہیں۔" اور اس موضوع پر شبلی فرماتے ہیں: "محبت کا نام اس لئے محبت ہے کہ وہ دل سے محبوب کے سوا ہر چیز کو مٹا دیتی ہے۔"

بعض کہتے ہیں کہ حب دراصل وہ چارچوبہ ہے جس پر پانی کا برتن رکھا جاتا ہے۔ محبت حق کو حب اس لئے کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی من اللہ ہو یعنی عزت، ذلت، راحت، تکلیف، آفت، آسائش، وفا اور جفا سب بطیب خاطر برداشت کرنا ہوتا ہے اور کسی حالت میں بھی کوئی چیز گراں نہیں گزرتی۔ کیونکہ محبت کا مقصود ہی یہ ہے جیسے کہ وہ چارچوبہ جو پانی کے برتن کا بوجھ برداشت کرتا ہے۔ محبت کی تکلیف اور خلقت ہی دوست کا بوجھ اٹھانے کے لئے ہے۔ اس مضمون پر ایک شاعر کہتا ہے۔

"تو کچھ مرحمت فرمایا اپنا ہاتھ روک لے۔ دونوں چیزیں تیرے کرم میں شامل ہیں۔"

بعض کا خیال ہے کہ محبت لفظ ''حب'' سے ماخوذ ہے اور یہ حبت کی جمع ہے جس کا مطلب حبہ دل یا دل کا سیاہ نقطہ ہے۔ دل ایک لطیف مقام ہے۔ اس کا طبعی نظام ہی لطافت ہے محبت بھی اسی سے اقامت پذیر ہوتی ہے۔ محبت کو اس کے محل کا نام دے دیا گیا کیونکہ اس کا قیام سویدائے دل میں ہوتا ہے۔ اہل عرب اکثر اشیاء کو اس کے محل اور مقام کے نام سے موسوم کر لیا کرتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں محبت مشتق ہے حباب الماء (پانی کے بلبلے) سے کہ شدید بارش کے جوش میں نمودار ہوتا ہے۔ محبت کا نام حب کر دیا کیونکہ ''وہ دل کا جوش ہوتا ہے دوست کے اشتیاق دید میں۔'' اہل محبت کا دل ہمیشہ شوق دید میں بے قرار و مضطرب رہا کرتا ہے۔ جسم روح کے لئے بے قرار ہوتا ہے اور اس کا قیام ہی روح پر منحصر ہے۔ اسی طرح دل محبت پر قائم ہے اور محبت کا قیام محبوب کے دیدار ملاقات پر موقوف ہے۔ اسی مضمون پر ایک شاعر کہتا ہے۔

''جب دنیا راحت و سکون کی تلاش میں ہوتی ہے تو میری تمنا ہوتی ہے کہ میں تجھے ملوں تا کہ تجھے میرے حال کی خبر ہو جائے۔''

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لفظ حب ایک اسم ہے جو صفائے محبت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ عرب آنکھ کی پتلی کے تل کو ''حبہ الانسان'' کہتے ہیں اور اسی طرح سویدائے قلب کو ''حبة القلب کا نام دیتے ہیں''۔ سویدائے دل محبت کا مقام ہے اور آنکھ کی پتلی دید کا محل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دل اور آنکھ محبت میں برابر کے شریک ہیں۔ اس موضوع پر بھی ایک شاعر کہتا ہے۔

''دل کو آنکھ سے پرخاش ہے کہ وہ لذت دید سے بہرہ ور ہے۔ آنکھ دل کو کھٹکتی ہے کہ وہ تصور محبوب سے بہرہ مند ہے۔''

فصل: محبت کے معانی

واضح ہو کہ لفظ محبت کا علماء کئی طریق پر استعمال کرتے ہیں۔ نفس کی بے قراری، رغبت،

خواہش، دلی آرزو اور انس کے ساتھ ارادت کو بھی محبت کا نام دیتے ہیں مگر ان جملہ چیزوں کو حق تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں یہ سب کچھ مخلوقات اور موجودات سے تعلق رکھتی ہیں۔ باری تعالیٰ کی ذات مقدس بے نیاز و بالاتر ہے۔

دوسرے یہ لفظ احسان کے معنی میں مستعمل ہے یعنی جہاں بندہ عنایات حق سے مخصوص ہو کر برگزیدگی کا مقام حاصل کر لیتا ہے اسے درجہ کمال عطا ہوتا ہے اور نوازشات باری سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

تیسرے معنی ثنائے جمیل کے ہیں۔ اہل کلام کی ایک جماعت کہتی ہے کہ محبت حق تعالیٰ ہمارے لئے سماعت ہونے والی صفات میں سے ایک ہے۔ چہرہ، ہاتھ اور استواء (بیٹھے کی صفت) عقلاً حق تعالیٰ کے لئے محال چیزیں ہیں اگر کتاب اور سنت میں ان کا بیان نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی محبت کا اثبات تو کرتے ہیں اور اس میں مبتلا ہوتے ہیں مگر اس کے تصرف میں ہمیں توقف ہوتا ہے۔

اہل طریقت حب لفظ محبت حق تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے ہیں تو ان کی مراد یہ اقوال نہیں ہوتے جو اوپر بیان ہوئے ہیں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز

معلوم ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ کی محبت انسان کے لئے امن، بھلائی کا ارادہ اور اس پر رحمت کرنے کو کہتے ہیں۔ محبت ارادہ سے متعلق اسمائے حق میں سے ایک اسم ہے۔ جیسے رضا، سخط، رحمت، رافت وغیرہ۔ ان چیزوں کو صرف ارادۂ حق پر محمول کیا جاسکتا ہے اور ارادہ حق تعالیٰ کی صفت قدیم ہے جس سے اس کے افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مبالغہ اور اظہار افعال سے متعلق ان میں سے بعض صفات دوسری صفات سے زیادہ مخصوص ہیں حاصل کلام حق تعالیٰ محبت سے بندہ کے لئے زیادتی نعمت کرتا ہے۔ دنیا و عقبیٰ کا ثواب عطا کرتا ہے۔ عذاب سے محفوظ فرماتا ہے۔ گناہ سے بچاتا ہے۔ بلند احوال و مقامات سے نوازتا ہے۔ باطن کو تصور غیر سے پاک کرتا ہے اور اپنے ازلی لطف و کرم سے بہرہ ور کرتا ہے تاکہ وہ سب سے کٹ کر صرف اس کی رضا کے لئے منفرد ہو جائے۔ جب باری تعالیٰ کسی کو

اس طرح مخصوص فرماتا ہے تو اس تخصیص کو محبت کہتے ہیں۔ یہ حارث محاسبی، جنید اور مشائخ کی ایک کثیر جماعت کا مذہب ہے۔ مختلف فریقوں کے فقہاء اور بیشتر متکلمین اہل سنت کا بھی یہی مسلک ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ محبت حق بندہ کے لئے ثنائے جمیل ہے تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ثنا اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔ حالانکہ اس کا کلام نامخلوق ہے (قدیم ہے) اور انسان (حادث ہے) اگر یہ کہیں کہ محبت حق بمعنی احسان حق ہے تو یقیناً احسان اس کا اپنا فعل ہے۔ یہ سب اقوال معنوی طور پر ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔

بندے کی محبت حق تعالیٰ کے لئے ایک صفت ہے جو فرمانبردار صاحب ایمان کے دل میں تعظیماً، تکبیراً اور تکریماً پیدا ہوتی ہے تا کہ وہ محبوب حق کی رضا جوئی کرے۔ اس کے دیدار کی طلب میں بے قرار ہو۔ سوا اس کے کسی چیز سے اسے راحت نہ ہو۔ اس کے ذکر کی عادت ہو۔ غیر اللہ کے ذکر سے بیزار ہو۔ آرام اس کے لئے محال ہو۔ رات اس سے دور ہو۔ دنیا کی مطلوب و مرغوب چیزوں سے الگ ہو۔ نفسانی خواہشات سے روگرداں ہو۔ سلطان محبت کے سامنے سرنگوں ہو۔ اس کے سامنے سرخمیدہ ہو اور اسی کی ذات پاک کو کمال صفات کے ساتھ پہچانے۔ یہ روا نہیں کہ محبت حق ایسی ہو جیسے خلق کو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کی باہمی محبت محبوب کو گھیر لینے اور اسے حاصل کر لینے کی تمنا ہوتی ہے۔ یہ جسمانی محبت ہے۔ حق تعالیٰ کے دوست اس کے قرب میں جان دینے والے ہوتے ہیں اس کی کیفیت کے طالب نہیں۔ طالب دوست معرض دوستی میں بذات خود قائم ہوتا ہے اور طالب ہلاکت بنام دوست قائم ہوتا ہے۔ محبان حق میں دوستی کے بلند ترین مقام پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو جان نثار ہوں اور مقہور ہوں۔ اس لئے کہ محدث (مخلوق) کی وابستگی، قدیم (خالق) کے ساتھ اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک قدیم (خالق) اپنے قہر کے ذریعے (بندے کے دل سے تمام خواہشات نکال کر اپنی ذات میں فنا نہ کر لے)۔ جو حقیقت محبت سے آشنا ہو اس کے دل میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔

محبت کی دو شکلیں ہیں:

۱۔ جنس کی جنس کے ساتھ محبت، یہ نفس کا میلان اور اس کی جستجو ہے۔ محبوب کے جسم کو چھونا اور ذوق تسکین کے لئے چمٹ جانا۔

۲۔ محبت غیر جنس سے، اس محبت کا تقاضا ہوتا ہے کہ محبوب کی کسی صفت کو اپنا لیا جائے مثلاً بے لفظ کلام سننا یا بغیر آنکھ دیکھنا۔

عاشقان حق دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ ہوئے جو حق تعالیٰ کے انعامات واحسانات دیکھ کر اپنے منعم اور محسن کی محبت کا دامن تھام لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جملہ انعامات کو غلبہ دوستی کے عالم میں حجاب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ انعامات سے منعم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پہلے گروہ سے دوسرے گروہ کا مسلک بلند تر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

فصل: رموز محبت

الغرض محبت ایک معروف لفظ ہے جو سب اقوام اور سب زبانوں میں موجود ہے دانش وروں کی کوئی بھی جماعت اسے چھپا نہیں سکتی۔ مشائخ طریقت میں حضرت سمنون المحب محبت حق کے بارے میں ایک خاص مسلک رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: محبت راہ حق کی اصل اور بنیاد ہے۔ احوال و مقامات کی حیثیت منازل کی ہے۔ ہر منزل زوال پذیر ہوتی ہے سوائے محبت حق کے محبت پر کوئی زوال نہیں آتا۔ باقی مشائخ بھی اس پر متفق ہیں مگر محبت کو ایک عام اور صاف لفظ سمجھتے ہوئے انہوں نے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ معنوی حیثیت کو بدلے بغیر انہوں نے محبت کا نام ''صفوت'' رکھ دیا اور محبّ حق کو صوفی کہنے لگے۔ ایک دوسرے گروہ نے اختیار حبیب کے اثبات اور اختیار محبّ کے ترک کو ''فقر'' اور محبّ کو ''فقیر'' کا نام دیا۔ کیونکہ محبت کا ادنیٰ درجہ ہر عالم میں موافقت حبیب ہے اور موافقت بہر صورت مخالفت سے الگ ہوتی ہے۔ میں نے کتاب کے شروع میں فقر اور صفوت کا حال کھول کر بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اس شیخ بزرگ نے کہا ہے: ''محبت زاہدوں کے نزدیک اجتہاد (نیکی کی کوشش) سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے اہل توبہ کے لئے محبت

نالہ وفریاد سے سہل تر ہے۔اسپ سواروں کے لیے شکار بند سے زیادہ کارآمد ہے ترکوں کے لئے سواری سے زیادہ اہم ہے۔اہل ہنود کے لئے محبت کی غلامی محمود کی غلامی سے بہتر ہے۔ اہل روم میں محبت اور محبوب کی داستان صلیب سے مشہور تر ہے۔عرب میں محبت کی حکایات ادب کا ایک جزو ہیں۔جو زندگی کے ہر پہلو خوشی، ہلاکت، کامرانی، حزن اور جنگ وغیرہ پر محیط ہے۔" مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے عالم غیب سے یہ جوہر عطا نہ ہوا ہو جسے دل میں محبت کا حوصلہ یا فرحت نہ ہو۔جو بادہ محبت میں سرشار نہ ہو یا اس کے قہر کا خمار نہ رکھتا ہو۔دل طبعی طور پر بے قرار و مضطرب ہے۔محبت کے سامنے تمام سمندروں کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں۔محبت غذا ہے جس پر انسان کی زندگی منحصر ہے۔محبت سے خالی دل بے کار ہے۔کوشش سے نہ محبت حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ اس کو دفع کیا جا سکتا ہے۔نفس ان لطائف سے آگاہ نہیں جو دل میں رونما ہوتے ہیں۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب " محبت" میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے دلوں کو اجسام سے سات ہزار برس پہلے پیدا کیا اور مقام قرب میں رکھا۔روحوں کو دلوں سے سات ہزار برس قبل پیدا کیا اور انس کے مقام پر رکھا۔باطن کو روحوں سے سات ہزار برس پیشتر پیدا کیا اور مقام وصل میں رکھا۔ہر روز ۳۶۰ بار اپنے جمال ظاہری سے باطن پر تجلی فرمائی اور تین سو ساٹھ بار عنایت فرمائی اور روحوں کو کلمہ محبت سنایا اور تین سو ساٹھ لطائف سے دلوں کو نوازا۔سب نے عالم کائنات پر نظر کی تو اپنے سے بڑھ کر کسی کو نہ پایا۔غرور و تفاخر رونما ہوا۔حق تعالیٰ نے اسی واسطے انہیں آزمائش میں ڈال دیا۔باطن کو دل میں اور دل کو جسم میں مقید کر دیا۔پھر عقل کو ان میں سمو دیا۔انبیاء علیہم السلام کے ذریعے احکام دیئے اور اس طرح سب اپنے اپنے مقام کے جویا ہوئے۔نماز کا حکم ہوا تو جسم ذکر میں مشغول ہو گیا۔دل محبت سے سرشار ہو گیا۔جان کو قرب حق کی تلاش ہوئی اور باطن وصل حق میں تسکین کا طالب ہوا۔

المختصر محبت کا مضمون لطیف لفظ و بیان میں نہیں سما سکتا۔محبت حال ہے اور حال، قال

کے دائرہ امکان سے باہر ہوتا ہے۔ اگر سب کائنات چاہے کہ محبت بزور پیدا ہو جائے تو نہیں ہو سکتی اگر کوئی اسے بزور دور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ محبت انعام خداوندی ہے۔ اکتساباً حاصل نہیں ہو سکتی۔ سب اہل عالم طالب محبت کے لئے زبردستی محبت پیدا نہیں کر سکتے اور اہل محبت سے زبردستی محبت چھین نہیں سکتے۔ محبت عطیہ حق ہے۔ انسان کھیل تماشے میں بہل جانے والا ہے۔ محبت انوار الٰہی کا مرقع ہے۔ کھیل تماشے کے ذریعے انوار الٰہی سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔

فصل: عشق کے بارے آراء

عشق کے بارے میں مشائخ طریقت کے بہت سے اقوال ہیں۔ ایک جماعت خدا کے لئے بندے کی محبت کو جائز سمجھتی ہے۔ مگر خدا کی محبت بندے کے لئے روا نہیں سمجھتی ان کے خیال میں عشق محبوب سے رکاوٹ کی صفت ہے بندہ کو حق تعالیٰ سے ملنے میں رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ حق تعالیٰ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس لئے بندہ حق تعالیٰ سے عشق کر سکتا ہے حق تعالیٰ بندہ سے عشق نہیں کرتا۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ بندہ سے بھی حق تعالیٰ کا عشق روا نہیں کیونکہ دراصل عشق حد سے متجاوز ہونے کا نام ہے اور حق تعالیٰ کی کوئی حد نہیں۔

متاخرین کا خیال ہے کہ عشق دونوں عالم میں صرف اسی کے لئے روا ہو سکتا ہے جو ذات حق کے ادراک کا طلب گار ہو۔ ادراک ذات حق دائرہ امکان سے باہر ہے اس لئے ذات حق سے محبت واخلاص ممکن ہے عشق روا نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کا انحصار دید پر ہے محبت صرف سننے سے بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ عشق کا تعلق نظر سے ہے اس لئے ذات حق سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے متعلق صرف سنا ہے اس لئے سب نے دعویٰ کر دیا۔ کیونکہ سب کو اذن گفتگو ہے۔ ذات حق محسوس نہیں ہو سکتی اور احاطہ ادراک سے باہر ہے اس لئے عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ اپنے افعال اور صفات سے اپنے اولیاء پر احسان اور رحمت کرتا ہے۔ اس کی صفات سے محبت درست ہے۔ جب

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں فراق کے کرب میں مبتلا تھے تو پیراہن یوسف کی خوشبو سے آپ کی آنکھوں کا نور واپس آ گیا۔ زلیخا عشق یوسف میں فنا تھی۔ جب تک دولت وصال میسر نہ آئی اس کی آنکھیں روشن نہ ہوئیں یہ طرفہ طریق ہے ایک ہوا و ہوس میں مبتلا ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ ذات حق میں کوئی تناقض نہیں اور عشق بھی تناقض سے معرا ہوتا ہے اس لئے عشق ذات حق کے لئے روا ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں بہت سی لطیف باتیں ہیں مگر بخوف طوالت اتنے ہی بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

فصل، حقیقت محبت

حقیقت محبت کے بارے میں مشائخ کبار کے بیان کردہ رموز اتنے ہیں کہ معرض بیان میں نہیں آسکتے۔ میں ان کے اقوال میں سے چند ٹکڑے بیان کرتا ہوں تا کہ حق تعالیٰ کو منظور ہو تو یہ چیز باعث برکت ہو۔

استاد ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "محبت، محبت کرنے والے کی صفات کا محو ہونا اور محبوب کی ذات کا ثبوت ہونا ہے۔" یعنی محبت یہ ہے کہ محبّ اپنے تمام اوصاف کی طلب محبوب میں اس کی اثبات ذات کے لئے نفی کر دے۔ محبوب باقی ہے اور محبت کرنے والا فانی۔ ضروری ہے کہ محبت کرنے والا بپاس غیرت دوستی اپنی نفی سے بقائے محبوب کو ثابت کرے، تا کہ اسے مکمل ولایت حاصل ہو۔ ذات محبوب کا اثبات محبت کرنے والے کی صفات کے فنا ہونے سے وابستہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ محبت کرنے والا اپنی صفات میں قائم رہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی صفات پر قائم ہے تو گویا جمال محبوب سے بے نیاز ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی جمال محبوب ہے اس واسطے وہ اپنی صفات کی نفی کا طالب ہوتا ہے کیونکہ اپنی صفات کی موجودگی میں وہ محبوب سے محجوب ہوتا ہے پس محبت حق میں وہ اپنا دشمن ہوتا ہے جب حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کو دار پر لٹکایا گیا تو آخری [illegible] تھے: "صاحب حال کی محبت

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو واحد کہے۔" محبت کرنے والے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ محبت کے راستے میں مٹ جائے اور وہ اپنے حال میں نفس کے طغیان سے محفوظ ہو جائے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "محبت یہ ہے کہ اپنے بہت کو تھوڑا اور حبیب کے تھوڑے کو بہت سمجھا جائے۔" یہی معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ دنیا کی نعمتوں کو اس نے تھوڑا کہا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا، قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (النساء:77) "اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے کہو دنیا کا مال و متاع قلیل ہے۔" پھر تھوڑی عمر، تھوڑی جگہ اور تھوڑے سامان کے ہوتے ہوئے بندوں کے ذکر کرنے کو کثیر کہا۔ چنانچہ فرمایا، وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ (الاحزاب:35) "اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔" تاکہ لوگ جان لیں کہ دوست در حقیقت وہی ہے۔ یہ صفت خلقت کے لئے رَوا نہیں۔ حق تعالیٰ سے جو کچھ پہنچتا ہے اس میں کوئی چیز تھوڑی نہیں۔ انسان کی طرف سے جو کچھ بھی ہے وہ تھوڑا ہے۔

شیخ سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، محبت یہ ہے کہ تو محبوب کی طاعت سے ہمکنار رہے اور مخالفت سے اعراض کرے۔" جب دل میں محبت قوی ہو تو طاعت دوست سہل ہو جاتی ہے یہ ملحدین کی اس جماعت کی تردید ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ محبت میں بندہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں طاعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ سراسر الحاد ہے۔ کیونکہ اگر عقل صحیح کام کر رہی ہے تو شرعی تکلیف ساقط نہیں ہوتی۔ تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اگر عقل و صحت کے ہوتے ہوئے کسی ایک شخص کے لیے ساقط سمجھی جائے تو سب کے لئے یکساں طور پر ساقط ہو گئی یہ بالکل زندقہ ہے۔ البتہ فاتر العقل اور دیوانے کی دوسری بات ہے اور اس کے لئے عذر بھی موجود ہے۔ یہ روا کہ حق تعالیٰ کسی بندے کو دوستی کا وہ مقام عطا کرے جہاں طاعت کی تکلیف کا احساس ختم ہو جائے۔ کسی بات کی تکلیف بمقدار محبت ہوتی ہے۔ محبت جتنی قوی ہو گی طاعت کی تکلیف کو برداشت کرنا اتنا ہی سہل ہو گا۔ یہ بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال

سے ظاہر ہے۔ جب حق تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ''لَعَمْرِکَ'' تو آپ نے اتنی عبادت کی کہ پاؤں پر ورم آ گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا، طٰهٰ ﴿١﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿٢﴾ (طٰہٰ) ''ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ ناقابل برداشت تکلیف اٹھائیں۔'' یہ بھی روا ہے کہ فرمان حق ادا کرنے کی حالت میں ادا کرنے کا تصور محو ہو جائے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً(1) ''میرے دل پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور میں ہر روز ستر بار استغفار کرتا ہوں۔'' حضور ﷺ کی نظر اپنے فعل اور اپنی ذات پر نہیں تھی یعنی پندار طاعت سے بری تھے۔ ہمیشہ احکام خداوندی کی تعظیم پیش نظر ہوتی تھی اور یوں فرماتے تھے کہ میری طاعت سزاوار حق نہیں۔

سمنون محبّ فرماتے ہیں۔ ذهب المحبون لِلّٰه بشرف الدنيا والآخرة لأنّ النّبى ﷺ قال: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ(2)۔ ''دوستان حق دونوں عالم کی بزرگی کے حق دار ہیں کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر آدمی اپنے دوست کے ساتھ ہوگا۔''

دوستان حق دنیا و عقبیٰ میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہیں انہیں کوئی گھاٹا نہیں۔ دنیا کا شرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور آخرت کا یہ کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں گے۔

یحیٰی بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''محبت کی حقیقت نہ جفا سے کم ہوتی ہے نہ عطا و مرحمت سے زیادہ ہوتی ہے۔'' کیونکہ یہ دونوں پہلو محبت کے اسباب ہیں اور اسباب اصل چیز کے ہوتے ہوئے بے سروپا ہوتے ہیں۔ دوست سے پہنچی ہوئی مصیبت دوست کے لئے وجہ مسرت ہوتی ہے۔ محبت کی راہ میں جفا و وفا کا کوئی فرق نہیں۔ محبت حاصل ہو تو جفا بھی وفا اور وفا بھی جفا ہے۔

مشہور ہے کہ شبلی کو تہمت جنون میں شفا خانے میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ لوگ زیارت کے لئے آئے۔ آپ نے فرمایا ''تم لوگ کون ہو؟'' لوگوں نے کہا: ''آپ کے دوست۔''

1۔ صحیح مسلم 2۔ صحیح بخاری و مسلم

آپ نے ان پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ سب بھاگ گئے۔ آپ نے فرمایا "اگر تم میرے دوست ہوتے تو راہ فرار کیوں اختیار کرتے بلکہ میری اس زیادتی پر صبر کرتے۔" دوست تو دوست کی دی ہوئی تکلیف سے نہیں بھاگا کرتے۔ الغرض اس موضوع پر بہت سی باتیں ہیں میں اسی قدر بیان کرنا پسندیدہ سمجھتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

چھٹا کشف حجاب، زکوٰۃ

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (البقرہ:43) "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔" اس سے متعلق بہت سی آیات واحادیث ہیں۔ زکوٰۃ، ارکان وفرائض اسلام میں شامل ہے۔ جس پر واجب ہو اس پر واجب ہے اور اس سے روگردانی روا نہیں۔ زکوٰۃ اتمام نعمت پر واجب ہوتی ہے یعنی جب ۲۰۰ درہم جو نعمت ہے کسی کے تصرف میں ہوں اور ایک سال گذرنے کے باوجود ان کی ضرورت نہ پڑے تو اس پر پانچ درہم زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے بیس دینار سونا بھی نعمت تمام ہے اور اس پر نیم دینار واجب الادا ہے۔ پانچ اونٹ بھی نعمت تمام ہے اور اس پر ایک بھیڑ یا بکری زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ باقی جو اموال اسی طرح ہوں ان پر زکوٰۃ واجب الادا ہے۔ یاد رکھو مال کی طرح "مرتبہ" پر بھی زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ وہ بھی نعمت تمام ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ عَلَیْکُمْ زَکٰوۃَ جَاھِکُمْ کَمَا فَرَضَ عَلَیْکُمْ زَکٰوۃَ مَالِکُمْ (1) "حق تعالیٰ نے تمہارے اوپر جاہ و مرتبہ کی زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جس طرح مال کی زکوٰۃ فرض ہے۔" اور نیز فرمایا: اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ زَکٰوۃٌ وَ زَکٰوۃُ الدَّارِ بَیْتُ الضِّیَافَۃِ (2) "ہر چیز کی زکوٰۃ ہے مثلاً گھر کی زکوٰۃ مہمان خانہ ہے۔" زکوٰۃ در حقیقت شکر نعمت ہے تندرستی بڑی نعمت ہے۔ ہر عضو کی زکوٰۃ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے تمام اعضاء کو مشغول عبادت رکھے اور صرف کھیل کود کیلئے وقف نہ کر دے تا کہ زکوٰۃ نعمت کا حق ادا ہو۔ باطنی نعمتوں کی بھی زکوٰۃ ہے۔ سب کی حقیقت احاطہ بیان میں نہیں آسکتی۔ جو چیز بھی کثرت سے ہو اس کی کثرت کے مطابق

1۔ الفوائد المجموعہ 2۔ الجامع الصغیر

زکوٰۃ واجب ہے۔ زکوٰۃ دراصل ظاہری اور باطنی نعم کا عرفان ہے۔ جب بندہ سمجھتا ہے کہ اس پر نعمت حق تعالیٰ بے شمار ہے تو وہ شکر نعمت بھی بے حساب کرتا ہے۔ بے حساب شکر نعمت بھی بے حساب نعمت ہے۔

اہل تصوف کے نزدیک مال دنیا کی زکوٰۃ کچھ ایسی قابل ستائش نہیں ہوتی۔ بخل انسان کے لئے مذموم ہے اور دو سو درہم بچا کر اپنی ملکیت میں سال بھر محفوظ رکھنا مکمل بخل ہے اور اس کے بعد صرف پانچ درہم ازراہ زکوٰۃ نکالنا اہل کرم مال بانٹتے ہیں اور سخاوت کرتے رہتے ہیں زکوٰۃ ان پر کس طرح واجب ہو سکتی ہے۔

کہتے ہیں کسی عالم نے ازراہ آزمائش حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے زکوٰۃ سے متعلق پوچھا، آپ نے فرمایا: جب بخل موجود ہو اور مال حاصل ہو تو دو سو درہم میں سے پانچ دینے واجب ہیں یعنی تمہارے مذہب کے مطابق بیس دینار میں سے نصف دینار دینا چاہئے۔ میرے مذہب میں کوئی ملکیت نہیں بنانا چاہئے تاکہ زکوٰۃ کے معاملہ میں آزاد ہو جائے۔ یہ سن کر اس عالم نے دریافت کیا: اس مسئلہ میں آپ کا امام کون ہے؟ فرمایا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب راہ حق میں دے دیا اور جب پیغمبر ﷺ نے پوچھا: "اپنے اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑا؟" عرض کی "اللہ اور اس کا رسول (1)۔" حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک شعر روایت ہے۔

فما وجبت علی زکوۃ مال وھل تجب الزکوۃ علی جواد

"مجھ پر مال کی زکوٰۃ واجب نہیں اور کیا سخی پر زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے؟"

اہل کرم کا مال خرچ کے لئے ہوتا ہے اور ان کا خون معاف ہوتا ہے۔ نہ وہ مال میں بخل کرتے ہیں نہ خون پر خصومت کیونکہ ان کی ملک ہی میں کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی جہالت کا مرتکب ہو اور یہ کہے کہ میرے پاس مال ہی نہیں لہٰذا مجھے زکوٰۃ سے متعلق علم کی ضرورت نہیں تو یہ سخت غلطی ہے۔ علم حاصل کرنا ہر مومن پر فرض ہے اور علم سے روگرداں ہونا کفر

1۔ ترمذی، ابوداؤد

ہے۔ دور حاضر کی خرابیوں میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ نیکی اور فقر کے مدعی اپنی جہالت میں رہ کر علم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

ایک موقع پر میں مبتدی صوفیوں کی ایک جماعت کو فقہ پڑھا رہا تھا۔ ایک جاہل آ گیا۔ اس وقت اونٹوں کی زکوٰۃ پر مسائل بیان ہو رہے تھے۔ اونٹ کے تین سالہ، دو سالہ اور چار سالہ بچے کا ذکر تھا۔ وہ جاہل تنگ آ گیا اور اٹھ کر کہنے لگا۔ میرے پاس کوئی اونٹ نہیں کہ مجھے اونٹ کے تین سالہ بچے وغیرہ کا علم درکار ہو۔ میں نے اسے سمجھایا، بھلے آدمی! جتنا علم زکوٰۃ دینے کے لئے درکار ہے اتنا ہی زکوٰۃ لینے کے لئے بھی چاہئے۔ اگر کوئی شخص تجھے اونٹ کا تین سالہ بچہ دے تو تجھے بھی تین سالہ بچے سے متعلق علم ہونا چاہئے۔ اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور وہ مال کا ضرورت مند ہو تو بھی علم کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ جہالت سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔

فصل: ایک نکتہ کی وضاحت

صوفیہ مشائخ میں سے بعض نے زکوٰۃ لی ہے اور بعض نے نہیں لی۔ جنہوں نے فقر از خود اختیار کیا ہوا تھا زکوٰۃ نہیں لی اور اس خیال سے کہ نہ ہم مال جمع کریں گے نہ ہمیں زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ اہل دنیا سے ہم نہیں لیتے تا کہ ان کا ہاتھ اونچا اور ہمارا نیچا نہ ہو۔ جن کا فقر مجبوراً غربت کی وجہ سے تھا انہوں نے زکوٰۃ لی اپنی ضرورت کے لئے نہیں بلکہ مسلمان بھائی کی گردن سے قرض کا بوجھ اتارنے کے لئے۔ اس نیت کے پیش نظر ان کا ہاتھ اونچا رہا دینے والے کا نہیں۔ اگر دینے والے کا ہاتھ بلند تر ہوتا تو یہ صورت باطل ہوتی۔ بقولہ تعالیٰ، وَ یَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (توبہ:104) "وہ صدقات وصول کرتا ہے۔" اس طرح لازم ہوتا کہ زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ لینے والے سے افضل ہے حالانکہ یہ اعتقاد صریح گمراہی ہے ہاتھ اس کا بلند ہے جو واجب کی تکمیل کے لئے مسلمان بھائی کی گردن پر سے بوجھ اٹھالے فقراء دنیا دار نہیں ہوتے ان کی نظر عقبیٰ پر ہوتی ہے اور عقبیٰ پر نظر رکھنے والے اگر اہل دنیا کی گردن سے بوجھ نہ اٹھائیں تو قیامت کے دن اس کوتاہی کے لئے وہ جوابدہ ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے

اہل عقبیٰ کا مناسب اور آسان امتحان لیا ہے تا کہ ان کے ذریعہ اہل دنیا اپنا بوجھ اتار سکیں۔ یقیناً ہاتھ فقراء ہی کا بلند ہوتا ہے جو احکام شریعت کے مطابق اس شخص سے حق لیتے ہیں جس پر باری تعالیٰ کا حق واجب ہوتا ہے۔ اگر زکوٰۃ لینے والوں کا ہاتھ نیچا ہوتا جیسے حشویہ لوگوں کی ایک جماعت کا خیال ہے تو چاہئے تھا کہ پیغمبروں کا ہاتھ بھی نیچا ہوتا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں سے وصول کرتے ہیں اور حسب شرائط اس کا صحیح مصرف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ غلطی پر ہیں اور نہیں جانتے کہ پیغمبر امر الٰہی کے مطابق زکوٰۃ لیتے ہیں۔ پیغمبروں کے بعد دین کے امام بھی اسی طریق پر عمل پیرا رہے ہیں اور بیت المال کا حق لیتے رہے ہیں۔ جو کوئی زکوٰۃ لینے والے ہاتھ کو نیچا اور زکوٰۃ دینے والے ہاتھ کو اونچا سمجھتا ہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ ان باتوں کو تصوف میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے جود وسخا کا قریبی تعلق ہے۔ اس لئے میں جود وسخا سے متعلق بھی کچھ بیان کئے دیتا ہوں۔ وباللہ التوفیق والعصمۃ

سترہواں باب

جود وسخا

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِنَ الْجَنَّةِ وَبَعِیْدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ قَرِیْبٌ مِنَ النَّارِ وَبَعِیْدٌ مِنَ الْجَنَّةِ(1) ۔ ''سخی بہشت کے قریب اور دوزخ سے بعید ہے۔ بخیل دوزخ کے قریب اور بہشت سے بعید ہے''۔ علماء کے نزدیک انسانی صفات کے بارے میں جود وسخا دونوں ایک مفہوم کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کو جواد کہتے ہیں، سخی نہیں کہتے۔ اور حق تعالیٰ نے اپنا یہ نام ظاہر نہیں فرمایا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث بھی اس پر ناطق نہیں۔ تمام امت اور اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حق تعالیٰ کا عقل اور نعت کی رو سے کوئی ایسا نام نہیں رکھنا چاہئے جس پر کتاب اور سنت گواہ نہ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ عالم ہے اور اس پر اجماع امت ہے کہ اسے عالم کہنا چاہئے۔ لیکن ہم عاقل اور فقیہ نہیں کہہ سکتے حالانکہ تینوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہم اسے عالم کہتے ہیں کیونکہ اس کے لئے توقیف موجود ہے۔ باقی دو نام اس کے لئے استعمال نہیں کرتے کیونکہ توقیف موجود نہیں۔

بعض لوگ جود وسخا میں فرق بیان کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ سخی سخاوت کرتے وقت اپنے پرائے کی تمیز برقرار رکھتا ہے اور اس کا فعل کسی دنیوی غرض یا سبب کی بناء پر ہوتا ہے۔ یہ سخاوت کا ابتدائی مقام ہے۔ جواد سخاوت میں اپنے بیگانے کی تفریق نہیں کرتا اور اس کی سخاوت بے غرض اور بلا سبب ہوتی ہے۔ یہ چیز دو پیغمبروں کے حال سے نمایاں ہے یعنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت محمد حبیب اللہ صلوات اللہ علیہم۔ احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک دستر خوان پر کوئی مہمان نہ ہوتا۔

1۔ سنن ترمذی

ایک دفعہ تین روز گذر گئے۔ کوئی مہمان وارد نہ ہوا۔ بالآخر کوئی آتش پرست دروازے پر آیا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا میں آتش پرست ہوں۔ آپ نے فرمایا: چلے جاؤ تم میرے مہمان ہونے کے قابل نہیں ہو۔ حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ ہم نے اس شخص کی ستر برس تک پرورش کی اور تم سے یہ بھی نہ بن پڑا کہ اسے ایک روٹی دے دو۔ اس کے برعکس جب حاتم کا بیٹا ''عدی'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چادر اس کے لئے بچھا دی اور فرمایا: اِذَا اَتَاکُمْ کَرِیْمٌ فَاَکْرِمُوْہُ(1) ''کسی قوم کا بھی کوئی صاحب کرم شخص آئے تو اس کی تکریم کرو۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیگانے کی تفریق کو پیش نظر رکھا اور ایک غیر مذہب والے کو ایک نان بھی دینے سے دریغ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرق نظر انداز کر دیا اور اپنی چادر کا فرش کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام سخاوت تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جود کا۔

اس معاملے میں سب سے اچھا راستہ یہ ہے کہ خیال اول پر عمل پیرا ہونے کو جود کہتے ہیں۔ دوسرا خیال پہلے کو مغلوب کر دے تو گویا بخل رونما ہو جاتا ہے۔ کامگار لوگوں کے نزدیک خیال اول کو ترجیح دینا چاہئے کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

کہتے ہیں نیشاپور میں ایک سوداگر تھا جو اکثر حضرت شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضری دیا کرتا تھا۔ ایک دن شیخ نے کسی درویش کے لئے کچھ طلب کیا۔ سوداگر کا بیان ہے کہ اس وقت اس کے پاس ایک دینار اور ایک چھوٹا چاندی کا سکہ تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ دینار دے دے۔ پھر خیال آیا کہ چاندی کا سکہ دینا چاہئے۔ چنانچہ وہی دے دیا۔ جب شیخ فارغ ہو کر باتیں کرنے لگے تو سوداگر نے پوچھا: ''کیا حق تعالیٰ سے تنازع کرنا روا ہے؟'' شیخ نے فرمایا: ''تو نے ابھی ابھی حق تعالیٰ سے تنازع کیا۔ اس کا حکم تھا مانگنے والے کو دینار دو مگر تم نے چاندی کا سکہ دیا۔

کہتے ہیں حضرت عبداللہ رودباری رحمۃ اللہ علیہ کسی مرید کے گھر پر آئے وہ گھر پر موجود

1۔ سنن ابن ماجہ

نہیں تھا۔ آپ کے حکم کے مطابق اس کے گھر کا سارا سامان فروخت کر دیا گیا۔ جب مرید گھر پر آیا تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور شیخ طریقت کی خوشنودی کے پیش نظر ایک حرف بھی زبان پر نہ لایا۔ اس کی بیوی آ گئی۔ جب اس نے صورت حال دیکھی تو گھر کے اندر جا کر اپنے کپڑے اتار کر پھینک دیئے اور کہا کہ یہ بھی گھر کے سامان میں شامل ہیں اور ان پر بھی وہی حکم لاگو ہوتا ہے۔ مرد نے چلا کر کہا یہ تکلف ہے اور تو اپنے اختیار سے کر رہی ہے۔ یہ شیخ کا حکم نہیں۔ عورت نے کہا شیخ نے جو کچھ کیا وہ اس کا جود تھا۔ ہمیں بھی چاہئے کہ تکلیف برداشت کریں تا کہ ہمارا جود بھی ظاہر ہو۔ آدمی نے کہا، یہ صحیح ہے مگر ہم نے شیخ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے اس نے جو کچھ کیا وہ ہمارے لئے عین جود تھا۔ جو انسانی صفت ہونے کی حیثیت سے محض تکلف اور مجاز ہوتا ہے۔ مرید کو ہمیشہ اپنی ملکیت اور اپنے نفس کو امر حق کے موافق صرف کرنا چاہئے۔ اس لئے سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا الصوفی دمه هدر و ملكه مباح ''صوفی کا خون حلال اور اس کی ملکیت عام لوگوں کے لئے جائز ہے۔''

شیخ ابو مسلم فارسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک جماعت کے ساتھ حجاز کو جا رہا تھا حلوان کے قریب کردوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہماری گدڑیاں چھین لیں۔ میں ان سے الجھنے کی بجائے ان کی دل جوئی کرتا رہا۔ ہمارے درمیان ایک آدمی تھا جو قدرے مضطرب تھا۔ ایک کرد نے اس پر تلوار کھینچ لی اور اس کو قتل کرنے کے لئے بڑھا۔ ہم سب نے مل کر اس کی سفارش کی مگر کرد نے کہا اس جھوٹے کو زندہ چھوڑنا روا نہیں میں تو اسے ضرور قتل کروں گا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا یہ صوفی نہیں۔ اولیاء کی صحبت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کرد نے جواب دیا صوفیوں کے لئے کمترین درجہ یہ ہے کہ وہ جود کریں۔ اس کی گدڑی میں چند ٹکڑے ہیں۔ یہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس قدر جھگڑا کرتا ہے صوفی نہیں ہو سکتا۔ ہم ایک مدت سے تمہاری خدمت کر رہے ہیں تمہیں راستے میں لوٹ کر دنیا کے تعلقات سے آزاد کر دیتے۔

کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بار کسی نخلستان کے قریب ایک

جماعت سے ملے۔ دیکھا کہ ایک حبشی غلام بھیڑ بکریاں چرا رہا ہے۔ ایک کتا آ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ غلام نے روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی۔ پھر اسی طرح دوسری اور تیسری بھی ڈال دی۔ عبداللہ نے بڑھ کر پوچھا تجھے ہر روز کتنی روٹیاں ملتی ہیں؟ غلام نے جواب دیا: جتنی آپ نے دیکھیں آپ نے کہا ساری روٹیاں تو نے کتے کے آگے ڈال دیں ہیں غلام نے کہا جی ہاں۔ دراصل یہ کتوں کی جگہ نہیں۔ خبر نہیں وہ کتنی دور سے اس امید پر آیا ہے۔ میں اس کی تکلیف کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی اور آپ نے غلام کو بھیڑ بکریوں اور نخلستان سمیت خرید لیا۔ پھر غلام کو راہ خدا میں آزاد کر کے سب کچھ اس کے سپرد کر دیا۔ غلام نے آپ کو دعا دی اور بھیڑ بکریاں وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے کر وہاں سے چلا گیا۔

روایت ہے کہ کوئی شخص حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے پر گیا اور عرض کی اے فرزند رسول! میرے ذمے چار سو درہم چاندی قرض ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اسی وقت چار سو درہم دینے کا حکم دیا اور خود روتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ لوگوں نے پوچھا آپ کیوں روتے ہیں؟ فرمایا اس لئے کہ میں نے اس شخص کا پہلے حال کیوں نہ دریافت کیا تا کہ اسے سوال کرنے کی ذلت برداشت نہ کرنا پڑتی۔

کہتے ہیں حضرت ابو سہل صعلوکی رحمۃ اللہ علیہ کبھی کسی درویش کے ہاتھ میں صدقہ نہیں دیتے تھے اور جو کچھ دینا ہوتا تھا اس کے ہاتھ پر نہیں رکھتے تھے بلکہ زمین پر رکھ دیتے تھے تا کہ وہ خود اٹھا لے۔ آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ دنیوی مال کی اتنی وقعت نہیں کہ کسی کے ہاتھ پر رکھا جائے اور اس کی وجہ سے میرا ہاتھ اونچا اور اس کا نیچا ہو۔

روایت ہے کہ فرمانروائے حبشہ نے دو سیر مشک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے سب کا سب پانی میں ڈال دیا اور اپنے اصحاب پر چھڑک دیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آیا اور آپ نے اسے دو پہاڑیوں کے درمیان ایک وادی بمع بھیڑ بکریوں کے عطا فرمائی۔ اس نے اپنے قبیلے کے

لوگوں کو جا کر کہا، مسلمان ہو جاؤ۔ پیغمبر ﷺ ایسے سخی ہیں کہ عطا کرتے وقت اپنے فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک بار حضور ﷺ کے پاس اسی ہزار درہم آئے۔ آپ نے اپنی جھولی میں ڈال لئے اور جب تک سب تقسیم نہ ہو گئے اپنی جگہ سے نہیں اٹھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو ایک بار ایسی حالت میں دیکھا کہ آپ نے بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا۔

میں نے متاخرین میں سے ایک درویش کو دیکھا۔ کسی بادشاہ نے تین سو درہم وزنی سونا اسے بھیجا۔ وہ ایک حمام میں گیا اور سب کا سب سونا اہل حمام کو دے دیا۔

قبل ازیں نوری فرقہ کے بیان میں ایثار کے ضمن میں کچھ حکایات لکھی جا چکی ہیں یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

ساتواں کشف حجاب، روزہ

خدائے عزوجل نے فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ (البقرہ:183) ''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نے خبر دی کہ حق تعالیٰ نے فرمایا، الصوم لی وانا اجزی بہ ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔'' روزہ ایک باطنی عبادت ہے جس کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں کوئی غیر اس میں حصہ دار نہیں ہوتا اور اسی لئے اس کی جزا بھی عظیم ہے۔ لوگوں کا داخلہ بہشت میں رحمت الٰہی سے ہوگا۔ درجات بقدر عبادات ملیں گے۔ مگر ہمیشہ بہشت میں رہنے کا ضامن روزہ ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے خود اس کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: الصوم نصف الطریقۃ ''روزہ آدھی طریقت ہے۔'' میں ایسے مشائخ کرام سے ملا ہوں جو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور کچھ ایسے بزرگوں سے بھی ملا ہوں جو صرف ماہ رمضان میں روزے رکھتے تھے اور یہ (ماہ رمضان کے روزے) طلب اجر کے لئے تھے۔ غیر رمضان روزہ نہ رکھنا ترک اختیار خود اور ترک ریا کے

لئے تھا۔ یہ بھی دیکھا کہ بعض مشائخ نفلی روزہ رکھتے ہیں مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی اور اگر کوئی کھانا لے آیا تو کھا لیتے ہیں۔ یہ بات سنت سے زیادہ قریب ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک روز پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر پر تشریف لائے تو دونوں نے عرض کی: ہم نے آپ کے لئے (کھجور کا حلوہ) تیار کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آج میرا ارادہ روزے کا تھا مگر لے آ۔ میں روزہ کسی اور دن رکھ لوں گا۔ میں نے دیکھا کہ مشائخ ایام بیض (ہر ماہ کی تیرہ، چودہ، اور پندرہ) ماہ مبارک (محرم) سے رجب اور شعبان تک کے ہر عشرہ میں روزہ رکھتے تھے۔ یہ بھی دیکھا کہ داؤد علیہ السلام روزہ رکھتے تھے جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیر الصیام کہا ہے اور وہ ایک دن روزہ رکھا جاتا ہے اور دوسرے دن افطار کیا جاتا ہے۔

میں ایک دفعہ شیخ احمد بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا ان کے سامنے ایک حلوے کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی اور وہ کھا رہے تھے۔ مجھے بھی اشارہ کیا۔ میں نے بچوں کی عادت کے مطابق اظہار کر دیا کہ روزے سے ہوں، پوچھا کیوں؟ میں نے عرض کی فلاں بزرگ کی موافقت میں۔ فرمایا مخلوق کو کسی مخلوق کی موافقت درست نہیں۔ میں نے روزہ توڑنے کا ارادہ کیا تو فرمایا یہ بھی غلط ہے۔ اگر اس بزرگ کی موافقت سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہو تو میری موافقت بھی نہ کرو۔ میں بھی مخلوق ہوں۔ دونوں پہلو برابر ہیں۔ روزہ درحقیقت نفس کو روکنا ہے (امساک) ساری طریقت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ روزہ کا کمترین پہلو بھوکا رہنا ہے۔ والجوع طعام اللہ فی الأرض "بھوک زمین پر حق تعالیٰ کا طعام ہے۔" بھوک سب زمانوں میں اور ہر قوم میں شرعاً اور عقلاً پسندیدہ ہے۔ رمضان کے ایک ماہ کے روزے ہر عاقل و بالغ، تندرست اور مقیم مسلمان پر فرض ہیں۔ ان کی ابتدا ماہ رمضان کا چاند دیکھ کر ہوتی ہے اور اختتام ماہ شوال کا چاند دیکھ کر۔ ہر روزے کے لئے درست نیت اور سچی شرط لازمی ہے۔ نفس کو روکنے کی بہت سی شرائط ہیں مثلاً پیٹ کو کھانے سے بچانا۔ آنکھ کو نظر شہوت سے۔ کان کو غیبت سننے سے۔ زبان کو لغو اور بیہودہ باتوں سے۔

جسم کو دنیا کی پیروی اور شریعت کی مخالفت سے۔ صرف ان شرائط کی تکمیل کی صورت میں روزہ درست ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا: ''جب تو روزہ رکھے تو تیرے کان، آنکھ، زبان، ہاتھ الغرض تیرا ہر عضو روزہ دار ہونا چاہئے۔'' اور نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو روزہ سے بھوک و پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

میں (علی بن عثمان جلابی) نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے وصیت فرمائیے۔'' آپ نے فرمایا ''اپنی زبان اور دیگر حواس کو محبوس رکھ۔'' حواس کو حبس میں رکھنا ہی مکمل مجاہدہ ہے۔ جملہ علوم حواس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ حواس دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کی قوتیں ہیں۔ حواس علم و عقل کے سالار ہیں۔ چار حواس کا مقام مخصوص ہے اور ایک حس سارے بدن میں پھیلی ہوئی ہے۔ آنکھ نظر کا مقام ہے اور یہ رنگ و اجسام کو دیکھتی ہے۔ کان شنوائی کا محل ہے اور آواز کو سنتا ہے۔ حلق ذائقہ کا محل ہے اور بامزہ اور بے مزہ چیز میں امتیاز کرتا ہے۔ ناک سونگھنے کا محل ہے اور خوشبودار اور بدبودار اشیاء میں تمیز کرتا ہے۔ لمس یعنی چھونے کا کوئی خاص محل نہیں۔ تمام اعضائے جسم گرمی، سردی، نرمی اور سختی محسوس کرتے ہیں۔ بدیہی اور الہامی امور کے سوا ہر چیز کا علم ان حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ الہامی امور ہر خرابی سے معرا ہوتے ہیں مگر حواس خمسہ سے صفائی بھی ہوتی ہے اور کدورت بھی۔ جس طرح، عقل اور روح کو حواس میں دخل ہے بالکل اسی طرح نفس اور خواہشات نفس اور وہم کو بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں طاعت و معصیت، سعادت و شقاوت میں حواس کی حیثیت مشترک آلہ کار کی ہے کان اور آنکھ کے لئے دوستی حق نیک چیزوں کو سننا اور دیکھنا ہے۔ نفس پرستی لغویات کو سننا اور نظر شہوت رکھنا ہے۔ چھونے، چکھنے اور سونگھنے میں دوستی حق احکام حق کے مطابق چلنا اور سنت کی پیروی کرنا ہے اور نفس پرستی فرمان حق اور احکام شریعت کی مخالفت ہے۔ روزہ دار کو چاہئے کہ وہ ہر حالت میں ان پانچ حواس کو قابو میں رکھے۔ احکام خداوندی

کی مخالفت چھوڑ کر شریعت کی مکمل پیروی کرے تا کہ صحیح روزہ دار کہلانے کا مستحق ہو۔ صرف کھانے پینے سے پرہیز کرنے کا روزہ بچوں اور بوڑھی عورتوں کا کام ہے۔ روزہ دراصل ماسوا کو پناہ گاہ سمجھنے سے احتراز، غیر اسلامی طور طریقوں اور ممنوعات ونواہی سے بچنے کا نام ہے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ (الانبیاء:8) ''ہم نے ان کے (انسانوں کے) جسم ایسے نہیں بنائے کہ وہ کھائے پئے بغیر رہ سکیں۔'' اور فرمایا۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ (المومنون) ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور یقیناً تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' ہم نے طبائع کو ضرورت مند بنایا ہے اور مخلوق کو کھیل کود کی خاطر پیدا نہیں کیا۔

پس روزہ لہو اور لقمہ حرام سے بچنے کا نام ہے صرف اکل حلال سے بچنا روزہ نہیں مجھے تعجب ہے ایسے آدمی پر جو فرضی روزہ کا تارک ہو اور نفلی روزہ رکھے۔ فرضی روزہ کو ترک کرنا تو نافرمانی ہے اور نافرمانی گناہ ہے ہمیشہ نفلی روزہ رکھنا محض سنت ہے اس شقاوت سے خدا کی پناہ مانگنا چاہئے۔

جب کوئی انسان حق تعالیٰ کی نافرمانی سے مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ ہر حال میں روزہ دار ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ پیدائش کے دن روزہ سے تھے اور وفات کے دن بھی روزہ دار تھے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہے؟ جواب ملا کہ آپ نے روز پیدائش تا نماز شام دودھ نہیں پیا۔ وفات کے دن ایسے ہی روزہ رکھا ہوا تھا۔ اس روایت کے ابوطلحہ مالکی راوی ہیں۔

روزۂ وصال (نفلی روزوں کو متواتر رکھنے) سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزۂ وصال رکھا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے موافقت کی۔ آپ نے فرمایا تم لوگ روزۂ وصال نہ رکھو۔ ''میں تم میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہوں میں اپنے مولا کے پاس رات بسر کرتا ہوں۔ وہ مجھے کھانے پینے کو دیتا ہے۔'' اہل مجاہدہ کہتے

ہیں کہ آپ نے ازراہ شفقت منع فرمایا۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے روزۂ وصال خلاف سنت ہے۔ درحقیقت روزۂ وصل ممکن ہی نہیں کیونکہ دن گذر جائے تو رات کو روزہ نہیں ہوتا اور اگر روزہ کی نیت رات کو کی جائے تو وصال نہیں رہتا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر پندرہ روز کے بعد کھانا کھاتے تھے اور ماہ رمضان میں عید تک کچھ نہیں کھاتے تھے۔ ہر رات چار سو رکعت نوافل ادا کرتے تھے۔ بظاہر یہ چیز انسانی طاقت سے باہر معلوم ہوتی ہے اور بجز توفیق الٰہی کے ناممکن ہے۔ دراصل توفیق حق ہی غذا ہو جاتی ہے۔ ایک دنیوی غذا پر جیتا ہے دوسرا تائید حق پر۔

طاؤس الفقراء شیخ ابونصر رحمۃ اللہ علیہ "صاحب کتاب اللمع" سے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ ماہ رمضان میں بغداد پہنچے۔ مسجد شونیزیہ میں آپ کو ایک الگ حجرہ مل گیا اور درویشوں کی امامت بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ عید تک امامت کراتے رہے۔ تراویح میں آپ نے پانچ بار قرآن دہرایا۔ ہر شام خادم ایک نان حجرہ میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ عید کے دن آپ تشریف لے گئے خادم نے دیکھا تو تیس کی تیس روٹیاں حجرہ میں اسی طرح موجود تھیں۔

علی بن بکار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حفص مصیصی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ رمضان میں آپ نے پندرہویں روزے کے علاوہ کسی دن کچھ نہیں کھایا۔

ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ رمضان میں آپ نے شروع سے اخیر تک کچھ نہیں کھایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ہر روز گندم کاٹنے کی مزدوری کرتے۔ جو کچھ مزدوری کماتے تھے درویشوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شب بھر نوافل ادا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا۔ نہ انہوں نے کچھ کھایا نہ سوئے۔

شیخ عبداللہ بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے پہلے چالیس چلے پے در پے کاٹے۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہر سال جنگل میں دوبار چلہ کیا کرتے تھے۔

دانشمند ابومحمد بایغزی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے وقت میں حاضر تھا۔ اسی روز سے آپ

نے کچھ نہیں کھایا تھا اور نماز باجماعت ادا کی تھی۔

میں نے متاخرین میں سے ایک بزرگ کو دیکھا اسی روز تک دن رات فاقہ کیا اور کوئی نماز بغیر جماعت ادا نہیں کی۔

مرو میں دو بزرگ تھے۔ مسعود اور ابو علی سیاہ۔ مسعود نے ابو علی کو پیغام بھیجا۔ یہ فقر کا دعویٰ کب تک؟ آیئے چالیس روز تک بیٹھیں اور کچھ نہ کھائیں۔ ابو علی نے کہلوایا آؤ ہم ہر رزو تین بار کھائیں اور چالیس روز تک ایک ہی وضو قائم رکھیں۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے۔ جاہل لوگ یہ اخذ کر لیتے ہیں، روزۂ وصال جائز ہے اور اطباء کے نزدیک بھی یہ قابل عمل ہے۔ میں اسے ذرا کھول کر بیان کرتا ہوں تاکہ شبہ دور ہو جائے۔

روزۂ وصال اس طریق پر رکھنا کہ امر حق کی تعمیل میں کوئی فرق نہ آئے کرامت ہے اور کرامت خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ خاص چیز عوام کے لئے نہیں ہوتی۔ اگر اظہار کرامت عام ہوتا تو ایمان کی شکل جبر کی ہو جاتی اور معرفت اہل عرفان کے لئے وجہ ثواب نہ ہوتی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب اعجاز تھے اس لئے آپ نے روزۂ وصال اعلانیہ رکھا۔ اہل کرامت کو اظہار سے منع فرما دیا۔ کرامت کی شرط پوشیدہ رکھنا اور معجزہ کی اعلان کرنا ہے۔ معجزہ و کرامت کا یہ فرق بین ہے۔ اہل ہدایت کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

چلہ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال سے تعلق رکھتا ہے۔ مکالمہ (گفتگو) مقام کی حالت میں درست ہوتا ہے۔ اولیاء جب کلام حق باطن میں سننا چاہتے ہیں تو چالیس روز بھوکا رہتے ہیں۔ تیس روز کے بعد صرف مسواک کرتے ہیں اور اس کے بعد دس روز اور بھوکا رہتے ہیں۔ لامحالہ حق تعالیٰ ان کے باطن سے کلام کرتا ہے۔ جو چیز انبیاء کو بظاہر حاصل ہوتی ہے وہ اولیاء کو باطن میں میسر آتی ہے۔ کلام حق انسانی کمزوریوں کے ہوتے ہوئے نہیں سنا جا سکتا۔ چار عناصر طبع کو چالیس روز تک خورد ونوش کو ترک کر کے مغلوب کرنا چاہئے تاکہ صفائے محبت اور لطافت روح پوری طرح حاصل ہو جائے۔ اس کا تعلق بھوک سے ہے۔ اور اب ہم اس کی حقیقت آشکار کرتے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز

اٹھارہواں باب

بھوک اور متعلقات

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (البقرہ:155) ''اور ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک، مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے معرض امتحان میں ڈالیں گے۔'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بَطِنٌ جَائِعٌ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنۡ سَبۡعِیۡنَ عَابِدًا غَافِلًا(1) ''بھوکے پیٹ والا حق تعالیٰ کے نزدیک ستر غافل عبادت گذاروں سے زیادہ محبوب ہے۔'' پس بھوکا رہنے کا مقام بہت بلند ہے اور تمام امتوں اور ملتوں میں پسندیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ بھوکے انسان کے دل و دماغ بہت تیز ہوتے ہیں اور اس کی طبیعت صحت مند ہوتی ہے۔'' کیونکہ بھوک نفس کو انکساری اور دل کو عجز سکھاتی ہے۔'' بھوکے آدمی کا جسم منکسر اور دل عاجز ہوتا ہے۔ قوت نفس بھوک سے ختم ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَجِیۡعُوۡا بُطُوۡنَکُمۡ وَاعۡرُوۡا اَجۡسَادَکُمۡ وَظَمَاُوۡا اَکۡبَادَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ قُلُوۡبَکُمۡ رَأَتُ اللّٰہِ عِیَانًا فِیۡ الدُّنۡیَا(2) ''شکم کو خالی جسم کو لباس سے آزاد اور جگر کو پیاسا رکھو تاکہ تمہارے دل دنیا میں دید حق سے فیض یاب ہوں۔'' جسم کو بھوک سے تکلیف ہوتی ہے مگر دل کو روشنی ملتی ہے۔ روح کو صفا اور دل کو ضیاء نصیب ہو تو جسمانی تکلیف سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ بسیار خوری کوئی قابل توقیر چیز نہیں ورنہ مویشیوں کو زیادہ نہ کھلایا جاتا۔ بسیار خوری مویشیوں کا کام ہے اور بھوک بیماروں کا علاج ہے۔ بھوک باطن کی پرورش کرتی ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا تن پروری ہے۔ بھلا وہ آدمی جو ساری عمر تن پروری میں مصروف رہے اور جسمانی خواہشات پر خرچ کرے اس شخص کی کس طرح برابری کر سکتا ہے جو ساری عمر اپنے باطن کی پرورش کرے راہ حق میں منفرد ہو اور

1۔ احیاء العلوم اور الطبقات الکبری سبکی میں شاہد مذکور ہے 2۔ اتحاف السادۃ المتقین

علائق دنیا سے آزاد ہو۔ ایک دنیا دار ہے جسے دنیا صرف کھانے کے لئے درکار ہے اور دوسرا دوست حق ہے جسے کھانا صرف عبادت کیلئے ضروری ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ ''پہلے لوگ صرف اس لئے کھاتے تھے کہ زندہ رہیں اور تم اس لئے زندہ ہو کہ کھاتے رہو۔'' نیز ''بھوک صدیقوں کا طعام، مریدوں کا مسلک اور شیاطین کی قید ہے۔'' آدم علیہ السلام کا بہشت سے نکلنا اور قرب الٰہی سے محروم ہونا قضائے حق سے ایک لقمہ کھانے کی بناء پر تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بے چارگی میں بھوکا ہو وہ بھوکا نہیں ہوتا۔ اسے کھانے کی خواہش ہوتی ہے اور کھانے کی خواہش رکھنے والا کھانے والے سے کم نہیں ہوتا۔ جسے بھوک کا مقام ملتا ہے وہ کھانے کو ترک کرنے والا ہوتا ہے کھانے سے منع کیا ہوا نہیں ہوتا۔ جو شخص کھانے کا سامان سامنے ہوتے ہوئے ترک کرے اور بھوک کی تکلیف برداشت کرے اسے بھوکا کہا جاسکتا ہے۔ شیطان کو مقید کرنا اور ہوائے نفس روکنا بجز بھوکا رہنے کے ممکن نہیں۔

کتانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''مرید میں تین چیزیں ضرور ہونی چاہئیں: نیند غلبہ کی وجہ سے، کلام ضرورت کے سبب اور کھانا فاقہ کی بناء پر۔''

بعض کے نزدیک فاقہ دو رات دن بھوکا رہنا ہے۔ بعض کے نزدیک تین رات دن بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک چالیس رزو۔ کیونکہ اہل تحقیق اس بات پر متفق ہیں کہ سچی بھوک چالیس دن رات میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ بھی جان کی حفاظت کے لئے۔ اس عرصہ کے درمیان جو بھوک ہوتی ہے وہ طبیعت کا شر اور غرور ہوتا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے (اللہ تجھے معاف کرے) کہ اہل معرفت کے رگ و پے اللہ تعالیٰ کے اسرار کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان کے دل نگاہ حق کے مقام ہوتے ہیں۔ دلوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ عقل و ہوا ان کی درگاہ پر سرنگوں ہوتی ہیں۔ روح عقل کی مدد ہوتی ہے اور نفس ہوا کا مددگار ہوتا ہے۔ جس قدر طبیعت خوراک سے پرورش پاتی ہے نفس قوی ہوتا ہے اور نفس میں بالیدگی آتی ہے اور اس کا غلبہ اعضاء پر ہوتا ہے اور ہر رگ میں ایک نیا حجاب رونما ہوتا ہے۔ جب نفس کو غذا سے قوت نہیں پہنچتی تو نفس اور ہوائے نفس میں ضعف،

پیدا ہوتا ہے۔ عقل کو قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ نفس سے منقطع ہو جاتی ہے۔ اسرار الٰہی اور اس کے نشانات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جب نفس اپنی حرکات میں سرنگوں ہو جاتا ہے، ہوس اپنے وجود سے خالی ہو جاتی ہے، جھوٹی ارادت جلوۂ حق کے سامنے محو ہو جاتی ہے تو اس وقت مرید کو دولت مقصود نصیب ہوتی ہے۔

حضرت ابو العباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''میری طاعت و معصیت روٹی کے ٹکڑوں سے وابستہ ہے۔ طعام کے بعد معاصی کا مادہ طبیعت میں موجزن ہوتا ہے۔ جب طعام سے دستبردار ہوتا ہوں تو طاعت کی حقیقت اپنے اندر دیکھتا ہوں''۔ مشاہدہ بھوک کا ثمر ہے کیونکہ مشاہدہ مجاہدہ سے قائم ہوتا ہے۔ اگر سیر ہو کر مشاہدۂ حق حاصل ہو جائے تو وہ اس بھوک سے بہتر ہے جو صرف مجاہدہ اور ریاضت تک محدود ہو اور اس سے مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ مشاہدہ مردان حق کی معرکہ گاہ ہے اور مجاہدہ بچوں کا کھیل۔ ''وہ سیری بہتر ہے جس میں مشاہدہ حق ہو اس بھوک سے جس میں صرف مشاہدہ خلق ہو۔'' اس موضوع پر بہت سی باتیں ہیں مگر میں بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ و باللہ التوفیق

آٹھواں کشف حجاب، حج

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (آل عمران: 97) ''بندوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جس کو اس تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔'' صحیح العقل بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان پر حج فرض ہے۔ میقات (احرام باندھنے کی جگہ) پر احرام باندھنا۔ میدان عرفات میں کھڑے ہونا۔ کعبہ کا طواف کرنا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا (اس میں علماء کا اختلاف ہے) اور بغیر احرام حرم میں داخل نہ ہونا، حرم مکہ کو مقام ابراہیم کی وجہ سے حرم کہتے ہیں۔ وہ مقام امن ہے اور جنگ و جدل اس میں حرام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں: ایک جسم کا مقام دوسرا دل کا۔ جسم کا مقام تو مکہ معظمہ ہے اور دل کا مقام ''خلت ہے'' جو ان کے جسم کے مقام کا قصد کرے اس پر لازم ہے کہ جملہ لذات نفسانی اور شہوات سے منہ پھیرے۔ احرام باندھ لے گویا کفن پہن لے۔

حلال شکار سے بھی دستبردار ہو۔ تمام حواس کو حبس کرے عرفات میں حاضری دے اور پھر مزدلفہ اور مشعر الحرام میں جائے۔ کنکریاں اٹھا کر طواف کرے۔ پھر منیٰ میں تین روز تک قیام کرے اور سنگریزے حسب شرائط پھینکے۔ سر منڈائے اور قربانی کے بعد اپنا معمول کا لباس پہن لے۔

جو شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام دل کا قصد کرے اس کے لئے لازمی ہے کہ اپنی پسندیدہ چیزوں سے منہ پھیر لے۔ دنیوی لذتوں اور راحتوں کو ترک کرے۔ ذکر اغیار سے روگرداں ہو کیونکہ عالم کون وفساد کی طرف ملتفت ہونا منع ہے پھر معرفت کے عرفات میں قیام کرے۔ الفت کے مزدلفہ کا رخ کرے۔ باطن کو تنزیہ حق کے طواف میں مشغول کرے۔ نفسانی خواہشات اور پراگندہ خیالات کے سنگریزے حفاظت ایمان کے منیٰ میں پھینکے۔ نفس کو مجاہدہ کے مذبح پر قربان کرے اور مقام "خلت" پر پہنچ جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جسم کا مقام حرم کعبہ ہے اور وہاں دشمن اور اس کی تلوار سے امان ہے۔ آپ کے دل کے مقام یعنی "خلت" میں داخل ہونا قطع علائق ہے اور دوری حق اور اس قسم کے دیگر شرور سے مصون ہونا ہے۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلْحَاجُّ وَفْدُ اللّٰهِ يُعْطِيْهِمْ مَاسَأَلُوْا وَيَسْتَجِيْبُ لَهُمْ مَادَعَوْا (1) "حجاج حق تعالیٰ کا کارواں ہیں جو کچھ وہ مانگیں انہیں دیا جاتا ہے وہ جو دعا کریں قبول کی جاتی ہے"۔ وہ جو مانگتے ہیں انہیں جواباً دیا جاتا ہے۔ اس پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جاہ و مرتبہ مانگتے ہیں۔ کچھ لوگ نہ کچھ چاہتے ہیں نہ دعا کرتے ہیں جیسا کہ ابراہیم پیغمبر صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے کہا: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ (البقرہ) "جب اس کے خدا نے کہا فرماں بردار ہو جا۔ عرض کی میں پروردگار دو عالم کا فرمانبردار ہوں۔" یہ "خلت" کا مقام تھا۔ وہ علائق دنیوی سے آزاد ہو گئے اور ان کا دل غیر حق سے منقطع ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے آپ کو عالم میں آشکارا کرنا چاہا یہ کام نمرود کے

1۔ مسند احمد

سپرد ہوا۔ اس نے پہلے آپ کو والدین سے جدا کیا۔ آگ بھڑکائی۔ ابلیس نے منجنیق (گوپیا) بنائی۔ آپ کو گائے کی کچی کھال میں بند کر کے گوپیا میں رکھ دیا گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے گوپیا تھام کر کہا: ''کیا آپ کو میری مدد چاہئے؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔'' حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ''کیا آپ کو حق تعالیٰ کی حاجت نہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''اس کو میرے حال کا علم ہے'' اور اس چیز نے مجھے سوال کرنے سے روک دیا ہے۔ مجھے وہ پسند ہے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ محض اس کے لئے مجھے آگ میں ڈال رہے ہیں۔ اب سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔

محمد بن فضل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مجھے تعجب ہے کہ لوگ دنیا میں اس کے (اللہ کے) گھر کی تلاش کرتے ہیں۔ اپنے دل میں اس کا مشاہدہ طلب نہیں کرتے۔ حالانکہ خانہ کعبہ کبھی موجود ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ دل میں مشاہدہ حق لامحالہ ہوتا ہے۔ سنگ کعبہ کی زیارت فریضہ ہے اور اس پر سال میں اس کی صرف ایک بار نظر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دل پر شب و روز تین سو ساٹھ بار چشم رحمت ہوتی ہے۔ سو دل کعبہ سے بڑھ کر قابل زیارت ہے۔ تاہم اہل تحقیق کے لئے راہ مکہ میں ہر قدم ایک نشان حق ہے اور حرم میں پہنچ کر تو ہر ایک کو خلعت نصیب ہوتی ہے۔

بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخرت میں ثواب طاعت پر نظر رکھنے والے سے کہو کہ آج اس کی طاعت طاعت نہیں کیونکہ عبادت اور مجاہدہ کے ہر سانس کا ثواب آج ہی میسر آنا چاہئے فرماتے ہیں کہ پہلی بار حج میں میں نے سوائے خانہ کعبہ کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ دوسری بار خانہ کعبہ کو بھی دیکھا اور خانہ کعبہ والے کو بھی دیکھا۔ تیسری بار صرف خانہ کعبہ والے ہی کو دیکھا۔ خانہ کعبہ کو نہیں دیکھا۔ الغرض حرم جائے مشاہدہ پر ہوتا ہے جائے مجاہدہ پر نہیں ہوتا اور اس کے لئے تعظیم ہے۔ جس کی نظر میں سارا عالم قرب حق کا مقام اور محبت کی خلوت گاہ نہ ہو وہ محبت حق سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ صاحب مشاہدہ کے لئے سارا عالم حرم ہے اور مشاہدہ حق سے محروم کے لئے حرم کعبہ بھی تاریک ترین مقام ہے ۔

محبوب کا گھر محبوب کے بغیر تمام جگہوں سے زیادہ تاریک ہوتا ہے۔

قدر و قیمت تو مشاہدۂ رضا کی ہوتی ہے جو مقام دوستی (خلت) پر حاصل ہو اور جس کا ذریعہ حق تعالیٰ نے زیارت کعبہ کو رکھا ہے۔ زیارت کعبہ بذات خود کوئی چیز نہیں تاہم ہر سبب (ذریعہ) کا مسبب سے تعلق ہوتا ہے کیا خبر عنایت حق تعالیٰ کا ظہور کہاں سے ہو اور طالب کی مراد کدھر سے رونما ہو۔ مردان حق دشت و بیابان میں بھی دیدار الٰہی کے لئے سرگرداں ہوتے ہیں کیونکہ دوست کو حرم دوست دیکھنا جائز نہیں۔ ان کا مقصد ایک شوق بے تاب اور محبت میں ایک آرزوئے پر گداز کے ساتھ مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔

کوئی شخص حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ آپ نے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو؟ عرض کی میں حج کے لئے گیا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا کیا حج کر لیا؟ اس نے جواب دیا ''جی ہاں۔'' فرمایا: ''کیا گھر اور وطن چھوڑتے وقت سب گناہوں کو بھی چھوڑا؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا'' تم نے وطن سے سفر نہیں کیا۔ اچھا جب تم گھر سے نکلے اور رات کے وقت کسی جگہ قیام کیا تو کیا طریق حق کی بھی کوئی منزل طے کی۔'' جواب پھر نفی میں تھا۔ آپ نے پھر فرمایا: ''تم نے کوئی منزل طے نہیں کی'' اچھا جب تم نے میقات پر احرام باندھا تو کیا اپنی صفات بشری سے بھی روگرداں ہوئے؟'' جواب نفی میں پا کر آپ نے پھر فرمایا: ''تم نے احرام نہیں باندھا۔'' اچھا، جب تم عرفات کے میدان میں کھڑے ہوئے تو کیا کشف و مشاہدہ میں بھی کھڑا ہونا نصیب ہوا۔'' جواب نفی تھا۔ آپ نے فرمایا: ''تم عرفات میں کھڑے نہیں ہوئے۔'' اچھا، جب تم مزدلفہ میں گئے اور تمہارا مقصد پورا ہو گیا تو کیا اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کر دیا۔ جواب ملا نہیں۔ فرمایا'' تم مزدلفہ بھی نہیں گئے۔ اچھا جب بیت اللہ کا طواف کیا تو باطن کی آنکھ سے تنزیہ (حق تعالیٰ کو ہر عیب سے منزہ سمجھنا) کے مقام میں حق تعالیٰ کے لطائف جمال کو دیکھا؟'' جواب پھر نفی میں تھا۔ آپ نے پھر فرمایا: ''تم نے طواف نہیں کیا۔ اچھا، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت کیا تم نے صفا اور مروہ کا درجہ سمجھا۔'' جواب نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا'' تم نے سعی بھی نہیں کی۔ اچھا

جب منیٰ میں آئے تو کیا تمہاری حسرتیں ساقط ہوگئیں؟'' عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تم منیٰ بھی نہیں گئے۔ اچھا، جب قربان گاہ پر قربانی دی تو کیا خواہشات نفس کو قربان کیا؟'' عرض کیا نہیں۔ آپ نے پھر فرمایا: ''تم نے قربانی بھی نہیں دی۔ اچھا: جب کنکر پھینکے تو تمام نفسانی امور پھینک دیئے؟'' جواب نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا ''تم نے کنکر بھی نہیں پھینکے۔ بھئی تمہارا حج نہیں ہوا۔ واپس جاؤ اور اس طریق پر حج کرو تا کہ مقام ابراہیم نصیب ہو۔

میں نے سنا ایک بزرگ کعبہ کے سامنے گریہ وزاری کر رہے تھے اور یہ اشعار ان کی زبان پر جاری تھے:

أصبحت يوم النحر والعير ترحل
وكان حدى الحادى بنا وهو معجل
اسئل عن سلمى من مخبر
بان له علما بها أين تنزل
لقد أفسدت حجي ونسكي و عمرتي
و في السرلي شغل عن الحج مشغل
سأرجع من عامي لحجة قابل
فإن الذي قدكان لا يتقبل

''حج میں قربانی کے روز صبح ہوئی۔ سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے۔ حدی خواں حدی پڑھ کر اونٹوں کو چلا رہا تھا اور جلدی کر رہا تھا۔

میں اپنی محبوبہ سلمیٰ سے متعلق پوچھ رہا تھا کوئی بتائے کہ وہ کہاں اترے گی۔

اس محبوبہ نے تو میرا حج، میری قربانی اور میرا عمرہ سب فاسد کر دیئے۔ اس کے فراق نے دل میں وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو حج سے دور کئے دیتی ہے۔ میں آئندہ سال حج کے لئے آؤں گا، اب میں لوٹ رہا ہوں۔ کیونکہ جو حج ہو چکا ہے وہ قبول نہیں ہوگا''۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں نے ایک نوجوان کو حج کے دوران خاموش کھڑے ہوئے دیکھا۔ لوگ دعا مانگ رہے تھے وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا تم کیوں دعا میں شریک نہیں ہوئے؟ اس نے جواب دیا میں وحشت میں مبتلا ہوں۔ میرا وقت فوت ہو گیا ہے۔ اب دعا کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا دعا کر خدا اس اجتماع کی برکت سے تیری مراد پوری کرے گا۔ اس نے چاہا کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے مگر بے اختیار اس نے ایک آہ بھری اور جاں بحق ہو گیا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو منیٰ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ سب لوگ قربانی میں مشغول تھے۔ میں اسے دیکھتا رہا وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ وہ کہہ رہا تھا: "بار خدایا! سب لوگ قربانی کر رہے ہیں۔ میں اپنے نفس کو تیری راہ میں قربان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قبول فرما۔" یہ بات کہی اور انگشت شہادت سے اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا اور گر پڑا۔ میں نے دیکھا تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اللہ اس پر رحم کرے۔

حج دو قسم کا ہوتا ہے: ایک غیبت میں ایک حضوری میں۔ جو آدمی حرم کعبہ میں حاضر ہو کر بھی غیبت میں مبتلا ہو اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو اپنے گھر میں موجود ہو اور غیب ہو۔ غیبت بہر حال غیبت ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی حاضر بحق ہو وہ گویا حاضر بارگاہ کعبہ ہے کیونکہ حضور حق ہر جگہ حضور حق ہے۔ حج ایک صورت مجاہدہ ہے۔ کشف مشاہدہ کے لئے اور مجاہدہ علت مشاہدہ نہیں بلکہ سبب مشاہدہ ہوتا ہے اور سبب کو حقیقت معانی میں زیادہ رسوخ نہیں ہوتا۔ مقصود حج زیارت خانہ کعبہ نہیں ہوتی مقصد کشف مشاہدہ ہوتا ہے اب میں اسی موضوع پر ایک باب رقم کرتا ہوں جو تیرے مقصد کی تکمیل میں کام آئے۔
واللہ اعلم بالصواب

انیسواں باب

مشاہدہ

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَجِیْعُوْا بُطُوْنَکُمْ دَعُوْا الْحِرْصَ وَاعْرُوْا اَجْسَادَکُمْ قَصِّرُوْا الْاَمَلَ وَاظْمَاءُوْا اَکْبَادَکُمْ دَعُوْا الدُّنْیَا لَعَلَّکُمْ تَرَوْنَ اللّٰهَ بِقُلُوْبِکُمْ ''اپنے پیٹوں کو خالی رکھو، حرص کو چھوڑو، جسموں کو لباس سے آراستہ نہ کرو۔ تمناؤں کو کم کرو، جگروں کو پیاسا رکھو، دنیا سے روگردانی اختیار کرو تاکہ تمہیں دلوں میں مشاہدۂ حق حاصل ہو۔'' حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے ماہیت احسان سے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ(1) ''تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔'' اگر تو حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا تو حق تعالیٰ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: یَادَاوٗدُ أَتَدْرِیْ مَا الْمَعْرِفَۃُ قَالَ لَا قَالَ هِیَ حَیَاۃُ الْقَلْبِ فِیْ مُشَاهَدَتِیْ ''اے داؤد! معلوم ہے میری معرفت کیا ہے! عرض کیا نہیں فرمایا میرے مشاہدہ سے دل کا زندہ ہونا۔''

اہل تصوف کے نزدیک مشاہدہ ذات حق کو چشم باطن سے دیکھنے کا نام ہے یعنی جلوۂ حق کو دل میں تجزیہ کئے بغیر دیکھے خلوت ہو یا جلوت۔

حضرت ابوالعباس بن عطاء رحمۃ اللہ علیہ اس قول حق کی تفسیر کر رہے تھے، اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (حم سجدہ: 30) ''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار تو اللہ ہے اور پھر اس پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے۔'' تفسیر کے دوران میں فرمایا ''جن لوگوں نے مجاہدہ میں یوں کہا کہ پروردگار تو اللہ تعالیٰ ہے اور پھر مشاہدہ حق کی بساط پر مضبوطی سے

1۔ مسند احمد، السنن الکبری

ثابت قدم رہے۔"

مشاہدہ کی حقیقت کے دو پہلو ہیں: ایک مشاہدہ صحیح یقین سے اور دوسرا غلبہ محبت حق یعنی غلبہ محبت سے وہ مقام حاصل ہو جہاں طالب ہمہ تن حدیث محبوب ہو کر رہ جائے اور اسے بجز اس کے کچھ نظر نہ آئے۔

محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "میں نے صحیح یقین کے ساتھ ہر چیز میں جلوۂ محبوب حق دیکھا، ایک اور شیخ طریقت نے فرمایا: "میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس کی سمت مجھے دیدار حق نہ ملا ہو۔"

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، **مارأیت شیئًا قط الا اللّٰہ یعنی بغلبة المحبة وغلیان المشاهدة** "میں نے غلبہ محبت حق میں اور مشاہدۂ حق کے ظہور میں جز باری تعالیٰ کے کسی چیز کو نہیں دیکھا۔" ایک آدمی کسی چیز کو ظاہری آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کے فاعل پر ظاہری نظر پڑتی ہے۔ دوسرا فاعل کی محبت میں مستغرق ہو کر ہر چیز سے قطع نظر کر لیتا ہے اور صرف فاعل کو دیکھتا ہے۔ پہلا طریق استدلال ہے۔ دوسرا جذبہ باطن استدلال میں حق کو دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں طالب مجذوب و بے خود شوق ہوتا ہے۔ دلائل وحقائق اس کے لئے حجاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "جو شخص کسی چیز کو پہچان لیتا ہے اس کے بغیر اسے تسکین خاطر نہیں ہوتی۔ جب کوئی شخص محبت کرتا ہے تو وہ سوائے محبوب چیز کے کسی پر نظر نہیں ڈالتا۔ وہ (محبوب کے) افعال واحکام پر اعتراض کرنے یا ان کی مخالفت کرنے سے اعراض کرتا ہے۔" تاکہ خلاف اور تصرف میں مبتلا نہ ہو جائے حق تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا، مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ (النجم) "آپ کی نظر نہ تجلیات حق سے بھٹکی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی۔" یہاں تک کہ آپ کی چشم باطن نے ہر دیکھنے والی چیز کو دیکھ لیا۔ جب محبّ حق موجودات سے نظر پھیر لیتا ہے تو چشم باطن سے مشاہدہ حق میں مشغول ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور:30) "اہل ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی

رکھیں۔'' یعنی ظاہری آنکھ کو نفسانی خواہشات سے اور باطنی آنکھ کو مخلوقات سے۔'' جو آدمی مجاہدہ کر کے ظاہری آنکھ کو مرغوبات سے روک لیتا ہے وہ یقیناً باطنی آنکھ سے مشاہدہ حق سے بہرہ یاب ہوتا ہے کیونکہ '' جو مجاہدہ میں مخلص ہو وہ مشاہدہ میں صادق ہوتا ہے۔''

باطن کی نظر کا مشاہدہ مجاہدۂ ظاہر سے وابستہ ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: '' جو چشم زدن کے لئے اپنی نظر حق تعالیٰ سے پھیر لیتا ہے وہ ساری عمر ہدایت نہیں پاسکتا۔'' کیونکہ غیر پر نظر ڈالنا غیر کی طرف رجوع کرنا ہے اور جس کو قضاو قدر نے غیر اللہ کے اختیار میں چھوڑ دیا وہ ہلاکت کا شکار ہو گیا۔ اہل مشاہدہ کی زندگی یہی ہے کہ وہ مشاہدۂ حق میں مشغول رہیں۔ جو زندگی کا حصہ حق تعالیٰ سے دوری میں گذرتا ہے وہ اسے زندگی میں شمار نہیں کرتا اور حقیقت میں ان کیلئے موت کے برابر ہوتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی عمر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا چار سال یا بروایت دیگر چالیس سال۔ لوگوں کو تعجب ہوا تو آپ نے فرمایا میں ستر برس تک دنیوی رجحانات میں رہا ہوں۔ صرف چار سال سے مشاہدہ حق میں مصروف ہوں۔ حجاب کا زمانہ شامل زندگی نہیں ہوتا۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ دعا میں کہا کرتے تھے '' اے خدا! دوزخ و جنت کو چھپا لے تا کہ تیری عبادت بلا واسطہ اور بغیر کسی لالچ کے ہو۔'' طبیعت میں بہشت کی خواہش ہوتی ہے اور اکثر عبادت اسی لئے کی جاتی ہے۔ دل میں محبت حق جاگزیں نہیں ہوتی اور آدمی اپنی غفلت کی وجہ سے مشاہدۂ حق سے محروم رہتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ معراج بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ کو دیکھا۔ لوگوں میں اس بات پر اختلاف رونما ہوا۔ مگر دوستان حق نے جو بہتر صورت تھی اسے چن لیا یعنی آپ نے جو یہ فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ اس سے مراد ظاہر کی آنکھ سے دیکھنا تھا۔ دونوں میں ایک صاحب باطن تھا۔ اور دوسرا اہل ظاہر۔ آپ

نے ہر ایک سے بقدر فہم بات کی۔ جب چشم باطن سے دیکھ لیا تو چشم ظاہر سے نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اگر حق تعالیٰ فرمائے کہ مجھے دیکھ تو میں نہ دیکھوں کیونکر محبت میں آنکھ کی حیثیت غیر اور بیگانے کی ہے۔ رشک غیر مانع دیدار ہے۔ جب دنیا میں اس کو واسطہ چشم کے بغیر دیکھتا رہا ہوں تو آخرت میں اس کا واسطہ کیوں تلاش کروں۔

"مجھے تیرے دیکھنے والوں پر رشک آتا ہے۔ جب میں تیری طرف دیکھتا ہوں تو اپنی آنکھ بند کر لیتا ہوں"۔

کسی بزرگ سے پوچھا گیا "کیا آپ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں؟" فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تو نہ دیکھ پائے۔ حضور ﷺ نے درخواست نہیں کی اور دیدار سے سرفراز ہوئے۔ دراصل ہماری خواہش ہی ایک حجاب ہے۔ ارادہ مخالفت کی دلیل ہے اور مخالفت وجہ حجاب ہوتی ہے۔ ارادہ ختم ہو تو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور مشاہدہ حاصل ہو تو دنیا و عقبیٰ برابر ہو جاتے ہیں۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو دنیا و آخرت میں رویت حق سے محروم ہوں تو مرتد ہو جائیں۔" یعنی ان کی پرورش دائمی مشاہدہ سے ہوتی ہے۔ محبت کی زندگی سے وہ زندہ ہیں۔ صاحب مشاہدہ اگر محروم مشاہدہ ہو تو گویا راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ مصر میں دیکھا کہ کچھ لڑکے ایک جوان کو پتھر مار رہے ہیں۔ میں نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ لڑکوں نے کہا یہ دیوانہ ہے پوچھا تم نے اس کا کیا دیوانہ پن دیکھا؟ لڑکوں نے کہا یہ کہتا ہے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے جوان کو مخاطب کر کے پوچھا کیا یہ سچ ہے یا لڑکے صرف تہمت تراش رہے ہیں جوان نے جواب دیا کہ ہاں اگر حق تعالیٰ ایک لحظہ میری نظر سے چھپ جائے تو حجاب حائل ہو جائے اور میں طاعت سے محروم ہو جاؤں۔

یہاں ایک جماعت کو اہل طریقت سے متعلق ایک مغالطہ ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رویت حق اور چشم باطن کا مشاہدہ ایک صورت ہے جو ذکر و فکر کی حالت میں واہمہ کی بدولت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ محض شبہ اور صریح گمراہی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات اندازہ و مقدار سے بالاتر ہے کہ کسی کی عقل اس کا ادراک کر سکے خدا تعالیٰ کے متعلق جو کچھ انسانی عقل میں آئے گا وہ سراسر وہم حق تعالیٰ کسی جنس کا متحمل نہیں اور جملہ لطائف و کشائف ایک دوسرے سے جنسی طور پر وابستہ ہیں۔ تضاد کی حالت میں بھی ہم جنسیت قائم رہتی ہے۔ توحید کی حقیقت بھی قدیم کے مقابل ایک جنس کی ہے کیونکہ متضاد چیزیں سب حادث ہوتی اور سب حادث ہم جنس ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان باتوں سے اور ہر اس چیز سے جو ملحد اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، پاک اور بالاتر ہے۔ اس دنیا میں مشاہدۂ حق اور عقبیٰ میں رویت حق برابر ہے۔ اگر رویت حق آخرت میں جملہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اتفاق اور اجماع کے ساتھ ثابت ہے تو مشاہدہ دنیا میں بھی روا ہونا چاہئے۔ رویت عقبیٰ کی خبر دینے والے اور مشاہدۂ دنیا کی خبر دینے والے میں کوئی فرق نہیں اور جو کوئی بھی ان دونوں سے متعلق خبر دے گا اور از روئے مشاہدہ اجازت سے خبر دے گا دعویٰ سے نہیں وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ آخرت میں دیدار حق اور دنیا میں مشاہدہ حق روا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے مشاہدہ ہوا ہے یا اس وقت مشاہدہ کر رہا ہوں۔

مشاہدہ باطن کا وصف ہے اور اس کا اظہار عبارت آرائی ہے۔ اگر زبان باطن سے آشنا ہو اور کیفیت مشاہدہ کو الفاظ میں ڈھال سکے تو مشاہدہ نہیں دعویٰ مشاہدہ ہے۔ کیونکہ جس کی کیفیت کی اصل عقل سے باہر ہو زبان اس کو الفاظ کا جامہ کیسے پہنا سکتی ہے بجز ایک مجازی صورت کے۔ کیونکہ مشاہدہ دل کے حاضر اور زبان کے قاصر ہو جانے کا نام ہے یہی سبب ہے کہ خاموشی گفتگو سے بہتر ہے۔ خاموشی علامت مشاہدہ ہے اور گفتگو شہادت مشاہدہ ہے۔ شہادت اور مشاہدہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرب حق کے اس

بلند مقام پر جو آپ کو عطا ہوا فرمایا: "میں تیری ثناء پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ (احاطہ نہیں کر سکتا)" حضور ﷺ مقام مشاہدہ پر تھے اور مشاہدہ کمال اتحاد ہوتا ہے۔ اتحاد کے عالم میں زبان کو کام میں لانا بیگانگی کا اظہار ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "تو وہ ہے کہ بس اپنی ثنا آپ کررہا ہے۔" یعنی یہاں جو تو کہے وہ گویا میں نے کہا ہے۔ جو تو اپنی ثنا کرے وہ گویا میں نے کی ہے۔ میری زبان اس قابل نہیں کہ میرے حال کو معرض بیان میں لاسکے اور بیان خود اس لائق نہیں کہ میری کیفیت کا اظہار کرسکے۔ اس موضوع پر کسی کا شعر ہے

تمنیت من اھوی فلما رأیته بھت فلم أملک لسانا ولا طرفا

"اس سے ملنے کی تمنا تھی جب ملا تو حیرت کا یہ عالم ہے کہ زبان پر اختیار ہے نہ آنکھ پر"۔ یہ ہیں جملہ احکام مشاہدہ مختصراً۔ وباللہ العون والتوفیق

نواں کشف حجاب، صحبت اور اس کے آداب واحکام

حق تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا (التحریم:6) "اے ایمان والو! اپنی ذات کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ...... ان کو ادب سکھاؤ۔" پیغمبر ﷺ نے فرمایا: حُسْنُ الْأَدَبِ مِنَ الْإِيْمَانِ(1) "اچھا ادب ایمان کا جزو ہے۔" اور نیز فرمایا، اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِيْبِيْ(2) "میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا۔" دین اور دنیا کے تمام کاموں کی آرائش ادب پر منحصر ہے۔ سب لوگ کافر، مسلمان، ملحد، موحد، سنی اور بدعتی متفق ہیں کہ معاملات میں حسن ادب ایک پسندیدہ چیز ہے۔ دنیا کی کوئی رسم بھی جذبہ حسن ادب کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔ لوگوں میں حفظ مروت، دین میں حفظ سنت اور محبت میں حفظ حرمت کا نام ادب ہے۔ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جسے پاس مروت نہیں وہ تابع سنت نہیں اور جو تابع سنت نہیں اسے پاس حرمت نہیں۔

اعمال میں پاس ادب مطلوب کی تعظیم سے حاصل ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اور اس کی آیات

1۔ عسکری، جمرۃ الامثال 2۔ کنز العمال، مجمع الزوائد

کی تعظیم جزو تقویٰ ہے جو شخص بے ادبی سے تجلیات حق کی تعظیم کو نظر انداز کرتا ہے اسے طریقت میں کوئی مقام نہیں ملتا۔ کسی حالت میں بھی جذب وغلبہ حال طالب حق کو پاس ادب سے منع نہیں کرتا۔ ادب طالبان حق کی عادت میں شامل ہوتا ہے اور عادت طبیعت ثانیہ ہوا کرتی ہے۔ طبیعت کبھی ساقط نہیں ہوتی۔ زندگی ہو تو طبیعت موجود ہوتی ہے۔ جب تک وجود قائم ہے طالبان حق پاس ادب کو کبھی تکلف سے اور کبھی بے تکلف ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ عالم ہوشیاری میں اگر پاس ادب تکلف سے ہوتا ہے تو عالم جذب میں حق تعالیٰ ان کے پاس ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ یاد رکھو ولی اللہ کسی عالم میں بھی تارک ادب نہیں ہوتا۔ ولایت کے لئے سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی ضروری ہے اور تارک ادب اخلاق محمدی سے بہت دور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ترک ادب فقدان محبت کی دلیل ہے۔ إن المودة عند الأدب وحسن الأدب صفة الأحباب "کیونکہ محبت ادب ہونے کی صورت میں ہوتی ہے اور اچھا ادب دوستی کی صفت ہے۔" جسے کرامت نصیب ہو اللہ تعالیٰ اسے آداب دین کی پاسداری کی توفیق عطا کرتا ہے۔ اس کے برعکس ملحد (اللہ ان پر لعنت کرے) کہتے ہیں کہ جب بندہ مغلوب محبت ہو جاتا ہے تو دین کی متابعت ساقط ہو جاتی ہے۔ میں اس چیز کو کسی دوسرے مقام پر زیادہ وضاحت سے بیان کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

آداب کی تین قسمیں ہیں: اول آداب توحید یعنی خلوت وجلوت میں بے ادب نہ ہونے پائے۔ اعمال میں ایسا رویہ اختیار کرے جیسے بادشاہوں کے حضور کیا جاتا ہے۔ احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ جبریل علیہ السلام نے آکر عرض کی "اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بارگاہ حق میں غلاموں کی طرح بیٹھئے۔" کہتے ہیں: حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ تعالیٰ چالیس برس تک دیوار سے پیٹھ لگا کر دو زانو بیٹھے رہے۔ لوگوں نے کہا آپ کیوں اس قدر تکلیف برداشت کرتے ہیں؟ فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ مشاہدۂ حق میں غلاموں کی طرح نہ بیٹھوں۔

میں (علی بن عثمان جلابی) خراسان کے ایک گاؤں کمند میں پہنچا۔ وہاں ایک معروف

آدمی ''ادیب کمندی'' رہتا تھا۔ بزرگ آدمی تھا۔ چوبیس برس سے کھڑا تھا اور نماز میں صرف تشہد کے لئے بیٹھتا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا: مجھے ابھی وہ مقام نصیب نہیں کہ مشاہدۂ حق میں بیٹھ سکوں۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا'' آپ کو یہ مقام کس وجہ سے ملا؟'' فرمایا میں نے کبھی حق تعالیٰ کے حضور آداب صحبت کو نظر انداز نہیں کیا۔ جلوت و خلوت میں یکساں رہا ہوں۔ کسی حالت میں پاس ادب کو نہیں چھوڑا۔ معبود کے مشاہدہ میں پاس ادب زلیخا سے سیکھنا چاہئے۔ جب یوسف علیہ السلام کے سامنے خلوت میں اپنی خواہش کی قبولیت کی درخواست کی تو پہلے بت کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا یہ کیوں؟ کہا میں نہیں چاہتی کہ میرا معبود مجھے تمہارے ساتھ اس بے حرمتی کے عالم میں دیکھے یہ شرط ادب نہیں۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کو مل گئے زلیخا کو حق تعالیٰ نے از سر نو جوان کر دیا۔ اسے راہ اسلام نصیب ہوئی اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجیت میں آ گئی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے قریب جانے کا قصد کیا تو پیچھے ہٹ گئی۔ آپ نے کہا اے زلیخا! میں تیرا وہی محبوب ہوں۔ دور کیوں ہٹ رہی ہو، کیا میری محبت ختم ہو گئی؟ زلیخا نے کہا ہرگز نہیں بلکہ اب بہت زیادہ ہے۔ مگر میں نے ہمیشہ آداب معبود کو پیش نظر رکھا ہے۔ پہلے دن عالم خلوت میں میرا معبود ایک بت تھا۔ اس کی آنکھیں نہیں تھیں مگر اس پر کوئی چیز ڈال دی تا کہ تہمت بے ادبی سے بچ سکوں۔ اب تو میرا معبود وہ ہے جو بغیر آنکھ یا اور کسی آلہ کار سے دیکھ رہا ہے۔ ہر حالت میں اس کی نظر میرے اوپر ہے۔ میں نہیں چاہتی مجھ سے ترک ادب سرزد ہو۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو بر پاس ادب ہر دو عالم کو نظر انداز کر دیا۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی مازاغ البصر برؤیة الدنیا وما طغٰی أی برویة العقبٰی '' آپ کی نظر دنیا کے مناظر میں نہیں کھوئی اور نہ عقبٰی کے مناظر سے تجاوز کیا۔''

ادب کی دوسری قسم اپنی ذات سے متعلق ہے یعنی آدمی کو چاہئے کہ ہر حالت میں اپنے

نفس کے ساتھ مروت ملحوظ خاطر رکھے۔ یہاں تک کہ جو چیز حق تعالیٰ کے لئے عام خلقت کے لئے خارج از ادب ہے اسے اپنی ذات کے لئے بھی روا نہ رکھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہمیشہ صداقت پر کاربند رہے جس چیز کے وہ خود خلاف ہو وہ زبان پر نہ لائے۔ کیونکہ یہ بے مروتی ہے۔ کم کھائے تاکہ طہارت گاہ میں کم جانا پڑے۔ اپنی کسی ایسی چیز کو نہ دیکھے جس پر کسی غیر کی نظر پڑنا بھی حرام ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی اپنی عریانی کو نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ ایسی چیز کو دیکھوں جس کی ہم جنس چیز کو دیکھنا میرے لئے حرام ہے۔

ادب کی تیسری قسم باقی مخلوق سے متعلق ہے۔ اس میں عظیم ترین چیز یہ ہے کہ سفر حضر میں مخلوق کے ساتھ حسن معاملت سے پیش آئے اور پیروی سنت کو پیش نظر رکھے۔ ان تینوں قسموں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔

اب میں تینوں اقسام کو ترتیب وار بیان کروں گا تاکہ تیرے لئے اور دیگر پڑھنے والوں کے لئے بات سہل ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز

بیسواں باب

صحبت اور متعلقات

باری تعالیٰ نے فرمایا، اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم) جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے۔"یعنی اس لئے کہ وہ اپنے بھائیوں کے حقوق ادا کرتے ہیں اور ان کو اپنے اوپر فضیلت دیتے ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: ثَلٰثٌ یَصۡفِیۡنَ لَکَ وُدًّا اَخِیۡکَ اَنۡ تُسَلِّمَ عَلَیۡهِ اِنۡ لَقِیۡتَهٗ وَتَوَسَّعَ لَهٗ فِی الۡمَجۡلِسِ وَتَدۡعُوۡهُ بِاَحَبِّ اَسۡمَائِهٖ تین چیزیں بھائی کے دل میں دوستی کو محکم کرتی ہیں اول یہ کہ اگر سر راہ ملے تو سلام کرے۔ دوسرے یہ کہ مجلس میں اس کے لئے کشادہ جگہ دے اور تیسرے یہ کہ تو اسے اس نام سے پکار جو اسے زیادہ پسند ہو۔"

اور نیز حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ (الحجرات:10) "سب مومن بھائی بھائی ہیں بھائیوں میں صلح اور آشتی پیدا کرو۔" سب کے لئے حکم ہے کہ دو مسلمان بھائیوں میں لطف و مہربانی کے جذبات پیدا کرو۔ تا کہ کسی کے دل میں ایک دوسرے سے خلش نہ رہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَکۡثِرُوۡا مِنَ الۡاَخۡوَانِ فَاِنَّ رَبَّکُمۡ حَیٌّ کَرِیۡمٌ یَسۡتَحۡیِیۡ اَنۡ یُّعَذِّبَ عَبۡدَهٗ بَیۡنَ اِخۡوَتِهٖ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ(1) "اپنے بھائی زیادہ بناؤ۔ تمہارا پروردگار حی کریم ہے۔ روز قیامت وہ اپنے کرم کی بدولت کسی کو اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب نہیں دے گا۔"

یہ ضروری ہے کہ ہم نشینی حق تعالیٰ کے لئے ہو خواہش نفس کے حصول کے لئے نہ ہو اور نہ اپنی کوئی غرض یا مراد مد نظر ہو تا کہ انسان حفظ ادب کی بدولت مشکور ہو۔

مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے داماد مغیرہ بن شعبہ سے فرمایا، "اے مغیرہ! جس بھائی یا دوست کی مصاحبت سے کوئی دینی فائدہ نہ ہو اسے ترک کر سلامتی اسی میں ہے۔

1۔ الفوائد المجموعہ

مقصد یہ ہے کہ ہم نشینی یا اپنے سے بڑے کی اختیار کر یا چھوٹے کی۔ اگر ہم نشین بڑا ہے تو تجھے فائدہ ہوگا اور اگر چھوٹا ہے تو بھی تجھے فائدہ ہوگا کیونکہ وہ تجھ سے کچھ سیکھ لے گا۔ بہر حال ہر روز دینی مفاد حاصل ہوگا۔ اسی لئے پیغمبر ﷺ نے فرمایا، اِنَّ مِنْ تَمَامِ التَّقْوٰی تَعْلِیْمَ مَنْ لَمْ یَعْلَمْ (1) ''جو شخص نہیں جانتا اس کو سکھانا بڑی پرہیز گاری میں داخل ہے۔''

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، بئس الصدیق تحتاج أن تقول له اذکرنی فی دعائک وبئس الصدیق تحتاج ان تعیش معه بالمداراة وبئس الصدیق یلجئک إلی الاعتذار فی ذلة کانت منک ''برا ہے وہ دوست جسے یہ کہنا پڑے کہ مجھے دعا میں یاد رکھنا (کیونکہ ایک ساعت کا حق صحبت ہمیشہ دعائے خیر میں یاد رکھنا ہے) اور برا ہے وہ دوست جس کے ساتھ زندگی مدارات سے بسر کرنی پڑے (کیونکہ صحبت تو ہے ہی سرمایہ مسرت) اور برا ہے وہ دوست جس کے سامنے قصور کے لئے معذرت کرنا پڑے (کیونکہ عذر دلیل بیگانگی ہے اور بیگانگی ہم نشینی میں ظلم ہے۔)

پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُخَالِلُ (2) ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لئے تم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہئے کہ اس کا ہم نشین کون ہے۔'' کیونکہ اگر کوئی نیک لوگوں کا ہم نشین ہے تو باوجود برا ہونے کے نیک کہلائے گا اور ان کی ہم نشینی اسے نیک کر دے گی۔ بروں کی صحبت میں بیٹھنے والا نیک بھی ہو تو برا ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ ان کے افعال بد کی تائید کرتا رہے گا اور برائی کی تائید کرنے والا بھی برا ہوتا ہے۔

ایک شخص کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور یہ دعا اس کے لب پر تھی: ''اے اللہ! میرے بھائیوں کی اصلاح فرما۔'' لوگوں نے کہا اس بلند مقام پر اپنے لئے دعا کیوں نہیں کرتا اس نے جواب دیا: إن لی إخوانا ارجع إلیهم فان أصلحوا صلحت معهم وإن فسدوا فسدت

1۔ جمع الزوائد، الجامع الصغیر 2۔ سنن ابی داؤد، ترمذی

معھم ''وہ میرے بھائی ہیں جن کے پاس میں لوٹ کر جاؤں گا۔ اگر درست ہوئے تو میں بھی ان کی صحبت میں درست ہو جاؤں گا۔ اگر وہ خراب ہوئے تو میں بھی لامحالہ خراب ہو جاؤں گا۔'' مطلب یہ ہے کہ جب میری بہبودی میرے بھائیوں کی بہبودی پر موقوف ہے تو میں کیوں نہ ان کے لئے دعا کروں تا کہ میرا مقصود بھی ان کی وجہ سے حاصل ہو جائے ان سب امور کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ نفس کو تسکین دوستوں میں حاصل ہوتی ہے۔ جس مجلس یا محفل میں انسان ہوگا اس کے عادات و افعال جذب کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ جملہ معاملت و ارادت حق و باطل کا ایک مرکب ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے وہی اس کی طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔ طبیعت پر صحبت کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ عادت ایسی سخت چیز ہے کہ آدمی فیض صحبت سے عالم ہو جاتا ہے۔ طوطا تعلیم سے آدمی کی طرح بولنا سیکھ لیتا ہے۔ گھوڑا محنت سے حیوانیت کی عادت چھوڑ کر انسانی عادات اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں جہاں صحبت کی تاثیر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مشائخ رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے فیض صحبت حاصل کرتے ہیں اور اپنے مریدوں کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں۔ مشائخ کے درمیان یہ بات فریضہ کی طرح ہوگئی ہے۔

اکثر مشائخ نے گروہ صوفیاء کے لئے آداب صحبت پر بسیط کتابیں لکھی ہیں چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب تحریر کی اور اس کا نام ''تصحیح الارادت'' رکھا۔ ایک کتاب احمد بن خضرویہ بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی اور اس کا نام ''الرعایہ بحقوق اللہ'' رکھا۔ محمد بن علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ''آداب المریدین'' ہے۔

ابو القاسم حکیم، ابوبکر وراق، سہل بن عبداللہ تستری، ابو عبدالرحمٰن سلمی اور استاد ابو القاسم قشیری رحمہم اللہ تعالیٰ سب نے اس موضوع پر مفصل کتابیں لکھی ہیں اور سب لوگ اس فن کے امام ہوئے ہیں۔ میرا مقصود اس کتاب سے یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا دوسری کتابوں کا حاجت مند نہ ہو۔ میں قبل ازیں تمہارے سوال کے جواب میں کہہ چکا ہوں کہ یہ کتاب تمہارے لئے اور دیگر طالبان طریقت کے لئے کافی ہونی چاہئے۔ اس لئے میں ان صوفیائے کرام کے خیالات، آداب معاملات کی مختلف اقسام پر ابواب کی صورت میں مرتب کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اکیسواں باب

آداب صحبت

یہ تو واضح ہو گیا کہ مرید کے لئے سب سے اہم چیز ہم نشینی ہے اور لامحالہ ہم نشینی کے حقوق کی پاسداری فرض ہے۔ مرید کے لئے تنہائی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لئے پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَلشَّیْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ "ابلیس تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے دور ہوتا ہے۔" حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ (المجادلہ: 7) "اگر تین آدمی باہم مشورے کر رہے ہوں تو چوتھا باری تعالیٰ ہوتا ہے۔"

المختصر مرید کے لئے تنہائی سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ حکایات میں آیا ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ درجہ کمال کو پہنچ چکا ہے اور اب اس کے لئے تنہائی ہم نشینی سے بہتر ہے۔ اس نے گوشہ تنہائی اختیار کر لیا اور جماعت مشائخ سے روگرداں ہو گیا۔ رات کے وقت اس کے پاس ایک اونٹ لایا جاتا اور اسے کہا جاتا چلو تمہیں بہشت جانا ہے۔ وہ اونٹ پر سوار ہوتے اور پر فضا مقام پر پہنچ جاتے۔ خوبرو لوگوں کی معیت میں عمدہ کھانے اس کے لئے مہیا کئے جاتے۔ صبح تک وہ وہاں رہتا۔ پھر اسے نیند آ جاتی اور بیدار ہوتا تو اپنے زاویہ (تکیہ) میں ہوتا۔ رفتہ رفتہ انسانی غرور اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا اور تکبر نے اسے پوری طرح جکڑ لیا اور وہ اپنے اوپر اس حالت کے وارد ہونے کا دعویدار ہو گیا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو علم ہوا تو وہ اس کے زاویہ پر تشریف لائے اور دیکھا کہ وہ غرور اور تکبر میں مبتلا ہے۔ حال دریافت کیا تو اس نے سب واقعہ بیان کر دیا۔ حضرت جنید نے کہا کہ آج رات اس مقام پر جانا ہو تو وہاں پہنچ کر تین بار پڑھنا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ ہنگام شب اسے پھر وہیں لے گئے۔ وہ دل ہی دل میں حضرت جنید کا منکر ہو رہا تھا۔ کچھ وقت گزرنے پر اس نے ازراہ آزمائش تین بار

''لاحول'' پڑھا۔ جملہ حاضرین میں ایک خروش اٹھا اور سب کے سب چلے گئے اور اس نے اپنے آپ کو ایک کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا پایا اور اس کے گرد مردار جانوروں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے توبہ کی۔ الغرض مرید کے حق میں تنہائی سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔

ہم نشینی کی اہم شرط یہ ہے کہ ہر شخص کا درجہ ملحوظ خاطر رہے۔ پیر طریقت کے ساتھ حرمت کا لحاظ، اپنے جیسوں کے ساتھ خوش وقتی، بچوں کے ساتھ شفقت اور بوڑھوں کے ساتھ پاس توقیر و حرمت، الغرض بوڑھوں کو باپ کا درجہ دے تو اپنے ہم عمروں کو بھائی سمجھے اور اپنے سے چھوٹوں کو فرزند۔ کینہ اور حسد سے دست بردار ہو۔ عداوت سے روگرداں ہو۔ جہاں نصیحت کی ضرورت ہو دریغ نہ کرے۔ ہم نشینی میں غیبت اور خیانت ناروا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے قول و فعل کی قطع برید منع ہے کیونکہ ہم نشینی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور وہ کسی قول یا فعل سے قطع نہیں ہو سکتی۔

مصنف (علی بن عثمان جلابی) فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ المشائخ ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ شرط ہم نشینی کیا ہے؟ فرمایا شرط ہم نشینی یہ ہے کہ تو اپنے حصے کا طالب نہ ہو۔ ہم نشینی میں جملہ خرابیاں اسی چیز سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہر شخص اپنا حصہ طلب کرتا ہے حصہ طلب کرنے والے کے لئے ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے حقیقی ہم نشینی یہ ہے کہ اپنے حصے سے دستبردار ہو کر ہم نشینوں کے حصے کی پاسداری کرے۔

ایک درویش نے کہا کہ میں ایک دفعہ کوفہ سے مکہ معظمہ جا رہا تھا۔ راستے میں حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ہمراہی (صحبت) کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک امیر ہو ایک خادم۔ اگر تم چاہتے ہو امیر کا کردار لے لو۔ میں نے کہا یہ کام آپ کریں۔ فرمایا ٹھیک ہے مگر تمہیں میرے حکم کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ عرض کیا بجا ہے۔ منزل پر پہنچے تو آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ میں حکم بجا لایا۔ آپ نے کنوئیں سے پانی کھینچا۔ سردی کا موسم تھا لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور

مجھے گرم کیا۔ میں جب بھی کوئی کام کرنے کو اٹھتا فرماتے بیٹھ جاؤ مجھے حکم بجالانا تھا۔ خاموش ہو جاتا۔ رات کو سخت بارش ہونے لگی۔ آپ نے اپنا خرقہ نکالا اور تا سحر میرے سر پر تان کر کھڑے رہے۔ میں شرم سے ڈوبا جا رہا تھا۔ مگر از روئے شرط کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جب صبح ہوئی تو میں نے کہا آج میں امیر ہوں گا۔ فرمایا ٹھیک ہے۔ جب پھر منزل پر قیام کیا تو پھر آپ نے خدمت اپنے اوپر لے لی۔ میں نے کہا میں امیر ہوں میرے حکم سے آپ باہر نہیں ہو سکتے۔ آپ نے فرمایا نافرمان وہ ہوتا ہے جو اپنی خدمت امیر کے سپرد کر دے۔ مکہ معظمہ تک آپ اسی طرح میرے ہم سفر رہے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر میں شرمساری کے عالم میں بھاگ گیا آپ نے منیٰ میں مجھے دیکھ لیا اور فرمایا دیکھو بیٹا! درویشوں کے ساتھ ہم نشینی کا طریقہ یہی ہے جو میں نے تمہارے ساتھ اختیار کیا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخَدَمْتُهُ عَشَرَ سِنِيْنَ فَوَاللّٰهِ مَاقَالَ لِیْ اُفٍ قَطُّ مَا قَالَ لِیْ بِشَیْءٍ لِمَ فَعَلْتَ كَذَا وَلَا بِشَیْءٍ لِمَ اَفْعَلْهُ لِمَ مَا فَعَلْتُ كَذَا(1) ''میں دس برس تک آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہا۔ بخدا آپ نے کبھی اف تک نہیں فرمایا۔ نہ کبھی کچھ کرنے پر کہا کہ کیوں کیا نہ ہی کچھ نہ کرنے پر کہا کہ کیوں نہیں کیا۔''

درویش دو طرح کے ہوتے ہیں: مقیم اور مسافر۔ سنت مشائخ یہ ہے کہ مسافر مقیموں کو اپنے آپ پر ترجیح دیں۔ کیونکہ مسافر اپنے حصے کی تلاش میں پھر رہے ہیں اور مقیم خدمت حق میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسافروں کی طلب لاحق ہوتی ہے اور مقیم لوگ طمانیت حصول میں مگن ہوتے ہیں۔ فضیلت صاحب حصول کے لئے ہوتی ہے طالب حصول کے لئے نہیں مقیموں کو بھی چاہئے کہ مسافروں کو ترجیح دیں کیونکہ وہ تعلق سے وابستہ ہیں اور مسافر تعلقات سے منقطع اور مجرد۔ مسافر تلاش میں ہوتے ہیں اور مقیم توقف میں۔ بوڑھوں کو چاہئے کہ جوانوں کو ترجیح دیں۔ کیونکہ جوان دنیا میں مقابلتاً نو وارد ہیں اور ان کی معصیت کا

1۔ صحیح مسلم

بوجھ کم ہے۔ جوانوں کو بھی بوڑھوں کی فوقیت تسلیم کرنی چاہئے کیونکہ وہ عبادت اور خدمت میں ان سے مقدم ہیں۔ ایسا ہو تو جانبین کے لئے باعث نجات ہے ورنہ ہلاکت۔

فصل: ادب کی اقسام

آداب، ستودہ عادات کا یکجا ہونا ہے۔ "ادیب کو ادیب اور مودب کو مودب اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی جو بات بھی ہوتی ہے نیک ہوتی ہے"۔ فالذی اجتمع فیه خصال الخیر فهو أدیب جس کسی میں نیک عادتیں جمع ہوں وہ ادیب ہے۔ "اصطلاح عام میں لغت اور صرف ونحو کے عالم کو ادیب کہتے ہیں۔ مگر صوفیائے کرام کے نزدیک الأدب الوقوف مع المستحسنات ومعناه أن تعامل لله فی الأدب سرا و علانیة واذا کنت کذلک کنت ادیبا وان کنت أعجیما وان لم تکن کذلک تکون علی ضده۔ "ادب نیک کاموں پر استقامت کا نام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے ہر معاملہ باادب ہو خفیہ ہو یا علانیہ۔ اگر معاملہ باادب ہے تو ادیب ہے چاہے عجمی ہو ورنہ اس کا برعکس"۔

عبارت آرائی کو معاملت میں کوئی دخل نہیں اور ہر حالت میں صاحب عمل لوگ صاحب قال لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ادب کی شرط کیا ہے؟ جواب دیا جو کچھ میں جانتا ہوں وہ ایک جملے میں بیان کئے دیتا ہوں۔ ادب یہ ہے کہ جو کچھ تیری زبان سے نکلے سچ ہو۔ اگر کوئی معاملہ کرے تو اس کی بنیاد حق وانصاف پر ہو۔ کلام سچا ہونا چاہئے خواہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔ عمل نیک ہونا چاہئے خواہ سخت ہی کیوں نہ ہو بولو تو سچ بولو۔ خاموش رہو تو خاموشی کو راستی پر مبنی رکھو۔

شیخ ابو نصر سراج رحمۃ اللہ علیہ مصنف "کتاب اللمع" نے اپنی کتاب میں ادب کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں فرماتے ہیں: الناس فی الأدب علی ثلث طبقات أما أهل الدنیا فأکثر آدابهم فی الفصاحة والبلاغة وحفظ العلوم واسماء

المملوك واشعار العرب وأمّا أهل الدين فأكثر آدابهم فى رياضة النفس وتأديب الجوارح وحفظ الحدود و ترك الشهوات وأما أهل الخصوصية فأكثر آدابهم فى طهارة القلوب ومراعاة الأسرار والوفاء بالعهود و حفظ الوقت وقلة الالتفات إلى الخواطر و حسن الأدب فى موافقة الطلب وأوقات الحضور و مقامات القرب "ادب کے لحاظ سے لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں: اہل دنیا جن کے نزدیک فصاحت، بلاغت، علوم وفنون کی تحقیق و تدوین، بادشاہوں کی داستانیں، مختلف شعراء کے اچھے شعر، علمی چیزوں، شاہی نسب ناموں اور عربی زبان کے اشعار کو حفظ کرنا ادب ہے۔

اہل دین کے نزدیک ادب نفس، ریاضت و مجاہدہ کی عادت، اعضائے جسمانی کی تادیب، حدود حق کی حفاظت اور ترک خواہشات نفسانی کو ادب کہتے ہیں۔

خاص لوگ، جن کے نزدیک دل کو پاک رکھنا، اسرار باطن پر نظر رکھنا، ایفائے عہد، وقت کی پاسداری، پراگندگی خیالات کا استیصال اور پھر طلب و قرب میں حضور حق میں مودب رہنا ادب ہے۔"

یہ عبارت جامع ہے اور ان کی تشریح اس کتاب میں مختلف مقامات پر آئے گی۔

بائیسواں باب

آداب اقامت

جب کوئی درویش اقامت پذیر ہو تو اس کے لئے شرط ادب یہ ہے کہ اگر کوئی مسافر اس کے دروازے پر آئے تو اس کی عزت و توقیر کرے اور اس کے ساتھ دلی مسرت سے پیش آئے اور احترام سے اپنے پاس ٹھہرائے۔ یہ سمجھے کہ گویا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں میں سے ہیں اور وہ برتاؤ کرے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں سے کیا کرتے تھے۔ بلا تکلف ماحضر سامنے رکھے جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا، فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِینٍ ۞ (الذاریات) "(آپ) بھنا ہوا تندرست بچھڑا سامنے لے آئے۔" یہ پاس ادب یہ نہ پوچھے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ اور تمہارا کیا نام ہے؟ یہ سمجھے کہ ایسے لوگ حق تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ اسی کی طرف وہ رو بہ سفر ہوتے ہیں اور ان کا نام "بندہ حق" ہوتا ہے یہ فیصلہ کرے کہ مسافر کو آرام کے لئے تنہائی کی ضرورت ہوگی یا مجالست کی۔ اگر وہ خلوت پسند ہے تو اس کے لئے جگہ خالی کر دے اگر مجالست ہو تو بے تکلف محبت اور ہمدردی سے اس کے ساتھ رہے۔ جب وہ تکیہ پر سر رکھ کر سونے کا ارادہ کرے تو اس کے پاؤں دبائے۔ اگر وہ کہے کہ مجھے عادت نہیں تو اصرار نہ کرے تاکہ اسے گراں نہ گذرے۔ دوسری صبح اسے نہایت صاف ستھرے حمام پر لے جائے۔ اس کے کپڑے ناپاک جگہ پر نہ رکھے۔ اور کسی اجنبی کو اس خدمت پر مامور نہ کرے۔ خدمت ایسے ہم جنس کے سپرد ہونی چاہئے جو پورے اعتقاد کے ساتھ اسے ہر نجاست سے پاک کر سکے۔ پیٹھ کھجلائے۔ گھٹنوں، پاؤں کے تلوؤں اور ہاتھوں کی مالش کرے۔ اس قدر کافی ہے۔ اگر توفیق ہو تو نئے کپڑے بنوا دے ورنہ تکلف نہ کرے۔ اسی کے کپڑے پاک کر کے پہنا دے۔ اگر وہ حمام سے واپس آ کر دو تین روز اور ٹھہرے اور شہر میں کوئی پیر، کوئی جماعت یا

کوئی امام ہوتو زیارت کے لئے دریافت کرے چلے تو فبہا ورنہ اصرار نہ کرے کیونکہ طالب حق کسی وقت ایسے مقام پر ہوتا ہے کہ اس کا اپنا دل اس کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے ان کے سفر کے حالات پوچھے تو آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت خضر علیہ السلام نے میرے ساتھ ہم نشینی کی خواہش کی مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ اس وقت میرا دل بجز بذات حق کے کسی چیز کی طرف راغب نہیں تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری نظر میں کسی اور چیز کی قدر و منزلت ہو تو میں اس کی رعایت سے اپنی توجہ کسی اور طرف کروں۔ یہ قطعاً روا نہیں کہ درویش مسافر کو اہل دنیا کے سلام کے لئے ان کی مہمان نوازیوں کے لئے یا تیمار داریوں کے لئے ساتھ لئے پھرے جس اقامت گزیں درویش کو مسافروں سے یہ لالچ ہو کہ ان کو اپنی گدائی کا آلہ کار بنائے اور اپنی غرض سے انہیں جگہ جگہ لئے پھرے تو اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ بجائے مسافروں کے ذلیل کرنے کے ابتدا ہی سے ان کی خدمت کرنے کا بیڑا نہ اٹھالے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) اپنے سفر کے دوران کسی چیز سے اتنا رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہیں ہوا جتنا جاہل خدمت گذاروں سے جو مجھے بلا تامل ساتھ لے لیتے اور بڑے آدمیوں اور دہقانوں کے گھروں پر لئے پھرتے۔ میں دلی کراہت سے ساتھ ہو لیتا اور بظاہر درگذر سے کام لیتا۔ مگر دل میں عہد کر لیتا کہ اقامت کے بعد مسافروں سے کبھی یہ سلوک نہیں کروں گا۔ بے ادبوں کی مصاحبت سے یہی فائدہ ہوتا ہے کہ جو وہ کریں تم اس سے پرہیز کرو۔

اگر مسافر خوش ہو کر چند روز قیام کرے اور کسی دنیوی ضرورت کا اظہار کرے تو درویش کو چاہئے کہ اس کی ضرورت پوری کر دے تاہم اگر وہ مدعی بے ہمت ہے تو درویش کو اس کی محال ضروریات پورا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سالکان حق کا وطیرہ نہیں ہوتا۔ سالک حق کو کیا ضرورت ہے کہ درویشوں سے ملے اگر اس کا دامن دنیوی ضروریات سے آلودہ ہے۔ اسے بازار میں جا کر خرید و فروخت کرنی چاہئے یا کسی بادشاہ کی درگاہ پر دربانی اختیار کرنا چاہئے۔

کہتے ہیں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں میں ریاضت مجاہدہ میں مشغول تھے۔ایک مہمان حاضر ہوا۔اس کے لئے بہت تکلف کیا گیا اور کھانا پیش ہوا۔اس نے کہا مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تمہیں اس چیز کے لئے بازار جانا ہوگا۔تم بازاری آدمی ہو، مسجد اور صومعہ سے تمہیں کوئی تعلق نہیں۔

میں دو درویشوں کے ہمراہ ابن معلاء کی زیارت کے لئے جا رہا تھا۔وہ ایک گاؤں رملہ نامی میں مقیم تھے ہم نے راستے میں یہ فیصلہ کیا کہ ہر شخص اپنے دل میں کوئی بات سوچ لے۔ دیکھیں پیر صاحب ہمارے باطن کی کیفیت سمجھتے ہیں یا نہیں چنانچہ میں نے سوچا مجھے آپ سے حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کی مناجات اور اشعار ملنے کی امید رکھنی چاہئے۔دوسرے نے کہا کہ میں تلی کے مرض میں مبتلا ہوں مجھے شفا حاصل ہو جائے۔تیسرے نے کہا مجھے حلوۂ صابونی (برفی) چاہئے۔ جب ہم لوگ حاضر خدمت ہوئے تو ان کے حکم سے حسین بن منصور کی مناجات اور ان کے اشعار لکھے پڑے تھے، وہ میرے سامنے رکھ دیئے۔دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا اور اس کی تلی کی تکلیف دور ہوگئی۔تیسرے سے فرمایا صابونی حلوہ بادشاہوں کے درباریوں کی غذا ہے۔مگر تم نے لباس اولیاء اوڑھ رکھا ہے یہ لباس شاہی نوکروں اور دنیاداروں کے مطالبات پر راس نہیں۔دو میں سے ایک چیز اختیار کرو۔

الغرض صاحب اقامت پر صرف اس شخص کی رعایت روا ہے جو رعایت حق میں مشغول ہو اور اپنے حصے سے دستبردار ہو۔جو درویش اپنے حصے پر اقامت پذیر ہو اس کے حصے پر اور کوئی ہاتھ نہیں مار سکتا۔کیونکہ درویش ایک دوسرے کے رہنما ہوتے ہیں رہزن نہیں ہوتے۔جب تک کوئی اپنے حصے پر بضد ہو دوسرے کو مخالفت کرنی چاہئے۔جب وہ اپنے حصے سے بے نیاز ہو جائے تو دوسرے پر لازم ہے کہ اس کا حصہ برقرار رکھے تاکہ دونوں راہ طے کرنیوالوں میں شمار ہوں اور راہ سے بھٹکے ہوئے نہ کہلائیں۔

اخبار نبوی میں آیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان برادری قائم کی تھی۔دونوں اہل صفہ کے سردار اور رئیس تھے۔

دونوں اہل باطن تھے۔ایک دن حضرت سلمان حضرت ابوذر کے گھر پر ملنے کے لئے گئے تو حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ نے شکایت کی کہ آپ کا بھائی نہ دن کو کچھ کھاتا ہے نہ رات کو سوتا ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کوئی کھانے کی چیز ہو تو لاؤ۔ جب کھانے کو کچھ سامنے آیا تو حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا آپ کو میرے ساتھ موافقت کرنا پڑے گی کیونکہ یہ روزہ فرض نہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موافقت کی۔ جب رات ہوئی تو کہا بھائی سونے میں بھی میرے ساتھ موافقت ضروری ہے کیونکہ اِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ (1) ''تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے۔ تیری بیوی کا بھی حق ہے، تیرے پروردگار کا بھی ہے۔'' جب دوسرے روز حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا، میں وہی کہتا ہوں جو کل سلمان نے کہا تھا۔ابوذر نے اپنے حصے کو ترک کیا ہوا تھا۔ حضرت سلمان نے ان کے حصے کو اقامت دی اور اپنا ورد چھوڑ دیا۔ اس بنیاد پر جو کچھ کیا جائے وہ درست اور مستحکم ہوگا۔

ایک ایسا وقت تھا کہ میں (علی بن عثمان جلابی) عراق میں دنیوی دولت کی طلب اور اس کو فنا کرنے میں نہایت تندہی سے مصروف تھا۔ مجھ پر بہت قرض ہوگیا۔ جس کو کچھ ضرورت ہوتی وہ میری طرف رخ کرتا۔ میں ان لوگوں کی حرص و ہوس کا شکار ہوکر رہ گیا۔ سرداران وقت میں سے ایک سردار نے مجھے لکھا: بیٹا! خبردار دل کو خدا سے ہٹا کر ایسے لوگوں کی دل دہی میں مشغول نہ ہو جو اپنے نفس کی خواہشات میں مشغول ہیں۔اگر کوئی دل اپنے دل سے عزیز تر ہو تو اس کی فراغت میں کوشاں ہونا روا ہے۔ ورنہ اس کام سے دستبردار ہونا چاہئے کیونکہ خود ذات حق اپنے بندوں کے لئے کافی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس چیز پر عمل پیرا ہونے سے مجھے فراغت حاصل ہوگئی۔ یہ ہیں احکام مقیموں اور مسافروں کی ہم نشینی سے متعلق۔

1۔صحیح بخاری و مسلم

تئیسواں باب

آداب سفر

اقامت چھوڑ کر سفر اختیار کرنا ہو تو اس کے آداب کو مدنظر رکھے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ سفر فی سبیل اللہ ہونا چاہئے۔ نفس کی تابعداری سے روگرداں ہو کر ظاہر کے سفر کی طرح باطن کا بھی سفر کرے یعنی خواہشات نفسانی کو پیچھے چھوڑ دے۔ ہمیشہ بقید وضو رہے اور اپنے اوراد کو ضائع نہ کرے۔ سفر کا کوئی مقصد ہونا چاہئے یعنی حج بیت اللہ، جہاد یا کسی مقدس مقام کی زیارت، تلاش علم یا کسی بزرگ کے مزار کی زیارت۔ اگر ایسا کوئی مقصد مدنظر نہیں تو سفر بیکار ہوگا۔

سفر میں خرقہ، مصلیٰ، لوٹا، رسی، جوتا اور عصا ساتھ رکھنا چاہئے تاکہ خرقہ سے بدن ڈھانپے۔ مصلّے پر نماز پڑھے۔ لوٹے سے وضو کرے اور عصا کی مدد سے ایذا دینے والے جانوروں سے محفوظ رہے۔ ان چیزوں میں اور بھی فوائد ہیں۔ حالت وضو میں جوتا پہنے رہے تاکہ مصلّے پر آسکے اگر کوئی درویش اقتدائے سنت میں کچھ اور چیزیں مثلاً کنگھی، ناخن تراش، سوئی اور سرمہ بھی ساتھ رکھے تو روا ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ اگر اور سامان بھی ساتھ ہو تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ درویش فی الوقت کس مقام پر ہے اگر ارادت کا مقام ہے تو ہر چیز کی حیثیت ایک رکاوٹ، ایک بت، ایک دیوار اور ایک حجاب کی ہے اور صرف نفسانی رعونت اور سرکشی کا اظہار ہے۔ اگر درویش تمکین واستقامت کے مقام پر ہے یعنی وہ ثابت قدم ہے اور نفسانی خواہشات پر کلی اختیار رکھتا ہے تو اسے سب سامان رکھنا روا ہے۔

شیخ ابو مسلم فارس بن غالب انصاری رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ شیخ ابوسعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے آئے دیکھا تو آپ تخت پر چار تکیے لگائے سو رہے ہیں۔ پاؤں ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں اور ایک مصری چادر اوڑھ رکھی ہے۔ ان کے اپنے کپڑے

میل کی وجہ سے چمڑے کی طرح ہو رہے تھے۔ جسم تکلیف سے سوکھا ہوا تھا۔ رنگ ریاضت سے زرد ہو رہا تھا۔ دل میں کراہت پیدا ہوئی اور سوچا میں بھی درویش ہوں۔ یہ بھی درویش ہے۔ اسے اس قدر آرام میسر ہے اور میں مشقت سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ شیخ ابوسعید نے نخوت باطن کی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا: "اے مسلم! تو نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ درویش بھی خود بین ہوتا ہے؟ سنو میں نے صرف حق تعالیٰ کو دیکھا اور حق تعالیٰ نے مجھے تخت پر بٹھایا تو نے صرف اپنے آپ کو دیکھا اور بجز خاک نشینی کے کچھ نہ پایا۔ ہمارے نصیب میں مشاہدہ ہے اور تیرے نصیب میں مجاہدہ۔ یہ دونوں طریقت کے مقامات ہیں مگر ذات حق ان سے منزہ ہے اور درویش مقامات واحوال سے فانی اور آزاد"۔

شیخ ابومسلم فرماتے ہیں کہ یہ بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور تمام عالم میری نظر میں تاریک ہو گیا۔ ہوش بجا ہوئے تو میں معافی کا خواستگار ہوا اور آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے جانے کی اجازت دیجئے کیونکہ میں دیدار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے اور مثال کے طور پر یہ شعر پڑھا۔

آنچہ گوشم نتواست شنیدن بخبر
ہمہ چشم بعیان یکسر دید آن بہ بصر

"جو چیز میرے کان سن نہ سکے وہ میری آنکھ نے ظاہر دیکھ لیا۔"

مسافر کو ہمیشہ سنت کی اقتداء کرنی چاہئے اور جب کسی مقیم سے ملاقات ہو تو عزت و احترام سے سامنے آئے۔ سلام کرے۔ پہلے بائیں پاؤں کا جوتا اتارے کیونکہ یہ سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ جب جوتا پہنے تو پہلے دایاں پاؤں جوتے میں ڈالے۔ جب پاؤں دھوئے تو پہلے دایاں اور پھر بایاں دھوئے۔ دو رکعت نماز تحیت ادا کرے اور پھر درویشوں کی خدمت میں مشغول ہو جائے۔ مقیموں پر کسی شکل میں اعتراض نہ کرے۔ کسی کے ساتھ معاملے میں زیادتی نہ کرے۔ اپنے سفر کے مصائب بیان نہ کرے۔ مجلس میں بیٹھ کر علم کی باتیں یا روایات و حکایات بیان نہ کرے کیونکہ سب چیزیں رعونت پر دلالت کرتی ہیں۔

سب کا دکھ بانٹے اور فی سبیل اللہ اوروں کا بوجھ برداشت کرے یہ چیز برکات خداوندی کا باعث ہے اگر مقیم یا اس کے خادم کوئی بات کہیں اور اس کو سلام یا زیارت کی دعوت دیں تو تا بہ امکان ان کی مخالفت نہ کرے۔ بجائے خود اہل دنیا سے رواداری کا قائل نہ ہو۔ عذر یا تاویل سے ٹال دے۔ اپنی کسی محال ضرورت کا بوجھ ان پر نہ ڈالے۔ راحت نفس اور حصول خواہش کے لئے امراء کی درگاہوں پر جانا مذموم ہے۔

الغرض مسافر اور مقیم کے جملہ معاملات میں حق تعالیٰ کی رضا جوئی مدنظر رہنا چاہئے۔ باہمی اعتماد ہو۔ ایک دوسرے کو برا نہ کہے۔ عدم موجودگی میں غیبت نہ کرے۔ خدائے برتر غیبت کو نہایت برا کہتا ہے اہل حقیقت فعل کو دیکھ کر فاعل پر نظر رکھتے ہیں۔ خلقت بہر حال مخلوق حق تعالیٰ ہے اگر کسی میں عیب ہے یا وہ بے عیب ہے۔ حجاب میں ہے یا عین مشاہدہ میں عیب جوئی فاعل (حق تعالیٰ) پر اعتراض ہے۔ آدمی ہونے کی حیثیت سے مخلوق پر نظر کرے تو سب سے آزاد ہو جائے اور سمجھ لے کر سب حجاب میں ہیں۔ مغلوب، مقہور اور عاجز ہیں۔ ہر فرد ہمیشہ اسی تقویم پر رہتا ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا۔ مخلوق کو خدا کی سلطنت میں کوئی تصرف نہیں اور کسی چیز کی اصلیت بدلنے پر جذبہ ذات حق کے کوئی قادر نہیں۔ واللہ اعلم

چوبیسواں باب

آداب طعام

انسان کے لئے غذا لازمی چیز ہے۔ طبیعتوں کا سکون کھانے پینے سے برقرار رہتا ہے مگر شرط مروت یہ ہے کہ اس میں مبالغے سے کام نہ لیا جائے اور آدمی روز وشب فکر خورد و نوش میں غرق نہ رہے۔ امام شافعی نے فرمایا: من کان همته ما یدخل فی جوفه کان قیمته مایخرج منه ''جس شخص کی کوشش ہمیشہ اس چیز پر صرف ہو جو پیٹ میں اترتی ہے اس کی قیمت وہی کچھ ہے جو پیٹ سے نکلتا ہے۔'' سالکان حق کے لئے پرخوری سب سے زیادہ ضرر رساں چیز ہے قبل ازیں بھوک سے متعلق کچھ کہا جا چکا ہے اور یہاں اسی قدر کافی ہے۔ کہتے ہیں حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا: آپ بھوک کی بہت تعریف کرتے ہیں فرمایا درست ہے اگر فرعون بھوکا ہوتا تو ہرگز یہ نہ کہتا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات) ''میں ہی تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں۔'' اگر قارون بھوکا ہوتا تو سرکشی نہ کرتا۔ ثعلبہ بھوکا تھا تو سب اسے قابل تعریف سمجھتے تھے۔ سیر ہو کر اس نے نفاق کا بیج بویا۔ حق تعالیٰ نے کفار کی نسبت فرمایا: ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الحجر) ''انہیں چھوڑ دیجئے وہ کھائیں۔ تمتع حاصل کریں۔ تمناؤں میں الجھے رہیں۔ عنقریب وہ سب کچھ جان لیں گے۔'' پھر باری تعالیٰ نے فرمایا، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد) ''کفار دنیا میں تمتع حاصل کرتے ہیں اور چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے''۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں شراب سے بھرے ہوئے پیٹ کو طعام حلال سے پر کیے ہوئے پیٹ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیوں؟ فرمایا پیٹ شراب سے بھر جائے تو عقل گل ہو جاتی ہے، آتش نفس ختم ہو جاتی ہے اور لوگ پینے والے کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ ہو جاتے ہیں اس کے برعکس اگر طعام حلال سے پیٹ پر

ہوتو لغویت زور مارتی ہے۔ شہوت برانگیختہ ہوتی ہے اور نفسانی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں۔ مشائخ کرام نے ایسے لوگوں سے متعلق کہا ہے، اکلھم کأکل المرضی ونومھم کنوم الغرقی کلامھم کلام الثکلی "کھاتے ہیں تو مریضوں کی طرح، غرقابوں کی نیند سوتے ہیں اور ماتم کرنیوالی عورتوں کی طرح کلام کرتے ہیں۔"

آداب طعام کی شرط یہ ہے کہ تنہا نہ کھائیں اور کھاتے وقت ایک دوسرے کے لئے ایثار کریں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: شَرُّ النَّاسِ مَنْ أَكَلَ وَحْدَهُ وَ ضَرَبَ عَبْدَهُ وَ مَنَعَ رِفْدَهُ(1) "سب سے برا آدمی وہ ہے جو تنہا کھائے، غلام کو پیٹے اور بخشش کرنے سے پہلو تہی کرے۔

جب دستر خوان پر بیٹھے تو بسم اللہ سے شروع کرے۔ خوان پر رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر نہ دیکھے تاکہ دوسروں کو کراہت نہ ہو پہلے نمکین لقمہ اٹھائے اور ساتھیوں کے ساتھ انصاف کرے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے اس آیت کا مفہوم پوچھا، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل:90) "بلاشبہ حق تعالیٰ عدل اور نیکی کا حکم فرماتا ہے۔" آپ نے فرمایا: عدل یہ ہے کہ کھانے میں اپنے ساتھی کے ساتھ انصاف کرے اور احسان یہ ہے کھانے میں اس کو اپنے آپ سے بہتر سمجھے۔

میرے شیخ محترم نے کہا مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو دعویٰ کرتا ہے ترک دنیا کا اور شب و روز کھانے کی فکر میں سر گرداں رہتا ہے۔

کھانا ہاتھ سے کھانا چاہئے۔ نظر صرف اپنے لقمے پر رکھے۔ پانی اس وقت پئے جب سچی پیاس ہو اور اتنا پئے کہ جگر تر ہو جائے۔ لقمہ چھوٹا بنائے۔ منہ میں ڈالنے اور چبانے میں جلدی نہ کرے۔ یہ سنت اور اصول صحت کے خلاف ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر الحمد للہ پڑھے اور ہاتھ دھوئے۔ اگر جماعت میں سے دو یا تین یا زیادہ افراد چوری چھپے کسی دعوت

1۔ العلل المتناہیہ

پر چلے جائیں اور کچھ کھائیں تو بعض مشائخ کے نزدیک حرام ہے اور حقوق صحبت میں خیانت کے برابر ہے۔ اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ (البقرہ:174) ''یہی وہ لوگ ہیں جو پیٹوں میں بجز آگ کے کچھ نہیں بھرتے۔'' دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اگر وہ باہم موافق ایک جماعت ہو تو روا ہے۔ ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی ہو تو بھی جائز ہے کیونکہ تنہائی میں انصاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انصاف ہم نشینوں کی موجودگی میں ہوتا ہے علیحدگی میں حکم صحبت برقرار نہیں رہتا اور وہ اس کے بدلے ماخوذ نہیں ہوسکتا۔

اہم ترین امر یہ ہے کہ درویش کی دعوت کو رد نہ کرے اور دنیادار کی دعوت قبول نہ کرے اس کے گھر نہ جائے اور اس سے کوئی چیز طلب نہ کرے۔ یہ اہل طریقت کے لئے باعث خفت ہے۔ اہل دنیا درویش کے محرم نہیں ہوتے۔ ساز و سامان کی کثرت سے آدمی دنیادار نہیں ہو جاتا اور اس کے فقدان سے درویش نہیں بن جاتا جو شخص ثروت و غنا پر فقر کو افضل سمجھتا ہو وہ دنیادار نہیں پادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ فقر کا منکر دنیادار ہوتا ہے مفلس ہی کیوں نہ ہو۔

دعوت پر کسی چیز کے کھانے یا نہ کھانے میں تکلف نہ کرے بہ تقاضائے وقت جو ملے کھالے۔ جب صاحب دعوت محرم ہو تو شادی شدہ کیلئے روا ہے کہ کھانا ساتھ بھی لے جائے۔ نامحرم ہو تو اس کے گھر جانا ہی روا نہیں۔ بہر صورت کھانا ساتھ نہ لے جانا بہتر ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کھانا ساتھ اٹھانا ذلت ہے۔''
واللہ اعلم بالصواب

پچیسواں باب

چلنے کے آداب

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان: 63) ''اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز وانکسار سے چلتے ہیں۔'' طالب حق کو لازم ہے کہ وہ چلتے وقت یہ سوچ کہ وہ اپنا قدم کس کے لئے اٹھاتا ہے، کسی خواہش نفس کے لئے یا محض حق تعالیٰ کے لئے اگر خواہش نفس کے لئے گامزن ہے تو توبہ کرے اور اگر حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہے تو مزید کوشش کرے تاکہ اور خوشنودی حق حاصل ہو۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز دوا پی۔ لوگوں نے کہا آپ تھوڑی دیر صحن میں ٹہل لیں تاکہ دوا اپنا پورا اثر کرے۔ آپ نے فرمایا: میں شرمسار ہوں۔ قیامت کے روز مجھ سے سوال ہوگا کہ اتنے قدم تو نے اپنے نفس کی خاطر کیوں اٹھائے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے، وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (یٰسین) ''اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ انہوں نے دنیا میں کمایا۔'' درویش کو چاہئے کہ بیداری کے عالم میں سر مراقبہ میں جھکا کر چلے۔ اپنے برابر اور راستے کے سوا کسی طرف نہ دیکھے۔ اگر راہ میں کوئی ملے تو اپنے کپڑوں کو بچاتے ہوئے اس سے پرے نہ ہٹائے کہ شاید وہ چھو نہ لے۔ سب مومن اور ان کے کپڑے پاک ہوتے ہیں۔ یہ محض رعونت اور خودنمائی ہے۔ البتہ اگر وہ کافر ہے یا اس پر کوئی نجاست بظاہر نظر آتی ہے تو اپنے آپ کو سمیٹ لینا روا ہے اگر کسی جماعت کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہو تو آگے بڑھنے کا قصد نہ کرے کیونکہ زیادتی کی طلب تکبر ہے۔ پیچھے چلنے کا بھی قصد نہ کرے اور حد سے زیادہ تواضع کا مظاہرہ نہ کرے کہ یہ بھی عین تکبر ہے۔ دن کے وقت جوتے کو ناپاکی سے محفوظ رکھے تاکہ خدارات کے وقت اس کے کپڑوں کو نجاست سے بچائے۔ جب کوئی جماعت یا درویش اس کے ساتھ ہوں تو راہ میں کسی سے بات کرنے کے

لئے ٹھہرنا نہیں چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ اس کا انتظار کریں۔ آہستہ چلے۔ جلد بازی نہ کرے کیونکہ اہل حرص کی روش ہے۔ اتنا آہستہ بھی نہ چلے کہ رفتار اہل غرور کی رفتار معلوم ہو۔ ہر قدم زمین پر پورا رکھے۔ الغرض چال ایسی ہو کہ اگر کوئی پوچھے کہاں جا رہے ہو تو وہ بلا تکلف کہہ سکے، اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾ (الصافات) ''بلاشبہ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ جلد میری رہنمائی فرمائے گا۔'' اگر رفتار اس طریق پر نہیں تو چلنا وبال ہے کیونکہ صحیح قدم صحیح قلبی کیفیتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جس کے خیالات حق کے لئے مجتمع ہوں اس کے قدم خیالات کے تابع ہوں گے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ درویش کی رفتار بغیر مراقبہ غفلت کا نشان ہے۔ جو کچھ بھی ہے دو قدم میں حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک قدم اپنے نصیب کا رکھے اور اور دوسرا فرمان حق کا۔ پہلا قدم اٹھائے۔ دوسرا قدم رکھے۔ طالب کی رفتار مسافت طے کرنے کی علامت ہے مگر قرب حق قطع مسافت سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے قرب کے لئے کوئی مسافت نہیں اور اس لئے طالب کے لئے پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ وباللہ التوفیق

چھبیسواں باب

سونے کے آداب

اس موضوع پر مشائخ کبار میں کافی اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ سالک کو صرف اس وقت سونا چاہئے جب نیند کا غلبہ ہو اور وہ بغیر سوئے نہ رہ سکتا ہو۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ(1) ''نیند اور موت میں برادری ہے۔'' زندگی نعمت ہے اور موت بلا اور بہر صورت نعمت بلا سے زیادہ بلند مرتبہ ہوتی ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ أطلع الحق علی فقال من نام غفل و من غفل حجب ''حق تعالیٰ نے مجھ پر نظر کی اور فرمایا سونے والا غافل ہے اور غافل حجاب میں ہے۔''

ایک دوسری جماعت کے عقیدہ کے مطابق سالک اپنے اختیار سے بھی سو سکتا ہے اور حق تعالیٰ کے احکام بجا لانے میں بھی احکام خداوندی کی رعایت کرے کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلٰثٍ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی يَنْتَبِهَ وَعَنِ الصَّبِی حَتّٰی يَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی يُفِيْقَ(2) ''تین آدمیوں پر احکام جاری نہیں ہوتے، ایک سونے والے پر جب تک بیدار نہ ہو۔ دوسرے لڑکے پر جب تک وہ جوان نہ ہو اور تیسرے دیوانے پر جب تک وہ ہوش میں نہ آئے۔'' سویا ہوا آدمی تکلیف احکام سے بری ہوتا ہے کیونکہ خلق کو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ بے اختیار ہوتا ہے۔ اس کا نفس اپنی خواہشات سے دور ہوتا ہے۔ اس کے کراماً کاتبین فارغ ہوتے ہیں۔ اس کی زبان دعوئی سے معذور ہوتی ہے۔ جھوٹ اور غیبت میں وہ مبتلا نہیں ہو سکتا اور خود بین اور ریا سے پاک ہوتا ہے، لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ③ (الفرقان) ''نہ وہ اپنی جان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ فائدہ۔ نہ انہیں موت اور زندگی پر اختیار

1۔ الجامع الصغیر 2۔ مستدرک حاکم، مسند احمد

ہوتا ہے اور نہ وہ دوبارہ زندہ ہونے پر قادر ہو سکتے ہیں۔" اسی بناء پر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: لا شیء أشد علی إبلیس من نوم العاصی فإذا نام العاصی یقول متی ینتبه ویقوم حتی یعصی اللّٰہ۔ "شیطان کے لئے گنہ گار کی نیند سے زیادہ کوئی چیز گراں نہیں۔ گنہ گار سوتا ہے تو شیطان کہتا ہے یہ کب بیدار ہو کر پھر حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا۔"

اس موضوع پر حضرت جنید اور علی بن سہل اصفہانی رحمہما اللہ میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں ایک مزیدار خط حضرت علی بن سہل نے حضرت جنید کو لکھا۔ وہ میں نے من وعن تو نہیں سنا۔ مگر مطلب یہ ہے کہ آپ نے خط میں فرمایا: نیند، غفلت، قرار، اعراض ہے کیونکہ محبّ حق کو دن رات قرار نہیں ہوتا۔ اگر وہ سوئے گا تو یقیناً اپنے مقصود کو کھو بیٹھے گا اور اپنے آپ سے اور اپنے روزگار سے غافل ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ سے دور بھٹک جائے گا۔

چنانچہ باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع فرمایا: کذب من ادعی محبتی فاذا جنه اللیل نام عنی "اے داؤد! وہ شخص میری محبت کا جھوٹا مدعی ہے جو رات آئی تو سو گیا اور میری یاد سے غافل ہو گیا۔"

حضرت جنید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً لکھا کہ "ہماری بیداری ہمارا فعل ہے اور نیند حق تعالیٰ کا انعام ہے۔ جو چیز ہمارے اختیار کے بغیر ظہور پذیر ہو وہ یقیناً اس چیز پر فوقیت رکھتی ہے جو ہمارے اختیار سے واقع ہو۔ نیند محبان حق پر حق تعالیٰ کی نعمت ہے۔" اس مسئلہ کا تعلق صحو وسکر سے ہے اور ان سے متعلق تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ تعجب ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ جو صاحب صحو تھے یہاں سکر کی تعریف کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لکھتے وقت مغلوب الحال ہوں اور کیفیت وقت کے مطابق بات کی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔ خواب عین صحو ہوتا ہے اور بیداری عین سکر۔ کیونکہ نیند انسانی صفت ہے اور جب تک انسانی صفت سایہ فگن ہو انسان کو صحو سے نسبت ہوتی ہے۔ بیداری حق تعالیٰ کی صفت ہے جب انسان اپنی صفت سے باہر ہو تو مغلوب الحال ہوتا ہے۔ میں نے ایک گروہ

مشائخ کو دیکھا جو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق خواب کو بیداری سے افضل سمجھتے تھے۔ کیونکہ اکثر پیغمبروں، اولیاء اور بزرگوں کو مکاشفہ عالم خواب میں ہوا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُبَاھِیْ بِالْعَبْدِ الَّذِیْ نَامَ فِیْ سُجُوْدِہٖ وَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی اُنْظُرُوْا یَا مَلَائِکَتِیْ اِلٰی عَبْدِیْ رُوْحُہٗ فِیْ مَحَلِّ النَّجْوٰی وَ بَدَنُہٗ عَلٰی بِسَاطِ الْعِبَادَۃِ(1) ''بیشک اللہ تعالیٰ اس بندے پر ناز کرتا ہے جو سجدے میں سو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے فرشتو! میرے بندے کی طرف دیکھو۔ اس کی روح میرے ساتھ محو راز و نیاز ہے اور اس کا جسم فرش عبادت پر ہے۔'' نیز پیغمبر ﷺ نے فرمایا، مَنْ نَامَ عَلٰی طَھَارَۃٍ یُؤْذَنَ لِرُوْحِہٖ اَنْ یَّطُوْفَ بِالْعَرْشِ وَ یَسْجُدُ لِلّٰہِ تَعَالٰی(2) ''باوضو سونے والے کی روح کو طواف عرش کی اور حق تعالیٰ کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔''

کہتے ہیں شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ چالیس برس تک متواتر جاگتے رہے جب ایک رات سوئے تو رویت حق سے فیض یاب ہوئے۔ اس کے بعد ہمیشہ اسی امید پر سویا کرتے۔ اس مضمون میں قیس بن عامر کہتا ہے ؎

وانّی لأستنعس و مابی نعسۃ

لعلّ خیالا منک یلقی خیا لیا

''میں دراصل سونا چاہتا ہوں مگر مجھے نیند نہیں آتی۔ شائد عالم خواب میں تیرا خیال میرے خیال سے ملاقات کرے۔''

میں نے ایک ایسی جماعت کو بھی دیکھا جو علی بن سہل رحمۃ اللہ علیہ کی طرح بیداری کو نیند پر ترجیح دیتی تھی۔ رسولوں کی وحی اور اولیاء کی کرامات کا تعلق بیداری سے ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ''اگر نیند میں کوئی بھلائی ہوتی تو اہل جنت کو بھی نیند ملتی۔'' بہشت میں نہ حجاب ہوگا نہ خواب پس ثابت ہوا کہ خواب ایک حجاب ہے۔ ارباب لطائف بیان کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام بہشت میں سو گئے تو حوا ان کے بائیں پہلو سے معرض

1۔ مصدر معلوم نہیں 2۔ مصدر معلوم نہیں

وجود میں آئی اور ان کے تمام مصائب کا باعث ہوئی۔ نیز کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کہا: يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ (الصافات) ''بیٹے! میں نے خواب دیکھا تو میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔'' حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی: هذا جزاء من نام عن حبيبه لولم تنم لما امر ت بذبح الولد ''یہ اس کی جزا ہے جو اپنے حبیب سے غافل ہو کر سو جائے۔ نہ آپ سوتے نہ آپ کو فرزند ذبح کرنے کا حکم ملتا۔'' آپ کی نیند نے آپ کو بیٹے سے محروم کر دیا اور مجھے جان سے۔ میرا درد تو ایک لمحہ کا ہوگا اور آپ کا عمر بھر کا۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر رات ایک کٹورہ نمکین پانی کا اور ایک سلائی اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ نیند غلبہ کرتی تو سلائی پانی میں ڈبو کر آنکھوں میں پھیر لیتے تا کہ نیند کافور ہو جائے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے بخارا میں شیخ احمد سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا جو چالیس برس سے رات کو نہیں سوئے تھے۔ دن کو تھوڑے وقفہ کے لئے سو جاتے تھے۔

الغرض جب کسی آدمی کو موت پسند ہوتی ہے وہ نیند کو بیداری سے افضل سمجھتا ہے جب زندگی موت سے زیادہ پسندیدہ نظر آئے تو بیداری کو ترجیح دیتا ہے۔ تکلف سے بیدار رہنے کی کچھ وقعت نہیں۔ وقعت اس بات کی ہے کہ اسے پردۂ غیب سے بیدار رہنے کی توفیق ہو۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برگزیدۂ حق تھے۔ آپ بلند مقام پر پہنچے تو آپ نے نہ سونے میں تکلف کیا نہ بیداری میں۔ حکم باری تعالیٰ ہوا: قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ (المزمل) ''آپ رات کو عبادت میں قیام کریں مگر رات کا تھوڑا حصہ یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم۔'' اس امر کی کوئی قیمت نہیں کہ تکلف سے سو جائے۔ قیمت اس چیز کی ہے کہ اسے تائید حق سلا دے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کو برگزیدگی دی۔ ان کو اعلیٰ مقام دیا اور لبادۂ کفران کے جسموں سے دور فرمایا۔ انہوں نے نہ سونے میں تکلف کیا نہ جاگنے میں۔ حق تعالیٰ نے ان کی نگہبانی کی اور ان کی اپنی کوشش کے بغیر ان کی پرورش

فرمائی۔ چنانچہ فرمایا، وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (الکہف:18) ''تم انہیں بیدار تصور کرو گے حالانکہ وہ سور ہے ہیں اور ہم ان کی دائیں بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔'' اور یہ دونوں صورتیں بے اختیاری کے عالم میں نہیں ہوتیں۔

جب بندہ کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا تو ہر چیز اس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے وہ غیر کا متحمل نہیں ہوتا وہ سوئے یا جاگے بہر صورت صاحب توقیر ہوتا ہے۔

مرید کے لئے شرط خواب یہ ہے کہ ہر ابتدائے خواب کو اپنی عمر کا آخری وقت سمجھے گناہوں سے توبہ کرے۔ مخالف اور رنجیدہ لوگوں کو خوش کرے اچھی طرح طہارت کرے اور دائیں ہاتھ پر قبلہ رو ہو کر سوئے۔ کار دنیا کی درستی کے بعد اسلام کا شکر نعمت کرے اور یہ عہد کرے کہ بیدار ہو کر مرتکب معاصی نہیں ہوگا۔ جو بیداری میں اپنا کام پورا کرے اسے نیند یا موت سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ ایک امام کے پاس آیا کرتے تھے۔ امام جاہ و دولت اور سرکشی نفس میں مبتلا تھا۔ بزرگ ہر بار کہتے تھے ''مرنا چاہئے۔'' امام کو یہ بات بری محسوس ہوتی تھی کہ ایک گدا ہمیشہ اس کو یہی بات کہے۔ اس نے سوچا میں کل خود پہل کروں گا۔ چنانچہ جب دوسرے روز وہ بزرگ آئے تو امام نے کہا: ''مرنا چاہئے۔'' اب بزرگ نے مصلیٰ بچھایا اور اس پر سر رکھ کر بولے ''مر گیا۔'' اسی وقت اس کی جان تن سے نکل گئی۔ امام متنبہ ہوا اور سمجھ گیا کہ بزرگ کا مطلب یہ تھا کہ موت کی تدبیر میری طرح کر۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ مریدوں کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ صرف اس وقت سونا چاہئے جب نیند کا غلبہ ہو۔ بیدار ہو کر دوبارہ سونے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ دوسری دفعہ سونا اور بیکاری مریدان حق پر حرام ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ستائیسواں باب

آداب کلام وخاموشی

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا (فصلت: 33) ''اس سے زیادہ اچھی کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے۔'' نیز فرمایا۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ (البقرہ: 263) ''نیک بات کہنا'' اور فرمایا قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (البقرہ: 136) ''کہو ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔'' حق تعالیٰ نے اچھے کلام کا اس طرح حکم دیا ہے جس طرح اس کا اقرار ربوبیت، اس کی صفت وثنا اور اس کی درگاہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے بولنے کی طاقت نعمت عظمیٰ ہے اور آدمی اس کی وجہ سے دیگر جانوروں سے ممتاز ہے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا، وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (الاسراء: 70) ''ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی۔'' مفسرین كَرَّمْنَا کا مطلب ''گویائی عطا کی'' بیان کرتے ہیں۔ یادرکھو گویائی جتنی بڑی نعمت ہے۔ اتنی ہی خرابی کا سرچشمہ ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِيْ اَللِّسَانُ (1) ''امت سے متعلق میں جس چیز سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ زبان ہے۔'' الغرض گفتار کی مثال شراب کی سی ہے جو عقل کو مست کر دیتی ہے اور جسے اس کی لت پڑ جائے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اہل طریقت نے یہ سمجھ کر گفتار باعث آفت ہے بجز ضرورت کے بات کرنے سے گریز کیا ہے۔ ہر کلام کے آغاز وانجام کو جانچتے ہیں اگر اظہار جانب حق ہو تو اظہار کرتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ حق تعالیٰ سب اسرار کو جاننے والا ہے اور وہ بد بخت ہیں جو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:
اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ۭ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۝80 (الزخرف) ''کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے اسرار اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے؟ ہم سنتے

1۔ مسند احمد، ابن ماجہ

ہیں اور ہمارے فرشتے لکھتے ہیں۔'' پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا(1) ''جس نے خاموشی اختیار کی اسے نجات حاصل ہوئی۔''

خاموشی میں بے حد فوائد اور کامرانیاں ہیں۔ مشائخ کی ایک جماعت خاموشی کو کلام سے بہتر سمجھتی ہے اور ایک دوسری جماعت کلام کو خاموشی سے افضل سمجھتی ہے۔ بقول حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ الفاظ اور عبارت آرائیاں کسی چیز کا دعویٰ کرنے کی دلیل نہیں اور اثبات حقیقت میں دعویٰ بے کار ہے۔ کبھی ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ اختیار گفتگو کے باوجود خاموش رہنا پڑتا ہے۔ مثلاً خوف کے مقام پر بات کرنے کا اختیار اور طاقت ہو بھی تو خوف کے مقام پر لب کشائی نہیں ہوتی اور یہ سقوط سخن حقیقت معرفت کے لئے وجہ زیاں نہیں ہوتا۔ مگر کسی حالت میں دعوائے بے حقیقت سے درگذر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہی منافقت کی جڑ ہے۔ یاد رکھو دعویٰ بغیر حقیقت منافقت ہے اور حقیقت بغیر دعویٰ اخلاص۔ جس نے بیان کا سہارا لیا وہ زبان سے بے نیاز نہیں جس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے وہ اس راز سے متعلق جو اس کے اور رب قدیر کے درمیان ہے زبان سے آزاد ہے یعنی جس کے لئے راستہ کھل جاتا ہے اسے بولنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کلام کا مقصد غیر کو مطلع کرنا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے احوال کے تغیر و تبدل سے متعلق مطلع ہونے سے بے نیاز ہے۔ غیر اللہ اس لائق نہیں کہ اسے توجہ دی جائے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے یہ چیز اور واضح ہو جاتی ہے۔ من عرف اللہ کلّ لسانہ ''جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوئی اس کی زبان گنگ ہوگئی۔'' کیونکہ عالم مشاہدہ میں گفتار حجاب ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ یک بیک اٹھ کر بلند آواز سے نعرہ لگایا: ''اے میری مراد!'' اشارہ حق تعالیٰ کی طرف تھا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اے ابوبکر! اگر مقصود حق تعالیٰ ہے تو بلند آواز سے

1۔ سنن ترمذی، سنن دارمی

نعرہ کیوں لگایا؟ اس کی ذات تو اس سے بے نیاز ہے۔ اگر مقصود وہ نہیں تو مرتکب خلاف کیوں ہوا؟ حق تعالیٰ کو تیری گفتار کا علم ہے شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے استغفار کیا۔

وہ لوگ جو کلام کو خاموشی سے بہتر سمجھتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا حال بیان کرنے کے لئے حق تعالیٰ کا حکم ہے تاکہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہو۔ اگر کوئی شخص ہزار برس تک دل ہی دل میں عارف باللہ ہو اور ضرورتاً خاموش نہ ہو تو جب تک زبان سے اقرار معرفت نہ کرے اس کی حیثیت کافروں کی سی ہوگی۔ حق تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اپنے انعامات اور اپنی نوازشات پر شکر اور حمد و ثنا کا حکم دیا ہے۔ حق تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ سے فرمایا۔ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾ (الضحیٰ) ''اپنے رب کی نعمت بیان کر۔'' ہمارا بولنا حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل و تعظیم ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن:40) ''مجھے پکارو میں پکار کو قبول کروں گا۔'' اور نیز فرمایا، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ:186) ''میں پکارنے والے کی سنتا ہوں۔ جب وہ پکارتا ہے۔'' اسی طرح بے شمار آیات ہیں جو ہمیں بولنے کا حکم دیتی ہیں۔

ایک شیخ فرماتے ہیں جو شخص اپنا حال بیان نہیں کرسکتا اس کو صحیح حال ہی نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ حال کا ترجمان خود حال ہی ہوتا ہے۔

لسان الحال أفصح من لساني وصمتي عن سؤالک ترجماني

''میری زبان حال میری زبان سے فصیح تر ہے اور میری خاموشی میری ترجمان ہے۔''

کہتے ہیں ایک روز حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے ایک محلہ کرخ سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک مدعی طریقت کہہ رہا ہے: ''خاموشی کلام سے بہتر ہے۔'' شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''تیری خاموشی تیرے کلام سے بہتر ہے۔ تیرا کلام لغو ہے اور تیری خاموشی مضحکہ خیز ہے۔ میرا کلام خاموشی سے بہتر ہے کیونکہ خاموشی حلم ہے اور میرا کلام علم ہے۔'' مطلب یہ کہ اگر میں نہ بولوں تو یہ میری بردباری ہے۔ اگر بولوں تو یہ میرے علم کا اظہار ہوگا۔ جب خاموش ہوتا ہوں تو حلیم ہوتا ہوں اور جب بولتا ہوں تو علیم ہوتا ہوں۔

میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ کلام دو قسم کا ہوتا ہے اور خاموشی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کلام کی بنیاد حق پر ہوئی اور دوسرے کی باطل پر۔ اسی طرح ایک خاموشی تو مقصود حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اور دوسری غفلت پر مبنی ہوتی ہے۔ کلام یا خاموشی کے وقت ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہئے۔ اگر کلام کی بنیاد حق پر ہے تو کلام خاموشی سے بہتر ہے ورنہ خاموشی کلام سے بہتر ہے۔ اسی طرح اگر خاموشی مقصود حاصل ہونے اور مشاہدہ کی وجہ سے ہے تو کلام سے بہتر ہے اور اگر یہ حجاب اور غفلت کی وجہ سے ہے تو گفتار بہتر ہے۔ کچھ مدعی جن کے پیش نظر چند فضول باتیں، کچھ نفسانی خواہشات اور بے ہودہ عبارت آرائیاں ہوتی ہیں کلام کو خاموشی سے بہتر سمجھتے ہیں اور اسی طرح جہلاء کی ایک جماعت جو کنوئیں اور منار میں تمیز نہیں کر سکتی خاموشی کو کلام سے بہتر کہتی ہے۔ یہ دونوں گروہ یکساں ہیں۔ ان کو بولنے دو ان کو خاموش رہنے دو۔ إن من نطق أصاب أو غلط ومن أنطق عصم من الشطط ''خبردار! جو کوئی بولتا ہے وہ یا غلط بولتا ہے یا صحیح۔ جو تائید غیب سے بولتا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا''۔ چنانچہ شیطان خود بولا اور اس نے کہا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (الاعراف:12) ''میں آدم سے بہتر ہوں۔'' آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے بولنے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کی: رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (الاعراف:23) ''اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔''

پس داعیان طریقت اپنی گفتار میں مامور اور مجبور ہوتے ہیں اور خاموشی میں شرمسار اور بے اختیار من کان سکوته حیا کان کلامه جنوة ''جن کی خاموشی حیا کی وجہ سے ہو ان کا کلام دلوں کے لئے پیام زندگی ہوتا ہے۔'' کیونکہ وہ عالم مشاہدہ میں بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گفتار بے دیدار ذلیل وخوار ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ میں ہوتے ہیں تو خاموشی کو کلام سے بہتر سمجھتے ہیں اور جب وہ مشاہدہ میں گم ہوں تو لوگ ان کے کلام کو تعویذ جان بنا لیتے ہیں۔ اسی بناء پر کسی بزرگ نے فرمایا: من کان سکوته له ذهبا کان کلامه لغیره مذهبا ''جب خاموش ہوں تو ان کا سکوت سونا ہوتا ہے اور جب بولیں تو ان کا کلام سونا بنانے کا نسخہ اکسیر۔''

پس سالک کو چاہئے کہ جب عبودیت کے مقام پر منہمک ہو تو خاموشی اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اس کی طاقت گفتار ربوبیت پر مشغول ثناء ہو کر سرگرم سخن ہو اور اس کا کلام مریدوں کے دلوں کو شکار کرے۔

آداب کلام یہ ہیں کہ سالک بجز حکم الٰہی کے نہ بولے اور بجز حکم الٰہی کے کچھ زبان سے نہ نکالے۔

خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ خاموشی اختیار کرنے والا جاہل نہ ہو۔ جہالت پر مطمئن نہ ہو اور غفلت میں مبتلا نہ ہو۔ مرید کو چاہئے کہ رہنماؤں کے کلام پر دخل انداز نہ ہو۔ اس میں تصرف نہ کرے۔ بے سروپا اور سطحی گفتگو نہ کرے۔ جس زبان سے کلمہ شہادت پڑھا ہے اور اقرار توحید کیا ہے، اسے جھوٹ اور غیبت کے لئے استعمال نہ کرے۔ مسلمانوں کا دل نہ دکھائے درویشوں کو ان کا نام لے کر نہ پکارے۔ جب تک اس سے کچھ پوچھا نہ جائے زبان نہ ہلائے درویش کے لئے خاموشی کی شرط یہ ہے کہ باطل پر خاموش نہ رہے اور بولنے کی شرط یہ ہے کہ بجز حق کے کوئی بات زبان سے نہ نکالے۔

اس اصل کی کئی شاخیں ہیں اور بے شمار لطائف ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

اٹھائیسواں باب

آداب سوال

باری تعالیٰ نے فرمایا، لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرہ:273) ''وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔'' جب کوئی ان سے سوال کرتا ہے تو وہ منع نہیں کرتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ سے فرمایا، وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ) ''سوال کرنے والے کو جھڑکو نہیں۔'' ایک جماعت کا خیال ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے سوال نہ کرنا چاہئے اور بجز اس کے کسی کو حاجت روا نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ سوال کرنا گویا حق تعالیٰ سے روگردانی ہے اور ہو سکتا ہے کہ روگردانی کرنے والے کو روگرداں ہی چھوڑ دیا جائے۔ کہتے ہیں ایک دنیا دار آدمی نے رابعہ عدویہ رحمہا اللہ سے کہا ''جس چیز کی بھی ضرورت ہو مانگ میں مہیا کروں گا۔'' انہوں نے جواب دیا: ''مجھے اپنے رب سے دنیا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے چہ جائیکہ میں اپنے ہم جنس سے کوئی دنیاوی چیز طلب کروں۔''

سنا ہے ایک دفعہ ابو مسلم مروزی نے ایک حق رسیدہ بزرگ کو چوری کے ایک غلط الزام کی بناء پر جیل میں ڈال دیا۔ اسی رات ابو مسلم نے خواب میں پیغمبر ﷺ کو دیکھا۔ آنحضور ﷺ نے اسے فرمایا اے ابو مسلم! میں بحکم خداوندی آیا ہوں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تو نے اس کے ایک دوست کو بے جرم قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ اسی وقت جا کر اسے رہا کر۔ ابو مسلم چونک اٹھا اور ننگے سر، ننگے پاؤں قید خانے میں پہنچا اور دروازے کھول کر درویش کو رہا کر دیا۔ معافی مانگی اور کہا کچھ ضرورت ہو تو حکم دیجئے۔ درویش نے کہا میرا مالک تو ایسا ہے کہ آدھی رات کے وقت ابو مسلم کو بستر سے اٹھا کر مجھے مصیبت سے نجات دینے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ میں کیوں کسی غیر کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟ ابو مسلم رونے لگا اور درویش چلا گیا۔

ایک دوسری جماعت سمجھتی ہے کہ درویش کے لئے سوال کرنا روا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ سوال ہی نہ کرو بلکہ یہ کہا ہے کہ لپٹ کر سوال نہ کرو اور ضد نہ کرو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی ضروریات کے مدنظر سوال کیا اور یہ بھی کہا: أُطْلُبُوا الْحَوَائِجَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوهِ(1) "اپنی ضرورتیں بطریق احسن لوگوں سے طلب کرو"۔

کچھ اور مشائخ نے تین صورتوں میں سوال کرنے کو جائز قرار دیا ہے: ایک تو فراغت دل کے لئے۔ بقول ان کے دو روٹیوں کی قدر و قیمت اتنی نہیں کہ شبانہ روز ان کا انتظار کیا جائے اور بحالت اضطرار ہمیں بارگاہ حق سے اور کوئی حاجت ہی نہ ہو کیونکہ طعام اور اس کا انتظار بذات خود ایک بہت بڑا کام ہے۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت شقیق رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید زیارت کے لئے آیا۔ آپ نے حضرت شقیق کا حال پوچھا تو مرید نے عرض کیا کہ آپ لوگوں سے ہٹ کر توکل پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب تو واپس جائے تو اس سے کہنا حق تعالیٰ کو دو روٹی کے لئے آزمانا چھوڑ دیں۔ بھوک لگے تو روٹی اپنے ہم جنسوں سے مانگ لیا کریں۔ اپنے توکل کا مسلک بالائے طاق رکھ دیں تاکہ شہر اور ملک تمہاری شومئی اعمال سے غرق نہ ہو جائے۔

سوال کی دوسری جائز صورت یہ ہے کہ سوال ریاضت نفس کے لئے کیا جائے تاکہ سوال کی ذلت برداشت کریں۔ اس کی تکلیف گوارا کریں۔ دوسروں کی نظر میں اپنی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگائیں اور اس طرح تکبر سے محفوظ رہیں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: تیرے سر میں غرور ہے کہ تو خلیفہ اور امیر سامرہ کے دربانوں کے سردار کا بیٹا ہے۔ تجھے کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی۔ جب تک تو بازار میں نہ گھومے اور ہر کسی سے سوال نہ کرے اور تجھے اپنی صحیح قیمت کا احساس نہ ہو جائے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی کیا۔ بھیک مانگنے کے معاملے میں بھی کساد بازاری بڑھتی گئی

1۔ المعجم الکبیر

اور ۶ سال میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ سارے بازار میں گھوم نکلے اور کسی نے کچھ نہ دیا۔ آپ نے واپس آ کر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اب تجھے اپنی قیمت کا اندازہ ہو گیا۔ لوگ تجھے کچھ نہیں سمجھتے۔ اپنے دل کو ان کی طرف سے پھیر لے اور کسی قیمت پر بھی ان کی صحبت اختیار نہ کر۔ یہ صرف ریاضت نفس کے لئے تھا کسب معاش کے لئے نہیں تھا۔

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، میرا ایک دوست تھا جس کے ساتھ میری خوب موافقت تھی۔ قضا کارو وہ فوت ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے عقبیٰ کی نعیم سے سرفراز فرمایا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہو کیا گذری؟ اس نے کہا میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا۔ پوچھا کس صلے میں؟ کہا حق تعالیٰ نے فرمایا: میرے لئے تو نے کمینے اور بخیل لوگوں سے بہت ذلت اور تکلیف اٹھائی ہے۔ ان کے آگے ہاتھ پھیلایا اور صبر کیا۔ اس بات پر تجھے بخشا جاتا ہے۔

جائز سوال کی تیسری صورت یہ ہے کہ سوال حق تعالیٰ کی عظمت و حرمت کے لئے کیا جائے۔ دنیا کی ہر چیز کا حقیقی مالک حق تعالیٰ ہے اور لوگ صرف وکیل اور نگران ہیں۔ درویش اپنے نصیب کی چیز حق تعالیٰ کے وکیل سے طلب کرتے ہیں اور سوال اس سے کرتے ہیں جو شخص حق تعالیٰ کے سامنے اپنی ضرورت کے لئے وکیل کو پیش کرتا ہے۔ حرمت و طاعت میں اس شخص سے بالاتر ہے جو خود حق تعالیٰ سے طلب کرتا ہے اس طرح وکیلوں کے ذریعے سوال حضور و اقبال کا نشان ہے غیبت یا روگردانی کا نہیں۔

کہتے ہیں حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لڑکی تھی۔ ایک دن اس نے اپنی والدہ سے کوئی چیز مانگی والدہ نے کہا خدا سے مانگو۔ لڑکی نے کہا، مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنی ذاتی ضرورت کی چیز حق تعالیٰ سے طلب کروں۔ جو آپ دیں گی وہ بھی تو اسی کا ہے۔ پس سوال کے آداب یہ ہیں۔

اگر سوال پورا نہ ہو تو درویش کو زیادہ خوشی ہو۔ لوگوں پر نظر نہ ہو۔ عورتوں اور بازاری

لوگوں سے سوال نہ کرے اپنی ضرورت صرف اس آدمی کے سامنے رکھے جس کی کمائی حلال ہونے کا یقین ہو۔ سوال صرف ضرورت کے مطابق ہو۔ آرائش اور خانہ داری کا سامان مہیا نہ کرے وقتی ضرورت کا پابند ہو۔ کل کی ضرورت کو پیش نظر نہ رکھے تا کہ ہمیشہ کی تباہی میں گرفتار نہ ہو۔ حق تعالیٰ کو اپنی گدائی کا جال نہ بنائے۔ اپنی پارسائی کا اظہار نہ کرے کہ لوگ پارسائی کے پیش نظر زیادہ دیں۔ میں نے ایک بلند مرتبہ صوفی کو دیکھا۔ وہ فاقہ میں مبتلا جنگل سے نکل کر راستے کی تکلیف اٹھاتا ہوا کوفہ کے ایک بازار میں آیا۔ ہاتھ پر ایک چڑیا اٹھا رکھی تھی اور پکار رہا تھا کون ہے؟ جو اس چڑیا کے لئے مجھے کچھ دے لوگوں نے پوچھا یہ کیوں کہتے ہو؟ کہا یہی ٹھیک ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خدا کے لئے مجھے کچھ دو۔ دنیاوی چیز کے لئے صرف حقیر چیز کی سفارش لائی جا سکتی ہے۔

اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے بخوف طوالت چند ضروری امور بیان کر دیئے۔ واللہ اعلم بالصواب

انتیسواں باب

آداب نکاح و تجرد

حق تعالیٰ نے فرمایا: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ:187) ''عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم عورتوں کا لباس ہو۔'' اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا: تَنَاكَحُوا تَكْثُرُوا فَاِنِّیْ اُبَاهِیْ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَوْ بِالْقِسْطِ(1)۔ نکاح کرو اور کثیر التعداد ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری کثرت پر قیامت کے دن سب امتوں پر فخر ہوگا چاہے خواہ ساقط بچے ہی کیوں نہ ہوں۔'' اور نیز فرمایا: اِنَّ اَعْظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَةً اَقَلُّهُنَّ مُؤْنَةً وَاَحْسَنُهُنَّ وُجُوْهًا وَاَرْخَصُهُنَّ مُهُوْرًا(2)۔ ''عظیم ترین بابرکت وہ عورت ہے جو کفایت شعار، جمیل اور جس کا مہر کم ہو''۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جملہ مردوں اور عورتوں کیلئے نکاح مباح ہے۔ جو حرام سے پرہیز نہ کر سکے اس پر فرض ہے اور اس کے لئے جو بال بچوں کے حقوق ادا کر سکے سنت ہے۔

اہل طریقت میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ نکاح دفع شہوت کے لئے ضروری ہے اور کسب حلال دل کی فراغت کے لئے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ نکاح قیام نسل کے لئے ضروری ہے تاکہ اولاد ہو۔ اولاد اگر باپ سے پہلے مر جائے تو شفاعت کرے گی۔ اگر باپ پہلے مر جائے تو وہ اس کے بعد اس کے لیے دعا گو رہے گی۔

روایات میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت پیغمبر ﷺ کی بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد مبارک کے لئے ان کے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے درخواست کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ لڑکی خرد سال ہے اور آپ بوڑھے ہیں۔ میرا ارادہ اسے اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر سے

1۔ مسند احمد، المعجم الاوسط 2۔ مسند احمد، سنن نسائی

بیاہنے کا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ جہاں میں بڑی عمر کی عورتیں ہیں مگر ام کلثوم کے لئے درخواست کا مقصد اطمینان نفس نہیں بلکہ بقائے نسل ہے۔ کیونکہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے: کُلُّ سَبَبٍ نسب وَ یَنْقَطِعُ بِالْمَوْتِ اِلَّاحَسَبِیْ وَنَسَبِیْ وَیُرْوٰی کُلُّ سَبَبٍ وَنَسَبٍ اِلَّاسَبَبِیْ وَنَسَبِیْ(1)۔ ”سب حسب ونسب موت سے کٹ جائیں گے۔ مگر میرا حسب ونسب قائم رہے گا۔ ہر سبب اور نسب منقطع ہو جائے گا میر اسبب اور نسب منقطع نہیں ہوگا۔“ میرا سبب تو ہے مگر میری ضرورت یہ ہے کہ میرا نسب بھی قائم رہے اور ہر دو طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت میں مستحکم ہو جاؤں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں دے دیا اور ان کے بطن سے حضرت زید پیدا ہوئے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تُنْکَحُ النِّسَاءُ عَلٰی اَرْبَعَةٍ عَلَی الْمَالِ وَالْحَسَبِ وَالْحُسْنِ وَالدِّیْنِ فَعَلَیْکُمْ بِذَاتِ الدِّیْنِ فَاِنَّهٗ مَا اسْتَفَادَ اِمْرَءٌ بَعْدَ الْاِسْلَامِ خَیْرًا مِنْ زَوْجَةٍ مُؤْمِنَةٍ مُوَافِقَةٍ لِیَسُرَّبِهَا اِذَا نَظَرَ اِلَیْهَا(2)۔ ”عورت سے نکاح چار مقاصد کی بناء پر کیا جاتا ہے: مال، حسب، حسن اور دین۔ نکاح دین دار عورت سے کرو۔ کیونکہ اسلام کے بعد مومن کے لئے فرمانبردار مومن عورت جسے دیکھ کر مسرت ہو غنیمت ہے۔“ ایمان دار آدمی ایسی عورت کی صحبت میں قوت، استحکام اور پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور دنیا میں اسے موانست نصیب ہوتی ہے۔ جملہ برائیاں تنہائی میں ہیں اور سب سعادت صحبت میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اَلشَّیْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ(3)۔ ”شیطان تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔“ یہ حقیقت ہے کہ جب مرد یا عورت تنہا ہوں تو شیطان ہم نشین ہو جاتا ہے۔ وہ نفسانی شہوات کو برانگیختہ کرتا ہے حرمت دین کے لئے اور حرام سے محفوظ رہنے کے لئے میاں بیوی کی مجالست سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں بشرطیکہ دونوں میں باہمی موانست اور موافقت ہو۔ کوئی عذاب یا تکلیف ناموافق عورت کی ہم نشینی سے بڑھ کر نہیں۔ درویش کو

1۔ الفوائد المجموعہ　2۔ صحیح بخاری و مسلم　3۔ مسند احمد

چاہئے کہ پہلے خوب غور کرے اور نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے حسن وقبح کا تجزیہ کرے تاکہ جس چیز کی خرابیوں کا تدارک وہ کر سکے اسے اپنائے۔

مجرد رہنے میں دو خرابیاں ہیں: ایک تو ترک سنت اور دوسری نفسانی خواہشات کا طغیان اور حرام میں مبتلا ہو جانے کا امکان۔ اسی طرح نکاح کرنے میں بھی دو خرابیاں ہیں، ایک دل کا غیر اللہ میں مشغول ہونا اور دوسری لذت نفسانی کا انہماک۔ یہ مسئلہ گوشہ نشینی اور ہم نشینی سے پیوستہ ہے۔ ہم نشینی کی طرف مائل درویش کے لئے نکاح ضروری ہے اور عزلت پسندوں کے لئے مجرد رہنا کافی ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: سِيْرُوْا فَقَدْ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ(1) ''تنہا رہنے والے سبقت لے گئے ہیں۔'' حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ نجی المخفون وھلک المثقلون ''ہلکے بوجھ والے نجات پا گئے۔ بھاری بوجھ والے ہلاک ہو گئے''۔ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں ایک گاؤں میں کسی بزرگ کی زیارت کے لئے گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ گھر ایک ولی اللہ کے عبادت کدہ کی مانند پاکیزہ ہے۔ دو محراب ہیں، ایک میں وہ بزرگ خود بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسرے میں ایک پاکیزہ بڑھیا عورت۔ کثرت عبادت سے دونوں کمزور ہیں۔ میری آمد پر دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ میں تین روز تک ٹھہرا۔ جب واپس لوٹنے کا ارادہ کیا تو اس بزرگ سے پوچھا: اس بڑھیا کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟ فرمایا رشتہ سے میرے چچا کی بیٹی ہے اور میری بیوی ہے۔ میں نے کہا: میں نے تو تین روزہ قیام میں یہ سمجھا کہ وہ بیگانہ ہیں۔ فرمایا پینسٹھ برس سے یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے پوچھا کیوں؟ کہا بچپن میں ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کے باپ نے اس کا ہاتھ مجھے دینے سے انکار کر دیا کیونکہ ہماری محبت کا راز اسے معلوم ہو گیا تھا۔ ایک مدت ہم نے غم فراق اٹھایا۔ آخر اس کا باپ فوت ہو گیا اور میرے باپ نے جو اس کے تایا بھی تھے اس کی شادی میرے ساتھ کر دی۔ جب ہم پہلی رات ملے تو اس نے کہا دیکھو حق تعالیٰ نے ہمیں کتنی بڑی نعمت عطا کی

1۔ المقاصد الحسنہ میں شاہد ہے۔

ہے۔ ہمیں ملا دیا اور ہمارے رنج و الم کو ختم کر دیا۔ میں نے کہا بیشک اس نے کہا پھر ہمیں آج رات اپنی نفسانی خواہشات کو روک کر نفس کو پامال کرنا چاہئے اور نعمت حق کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے عبادت کرنی چاہئے۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ دوسری رات بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ تیسری رات میں نے کہا کہ دو راتیں تیرے کہنے پر شکر نعمت کیا۔ آج رات میرے کہنے پر سہی۔ چنانچہ اب پینسٹھ برس ہو چکے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں۔ عمر شکر نعمت میں گذار رہے ہیں۔

جب درویش کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کی ہم نشینی اختیار کرے تو چاہئے کہ جب تک اس پردہ نشین عورت کا نان و نفقہ اور اس کا حق مہر ادا نہ کر لے اور دیگر حقوق الٰہی پورے نہ کرے لذات نفسانی میں مستغرق نہ ہو۔ ہم بستری سے قبل اپنے اوراد و وظائف ادا کرے۔ حرص و ہوا کو ختم کر دے اور از راہ مناجات کہے:

''بار خدایا! تو نے بقائے نسل کے لئے جذبہ موانست پیدا کیا ہے۔ تیری رضا ہے کہ میں اس صحبت کو قبول کروں۔ پروردگار! تو اس میں میرے لئے دو چیزیں ودیعت فرما: ایک یہ کہ میں فعل حرام سے محفوظ رہوں اور دوسری یہ کہ مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو تیرا ولی ہو اور میرے دل کو تیری طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف مشغول نہ کرے''۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا فرزند بچپن میں جب اپنی والدہ سے کچھ کھانے کو مانگتا تو وہ فرماتیں اپنے خدا سے مانگ۔ لڑکا محراب میں جا کر سجدہ کرتا اور اس دوران والدہ چپکے سے کھانا سامنے رکھ دیتی۔ لڑکے کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ والدہ نے رکھا ہے۔ اس طرح اسے حق تعالیٰ سے مانگنے کی عادت پڑ گئی۔ ایک روز لڑکا مدرسہ سے آیا تو والدہ گھر پر نہیں تھی۔ اس نے اپنی ضرورت کے لئے سجدہ کیا۔ حق تعالیٰ نے اس کی ضرورت مہیا کر دی۔ والدہ نے یہ صورت دیکھی تو حیرت زدہ ہو گئی اور پوچھا یہ کھانا کہاں سے آیا: لڑکے نے جواب دیا جہاں سے روز آتا ہے۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے پاس آئے تو گرمی کے دنوں میں سردی اور سردی کے دنوں میں گرمی کا میوہ

ان کے پاس موجود پاتے اور تعجب سے پوچھتے: اَنّٰى لَكِ هٰذَا (آل عمران: 37) ''یہ میوہ کہاں سے ملا؟'' آپ فرماتیں: مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران: 37) ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔'' پس ضروری ہے کہ کسی سنت پر عمل دنیا میں طلب حرام اور دل کی مشغولیت میں غرق نہ کردے۔ درویش کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی ہے جیسے دولت مند کی بربادی اس کے گھر اور گھر کے سامان کی خرابی ہے۔ دولت مند کا نقصان پورا ہو جاتا ہے مگر درویش کا نقصان کبھی پورا نہیں ہوتا۔ فی زمانہ یہ امر محال ہے کہ کسی شخص کو ایسی رفیقہ حیات میسر آئے جو ضرورت سے زیادہ فضول خرچ اور محال چیزوں کی طالب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جماعت مجرد اور سکبسار رہنا بہتر سمجھتی ہے اور اس حدیث کی رعایت پیش نظر رکھتی ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خَيْرُ النَّاسِ فِى اٰخِرِ الزَّمَانَ خَفِيفُ الْحَاذِ کہ اخیر زمانہ میں وہ شخص فائدہ میں رہے گا جو خفیف الحال ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا: اَلَّذِىْ لَا أَهْلَ لَهٗ وَلَا وَلَدَ لَهٗ(1) ''جس کے اہل وعیال نہ ہوں۔'' نیز فرمایا: سِيْرُوْا وَاسَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ ''چلو کہ بے اہل وعیال تم سے آگے نکل گئے۔''

اہل طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ سالکان حق میں مفرد اور تنہا لوگ افضل ہیں۔ بشرطیکہ ان کے دلوں میں خرابی نہ ہو اور وہ ارتکاب معاصی اور حصول خواہشات نفسانی سے روگرداں ہوں عام لوگ حصول خواہشات نفسانی کے لئے اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں، حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ اَلطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ(2) ''تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے محبوب ہیں خوشبو، عورت اور آنکھ کی ٹھنڈک نماز۔'' چونکہ عورت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب تھی اس لئے نکاح کرنا افضل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لِیْ حِرْفَتَانِ اَلْفَقْرُ وَالْجِهَادُ(3) ''میرے دو کام ہیں فقر اور جہاد۔'' ان چیزوں سے کیوں دور رہتے ہو؟ اگر عورت محبوب تھی تو یہ کام بھی آپ کو محبوب تھے۔ محض اپنی نفسانی رغبت کو محبوب پیغمبر کہنا غلط ہے۔ کوئی آدمی پچاس برس تک

1۔ الجامع الصغیر، المقاصد حسنہ 2۔ مسند احمد، ابو یعلیٰ 3۔ احیاء العلوم

ہوا و ہوس میں مبتلا رہ کر یہ کہے کہ وہ متابع سنت ہے تو سخت غلطی کا مرتکب ہے۔

الغرض پہلا فتنہ جو بہشت میں ظہور پذیر ہوا وہ عورت کی وجہ سے تھا۔ یعنی فتنہ ہابیل و قابیل۔ اسی طرح جب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ دو فرشتوں کو مبتلائے عذاب کرے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو بنایا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ(1) میں نے اپنے پیچھے مردوں کے لئے عورت سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔'' جو ظاہر میں فتنہ ہے وہ حقیقت میں کیا ہوگا۔

میں (علی بن عثمان جلابی) گیارہ برس تک اس فتنہ سے محفوظ رہا۔ مگر بالآخر قضائے الٰہی سے اس فتنہ کا شکار ہوا۔ میرا دل بن دیکھے ایک پری صفت عورت کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا اور میں پورا ایک سال اس آفت میں مبتلا رہا۔ قریب تھا کہ میرا دین برباد ہو جاتا مگر حق تعالیٰ نے کمال فضل و کرم سے مجھے ہلاکت سے بچانے کا سامان مہیا فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے نجات عطا فرمائی۔ حق تعالیٰ کی اس نعمت عظیم کا شکر ہے۔

المختصر طریقت کی بنیاد تجرد پر ہے۔ نکاح کے بعد حالت بدل جاتی ہے۔ شہوات نفسانی کی آگ ایسی نہیں کہ کسی کوشش سے فرو کی جا سکے کیونکہ خود پیدا کردہ مصیبت کا علاج آدمی خود ہی کر سکتا ہے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ یاد رکھو خواہش نفس کا ازالہ ہر دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک تو انسان کی اپنی کوشش اور تکلیف ہے۔ دوسری صورت اس کے کسب اور مجاہدہ کے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ تکلیف کے تحت فاقہ کشی ہے اور جو انسانی کوشش اور تکلف سے باہر ہے وہ بے قرار رکھنے والا خوف ہے۔ یا سچی محبت ہے جو ہمت اور ارادے پر رفتہ رفتہ اثر انداز ہو کر بالآخر دل کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ محبت آہستہ آہستہ تمام اعضائے انسانی پر اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے اور تمام حواس کو معزول کر کے انسان کو معقولیت کے مقام پر فائز کر دیتی ہے اور اس کو جملہ ہزلیات سے پاک کر دیتی ہے۔ احمد حمادی سرخسی رحمۃ اللہ علیہ ماوراء النہر میں مقیم تھے تو لوگوں نے دریافت کیا آپ شادی کرنا

1۔ صحیح بخاری و مسلم

چاہتے ہیں؟ کہا نہیں پوچھا کیوں؟ کہا میں یا اپنے آپ سے غائب ہوتا ہوں یا حاضر۔ جب غائب ہوتا ہوں تو مجھے ہر دو جہان کی کوئی چیز یاد نہیں ہوتی۔ جب حاضر ہوتا ہوں تو نفس کو اس منہاج پر رکھتا ہوں کہ اگر ایک روٹی مل جائے تو ہزار حور کے برابر ہوتی ہے۔ دل کی مشغولیت کار عظیم ہے۔ جس طرح بھی حاصل ہو سکے۔

ایک دوسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ نکاح و تجرد میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ دیکھنا چاہئے کہ تقدیر الٰہی کے مطابق پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مجرد رہنا مقدر ہے تو پاک رہنے کی کوشش لازم ہے اگر نکاح مقدر ہے تو اتباع سنت ضروری ہے اور دل کو غفلت سے بچانا لابدی ہے۔ اگر تائید ربانی شامل حال ہو تو مجرد رہ کر بھی آدمی محفوظ رہتا ہے۔ مثلاً یوسف علیہ السلام زلیخا کے ابتلاء میں مصون رہے۔ جب زلیخا خلوت میں ملی تو آپ مراد حاصل کرنے پر قادر تھے مگر روگردانی فرمائی۔ مراد سے بے مراد رہ کر خواہش نفس کو مغلوب کرنے اور اپنے عیوب پر نظر رکھنے میں مشغول رہے۔ اسی طرح اگر نکاح میں بھی تائید ربانی حاصل ہے تو وہ نکاح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہوگا۔ ان کو حق تعالیٰ پر مکمل اعتماد تھا۔ انہوں نے گھریلو زندگی کو اپنا واحد مشغلہ نہیں بنایا۔ جب حضرت سارہ کے دل میں رشک پیدا ہوا اور انہوں نے غیرت کا اظہار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ کو لے گئے اور مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آئے حق تعالیٰ نے جیسے چاہا ان کی پرورش فرمائی۔

القصہ آدمی کی ہلاکت نہ نکاح کرنے میں ہے اور نہ مجرد رہنے میں۔ ہلاکت دراصل اپنے اختیار کو بروئے کار لانے اور خواہشات نفسانی کی متابعت کرنے میں ہے۔ عیالدار کے لئے شرط ادب یہ ہے کہ اس کے روزمرہ کے اوراد و وظائف قضا نہ ہوں۔ احوال ضائع نہ ہوں اوقات برباد نہ ہوں اہل خانہ سے شفقت سے پیش آئے۔ طیب کمائی سے روزی مہیا کرے ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ظالم فرماں رواؤں کی رواداری نہ کرے تاکہ اس کی اولاد بھی اسی قماش کی پیدا نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ احمد بن حرب نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک روز نیشاپور کے رؤسا

اور سردار سلام کے لئے حاضر خدمت تھے آپ ان کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں آپ کا بیٹا شراب میں بدمست جھومتا ہوا آیا اور گاتا ہوا لاپروائی کے عالم میں پاس سے گزر گیا۔ سب کو رنج ہوا۔ احمد بن حرب نے پوچھا آپ لوگوں کا حال کیوں متغیر ہو گیا؟ سب نے جواب دیا کہ ہمیں اس لڑکے کے حال پر بے حد افسوس ہوا۔ اس نے آپ کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔ فرمایا وہ معذور ہے۔ ایک رات ہمارے گھر میں ہمسایہ کے گھر سے کھانا آیا تھا۔ میں نے اور میری بیوی نے کھایا۔ اسی رات اس لڑکے کا نطفہ قرار پایا۔ ہم پر نیند نے غلبہ کیا اور ہمارے تمام اوراد و وظائف قضا ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے جستجو کی اور اس ہمسایہ کے پاس گئے اور پوچھا جو کھانا ہمیں بھیجا تھا وہ کہاں سے آیا تھا؟ معلوم ہوا کہ شادی کی ایک تقریب سے آیا تھا۔ ہم نے مزید تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا بادشاہ کے گھر سے آیا تھا۔ آداب تجرد میں یہ شامل ہے کہ آنکھ ناشائستہ چیزوں پر نہ ڈالے۔ ناقابل شنید چیزوں کو نہ سنے۔ ایسی چیزوں کے متعلق نہ سوچے جو سوچنے کے لائق نہ ہوں۔ نفسانی خواہش کی آگ کو بھوک سے فرو کرے۔ دل کو دنیا اور دنیا کی دلچسپیوں سے بچائے۔ اپنی خواہش نفس کو علم اور الہام نہ کہے۔ شیطانی شعبدوں کی تاویل نہ کرے۔ یہی مقبول طریقت ہونے کا راستہ ہے۔ یہ صحبت و معاملہ کے آداب ہیں جو مختصراً بیان ہوئے۔ اگرچہ تھوڑے سے معرض بیان میں آئے تاہم تھوڑی چیز زیادہ کے لئے دلیل راہ ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

دسواں کشف حجاب، کلام صوفیاء، حدود الفاظ اور حقائق معانی

خدا تجھے سعادت نصیب کرے۔ اہل صنعت اور ارباب معاملہ کے پاس باہمی رموز بیان کرنے کے لئے ایسے مخصوص الفاظ اور اصطلاحات ہوتی ہیں جن کا مطلب ان کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ عبارات اور اصطلاحات اس لئے وضع کی جاتی ہیں کہ بات اچھی طرح سمجھائی جا سکے اور مشکل چیز آسان ہو کر مرید پر واضح ہو سکے۔ ایک اور مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ راز کی چیزیں نااہل لوگوں سے چھپائی جا سکیں۔ اس کے لئے واضح دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ اہل لغت کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً فعل ماضی۔ مستقبل۔ صحیح۔ معتل۔ اجوف۔

لفیف۔ ناقص وغیرہ اہل نحو کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً رفع۔ نصب۔ جر۔ ضمہ۔ کسرہ، جزم، منصرف، غیر منصرف وغیرہ۔ اہل عروض کی بھی اصطلاحات ہیں مثلاً بحور۔ دائرہ۔ سبب۔ وتد۔ فاصلہ وغیرہ اہل حساب کی اپنی وضع کی ہوئی اصطلاحات ہیں مثلاً فرد، زوج، ضرب، تقسیم، کعب، جزء، اضافت، تنصیف، جمع، تفریق وغیرہ۔ اہل فقہ کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً علت، معلول، قیاس، اجتہاد، دفع، الزام وغیرہ، اہل حدیث کی اپنی وضع کردہ اصطلاحات ہیں مثلاً مسند، مرسل، احاد، متواتر، جرح، تعدیل وغیرہ۔ اہل کلام کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً، عرض، جوہر، کل، جزء، جسم، حدوث، تحیر، توالی وغیرہ۔ اسی طرح صوفیائے کرام نے بھی مطالب کو بیان کرنے یا چھپانے کے لئے کچھ الفاظ مقرر کر رکھے ہیں تا کہ جسے چاہیں اپنا مطلب بتا دیں اور جس سے چاہیں چھپالیں۔ میں ان کلمات میں سے بعض کی پوری تشریح کرتا ہوں اور فرق واضح کرتا ہوں تا کہ تجھے اور اس کتاب کے قارئین کو پوری منفعت ہو اور مجھے نیک دعا حاصل ہو۔

حال، وقت اور ان میں فرق

''وقت'' ایک مشہور اصطلاح ہے اور مشائخ کبار نے اس پر بہت کچھ کہا ہے۔ میں بیان کو طول دینا نہیں چاہتا۔ اس لئے صرف وقت اور حال کی کیفیت بیان کروں گا اور دونوں کا فرق واضح کروں گا۔

صوفیائے کرام کے نزدیک وقت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں درویش گذشتہ اور آئندہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے دل پر فیضان حق وارد ہوتا ہے اور اس کا باطن اس طرح مجتمع ہو جاتا ہے کہ عالم مشاہدہ میں نہ گذشتہ کی یاد آتی ہے نہ آئندہ کا خیال۔ یہ ہر شخص کے بس میں نہیں گو سب نہیں جانتے کہ سابقہ تقدیر کیا تھی اور انجام کیا ہوگا اس کے اہل صرف صاحب وقت ہیں جو کہتے ہیں کہ رفتہ و آئندہ ہمارے احاطہ ادراک سے باہر ہیں ہمارے لئے یہ وقت خوب ہے اگر ہم ماضی میں مشغول ہوں یا آئندہ کا اندیشہ دل میں لائیں تو ہمارے اور وقت یعنی مشاہدہ حق کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا اور پردہ صرف

پریشانی اور آشفتگی کا باعث ہوتا ہے۔ الغرض جو چیز دسترس سے باہر ہو اس کی بابت سوچنا بے کار ہے۔

حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اپنے عزیز وقت کو سوائے عزیز ترین چیزوں کے کسی چیز پر صرف نہ کرو اور عزیز ترین چیزیں صرف ماضی و مستقبل کے درمیانی وقفے میں رونما ہوتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْهِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ(1) ''مجھے حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت نصیب ہوتا ہے جب میرے ساتھ نہ کسی مقرب فرشتہ کی اور نہ کسی نبی مرسل کی گنجائش ہوتی ہے۔'' یعنی ہزار دو ہزار عالم میرے دل سے بعید ہوتے ہیں اور میری نظر میں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب شب معراج زمین اور افلاک کی دلچسپیاں آپ کو پیش کی گئیں۔ آپ نے کسی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ (النجم) ''نہ نظر بھٹکی اور نہ متجاوز ہوئی۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عزیز تھے اور عزیز کو، بجز عزیز کے مشغولیت نہیں ہوتی۔

موحد کے لئے دو وقت ہوتے ہیں ایک ''فقد'' جس میں مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرا ''وجد'' جب عالم مشاہدہ ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں موحد مقہور ہوتا ہے۔ وصل (وجد) وصل حق اور جدائی (فقد) بحکم حق ہوتی ہے۔ اس کے اپنے اختیار یا کسب کا کوئی قابل ذکر دخل نہیں ہوتا۔ جب دست اختیار کوتاہ ہو تو بندہ جو کچھ دیکھتا یا کرتا ہے وہ ''وقت'' کے زیر اثر ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے ایک درویش کو صحرا میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے سخت ریاضت اور مجاہدہ کے عالم میں دیکھا۔ پوچھا تم اس جگہ کیوں بیٹھے ہو اور اس قدر سختی اور مصیبت کیوں اٹھا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا مجھے ''وقت'' حاصل تھا جو اس جگہ برباد ہو گیا اسی کے غم میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کتنے عرصہ سے بیٹھے ہو؟ کہا بارہ برس سے اور پھر درخواست کی کہ میرے لئے دعا فرمائیں

1۔ المقاصد الحسنہ

شاید میرا کھویا ہوا وقت مل جائے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں: میں نے حج سے فارغ ہو کر اس کے حق میں دعا مانگی۔ دعا قبول ہوئی اور اس کی مراد پوری ہو گئی واپس پلٹے دیکھا تو درویش اسی جگہ بدستور بیٹھا تھا پوچھا تمہارا وقت مل گیا اب کیوں بیٹھے ہو؟ کہا یہ میری وحشت کا مقام تھا۔ میری دولت اسی جگہ گم ہوئی تھی۔ دوبارہ اسی جگہ ملی۔ اب یہ میری محبت کا مقام ہے اسے چھوڑنا روا نہیں۔ آپ سلامتی کے ساتھ تشریف لے جائیں۔ میں اپنی خاک اسی خاک میں ملاؤں گا تا کہ حشر کے دن اسی زمین سے سر اٹھاؤں۔ جہاں میری محبت کی دولت ہے اور جو میری فرحت کا مقام ہے۔

فکل أمری یولی الجمیل محبب وکل مکان ینبت العز طیب

"جو حسین تحفہ حبیب سے آئے وہ عزیز ہوتا ہے جس مقام پر عزت ملے وہ پاکیزہ ہوتا ہے۔"

جو چیز انسانی اختیار سے باہر ہو اور اسے محنت و مشقت سے حاصل نہ کیا جا سکے جو بازار میں فروخت نہ ہوتی ہو چاہے کہ اس کے عوض جان عزیز بھی پیش کی جائے۔ آدمی کو اس کے حصول یا دفع میں کوئی دخل نہیں اور یہ دونوں پہلو اس کے لئے برابر ہیں۔ اس کی تحقیق میں انسانی اختیار قطعاً باطل ہے۔ مشائخ نے کہا ہے الوقت سیف قاطع "وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔" تلوار کی صفت کاٹنا ہے۔ وقت کی صفت بھی کاٹنا ہے۔ وقت ماضی اور مستقبل کی جڑ کاٹتا ہے۔ گذشتہ کل اور آنے والی کل کا اندازہ ختم کر دیتا ہے۔ تلوار کا وجود خطرناک ہوتا ہے یا بادشاہ بنا دیتی ہے یا ہلاک کر دیتی ہے۔ اگر کوئی ہزار سال تلوار کی خدمت کرے اور اسے اپنے کندھے پر اٹھائے پھرے کاٹنے کے وقت وہ اپنے مالک اور غیر کی گردن میں کوئی تمیز نہیں کرتی اس کی صفت قہر ہے اور کسی کے قبضہ میں رہ کر اس کی صفت زائل نہیں ہوتی۔

حال ایک واردات ہے جو وقت پر نازل ہو کر اسے اس طرح مزین کر دیتی ہے جیسے روح جسم کو۔ حال وقت کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ اس کی صفا اور اس کا قیام حال پر منحصر ہے جب صاحب وقت صاحب حال ہو جاتا ہے تو تغیر سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسے استقامت

میسر آجاتی ہے۔ بے حال وقت زوال پذیر رہتا ہے۔ حال میسر آئے تو جملہ کیفیت وقت ہو جاتی ہے اور اس پر زوال نہیں آتا۔ فیضان کی آمد ورفت صرف شکل پذیر ہونے اور نمایاں ہونے کا پہلو ہے۔ حال سے قبل صاحب وقت پر حال وقتی طور پر نازل ہوتا ہے اور غفلت اس کے جلو میں ہوتی ہے۔ نزول حال وقت کو تمکین دیتا ہے۔ صاحب وقت پر غفلت اور صاحب حال پر نا روا ہے۔

مشائخ نے فرمایا: الحال سکوت اللسان فی فنون البیان "حال فنون بیان میں زبان کے ساکت ہو جانے کا نام ہے۔" صاحب حال کی کیفیت اس کے عمل سے نمایاں ہوتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے السوال عن الحال محال "حال سے متعلق سوال محال ہے۔" کیونکہ حال فنائے قال کا نام ہے۔

استاد ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا وعقبیٰ میں یا مسرت ہے ہلاکت "وقت" وہی ہے جو فی الحال تم پر وارد ہے۔ "حال" کی یہ کیفیت نہیں۔ وہ واردات من اللہ ہے جو اپنے ساتھ ہر چیز کو بہا کر لے جاتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام صاحب وقت تھے۔ کبھی غم فراق میں آنکھیں سفید ہو جاتی تھیں۔ کبھی مسرت وصال سے نور واپس آجاتا تھا۔ کبھی گریہ سے بال اور نالہ سے ریشہ قلم کی طرح ہو جاتے تھے۔ کبھی مسرت سے روح کی طرح لطیف اور فرحت سے سراپا سرو ہو جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب حال تھے نہ غم فراق میں مبتلا تھے نہ فرحت وصال میں۔ سورج، چاند، ستارے سب کچھ سامنے تھے۔ مگر آپ بہ فیض حال سب سے فارغ تھے۔ ہر چیز میں مشاہدۂ حق کرتے اور فرماتے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۞ (الانعام) "میں زوال پذیر چیزوں کو دوست نہیں رکھتا۔" صاحب وقت کے لئے دنیا کبھی جہنم ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مشاہدۂ حق سے محروم ہو جاتا ہے اور حبیب کے حجاب سے اس کا دل وحشت میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر کبھی دولت مشاہدہ پا کر وہ بہشت کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس صاحب حال کے لئے حجاب اور مشاہدے کا عالم برابر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ محل مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ الغرض حال مطلوب حق

کی صفت ہے اور وقت طالب حق کی۔ طالب حق یعنی صاحب وقت باہوش و تمکین ہوتا ہے۔ مطلوب حق (صاحب حال) مجذوب حق اور مدہوش حق ہوتا ہے۔ دونوں مقام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اصطلاحات صوفیہ میں مقام و تمکین بھی ہیں۔

مقام و تمکین اور ان میں فرق

مقام سے مراد طالب کا حقوق مطلوب کو سخت کوشش اور صحیح نیت سے ادا کرنا ہے ہر مرید کے لئے ایک مقام ہوتا ہے جو ابتدائے طلب میں باعث طلب ہوتا ہے۔ طالب حق ویسے تو ہر مقام سے بہرہ ور ہوتا ہے اور وہ ہر مقام سے گزرتا ہے مگر اس کا قیام صرف ایک مقام پر ہوتا ہے کیونکہ مقام واردات کا تعلق جبلت اور فطری ترکیب سے ہے فعل اور عمل سے نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا، وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ (الصافات) ''سب کے لئے ایک معین مقام ہوتا ہے۔'' آدم علیہ السلام کا مقام توبہ تھا۔ نوح علیہ السلام کا زہد، ابراہیم علیہ السلام کا تسلیم، حضرت موسیٰ کا انابت، داؤد علیہ السلام کا غم، عیسیٰ علیہ السلام کا امید، یحیٰ علیہ السلام کا خوف اور ہمارے پیغمبر ﷺ کا ذکر۔ ویسے تو ہر طالب ہر جگہ سے استفادہ کرتا ہے مگر بالآخر اس کا رجوع اپنی اصل کی طرف ہوتا ہے مکتب حارثیہ کے تحت میں مقامات سے متعلق کچھ بیان کر چکا ہوں اور حال و مقام میں فرق ظاہر کر چکا ہوں۔ مگر یہاں بھی کچھ بیان کرنا ضروری ہے۔ راہ حق کے تین پہلو ہیں: مقام، حال اور تمکین۔ باری تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا تا کہ وہ راہ حق دکھائیں اور مقامات کو ظاہر کریں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی تشریف لائے ہر ایک اپنے مقام کے ساتھ پیغمبر ﷺ کی آمد پر ہر مقام کو ''حال'' نصیب ہوا اور اسے وہ جگہ ملی جو انسان کی کسب و کوشش کے دائرہ امکان سے باہر تھی۔ یہاں تک کہ دین پایہ تکمیل کو پہنچا اور نعمت حق کا اتمام ہوا اور حق تعالیٰ نے فرمایا، اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ:3) ''آج کے دن دین تمہارے لئے کامل کر دیا گیا۔ تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پسند کیا۔'' اس کے بعد اہل تمکین سر منظر آئے۔ اگر تمام احوال

معرض بیان میں لاؤں اور تمام مقامات کی شرح کروں تو اپنے مقصد سے بہت دور جا پڑوں گا۔

تمکین۔ سے مراد محل کمال اور درجہ اعلیٰ پر اہل حقیقت کی اقامت ہے۔ اہل مقام اپنے مقامات بدلتے رہتے ہیں مگر تمکین کے درجہ سے نکلنا محال ہوتا ہے۔ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے اور تمکین منتہی لوگوں کی قرار گاہ ہے۔ ابتدا سے نہایت کی طرف تو جا سکتے ہیں مگر نہایت سے آگے کوئی گذرگاہ نہیں۔ مقامات سلوک حق کی منزلیں ہیں اور تمکین درگاہ حق کا قیام ہے۔ دوستان حق جادہ پیمائی کے دوران خود سے غائب اور منزل روی میں خود سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ ان کا باطن مشغول حق ہوتا ہے۔ مشغولیت حق میں اسباب وعلل کی موجودگی وجہ آفت اور سامان پریشانی ہوتی ہے۔

دور جاہلیت میں شعراء اپنے ممدوح کی مدح عملاً کرتے تھے۔ اپنے اشعار کچھ دن نہیں سناتے تھے۔ جب شاعر اپنے ممدوح کے حضور پہنچ جاتا تھا تو وہ تلوار نکال کر اپنے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیتا تھا اور تلوار توڑ دیتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ گھوڑے کی ضرورت بارگاہ تک مسافت طے کرنے کے لئے تھی اور شمشیر اس لئے تھی کہ بارگاہ تک رسائی حاصل کرنے میں سد باب ہونے والے حاسدوں سے راستہ صاف کیا جائے۔ بارگاہ تک پہنچ کر مسافت ختم ہوگئی۔ شمشیر کی ضرورت بھی نہ رہی کیونکہ اب بارگاہ ممدوح کو چھوڑنے کا خیال ہی نہیں۔ چند روز گذرنے کے بعد شاعر اپنے اشعار پیش کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہی حکم تھا۔ چنانچہ جب آپ قطع منازل ومقامات کے بعد محل تمکین پر پہنچے تو جملہ اسباب تغیر ساقط ہوگئے اور حق تعالیٰ نے فرمایا، فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (طٰہٰ:12) وَاَلْقِ عَصَاكَ (النمل:10) ''اپنے جوتے اتارو اور لاٹھی پھینک دو۔'' کیونکہ یہ چیزیں مسافت کے اسباب ہیں اور بارگاہ وصل میں سامان مسافت کی آفت کے لئے جگہ نہیں محبت کی ابتدا طلب حق ہے اور انتہا قرار بحق ہے۔ پانی جب تک دریا میں ہوتا ہے اس میں روانی ہوتی ہے۔ سمندر میں پہنچ کر وہ قرار پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔

پانی کا ضرورت مند سمندر کی طرف نہیں آتا۔ صرف جواہرات کے طالب ادھر کا رخ کرتے ہیں تا کہ جان پر کھیل کر طلب کا بوجھ پاؤں میں باندھے اور سر کے بل سمندر میں غوطے لگائے یا جواہرات پائے یا اپنی جان عزیز گنوائے۔

ایک شیخ فرماتے ہیں: ''تمکین تلوین کو چھوڑ دینا ہے۔''

تلوین بھی صوفیائے کرام کی ایک اصطلاح ہے حال و مقام کی طرح۔ معانی میں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ تلوین کا مطلب متغیر ہونا ہے ایک حال سے دوسرے حال میں جانا۔ صاحب تمکین یا متمکن سے وہ سالک مراد ہے جو متردد نہ ہو اور اپنے جملہ سامان کے ساتھ بارگاہ حق میں باریاب ہو۔ وسوسہ غیر سے پاک ہو کوئی معاملہ میں اس کے ظاہر کو بدل نہ سکے اور کوئی حال اس کے باطن پر اثر انداز نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام متلون تھے جمال حق کی ایک جھلک میں بے ہوش ہو گئے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا، وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (الاعراف:143) ''موسیٰ غش کھا کر گر گئے۔'' پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متمکن تھے۔ مکہ معظمہ سے عین تجلی میں قاب قوسین تک تشریف لے گئے مگر نہ متغیر ہوئے نہ متبدل۔ یہ اعلیٰ درجہ تھا۔

تمکین کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس کا تعلق ''شاہد حق'' سے ہو اور دوسری یہ کہ تمکین کی نسبت ''خود'' سے ہو۔ ''خود'' کی نسبت والا باقی الصفت ہوتا ہے اور شاہد حق کے تعلق والا فانی الصفت، محو، صحو، محق، فنا، بقا، وجود اور عدم سے باہر ہوتا ہے کیونکہ ان صفات کے لئے موصوف کی ضرورت ہے اور جب موصوف مستغرق ہو تو ہر صفت اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ ہے مگر میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

محاضرہ و مکاشفہ

محاضرہ لطیف آیات کے پیش نظر حضور دل حاصل ہونے کو کہتے ہیں اور مکاشفہ باطن کے تحیر کا نام ہے جو جلوۂ حقیقت کو دیکھ کر رونما ہو۔ محاضرہ کا تعلق آیات کے دیکھنے سے ہے اور مکاشفہ کا شواہدات کے دیکھنے سے۔ محاضرہ کی علامت دوامی تفکر ہے آیات کے سامنے اور مکاشفہ کی علامت دوامی تحیر ہے حق تعالیٰ کی بے انتہا عظمت کے روبرو۔ افعال حق میں

متفکر رہنے اور جلال حق میں متحیر رہنے میں فرق ہے۔ متفکر دوستی کے محل میں ہوتا ہے اور متحیر محبت کے مقام پر۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آسمانوں کے ملکوتی نظام کو دیکھا اور غور کیا تو ان کا دل ''حاضر'' ہوا اور وہ افعال حق کو دیکھ کر طالب فاعل (حق تعالیٰ) ہوئے۔ اور ان کے حضور قلب نے فعل کو دلیل فاعل بنا دیا اور آپ نے کمال معرفت الٰہی کے عالم میں فرمایا اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا (الانعام:79) ''میں نے اپنا رخ زمینوں اور آسمانوں کے خالق کی طرف ایک سچے موحد کی طرح کرلیا۔''

جب خدا تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم ملکوت کی سیر کے لئے بلایا تو آپ نے ماسوا اللہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ نہ آپ نے عالم ملکوت تک لے جائے جانے پر نظر کی، نہ مخلوق کو نظر میں رکھا نہ اپنے آپ کو دیکھا۔ جس کے نتیجہ میں آپ پر ذات خداوندی کی حقیقت اور کھلی۔ پس اس کشف کی حالت میں آپ کا شوق وقلق اور زیادہ ہوا۔ دیدار کی طلب ہوئی دیدار نہ ہوا۔ قرب چاہا وہ بھی ممکن نہ ہوا، وصل کا ارادہ کیا اس کا بھی امکان نہ تھا جس قدر دوست کی پاکیزگی دل پر نقش جماتی گئی دیدار وقرب ووصل کا شوق بڑھتا گیا۔ نہ اعراض (پیچھے ہٹنے) کا مقام تھا نہ اقبال (آگے بڑھنے) کا حیران ہو گئے۔ پس جہاں تک وفا اور دوستی کا تقاضا تھا حیرت نے تذبذب میں ڈالا اور جہاں تک محبت کا تقاضا تھا قرب و وصل سے دوئی ثابت ہوتی تھی جو شرک تھی۔ چنانچہ حیرت ہی سرمایہ بنی اس لئے کہ وفا کی صورت میں حیرت (شک) ہستی ذات کے بارے میں تھی جو شرک ہے اور محبت کی صورت میں حیرت کیفیت ذات کے متعلق تھی جو توحید ہے۔ اسی لئے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ یا دلیل المتحیرین ذدنی تحیرا ''اے حیرت زدوں کے رہنما! میری حیرت کو اور بڑھا۔'' مشاہدہ میں حیرت کی زیادتی زیادت درجات کا باعث ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ جب حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم سعد علوی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں ایک دوست حق کو لب دریا دیکھا تو پوچھا راہ حق کیا ہے؟ اس نے جواب دیا دو راہیں ہیں، ایک خاص لوگوں کی راہ اور ایک عام لوگوں کی۔ کہا اس کی شرح فرمائیے۔

انہوں نے کہا راہ عام تو وہی ہے جس پر آپ گامزن ہیں۔ یہ راہ چند اسباب پر اختیار کی جاتی ہے آپ اسباب دیکھتے ہیں، سبب سے ہی قبول یاد کرتے ہیں۔

خاص لوگ وہ ہیں جو مسبب الاسباب کو دیکھتے ہیں اسباب پر نظر نہیں رکھتے۔ اس حکایت کی شرح اوپر بیان ہو چکی ہے اور میرا مقصد اس سے زیادہ نہیں۔ وباللہ التوفیق

قبض و بسط

قبض و بسط دو حالتیں ہیں جو انسانی اختیار سے باہر ہیں۔ نہ کوشش سے حاصل ہو سکتی ہیں اور نہ تکلیف سے دور کی جاسکتی ہیں حق تعالیٰ نے فرمایا، وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ (البقرہ:245) ''اللہ قبض و بسط پر قادر ہے۔'' قبض سے مراد عالم حجاب میں دل کا انقباض ہے اور بسط کا مطلب حالت کشف میں دل کی کشائش ہے۔ دونوں چیزیں بلا کوشش انسانی من اللہ ہیں۔ عارفوں کے لئے قبض کا مقام وہی ہے جو مریدوں کے لئے خوف کا اور بسط ان کے لئے ایسے ہی ہے جیسے امید مریدوں کے لئے۔

یہ معانی ہیں ایک گروہ صوفیاء کے مطابق۔ مشائخ کی ایک جماعت کے خیال میں قبض کا مقام بسط سے بلند تر ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ کلام حق میں قبض کا ذکر بسط سے پہلے ہے اور دوسرے یہ کہ قبض میں گداز و قہر ہوتا ہے اور بسط میں نوازش و لطف۔ گداز بشریت اور قہر نفسانی پرورش و لطف سے فاضل تر ہے کیونکہ پرورش نفس ایک بڑا حجاب ہے۔ ایک دوسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ بسط کا مقام قبض سے بلند تر ہے۔ کیونکہ کلام حق میں قبض کے ذکر کا تقدم بسط کے افضل تر ہونے کی دلیل ہے۔ عربی زبان کے عرف و عادت کے مطابق جو چیز درجہ میں کم ہو اس کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا، فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ (الفاطر:32) ''لوگوں میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی اللہ تعالیٰ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔ اور نیز فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾ (البقرہ) ''حق تعالیٰ توبہ کرنیوالوں اور پاک رہنے

والوں کو دوست رکھتا ہے۔" نیز فرمایا، یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝ (آل عمران) "اے مریم! اپنے رب کی فرماں بردار ہو اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔"

اور یہ بھی ہے کہ بسط میں فرحت ہوتی ہے اور قبض میں ہلاکت عارفوں کی فرحت حصول معرفت کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور ہلاکت مطلوب سے دوری کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وصل کا مقام فراق کی منزل سے بہر صورت ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قبض وبسط دو حقیقتیں ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے دل پر وارد ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی حقیقت وارد ہوتی ہے تو باطن اس سے مسرور ہوتا ہے اور نفس مقہور یا باطن مقہور ہوتا ہے اور نفس مسرور ایک آدمی کے لئے اس کے باطن کا انقباض نفس کے لئے کشائش کا باعث ہوتا ہے دوسرے کے لئے باطن کی کشائش اس کے نفس کے انقباض کا ذریعہ ہوتی ہے جو کوئی اس سے زیادہ کہتا ہے وہ تضیع اوقات کرتا ہے۔

اسی بناء پر حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا قبض القلوب فی بسط النفوس وبسط القلوب فی قبض النفوس "دل کا انقباض نفس کی کشائش کرتا ہے اور دل کی کشائش نفس کے انقباض کا باعث ہوتی ہے۔" مقبوض نفس خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور کشادہ باطن لغزش سے مصون رہتا ہے۔ غیرت دوستی کا دستور ہے اور انقباض غیرت حق کا نشان ہے۔ اور دوست دوست پر عتاب کیا ہی کرتا ہے۔ بسط عتاب دوست کی علامت ہے مشہور ہے کہ حضرت یحیٰی علیہ السلام ہنستے نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام روتے نہیں تھے۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام عالم انقباض میں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبساط میں۔ جب ایک دوسرے سے ملتے تو حضرت یحیٰی علیہ السلام فرماتے اے عیسیٰ! علیہ السلام کیا تو جدائی کے خوف سے بے نیاز ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے کیا تو رحمت حق سے ناامید ہے؟ نہ تیرا رونا تقدیر ازلی مٹا سکتا ہے اور نہ میرا ہنسنا قضا کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ قبض، بسط، طمس، محبت، محو، صحو، محق عجز، جہد سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں وہی ہوتا ہے جو لکھا جا چکا

ہے۔ واللہ اعلم

انس و ہیبت

اللہ تعالیٰ تجھے سعادت دے۔ انس و ہیبت سالکان حق کے احوال میں شامل ہیں۔ جب حق تعالیٰ بندے کے دل پر اپنے جلال کا پرتو ڈالتا ہے تو اسے ''ہیبت'' مقدر ہوتی ہے جب اپنے جمال کی تجلی سے سرفراز کرتا ہے تو انس نصیب ہوتا ہے۔ اہل ہیبت اس کے جلال کے سامنے تکلیف میں ہوتے ہیں اور اہل انس جمال حق کے مشاہدہ میں مسرور ہوتے ہیں۔ ایک دل اس کے جلال سے دوستی کی آگ میں جلتا ہے دوسرا اس کے جمال سے انوار مشاہدہ میں تابناک ہوتا ہے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

ایک گروہ مشائخ کہتا ہے کہ ہیبت درجہ عارفان اور انس درجہ مریدان ہے۔ کیونکہ جو بھی بارگاہ حق میں اوصاف حق کی تنزیہہ میں مستحکم ہوتا ہے اس پر ہیبت زیادہ طاری ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت انس سے نفور رہتی ہے کیونکہ انس ہم جنس سے ہوتا ہے اور یہ محال ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کا ہم جنس یا ہم شکل ہو سکے۔ اس لئے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کو خلق کے ساتھ انس ہو۔ اگر انس ممکن ہے تو صرف اس کے ذکر سے ہوسکتا ہے مگر ذکر حق بذات خود غیر حق چیز ہے کیونکہ وہ بندہ کی صفت ہے۔ محبت میں کسی غیر از محبوب چیز میں الجھنا سراسر غلط خیال، بے بنیاد دعویٰ اور جھوٹے پندار کی دلیل ہے ہیبت، عظمت حق کے مشاہدہ سے طاری ہوتی ہے۔ عظمت، حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ جس بندے کا عمل از خود برائے خود ہو اور جس کا عمل اپنی فنا سے بقائے حق کے اثبات پر مرکوز ہو دونوں میں بہت فرق ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک عرصہ اسی خیال میں مبتلا رہا کہ محبت الٰہی میں سرشار ہوں اور مشاہدۂ حق میں مجھے ''انس'' حاصل ہے اب معلوم ہوا کہ انس سوائے ہم جنس کے ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک جماعت کے خیال میں ہیبت ''فراق اور عقوبت سے'' تعلق رکھتی ہے اور انس وصل و رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے دوستان حق کو ہیبت سے محفوظ رہنا چاہئے اور انس کو

اپنانا چاہئے۔ انس محبت کا مقتضی ہوتا ہے اور جس طرح محبت کے لئے مجانست محال ہے اسی طرح انس کے لئے بھی ناممکن ہے۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ سے انس ناممکن ہے حق تعالیٰ تو خود فرماتا ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ (بقرہ:186)، يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (زخرف:68) ''جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں۔ پس تحقیق میں قریب ہوں (تو کہہ دو) اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف وحزن نہیں۔''

بندہ جب حق تعالیٰ کا فضل وکرم دیکھتا ہے تو اس کی دوستی اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو تو انس پیدا ہوتا ہے کیونکہ دوست کی ہیبت بیگانگی اور انس یگانگی کا نشان ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ اسے اپنے منعم سے انس ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کے ہم پر اتنے انعامات ہیں اور ہمیں اسکی وہ معرفت حاصل ہے کہ ہیبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں (علی بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ باوجود اختلاف کے دونوں گروہ راستی پر ہیں۔ کیونکہ ہیبت کا غلبہ، نفس کی ہوا وہوس اور اس کی بشریت کو فنا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ انس باطنی طور پر طاری ہو جاتا ہے اور معرفت حق ودیعت کرتا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے جلال کی تجلیوں سے اپنے دوستوں کے نفس کو فانی کرتا ہے اور اپنے جمال کے نور سے ان کے باطن کو بقا عنایت کرتا ہے۔ پس اہل فنا ہیبت کو مقدم سمجھتے ہیں اور ارباب بقا انس کو فضیلت دیتے ہیں۔ اس سے قبل فنا اور بقا کے بیان میں اس کی شرح کر چکا ہوں۔

قہر ولطف

قہر اور لطف بھی دو اصطلاحیں ہیں جن کے ذریعے صوفیائے کرام اپنی کیفیت روزگار بیان کرتے ہیں۔ قہر کا مطلب تائید حق سے اپنی آرزوؤں کو فنا کرنا اور اپنے مقاصد نفسانی کو روکنا ہے بغیر کسی ذاتی مراد کے۔ لطف کے معنی بقائے باطن، دوام مشاہدہ اور استقامت حال بحکم تائید ربانی ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ بزرگی تائید حق سے مراد حاصل ہونے میں ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ بزرگی یہ ہے کہ حق تعالیٰ انسان کو سوائے اپنی مراد کے ہر مراد سے نامراد کرے اور اسے مغلوب نامرادی رکھے۔ یہاں تک کہ تشنگی کے عالم میں اگر وہ دریا میں چلا جائے تو دریا خشک ہو جائے۔

مشہور ہے کہ بغداد میں دو درویش تھے۔ دونوں فقر میں بلند مرتبہ تھے۔ ایک اہل قہر اور دوسرا اہل لطف میں شامل تھا۔ دونوں میں لگاوٹ تھی۔ ایک دوسرے کی کیفیت کو کمتر سمجھتے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ لطف خداوندی سب چیزوں سے افضل ہے۔ کیونکہ اس کا فرمان ہے، اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ (الشوریٰ:19) ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر لطف فرمانے والا ہے۔'' دوسرا کہتا تھا۔ قہر کا مقام بہت بلند ہے۔ کیونکہ خدا کا فرمان ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (الانعام:18) ''وہ (حق تعالیٰ) اپنے بندوں پر قاہر ہے۔'' اس مسئلہ پر مدت تک دونوں کے درمیان بہت شدید مباحثہ رہا۔ آخر الامر صاحب لطف درویش نے مکہ معظمہ کا عزم کیا مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ایک جنگل میں قیام کر لیا اور مجاہدہ میں مشغول ہو گیا کئی برس گزر گئے اور کسی کو اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک دفعہ کوئی شخص مکہ معظمہ سے بغداد آرہا تھا راستے میں اس درویش سے ملاقات ہوگئی۔ درویش نے کہا کہ اگر تمہارا جانا بغداد ہو تو میرے دوست سے محلّہ کرخ میں مل کر یہ بات کہنا کہ اگر محلّہ کرخ کی دلچسپیاں جنگل میں دیکھنے کا خیال ہو تو میرے پاس آجاؤ وہ شخص بغداد پہنچا اور درویش کو پیغام دے دیا مگر درویش نے کہا جب تم واپس جاؤ تو میری جانب سے کہہ دینا کہ یہ کوئی قابل ناز چیز نہیں کہ ہولناک جنگل کو تمہارے لئے محلّہ کرخ کی طرح بنا دیا گیا تا کہ تم درگاہ سے دور نہ بھاگ جاؤ۔ قابل ناز چیز یہ ہے کہ میرے لئے محلّہ کرخ کو اس خوبصورتیوں کے باوجود ہولناک جنگل کی طرح بنا دیا اور میں اس میں خوش وخرم ہوں۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مناجات میں کہا، ''یاالٰہی! اگر تو آسمان کو میرے گلے کا طوق اور زمین کو میرے پاؤں کی زنجیر بنا دے اور سارا عالم میرے خون کا پیاسا ہو جائے

تو بھی میں تجھ سے روگردانی نہیں کروں گا۔"

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ایک سال صحرا میں اولیائے کرام کا اجتماع ہوا۔ میرے مرشد حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ مجھے ہمراہ لے گئے۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ تخت ہوا پر اڑاتے ہوئے آ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو تختوں پر لایا جا رہا تھا۔ کچھ اڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے ایک جوان کو بحال تباہ آتے ہوئے دیکھا۔ اس کا جوتا پھٹا ہوا تھا۔ عصا ٹوٹا ہوا تھا۔ پاؤں بیکار ہو چکے تھے۔ سر ننگا تھا۔ جسم سوختہ، نحیف اور کمزور تھا۔ وہ سامنے آیا ہی تھا کہ حصری رحمۃ اللہ علیہ اچھل پڑے اور اس کو تھام کر بلند جگہ پر بٹھایا۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ مجلس کے اختتام پر میں نے حصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اولیائے کرام میں ایک ایسا ولی ہے جو ولایت کے تابع نہیں بلکہ ولایت اس کے تابع ہے۔

الغرض جو چیز ہم خود اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے لئے مصیبت ہوتی ہے۔ مجھے صرف اس چیز کی آرزو ہے جس میں حق تعالیٰ مجھے مصیبت سے محفوظ رکھے اور نفس کے شر سے بچائے۔ قہر میں مجھے تمنائے لطف نہ ہو اور اگر لطف میسر آئے تو ارادت قہر نہ ہو کیونکہ ہمیں اس کے اختیار میں کوئی دخل نہیں۔

نفی و اثبات

مشائخ کرام صفات بشریت کو مٹانے اور تائید حق کو ثابت کرنے کو نفی اور اثبات کا نام دیتے ہیں۔ نفی سے مراد نفی صفت بشریت لیتے ہیں اور اثبات سے اثبات قوت حقانیت۔ کیونکہ محو کا مطلب کلیت کو مٹانا ہے اور کلیت کے مٹنے کا تعلق صرف صفات سے ہو سکتا ہے ذات سے نہیں ذات برقرار رہتی ہے جب تک کلیت موجود ہو۔ پس لازم ہے کہ ستودہ خصائل کے اثبات سے مذموم صفات کی نفی کی جائے۔ یعنی طلب حق میں اثبات حق سے دعوائے دوستی حق کی نفی کی جائے۔ کیونکہ دعویٰ نفسانی رعونت کا ایک پہلو ہے۔ عادتاً جب صوفیائے کرام اوصاف بشریت کے معاملے میں مغلوب حق ہوتے ہیں تو کہتے ہیں، یہ

صفات بشریت کی نفی اور بقائے حق کا اثبات ہے۔ اس سے قبل فقر و صفوت اور فنا و بقا کے باب میں اسی موضوع پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ مراد حق تعالیٰ کے اختیار کا اثبات اور انسانی اختیار کی نفی ہے اسی بناء پر کسی بزرگ نے کہا ہے: "بندے کے حق میں حق تعالیٰ کا اختیار اپنے علم کے ساتھ بہتر ہے اس اختیار سے جو بندے کو اپنے نفس کے حق میں ہو بغیر مشیت ایزدی کے علم کے۔" محبت صرف محبوب کے اختیار کا اثبات اور محبت کرنے والے کے اختیار کی نفی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

حکایات میں ہے کوئی شخص دریا میں غرق ہو رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کیا تم بچنا چاہتے ہو؟ جواب دیا نہیں۔ اس نے پھر پوچھا تو کیا ڈوبنا چاہتے ہو؟ جواب دیا نہیں اس نے کہا عجیب بات ہے نہ بچنا چاہتے ہو نہ ڈوبنا۔ جواب ملا مجھے ہلاکت اور نجات سے کیا کام! میں وہی چاہتا ہوں جو حق تعالیٰ چاہتے ہیں۔

مشائخ نے فرمایا کہ کمترین مقام اپنے اختیار کی نفی ہے۔ اختیار باری تعالیٰ ازلی ہے اور اس کی نفی محال ہے۔ انسانی اختیار عارضی ہے اور اس کی نفی روا ہے۔ عارضی اختیار کو پامال کر دینا چاہئے تاکہ ازلی اختیار حاصل ہو۔ جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو آپ نے عالم انبساط میں دیدار حق کی آرزو کی اور اپنے اختیار کو بروئے کار رکھ کر درخواست کی۔ رَبِّ اَرِنِیْٓ "اے میرے رب مجھے دیدار دے۔" حق تعالیٰ نے فرمایا، لَنْ تَرٰىنِیْ "تو ہرگز دیکھ نہیں سکتا۔" عرض کی بار خدایا! دیدار حق ہے اور میں مستحق ہوں۔ انکار کیوں؟ حکم ہوا دیدار حق ہے مگر دوستی میں اختیار باطل ہے۔

اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ان اصطلاحات کا مطلب بخوبی واضح ہو جائے۔ توفیق من اللہ ہے۔ جمع و تفرقہ اور غیبت و حضور کا ذکر مکاتب تصوف میں ہو چکا ہے جہاں صحو و سکر اور اس کی مختلف اشکال معرض بیان میں آ چکی ہیں۔ بیان کا صحیح مقام بھی وہی تھا۔ ضرورتاً یہاں بھی کچھ بیان کر دیا تاکہ ہر کسی کا طریق کار سامنے

آجائے۔

مسامرہ ومحادثہ

مسامرہ اور محادثہ کا ملان طریقت کے دو احوال کا نام ہے۔ محادثہ گفتگوئے باطن ہے جس میں زبان خاموش رہتی ہے۔ مسامرہ اخفائے باطن میں مسرت دائمی محسوس کرنے کو کہتے ہیں۔ عام معنی کے لحاظ سے مسامرہ رات میں اور محادثہ دن میں کوئی وقت ہوتا ہے جب ظاہری اور باطنی سوال وجواب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں۔ دن کا حال عالم کشف اور رات کا عالم ستر کہلاتا ہے۔

محبت حق میں مسامرہ کا مقام محادثہ سے بلند تر ہے۔ مسامرہ کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ حق تعالیٰ نے چاہا تو حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور وہ آپ کو رات کے کچھ حصے میں مکہ معظّمہ سے براق پر ''قاب قوسین'' تک لے گئے۔ راز و نیاز ہوا۔ آپ نے سخن حق سنا۔ گفتگو سے عاجز ہوئے اور عرض کیا، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ (1) ''میں تیری ثنا کما حقہ نہیں کرسکتا۔''

محادثہ کا تعلق موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔ جب ان کو حضور حق کی تمنا ہوئی تو چالیس روز کے وعدہ اور انتظار کے بعد ایک روز آپ طور پر آئے اور ہم کلامی سے فیض یاب ہوئے۔ عالم انبساط میں دیدار کی التجا کی۔ مقصد حاصل نہ ہوا اور آپ بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آئے تو عرض کی، تُبْتُ اِلَیْكَ (الاعراف:143) ''میں توبہ کرتا ہوں۔''

یہ فرق تھا اس ذات گرامی میں جس کو بارگاہ حق میں لایا گیا، سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا (الاسراء:1) ''پاک ہے وہ ذات حق جس نے اپنے بندے کو وقت شب سیر کرائی۔'' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو بارگاہ میں حاضر ہوئے، وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا (الاعراف:143) ''اور جب موسیٰ (علیہ السلام) مقام وعدہ پر آئے۔''

پس رات دوستوں کی خلوت اور دن بندوں کی بندگی کا وقت ہے۔ بندہ حد سے

1۔ صحیح مسلم

گزرے تو قابل زجر ہوتا ہے۔ دوست محدود نہیں کیونکہ دوست جو کچھ بھی کرتا ہے وہ عین رضائے دوست ہوتا ہے۔ وباللہ التوفیق

علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین

مندرجہ بالا تمام عبارات کا اطلاق علم پر ہوتا ہے۔ علم جس میں یقین شامل نہ ہو اور جو معلوم چیز کی حقیقت اور صحت پر مبنی نہ ہو علم نہیں کہلا سکتا۔ جب علم حاصل ہوتا ہے تو غیب عین نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ قیامت کے روز اہل ایمان حق تعالیٰ کو اسی صورت میں دیکھیں گے جس صورت میں آج دنیا میں اس کو جانتے ہیں۔ اس کے خلاف ہوگا تو حشر میں رویت صحیح نہیں ہوگی یا ان کا آج علم صحیح نہیں۔ یہ دونوں چیزیں خلاف توحید ہیں کیونکہ توحید حق کا اثبات یہی ہے کہ آج مخلوق کا علم درست ہے اور کل حشر کے روز رویت صحیح ہو اور توحید سے متعلق علم یقین عین یقین ہو جائے اور حق یقین علم یقین ہو جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں، عین الیقین رویت میں علم کا جذب ہو جانا ہے۔ یہ محال ہے کیونکہ رویت علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جیسے سمع وغیرہ جس طرح علم سمع میں جذب نہیں ہوسکتا اسی طرح رویت میں بھی جذب نہیں ہوسکتا۔

صوفیائے کے نزدیک علم الیقین دنیوی معاملت سے متعلقہ احکام واوامر کو جاننا ہے۔ عین الیقین سے مراد عالم نزع اور سفر آخرت کا علم ہے اور حق الیقین کا مطلب حشر کے دن رویت باری اور اس کی کیفیت سے مستفیذ ہونے کا نام ہے۔ الغرض علم الیقین علماء کا مقام ہے کیونکہ وہ شرعی احکام وامور پر ثابت قدم ہوتے ہیں۔ عین الیقین عارفان حق کا درجہ ہے کیونکہ وہ ہر وقت موت کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ حق الیقین محبان حق کا مقام فنا ہے کیونکہ وہ کل موجودات سے روگرداں رہتے ہیں۔ علم الیقین کی بنیاد مجاہدہ پر ہے۔ عین الیقین کی محبت حق پر اور حق الیقین کی مشاہدہ حق پر۔ پہلی چیز عام ہے، دوسری خاص اور تیسری خاص الخاص۔

علم ومعرفت

علمائے اصول علم ومعرفت میں کوئی فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک چیز تصور کرتے ہیں البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے لئے صرف عالم کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے عارف کا نہیں۔ اس موضوع پر کوئی صریح نص موجود نہیں۔ مشائخ طریقت اس علم کو معرفت کہتے ہیں جس میں عمل اور حال شامل ہوں اور صاحب علم اسے معرض بیان میں لائے۔ اس کے برعکس وہ علم جو حال سے الگ اور عمل سے خالی ہو محض علم ہے اور اس کو جاننے والا عالم۔ الغرض جو کوئی معانی اور حقیقت کا عالم ہو عارف کہلاتا ہے اور جو صرف عبارت کو ذہن میں رکھے بغیر فہم حقیقت کے وہ عالم ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام جب اپنے ہم عصروں کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں دانش مند کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ عوام اس کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ مراد تحصیل علم کی برائی نہیں ہوتی بلکہ علم بے عمل کو برا کہنا مقصود ہوتا ہے ان العالم قائم بنفسه والعارف قائم بربه ''عالم اپنی ذات پر قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب پر۔'' اس موضوع پر کشف حجاب معرفت کے تحت بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ یہاں اسی قدر کافی ہے۔

شریعت اور طریقت

یہ بھی دو اصطلاحات صوفیائے میں شامل ہیں۔ شریعت سے مراد حال ظاہر کی صحت اور حقیقت سے مراد حال باطن کی درستگی ہے۔ دو گروہ اس معاملے میں غلطی کے مرتکب ہیں ایک علمائے ظاہر ہیں جو دونوں میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ شریعت بذات خود حقیقت اور حقیقت شریعت ہے دوسرا گروہ ملحدین کا ہے جو دونوں کو علیحدہ علیحدہ قائم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں جب حقیقت بروئے کار ہو تو شریعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ عقیدہ مشبہین، قراطہ، شیعہ اور دیگر وسوسہ ڈالنے والے لوگوں کا ہے۔ اس بات کی دلیل کہ احکام شریعت حقیقت سے جدا ہیں، یہ لائی جاتی ہے کہ ایمان کے معاملے میں دل کی تصدیق زبان کے قول سے جدا ہے اور اس بات کی دلیل کہ دونوں دراصل ایک ہیں کہ محض دل کی تصدیق بغیر زبانی قول کے ایمان نہیں ہوتا اور قول بغیر تصدیق کے بے معنی ہوتا ہے۔ قول اور تصدیق کا فرق ظاہر

ہے۔ پس حقیقت عبارت ہوتی ہے ایسے معنی سے جس میں کوئی تغیر و تبدل روا نہ ہو۔ پیدائش آدم سے فنائے عالم تک اس کی حیثیت یکساں رہتی ہے جیسے معرفت حق اور خلوص نیت پر مبنی اعمال۔ شریعت عبارت ہے ایسے معانی سے جس میں تغیر و تبدل روا ہوتا ہے جیسے احکام و اوامر۔ شریعت فعل انسانی ہے اور حق تعالیٰ کی پرورش ہے اور اس کی حفاظت اور تقدس شریعت کی اقامت حفاظت حقیقت پر منحصر ہے۔ اسی طرح حقیقت کی اقامت کا انحصار شریعت پر ہے اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ جسم میں جب تک جان ہے انسان زندہ ہے جب جان نکل جائے تو تن مردار ہے اور جان کی حیثیت ہوا سے زیادہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جسم و جان کی اہمیت باہم ملاپ سے ہے۔ بالکل یہی عالم شریعت و حقیقت کا ہے۔ شریعت بغیر حقیقت کے ریا اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا، وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: 49) ''جو لوگ ہمارے لئے کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں۔'' مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت حقیقت۔ شریعت احکام کی حفاظت ہے بندہ کے لئے اور حقیقت بندے کے احوال باطن کی حفاظت ہے حق تعالیٰ کی طرف سے۔ شریعت کسب انسانی ہے اور حقیقت انعام خداوندی۔

اصطلاحات کی دوسری قسم وہ عبارات ہیں جو کلام صوفیاء میں استعارۃً استعمال ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل اور شرح مشکل ہوتی ہے اور یہاں میں مختصراً بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز۔

حق: سے مراد حق تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ کیونکہ یہ اسمائے باری تعالیٰ میں ایک اسم ہے۔ جیسے فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (الحج: 4) ''یہ بات اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے۔''

حقیقت: وصل حق کے مقام پر اقامت اور محل تنزیہہ پر استقامت کا نام ہے۔

خطرات: دل میں تفرقات کا گذر۔

وطنات: عرفان حق میں جو کچھ باطن میں رونما ہو۔

طمس: اس چیز کی اصلیت کی نفی جس کی یاد باقی ہے۔

رمس: کسی چیز کی اصلیت کی نفی مع اس کے اثرات کے۔

علائق: کمتر درجہ کے اسباب جن میں الجھ کر طالب اپنے مقصود سے بے بہرہ ہو جائے۔

وسائط: وہ اسباب جن کے ذریعہ مقصود حاصل ہو۔

زوائد: دل میں انوار حق کی شدت۔

فوائد: باطن کا اس چیز کو پالینا جس کی ضرورت ہو۔

ملجاء: تحصیل مقصود کا اعتماد۔

منجاء: دل کا محل آفت سے فرار۔

کلیت: انسانی اوصاف کا کلیات میں جذب ہو جانا۔

لوائح: نفی مراد سے اثبات۔

لوامع: دل میں طلوع انوار بقائے حصول کے ساتھ۔

طوالع: دل میں انوار معارف کا ظہور۔

طوارق: رات کی مناجات میں دل پر بشارت یا زجر کا نزول۔

لطیفہ: دقیق نکات کا اشارہ۔

سر: راز دوستی کا اخفا۔

نجویٰ: آفات کو غیر سے چھپانا۔

اشارہ: غیر کو مقصود کی خبر دینا بغیر زبان ہلائے۔

ایماء: بغیر بیان یا اشارہ کے کنایۃً مخاطب کرنا۔

وارد: حقیقت یعنی معانی کا دل پر وارد ہونا۔

انتباہ: غفلت کا دل سے نکلنا۔

اشتباہ: حق و باطل میں تذبذب۔

قرار: حقیقت حال سے تردد کا دور ہونا۔

انزعاج: عالم وجد میں دل کی حرکت۔

یہ معانی ہیں صوفیاء کرام کے بعض الفاظ کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسری قسم ان اصطلاحات کی ہے جو صوفیاء توحید حق اور اپنا اعتقاد بیان کرنے میں بغیر استعمال کرتے ہیں۔ یہ حسب ذیل ہیں:

عالم: اس سے مراد مخلوقات خداوند عالم ہے کہتے ہیں اٹھارہ ہزار یا پچاس ہزار عالم ہیں۔ اہل فلسفہ کے نزدیک دو عالم ہیں۔ علوی اور سفلی۔ علمائے اصول کہتے ہیں کہ عرش سے تحت الثریٰ تک ایک عالم ہے الغرض عالم مجموعہ ہے مخلوقات کی مختلف اقسام کا۔ اہل طریقت بھی عالم ارواح اور عالم نفوس کے قائل ہیں مگر ان کا مطلب وہ دو عالم نہیں جو اہل فلسفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اہل طریقت کا مطلب اجتماع ارواح اور اجتماع نفوس ہے۔

محدث: جس کا وجود بعد میں ظاہر ہوا ہو یعنی جو پہلے نہ تھا اور بعد میں وجود میں آیا۔

قدیم: جس کا وجود ہمیشہ سے تھا اور رہے گا۔ یہ سوائے ذات حق کے اور کچھ نہیں۔

ازل: وہ جس کی ابتدا نہ ہو۔ وہ نقطہ آغاز جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہ ہو۔

ابد: وہ انتہا جس کی انتہا نہ ہو۔ وہ نقطہ اختتام جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہ ہو۔

ذات: کسی چیز کی اصلیت اور حقیقت۔

صفت: وہ چیز جو قابل بیان ہو بغیر اپنے وجود کے یعنی جس کا اپنا وجود نہ ہو۔ صرف موصوف کی موجودگی میں صورت پذیر ہو۔

اسم: علامت جو مسمیٰ سے جدگانہ ہو۔

تسمیہ: مسمیٰ سے متعلق خبر۔

نفی: کسی چیز کے عدم کا اعلان۔

اثبات: کسی چیز کے وجود کا اقرار۔

شیئان: وہ دو چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہو۔

ضدات: وہ چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے کے منافی ہو۔

غیران: ایک چیز کا وجود دوسری چیز کی فنا۔

جوہر: کسی چیز کا اصل جو بذات خود قائم ہو۔

عرض: جو چیز جوہر کے ساتھ وابستہ ہو۔

جسم: اجزائے پریشان کا اجتماع۔

سوال: طلب کرنا۔ (کسی چیز کی حقیقت)

جواب: سوال کے مضمون کے متعلق اطلاع۔

حسن جو چیز امر حق کے مطابق ہو۔

قبیح: جو امر الٰہی کے خلاف ہو۔

سفہ: اوامر حق کا ترک کرنا۔

ظلم: کسی چیز کو ایسے مقام پر رکھنا جو اس کا اہل نہ ہو۔

عدل: کسی چیز کو اس کا مناسب مقام دینا۔

ملک: جس کا کوئی فعل قابل اعتراض نہ ہو۔

یہ ہیں مختصراً وہ اصطلاحات جن کا علم طالب حق کے لئے ضروری ہے۔

چوتھی قسم ان اصطلاحات پر مشتمل ہے جن کی شرح ضروری ہے۔ یہ صوفیائے کرام میں مستعمل ہیں مگر ان کا مطلب عام لغوی معانی سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔

خاطر

خاطر (خیال گذراں) سے صوفیائے کا مطلب ایسا خیال ہوتا ہے جو دل میں رونما ہو اور جلد ہی کسی دوسرے خیال کے آتے ہی ختم ہو جائے اور صاحب خیال کو اسے دور کرنے کی قدرت حاصل ہو۔ ایسی حالت میں درویش حق تعالیٰ کی طرف سے رونما ہونے والے امور میں پہلے خیال کا اتباع کرتے ہیں کہتے ہیں حضرت خیر النساج رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اس خیال کو دور کرنے کا خیال کیا مگر دوسرے خیال کی تردید میں پھر وہی خیال رونما ہوا۔ آپ نے بار دیگر کوشش کی مگر پھر وہی ہوا۔ آپ باہر نکلے تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کھڑے تھے۔ انہوں

نے فرمایا کہ اے خیر! اگر تم پہلے خیال کا اتباع کرتے ہوئے رسم درویشی بجالاتے تو مجھے اتنی دیر کھڑا نہ ہونا پڑتا۔

مشائخ اس پر کہتے ہیں کہ اگر "خاطر" وہی تھی جو خیر النساج پر وارد ہوئی تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا اس سے کیا تعلق تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ چونکہ خیر النساج کے پیر تھے اس لئے اپنے مرید کے کل احوال سے باخبر تھے۔

واقع

واقع سے مراد وہ چیز ہے جو دل پر وارد ہو اور خاطر کے برعکس دیرپا ہو اور طالب اسے دور کرنے پر قادر نہ ہو چنانچہ عام محاورہ میں کہا جاتا ہے **خطر علی قلبی ووقع فی قلبی** "میرے دل میں خیال گذرا اور میرے دل پر ایک چیز وارد ہوئی۔" خیالات تو ہر دل میں گذرتے ہیں مگر واقعات صرف اس دل میں صورت پذیر ہوتے ہیں جو صرف حقانیت کا مسکن ہو۔ جب راہ حق میں مرید کو کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو اسے "قید" کا نام دیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اسے واقع پیش آیا ہے۔ اہل لغت واقع سے مراد کسی مسئلہ میں الجھن پیدا ہونا لیتے ہیں۔ جب صحیح حل مل جائے اور مشکل دور ہو جائے تو کہتے ہیں: واقع حل ہو گیا۔ اہل طریقت کے نزدیک واقع حل نہیں ہوتا اگر حل ہو جائے تو وہ خاطر ہے، واقع نہیں۔ کیونکہ واقع نہایت اہم چیز ہوتی ہے اور ہر وقت اس کی حیثیت نہیں بدل سکتی۔ واللہ اعلم بالصواب

اختیار

اہل طریقت کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اختیار حق کو اپنے اختیار پر فائق سمجھا جائے یعنی خیر و شر جو کچھ بھی ہو اسے من اللہ کا فی تصور کیا جائے۔ حق تعالیٰ کے اختیار کو اختیار کرنا بھی اختیار حق سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک حق تعالیٰ بندے کو بے اختیار نہ کرے وہ اپنا اختیار چھوڑنے کا اہل نہیں ہوتا۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا امیر کسے کہتے ہیں؟ فرمایا جسے اپنا کوئی اختیار حاصل نہ ہو اور صرف اختیار حق ہی اس کا اختیار ہو۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بخار میں مبتلا تھے۔ آپ نے دعا فرمائی: باری تعالیٰ! مجھے

خیریت عطا فرما۔ آپ کے باطن سے ندا آئی۔ میری فرماں روائی میں دخل دینے والا تو کون ہے؟ میں اپنی سلطنت کا انتظام تجھ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے اختیار پر راضی ہو اور اپنے اختیار کا اظہار نہ کر۔ واللہ اعلم بالصواب

امتحان

اس سے مراد اولیاء کے دلوں کا مختلف مصائب میں ابتلا ہے جو من جانب اللہ ظہور میں آتی ہے۔ مثلاً خوف، غم، قبض، ہیبت وغیرہ۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا، اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ (الحجرات) ''وہ لوگ جن کے دل پرہیز گاری کے لئے مبتلائے آزمائش میں ہیں، بڑی بخشش اور اجر کے مستحق ہیں۔'' یہ درجہ بہت ارفع ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

بلا

بلا سے مراد اولیاء کا تکلیفوں، بیماریوں اور غموں کے ذریعہ جسمانی ابتلا ہے۔ قرب بقدر شدت مصیبت حاصل ہوتا ہے۔ مصیبت اولیاء کا لباس، برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیاء کی غذا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نَحْنُ مُعَاشَرُ الْاَنْبِیَاءِ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً(1) ''ہم جماعت انبیاء سب سے زیادہ مبتلائے بلا ہوتے ہیں۔'' نیز فرمایا: اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَوْلِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ(2) ''سب سے زیادہ مبتلائے بلا انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء پھر جو زیادہ بزرگ ہوتے ہیں اور پھر جو زیادہ بزرگ ہوتے ہیں۔'' الغرض بلا وہ ابتلا ہے جو مومن کے دل و جان پر نازل ہوتی ہے جس کی حقیقت دراصل نعمت حق ہوتی ہے اور بظاہر ایک راز پوشیدہ۔ اس ابتلاء کو برداشت کرنا مومن کیلئے باعث ثواب ہوتا ہے۔ کفار پر نازل ہونے والی مصیبت بلا نہیں ہوتی۔ وہ اُن کی بدبختی ہوتی ہے اور بدبختی سے انہیں نجات حاصل ہوتی ہے۔ بلا کا مقام امتحان سے بلند تر ہے۔ امتحان کا اثر فقط دل پر ہوتا ہے اور بلا کا جسم اور دل دونوں پر، واللہ اعلم بالصواب

1۔ کتاب الزہد 2۔ الجامع الصغیر

تحلی

کسی ستودہ اقوال اور عمدہ خصال قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لَیْسَ الْاِیْمَانُ بِالتَّحَلِّیْ وَالتَّمَنِّیْ لٰکِنْ مَا قَرَّفِی الْقُلُوْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ(1) "مشابہت پیدا کرنے اور کسی جیسا بننے کی تمنا کرنے سے ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ ایمان وہ ہے جو دل میں قرار پائے اور اس کی تصدیق عمل سے کی جائے۔" الغرض اپنے آپ بغیر حقیقی عمل کے کسی جماعت کے ساتھ مشابہت دینا تحلی ہے جو لوگ وہ کچھ دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے بہت جلد رسوائی کا منہ دیکھتے ہیں اور ان کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

تجلی

مقبل دلوں پر انوار حق کا نزول جن کی بدولت ان کے دل کی آنکھ دیدار حق سے بہرہ یاب ہو جاتی ہے۔ اس دلی رویت حق اور عینی رویت میں فرق ہے۔ دلی ردیت پانے والا چاہے تو دیدار حق کرے چاہے نہ کرے یا کبھی کرے اور کبھی نہ کرے۔ عینی رویت میں یہ نہیں ہوگا۔ بہشت میں عینی رویت کے ہنگام اگر دید حق نہ کرنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔ تجلی پر پردہ ہو سکتا ہے رویت پر حجاب روا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

تخلی

تخلی سے مراد ان اشغال سے روگرداں ہونا ہے جو مانع قرب حق ہوں۔ مثلاً دنیا جس سے ہاتھ اٹھا لینا چاہئے۔ عقبیٰ جس کی محبت سے دل خالی ہونا چاہئے۔ خواہش نفس کی پیروی جسے چھوڑ دینا چاہئے۔ صحبت خلق جس سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لینا چاہئے اور اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ واللہ اعلم بالصواب

1۔ الکامل ابن عدی

شرود

آفات، حجابات اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے کو شرود کہتے ہیں۔ طالب حق کی جملہ آفت حجاب سے ہوتی ہے۔ اہل طلب کی کشف حجاب میں کوشش، پردے دور کرنے میں سعی اور اس مقصد کے لئے ان کا وسائل سے تعلق سب کچھ شرود کے تحت آتا ہے جو طالب حق ابتدا میں زیادہ بے قرار ہو وہ انتہا میں زیادہ صاحب تمکین ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مقصود

مقصود سے مراد طلب حقیقت کے لئے صحیح قصد کرنا ہے۔ اہل حقیقت کا قصد حرکت و سکون سے بے نیاز ہونا ہے۔ طالب حق حالت سکون میں بھی صاحب قصد ہوتا ہے۔ یہ چیز عام قاعدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہر قاصد کے لئے یا ظاہر قاصد ہونے کا اثر ہوتا ہے یا باطن میں کوئی نشان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوستان حق بغیر سبب کے صاحب طلب ہوتے ہیں اور بغیر حرکت کے صاحب قصد۔ ان کی تمام صفات قصد ہوتی ہیں۔ وہ انتہائی قصد کرتے ہیں اور جب دوستی حاصل ہو تو ہمہ تن قصد ہوتی ہے۔

اصطناع

اس سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کی تہذیب نفس کے لئے اس کے جملہ نصیب کو ختم کر دے اور اس کی تمام لذات نفسانی پر زوال مسلط کر دے۔ بندے کے نفسانی اوصاف تغیر پذیر ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی صفات کے زوال اور تغیر سے متاثر ہو کر بے خود ہو جاتا ہے۔ یہ درجہ صرف پیغمبروں کے لئے ہے مگر بعض مشائخ اولیائے کرام کے لئے بھی روا سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

اصطفاء

اصطفاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ کے دل کو اپنی معرفت کے لئے مخصوص کر کے نور معرفت سے معمور کر دے۔ اس درجہ کے لئے خاص و عام، مومن، گنہ گار، طاعت گزار،

ولی، نبی سب برابر ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (الفاطر:32) ''پھر ہم نے برگزیدہ لوگوں کو کتاب دی ان میں سے کچھ ظالم ہیں، کچھ میانہ رو اور کچھ نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔

اصطلام

تجلی حق کا غلبہ جو کسی لطیف ابتلا کے ذریعہ انسانی ارادہ کو کالعدم کر دیتا ہے۔ قلب ممتحن (دل آزمودہ) اور قلب مصطلم (دل برباد) کے معانی ایک ہیں۔ گو صوفیاء عام طور پر اصطلام کو زیادہ خاص اور لطیف امتحان تصور کرتے ہیں۔

رین

یہ ایک قسم کا حجاب دل ہے جو ایمان کے سوا کسی چیز سے دور نہیں ہوتا۔ یہ کفر اور ضلالت کا پردہ ہے حق تعالیٰ نے کفار کی نسبت فرمایا: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ (المطففین) ''ایسا نہیں بلکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ ان کے دلوں پر ایک قسم کا زنگ (حجاب) ہو گیا ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ رین وہ حجاب ہے جو کسی طرح دور نہیں ہوسکتا کیونکہ کافر ایمان قبول نہیں کرتا اور جو کرتا ہے وہ علم الٰہی میں مومن ہی ہوتا ہے۔

غین

ایسا حجاب جو توبہ سے دور ہو جائے یہ خفیف بھی ہوسکتا اور غلیظ بھی۔ غلیظ حجاب اہل غفلت اور کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہونے والوں پر ہوتا ہے۔ حجاب خفیف سب کے لئے ہوسکتا ہے ولی ہو یا نبی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَاِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ(1) ''میرے دل پر خفیف سا پردہ آ جاتا ہے اور میں دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔'' حجاب غلیظ کے لئے توبہ اور حجاب خفیف کے لئے رجوع الی اللہ

1۔ صحیح مسلم

کی ضرورت ہوتی ہے۔ توبہ کا مطلب معاصی سے بندگی کی طرف پلٹنا ہے اور رجوع کا مطلب اپنے آپ سے حق تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے توبہ جرم سے ہوتی ہے جرم عام بندوں کے لئے احکام حق کی خلاف ورزی کا نام ہے اور دوستان حق کے لئے مرضی حق کی مخالفت کا۔ عوام کا گناہ نافرمانی ہے اور دوستان حق کا گناہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنی ہستی کا احساس ہو۔ اگر کوئی شخص غلط کاری کو چھوڑ کر راہ راست اختیار کرے تو اسے تائب (توبہ کرنے والا) اور اگر کوئی خوب سے خوب تر کی طرف رجوع کرے تو اسے آئب کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ باب توبہ میں بیان ہو چکا ہے۔

تلبیس

کسی چیز کو اس کی حقیقت سے مختلف پیش کرنے کو تلبیس کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ وَلَلَبَسۡنَا عَلَيۡهِم مَّا يَلۡبِسُونَ ۞ (الانعام) ''تحقیق ہم ان پر وہ شبہ ڈالتے ہیں جو وہ شبہ کرتے ہیں۔'' یہ صفت بجز ذات حق کے کسی کو زیبا نہیں جو کافر کو بصورت مومن اور مومن کو بصورت کافر رکھتی ہے جب تک اظہار حقیقت کا وقت نہیں آتا۔ صوفیاء میں سے جب کوئی اچھی خصلتوں کو مذموم خصائل سے چھپاتا ہے تو کہتے ہیں وہ تلبیس کر رہا ہے۔ اس صورت کے سوا کسی اور جگہ اس لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ ریا اور نفاق کو تلبیس نہیں کہتے حالانکہ دراصل تلبیس وہی ہے۔ تصوف میں تلبیس صرف فعل حق کی اقامت کے لئے مستعمل ہے۔

شرب

صوفیائے کرام بندگی کی مٹھاس، مکرمت کی لذت اور محبت کی راحت کو شرب کا نام دیتے ہیں۔ بغیر لذت شرب کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جسم کے لئے شرب پانی سے ہے اور دل کے لئے راحت وحلاوت سے۔ میرے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ بے شرب مرید اور باشرب عارف ارادت اور معرفت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ مرید کے لئے شرب ضروری ہے تاکہ وہ ارادت میں حق طلب بجالائے۔ عارف کے لئے شرب کی ضرورت نہیں۔ مبادا بدون حق

اسے کسی چیز سے شرب حاصل ہو اور وہ شراب اگر نفس سے تعلق رکھے تو وہ (عارف) اقرب حق سے محروم ہو جائے۔

ذوق

ذوق بھی شرب کی طرح ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ شرب صرف راحت و لذت کے لئے مستعمل ہے اور ذوق راحت و رنج دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی عارف نے کہا ہے ذقت الخلاف و ذقت البلاء و ذقت الراحة ''میں نے مٹھاس چکھی میں نے رنج و راحت کا مزہ چکھا۔'' شرب سے متعلق کہاشربت بکأس الوصل و بکأس الود ''میں نے وصل و محبت کا ساغر پیا'' وغیرہ۔ جب حق تعالیٰ نے شرب کا ذکر کیا تو فرمایا، كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ (المرسلات) ''کھاؤ پیو دل پسند اشیاء یہ اجر ہے ان اعمال کا جو تم کرتے رہے ہو۔'' ذوق کا ذکر کیا تو فرمایا: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾ (الدخان) ''چکھ! تحقیق تو کریم اور غالب ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا، ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ (القمر) ''دوزخ کا عذاب چکھو''۔

یہ تھے صوفیاء میں مروجہ اصطلاحات کے احکام اور معانی۔ اگر سبب بیان کروں تو کتاب طویل ہونے کا احتمال ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

گیارہواں کشف حجاب، سماع

ظاہر ہے کہ حصول علم کے لئے پانچ ذرائع ہیں۔ سننا، دیکھنا، چکھنا، سونگنا اور چھونا۔ یہ حق تعالیٰ کے عطا کردہ پانچ دروازے ہیں جن کے ذریعہ ہر قسم کا علم انسانی باطن میں داخل ہوتا ہے۔ آواز اور خبر کا تعلق سننے سے ہے۔ مختلف رنگوں اور اجسام کا دیکھنے سے تلخ و شیریں کا چکھنے سے، بو اور خوشبو کا سونگھنے اور سختی و نرمی کا چھونے سے۔ ان پانچ حواس میں سے چار کے لئے اپنا اپنا مخصوص مقام ہے اور ایک حس ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ سننے کا مقام کان میں دیکھنے کا آنکھ، چکھنے کا کام دہن اور سونگھنے کا ناک۔ مگر چھونے کی حس تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہے۔ آدمی صرف آنکھ سے دیکھتا ہے کان سے سنتا ہے۔ ناک سے سونگھتا ہے اور کام

دہن سے چکھتا ہے۔ مگر چھونے کے معاملے میں اس کا سارا جسم سرد و گرم اور سخت و نرم میں تمیز کر سکتا ہے از روئے قیاس یہ ممکن ہے کہ جس طرح قوت لامسہ سارے اعضاء میں موجود ہے اس طرح باقی حواس و قویٰ بھی سارے اعضاء میں پائے جائیں۔ لیکن فرقہ معتزلہ کے نزدیک ہر حس اپنے مخصوص مقام کے سوا کسی دوسرے عضو میں نہیں ہو سکتی۔ معتزلہ کے اس خیال کی تردید میں چھونے کی حس کا حوالہ کافی ہے۔ اگر پانچ حواس میں سے ایک یعنی لمس کا کوئی مخصوص مقام نہیں تو یہی چیز باقی چار حواس کے لئے بھی روا ہو سکتی ہے بہر حال یہ موضوع بحث نہیں تاہم اس قدر بیان کر دینا ضروری تھا۔

ایک حس یعنی سماعت کو چھوڑ کر باقی چار حواس میں سے ایک حس دیکھتی ہے۔ دوسری سونگھتی ہے۔ تیسری چکھتی ہے اور چوتھی چھوتی ہے۔ اس عجائب خانہ کائنات کو دیکھ کر خوش آئند اشیاء کو سونگھ کر، عمدہ نعیم کو چکھ کر اور نرم و ملائم چیزوں کو چھو کر عقل کی رہنمائی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں اور ان حواس کے ذریعہ عقل کے سامنے روشن ہو جاتا ہے کہ کائنات حادث ہے کیونکہ اس میں تغیر و تبدل رونما ہوتا رہتا ہے اور تغیر و تبدل حادث ہونے کی دلیل ہے۔ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو اس کا جز نہیں کیونکہ تمام عالم مکون (تکوین دیا گیا) ہے اور مکون (تکوین دینے والا) خالق اکبر ہے۔ کائنات عالم اجسام ہے اور اس کی ذات پاک مجسم کرنے والی ہے حق تعالیٰ قدیم ہے اور تمام کائنات حادث۔ اس کی ذات لامتناہی ہے اور تمام عالم متناہی۔ وہ قادر مطلق ہے۔ علیم ہے۔ ہر جگہ اسی کا تصرف ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اسی نے آیات صادقہ دے کر پیغمبر بھیجے مگر ان پیغمبروں پر ایمان اس وقت لازم ہوا جب معرفت حق کے کلمات اور باقی احکامات شرع و دین ان کی زبان سے گوش سماعت نے سنے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت و جماعت سماعت کو دیکھنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے سماعت سننے کا مقام ہے اور دیکھنا نظر کا۔ دیدار حق اس کا کلام سننے سے افضل تر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ از روئے احادیث نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) بہشت میں مومنوں کو دیدار حق ہوگا۔ دیدار کی عقلی دلیل کشف سے بہتر نہیں ہو سکتی ہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن لیا

کہ بہشت میں رویت حق ہوگی اور نگاہوں کے حجاب اٹھ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سننا دیکھنے سے افضل تر ہے۔ علاوہ ازیں احکامات شرعی سماعت پر منحصر ہیں۔ وہ قائم ہی سماعت پر ہیں۔ جملہ انبیائے علیہم السلام نے پیغام حق زبانی دیا اور جنہوں نے سنا وہ گرویدہ ہوگئے۔ پھر ظہور معجزات ہوا اور معجزات کے دیکھے جانے کا علم بھی سننے ہی سے ہوا۔

ان دلائل کے ہوتے ہوئے جو افضلیت سماعت کا انکار کرتا ہے وہ یقیناً تمام شریعت کا منکر ہے اور احکام کو دیدہ و دانستہ چھپانے والا ہے اب میں سماع سے متعلق جملہ امور مختصراً معرض بیان میں لاتا ہوں۔ ان شاء اللہ العزیز

تیسواں باب

قرآن حکیم کا سننا اور متعلقات

قابل سماعت چیزوں میں دل کے لئے فوائد میں باطن کے لئے زوائد میں اور کانوں کے لئے لذت میں ترین مقام حق تعالیٰ عز اسمہ کے کلام پاک کا ہے۔ سب اہل ایمان کو قرآن حکیم سننے کا حکم ہے اور سب کفار اور جن کلام حق سننے کے لئے مکلّف ہیں۔ مجملہ معجزات قرآن پاک کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اسے پڑھ کر طبیعت ملول نہیں ہوتی۔ اس میں انتہا درجہ کی رقت ہے۔ کفار قریش رات کے وقت چھپ کر آتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوت فرماتے ہوئے سنتے تھے اور متعجب ہوتے تھے۔ مثلاً نضر بن حارث جو اپنے زمانے میں نہایت فصیح تسلیم کیا جاتا تھا، عتبہ بن ربیع جو بلاغت کے لحاظ سے جادو بیان تھا اور ابو جہل بن ہشام جو خطابت اور منطق میں ید طولیٰ رکھتا تھا وغیرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک رات کوئی سورت تلاوت فرمار ہے تھے۔ عتبہ بے خود ہو گیا اور ابو جہل سے بولا یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا۔ حق تعالیٰ نے جنوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا انہوں نے کلام حق سنا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا۔ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝١ (الجن) ''جنوں نے کہا ہم نے عجیب وغریب کلام سنا۔'' پھر باری تعالیٰ نے جنوں کا یہ قول بیان فرمایا کہ قرآن روحانی بیماریوں میں مبتلا دلوں کی حق تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝٢ (الجن) ''یہ قرآن نیکی کی راہ دکھاتا ہے۔ ہم ایمان لائے اور کسی کو حق تعالیٰ کا شریک نہیں بنائیں گے۔'' پس قرآن کی ہر نصیحت جملہ نصیحتوں سے بہتر ہے۔ اس کا ہر لفظ جملہ الفاظ سے زیادہ بلیغ ہے اس کا ہر حکم جملہ احکام سے زیادہ لطیف ہے۔ اس کی ہر نہی جملہ منہیات سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس کا ہر وعدہ جملہ وعدوں سے زیادہ دل کش ہے۔ اس کا خوف ہر خوف سے زیادہ جاں گداز ہے۔ اس کا ہر قصہ جملہ قصص سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ اس کی ہر مثال جملہ امثال سے زیادہ فصیح ہے۔ ہزاروں دل اس کا

شکار ہیں۔ ہزاروں جانیں اس کے لطیف مضامین کے تاثر سے پامال بلا ہیں۔ ذلیل کو عزت اور عزیز کو ذلت دیتا ہے۔

قبول اسلام سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۔نے جب یہ سنا کہ ان کی بہن اور ان کا بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں تو طیش میں آ کر تلوار کھینچ لی اور محبت کو بالائے طاق رکھ کر ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ حق تعالیٰ نے سورہ طٰہ کے پردہ میں ان کی گھات میں لشکر بٹھا رکھا تھا آپ جب ہمشیرہ کے دروازے پر آئے تو وہ پاک دامن سورہ طٰہ کی یہ ابتدائی آیت پڑھ رہی تھی، طٰهٰ ۝١ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝٣ (طٰہٰ) ''اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ اس کی وجہ سے تو مشقت اٹھائے۔ یہ ڈرنے والوں کے لئے پیغام ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جان کلام کی باریکیوں کا شکار ہو گئی اور آپ کا دل لطیف ئق میں کھو گیا۔ صلح کا راستہ اختیار کیا۔ عداوت کا جامہ اتار پھینکا۔ مخالفت سے دستبردار ہو کر موافقت پر اتر آئے۔

مشہور ہے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی تو آپ بے ہوش ہو گئے: اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝١٢ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝١٣ (المزمل) ''ہمارے پاس طوق و سلاسل اور آتش جہنم ہے۔ گلے میں اٹک جانے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب یہ آیت پڑھی گئی تو آپ نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ آپ کو اٹھا کر گھر پہنچایا اور آپ کامل ایک ماہ تک صاحب فراش رہے۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝٧ (الطور) بے شک تیرے رب کا عذاب ضرور آئے گا۔

کہتے ہیں کسی شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی، لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (الاعراف:71) ''کفار کے لئے آتش جہنم کے بستر اور اسی کے بالا پوش ہوں گے۔'' آپ رونے لگے۔ راوی کہتا ہے کہ میں سمجھا شاید انتقال کر گئے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے بیٹھنے کی درخواست کی تو

فرمایا اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے نہیں دیتی حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴿۲﴾ (الصف) ''اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔'' تو آپ نے فرمایا: بار خدایا! ہم جو کچھ کہتے ہیں تیرے حکم سے کہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں تیری توفیق سے کرتے ہیں۔ ہمارا قول و فعل کہاں۔''

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مشہور ہے کہ کسی نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ (الکہف:24) ''یاد کرا اپنے رب کو جب تو بھول جائے۔'' آپ نے فرمایا۔ ذکر کی شرط بھول جانا ہے۔ (اپنے آپ کو) اور سارا عالم ذکر میں ناکام ہے۔ یہ کہا اور نعرہ مار کر بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا مجھے حیرت ہے ایسے دل پر جو کلام حق سن کر اپنی جگہ برقرار رہے اور اس جان پر جو کلام حق سن کر نکل نہ جائے۔ ایک بزرگ سے روایت ہے کہ وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے: وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ (البقرہ:281) ''ڈرو! اس دن سے جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' ہاتف غیب کی آواز آئی۔ آہستہ پڑھو اس آیت کی ہیبت سے چار پریاں جاں بحق ہو گئی ہیں۔ ایک درویش نے کہا میں نے گذشتہ دس برس میں صرف اتنا قرآن پڑھا یا سنا ہے۔ جتنا نماز کے لئے ضروری ہے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا اس خوف سے کہ مجھ پر اتمام حجت نہ ہو جائے۔

میں ایک روز شیخ ابو العباس رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ (النحل:75) ''حق تعالیٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے جو کسی اور کی ملکیت ہے اور اسے کسی کام کی قدرت نہیں''۔ میں یہ سمجھا کہ آپ انتقال فرما گئے ہیں۔ ہوش میں آئے تو میں نے پوچھا محترم یہ کیا حالت ہے؟ آپ نے فرمایا گذشتہ گیارہ سال سے میرا ورد اسی آیت تک پہنچا ہے اور میں اس سے آگے نکل نہیں سکا۔

میں نے حضرت ابو العباس عطار رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھتے

ہیں؟ فرمایا پہلے شبانہ روز دو بار قرآن ختم کیا کرتا تھا۔ اب چودہ برس میں سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔

سنا ہے حضرت ابوالعباس قصاب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قاری سے قرآن پڑھنے کو کہا۔ اس نے پڑھا: يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ (یوسف:88) "اے عزیز! (مصر) ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو فاقہ کشی نے تنگ کر رکھا ہے اور ہم قلیل سرمایہ لے کر آئے ہیں۔" آپ نے فرمایا اور پڑھو۔ قاری نے پڑھا، اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (یوسف:77) "انہوں (یوسف علیہ السلام کے بھائیوں) نے کہا اگر اس (بن یامین) نے چوری کی ہے تو کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ اس کا بھائی بھی پہلے چوری کر چکا ہے۔" ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور پڑھو۔ قاری نے پڑھا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ (یوسف:92) "آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے۔" اس کے بعد آپ نے دعا کی بار خدایا! میں ظلم میں یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں سے کم نہیں تو کرم میں یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہے میرے ساتھ وہ کر جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا۔

بایں ہمہ سب مسلمانوں کے لئے اطاعت پذیر ہوں یا گناہ گار، قرآن حکیم سننے کا حکم ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا، وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ (الاعراف) "جب قرآن پڑھا جارہا ہو تو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم رحم کے مستحق بنو۔" جس حال میں کوئی قرآن پڑھے لوگوں کو خاموشی اور توجہ سے سننے کا حکم دیا اور نیز فرمایا: فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ (الزمر) "تو آپ ان لوگوں کو خوشخبری دیں جو کلام سنتے ہیں اور احسن چیزوں پر عمل کرتے ہیں"۔ یعنی اوامر بجالاتے ہیں۔

نیز فرمایا، اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال:2) "وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو تو ان کے دل خوف زدہ ہو جائیں پھر فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (الرعد) "ایمان والے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے

مطمئن ہوتے ہیں اور یاد رکھو دلوں کو اطمینان صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔'' ایسی اور بہت سی آیات ہیں جو اس بات پر زور دیتی ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو کلام حق کو کما حقہٗ نہیں سنتے اور کانوں سے دل میں نہیں اتارتے۔ چنانچہ فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ٘ (البقرہ:7) ''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔'' نیز فرمایا کہ اہل جہنم یوں کہیں گے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ (الملک) ''اگر ہم (دنیا میں) قرآن کو سنتے اور سمجھتے تو آج جہنم میں نہ ہوتے۔'' پھر فرمایا، وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (الانعام:25) ''ان میں سے کچھ لوگ سنتے ہیں مگر ان کے دلوں پر پردے ہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں پاتے ان کے کان بہرے ہیں۔'' پھر فرمایا۔ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝ (الانفال) ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں ہم نے سنا مگر وہ نہیں سنتے۔'' ایسی اور بہت سی آیات ہیں۔

روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا'' مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ'' حضرت عبداللہ نے عرض کی'' قرآن تو آپ پر نازل ہوا ہے۔ میں آپ کو کیا سناؤں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَنَا اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَ مِنْ غَیْرِیْ (1) میں دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ سننے والا اپنے حال میں پڑھنے والے سے کامل تر ہوتا ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں دوسرے آدمی سے سننا پسند کرتا ہوں''۔ قاری'' حال'' یا'' غیر حال'' کے عالم میں پڑھتا ہے مگر سننے والا ہمیشہ'' عالم حال'' میں سنتا ہے۔ بولنے میں ایک قسم کے تکبر کا شائبہ ہوتا ہے اور سننے میں تواضع کا پہلو۔

نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَةُ هُوْدٍ (2) ''مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔'' کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اس لئے فرمایا کہ سورۂ ہود کے آخر میں یہ کلمات

1۔ ترمذی: الشمائل المحمدیہ 2۔ مسند بزار۔

ہیں۔ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (ہود:112) "ثابت قدم رہو جیسا کہ حکم دیا گیا ہے۔" آدمی امورِ حق پر ثابت قدمی کے معاملے میں عاجز ہے کیونکہ وہ توفیق خداوندی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب حکم ہوا کہ "ثابت قدم رہو" تو آپ متحیر ہوئے کہ اس حکم پر کس طرح قائم رہا جائے۔ اس کلفت کی وجہ سے قوت جواب دینے لگی اور کلفت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک روز آپ کھڑے ہونے لگے تو ہاتھ زمین پر ٹیک کر زور لگایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا آپ تو ابھی جوان اور تندرست ہیں۔ آپ نے فرمایا: سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا اس کے مذکورہ احکام نے مجھے اتنا خوف زدہ کیا ہے کہ میری قوت جواب دے گئی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے،

كُنْتُ فِيْ عِصَابَةٍ فِيهَا ضُعَفَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ وَاِنَّ بَعْضَهُمْ يَسْتُرُ بَعْضًا مِنَ الْعُرْيِ وَقَارِئٌ يَقْرَءُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَسْتَمِعُ لِقِرَاْتِهٖ وَ قَالَ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى قَامَ عَلَيْنَا فَلَمَّا رَاٰهُ الْقَارِئُ سَكَتَ قَالَ فَسَلَّمَ فَقَالَ مَاذَا كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَانَ قَارِئٌ يَقْرَءُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ نَسْتَمِعُ لِقِرَاْتِهٖ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ اُمِرْتُ اَنْ اَصْبِرَ نَفْسِيْ مَعَهُمْ قَالَ ثُمَّ جَلَسَ وَسْطَنَا لِيَعْدِلَ نَفْسَهٗ فِيْنَا ثُمَّ قَالَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا فَتَحَلَّقَ الْقَوْمُ فَلَمْ يَعْرِفْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ اَحَدٌ قَالُوْا وَكَانُوْا ضُعَفَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْشِرُ صَعَالِيْكَ الْمُهَاجِرِيْنَ بِالْفَوْزِ التَّامِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِيَائِكُمْ بِنِصْفِ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسَ مِائَةِ عَامٍ(1)

1۔ سنن دارمی میں شاہد ہے

''میں صحابہ کرام کی ایک جماعت میں بیٹھا تھا جو کمزور اور لاغر مہاجرین پر مشتمل تھی۔ برہنگی سے بچنے کے لئے سب ایک دوسرے کو پردہ کئے ہوئے تھے۔ قاری قرآن پڑھ رہا تھا اور ہم سن رہے تھے کہ اچانک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے قاری خاموش ہو گیا۔ آپ نے سلام کر کے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ ہم نے جواب دیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پڑھا جا رہا تھا اور ہم سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے میری امت میں ایسے آدمی شامل ہیں جن کے ساتھ میں صبر کرنے پر مامور ہوں۔ اس کے بعد آپ ان کے درمیان تشریف فرما ہوئے۔ اس طرح کہ آپ خصوصیت سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک حلقہ میں سب برابر ہو گئے۔ پھر فرمایا اے گروہ مہاجرین! روز قیامت تمہیں کامرانی کی بشارت دیتا ہوں۔ تم لوگ بہشت میں اپنے دولت مند بھائیوں سے نصف دن پہلے داخل ہو جاؤ گے اور نصف دن پانچ سو سال کے برابر ہو گا۔

مندرجہ بالا حدیث کچھ اختلاف سے بھی مروی ہے مگر یہ اختلاف صرف لفظی ہے معنوی لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔

فصل: قرآن کی جلالت

زرارہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ایک مرتبہ آپ امامت فرما رہے تھے۔ آپ نے ایک آیت پڑھی جس کے جلال کی تاب نہ لا کر ایک چیخ ماری اور جاں بحق ہو گئے۔

حضرت ابو جمیر رحمۃ اللہ علیہ بزرگ تابعین میں شامل تھے۔ آپ کے سامنے ایک آیت پڑھی گئی تو آپ چیخ مار کر رحلت فرما گئے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ نواح کوفہ میں ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ ایک عورت کو نماز میں کھڑی دیکھا۔ اس پر نیکی کے آثار نمایاں تھے جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو ابراہیم نے تکریما سلام کیا۔ عورت نے پوچھا کیا تم قرآن جانتے ہو؟ جواب دیا ہاں۔ کہا کچھ پڑھو۔

ابراہیم نے ایک آیت پڑھی۔ عورت نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

احمد بن ابی الحواری رحمۃ اللہ علیہ نے صحرا میں ایک نوجوان کو دیکھا جو موٹے کپڑے کی گدڑی پہنے ایک کنویں پر کھڑا تھا۔ نوجوان نے کہا اے احمد! وقت پر آ گئے۔ مجھے اس وقت سماع کی ضرورت ہے تاکہ جان سپرد حق کر سکوں۔ حضرت احمد کو اشارۂ حق ہوا اور انہوں نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (الا ف:13) ''تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے اور اس پر استقامت کی۔'' جوان نے کہا بخدا آپ نے وہی آیت پڑھی جو اس وقت فرشتے میرے سامنے پڑھ رہے تھے یہ کہا اور جاں بحق تسلیم ہو گیا۔

اس موضوع پر اور بھی بہت کچھ ہے۔ سب کچھ بیان کروں تو مقصد فوت ہو جائے گا اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

اکتیسواں باب

شعر سننا اور متعلقات

شعر سننا مباح ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشعار سنے ہیں۔ صحابہ کرام نے بھی اشعار سنے ہیں اور کہے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً(1) ''بلاشبہ بعض اشعار حکمت ہیں۔'' نیز فرمایا، اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَاَ حَقُّ بِهَا(2) ''حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ جہاں ملے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔'' یہاں شعر سے مراد وہ شعر ہے جس میں حکمت ہو اور حکمت مومن کا حق ہے جہاں بھی ہو۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَتْهَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِيْدٍ ''اہل عرب میں سب سے سچا کلام لبید شاعر کا یہ قول ہے۔

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ   وَمَا كُلُّ نَعِيْمٍ لَا مُحَالَةَ زَائِلٌ

''سنو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر نعمت رو بہ زوال ہے۔''

عمرو بن شرید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، قَالَ اِسْتَنْشَدَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَرْوِیْ مِنْ شِعْرِ اُمَيَّةَ بْنِ اَبِی الصَّلْتِ شَيْئًا فَاَنْشَدْتُهُ مِائَةَ قَافِيَةٍ كُلَّمَا مَرَرْتُ عَلٰى بَيْتٍ قَالَ هِيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادَ اَنْ يُسْلِمَ فِیْ شِعْرِهٖ(3) ''رسول حق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے شعر پڑھنے کا حکم دیا اور پوچھا کیا امیہ ابن ابی الصلت کے اشعار سنا سکتے ہو؟ میں نے سو شعر سنائے۔ ہر شعر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے اور سناؤ۔ آخر میں فرمایا امیہ اپنے اشعار میں قریب قریب مسلمان تھے۔'' آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام سے ایسی کئی روایات ہیں۔ مگر عام لوگوں میں کچھ غلط فہمیاں موجود ہیں۔ ایک جماعت ہر قسم کے اشعار سننا حرام سمجھتی ہے

1۔ صحیح مسلم   2۔ الادب المفرد، الشمائل المحمدیہ   3۔ الجامع الصغیر

اور اسی بناء پر باقی برادران اسلام پر نکتہ چینی میں مصروف رہتی ہے۔ دوسری جماعت ہر قسم کے اشعار کو جائز سمجھتی ہے اور شبانہ روز حسن محبوب اور زلف جاناں پر غزل سرائی میں مشغول رہتی ہے۔ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کرتی ہیں۔ میرا مقصد ان کی تردید یا تائید نہیں۔ میں اس قدر کافی سمجھتا ہوں۔ صوفیائے کرام کا طریق الگ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شعر کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: كَلَامٌ حُسْنُهُ حَسَنٌ وَ قُبْحُهُ قَبِيحٌ "شعر وہ کلام ہے کہ اس کا مضمون اچھا ہو تو شعر اچھا ہے اور برا ہو تو شعر برا ہے یعنی جس چیز کو نثر میں سننا حرام ہے مثلاً غیبت، بہتان، فواحش، الزام تراشی اور کلمات کفر، اس کا نظم میں سننا بھی حرام ہے۔ جس چیز کو نثر میں سننا حلال ہے۔ مثلاً وعظ و حکمت، آیات حق میں استدلال، شواہد حق پر تبصرہ اسے نظم میں بھی سننا مباح ہے۔ الغرض جس طرح ایسے حسن و جمال کو دیکھنا جو محل آفت ہو، حرام و ممنوع ہے۔ بالکل اسی طرح ایسے حسن و جمال سے متعلق نظم و نثر میں سننا بھی حرام و ممنوع ہے اور اس کی تعریف سننا بھی حرام ہے۔ جو تعریف سننے کو حلال مطلق سمجھتا ہے اسے لازماً دیکھنے اور چھونے کو بھی حلال سمجھنا چاہئے اور یہ صریح کفر و بے دینی ہے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میں چشم و گیسو اور خد و خال کی تعریف میں صدائے حق سنتا ہوں اور حق کا طالب ہوں تو دوسرا کہہ سکتا ہے کہ میں ان چیزوں کو دیکھنے میں صرف حق کو دیکھتا ہوں اور اسی کا طالب ہوں کیونکہ آنکھ اور کان دونوں محل آفت اور منبع علم ہیں اسی طرح ایک تیسرا کہہ سکتا ہے کہ میں حسین جسم کو چھوتا ہوں کیونکہ اور لوگ اس کو دیکھنے اور سننے کو جائز سمجھتے ہیں۔ میں بھی طالب حق ہوں۔ سب حواس ادراک معانی میں برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح شریعت کلیتہً باطل ہو جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان اَلْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ "دونوں آنکھیں مرتکب زنا ہوتی ہیں۔" ختم ہو جائے گا۔ نامحرموں کو چھونے پر بھی کوئی ملامت نہ رہے گی اور شرعی حدود ساقط ہو جائیں گی۔ یہ صریح گمراہی کا مقام ہے۔

جب جاہل لوگ حال مست سماع کرنے والے صوفیاء کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شائد

یہ لوگ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے بھی سماع کو جائز سمجھ لیا اور کہا کہ اگر جائز نہ ہوتا تو صوفی لوگ اختیار نہ کرتے۔ جہلاء نے تقلید میں صوفیاء کے ظاہر کو اختیار کر لیا اور باطن سے کنارہ کش رہے اور اس طرح خود بھی ہلاک ہوئے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا۔ یہ اس زمانے کی سب سے بڑی آفت ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی پوری تشریح آئے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ

بتیسواں باب

سماع اصوات ونغمات

پیغمبر ﷺ نے فرمایا، زَیِّنُوْا اَصْوَاتِکُمْ بِالْقُرْاٰنِ(1) ''قرآن پڑھتے وقت اپنی آوازوں کو سنوارو۔'' باری تعالیٰ نے فرمایا: یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (الفاطر:1) ''وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔'' تفسیر کرنے والے اس سے مراد عمدہ آواز لیتے ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مَنْ اَرَادَ اَنْ لَّیَسْمَعَ صَوْتَ دَاوٗدَ فَلْیَسْبَحْ صَوْتَ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ(2) ''جو حضرت داؤد کی آواز سننے کی تمنا رکھتا ہو وہ ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنے۔'' احادیث میں ہے کہ اہل بہشت کے لئے روضہ بہشت میں سماع ہوگا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہر درخت سے اصوات ونغمات سنائی دیں گے۔

جب مختلف قسم کی آوازیں باہم ملتی ہیں تو طبیعتوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ سماع انسانوں اور حیوانوں میں عام ہے۔ روح ایک لطیف چیز ہے۔ سریلی آوازمیں بھی صد گونہ لطافت ہوتی ہے۔ جب روح ایک سریلی آواز کو سنتی ہے تو جنسی میلان (لطافت کا لطافت کی طرف) رونما ہوتا ہے۔ اطباء اور دیگر مدعیان تحقیق نے اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے اور صوت و آہنگ پر ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کے آثار فن آج ہمارے سامنے گانے بجانے کے آلات کی صورت میں موجود ہیں جو لوگوں نے ہواو ہوس اور لہو ولعب کی طلب کی تسکین کے لئے شیطانی روش پر وضع کئے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ اسحاق موصلی رحمۃ اللہ علیہ ایک باغ میں گا رہے تھے۔ ایک بلبل نغمہ سرا ان کی راگنی سن کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر سنتا رہا۔ پھر تڑپ کر درخت سے نیچے گرا اور مر گیا۔ اس قسم کی اور کئی حکایات ہیں۔ مقصود بیان کرنا صرف اس امر کا ہے کہ الحان وسرود جملہ

1۔ المستدرک، مسند دارمی	2۔ صحیح بخاری ومسلم

جانداروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار عرب کے ایک قبیلہ کے سردار کے ہاں مہمان تھا۔ ایک حبشی کو دیکھا طوق وزنجیر میں جکڑا ہوا خیمے کے دروازے پر دھوپ میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے ترس آیا۔ ارادہ کیا کہ سردار سے اس کی سفارش کروں۔ چنانچہ جب کھانا سامنے آیا اور سردار تکریماً خود بھی شریک طعام ہونے کے لئے آ گیا تو میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ عربوں کے نزدیک یہ چیز سخت ناگوار ہے۔ سردار نے انکار کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا میرا انکار اس امید کرم کی بناء پر ہے جو میں سردار سے رکھتا ہوں۔ جواب ملا: ''میرا سب مال ومتاع حاضر ہے کھانے سے انکار نہیں ہونا چاہئے۔'' میں نے کہا مجھے مال ومتاع کی ضرورت نہیں صرف یہ غلام چاہئے۔ سردار نے کہا ''پہلے اس کا جرم سمجھ لو پھر غلام کو چھوڑ دیا جائے گا۔ غلام کیا سب املاک تمہارے قبضہ اختیار میں ہے۔'' میں نے جرم پوچھا تو سردار نے بیان کیا۔ یہ غلام حدی خوان ہے اور نہایت درجہ خوش الحان ہے۔ میں نے اسے کچھ اونٹ دیکر غلہ لادلانے کو بھیجا۔ اس نے ہر اونٹ پر دو اونٹوں کا بوجھ لاد دیا۔ راستہ بھر حدی خوانی کرتا رہا اور اونٹ دوڑتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ یہاں آ گیا۔ جب بوجھ اتارا گیا تو سب اونٹ ایک ایک کر کے ہلاک ہو گئے۔ مجھے سخت تعجب ہوا اور میں نے کہا سردار! یقیناً یہ سچ ہے۔ مگر مجھے اس کا ثبوت چاہئے۔ ہم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ چند اونٹ صحرا سے کنوئیں پر پانی پینے کے لئے آئے۔ شتربانوں کے بیان کے مطابق یہ اونٹ تین روز سے پیاسے تھے۔ سردار نے حبشی غلام کو حدی خوانی کا حکم دیا۔ اونٹ اس کی آواز سن کر ایسے ہوئے کہ کسی نے پانی کو منہ تک نہ لگایا اور تھوڑی ہی دیر میں جنگل میں منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد سردار نے غلام کو مجھے دے دیا۔

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شتربان اور گدھوں والے گاتے ہیں تو ان کے جانوروں پر سرور کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ خراسان اور عراق میں رات کے وقت ہرن پکڑنے والے ایک طشت بجاتے ہیں۔ ہرن اس کی آواز سن کر اپنی جگہ ساکت ہو جاتے ہیں اور پکڑ لئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہرن کے شکاری جنگل میں گاتے ہیں۔ ہرن سریلی آوازوں

کے کیف میں جھوم کر ان کی طرف آتے ہیں۔ شکاری ان کو گھیرے میں لے کر گاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہرن آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں اور پکڑ لئے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچے گہوارے میں رو رہے ہوں اور کوئی انہیں سریلی آواز میں لوری سنائے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں اور لوری سنتے ہیں۔ اطبا ایسے بچوں کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ صحیح الحس ہیں اور بڑے ہو کر زیرک و صاحب فہم ہوں گے۔

کہتے ہیں ایران کا کوئی بادشاہ وفات پا گیا۔ اس کا بچہ صرف دو سال کا تھا۔ وزراء نے ارادہ کیا کہ بچے کو تخت نشین کر دیا جائے۔ حکیم بزرجمہر سے مشورہ کیا گیا اس نے کہا ٹھیک ہے مگر دیکھنا چاہئے کہ یہ صحیح الحس ہے یا نہیں؟ وزراء نے تدبیر پوچھی۔ بزرجمہر کے حکم کے مطابق گویوں نے گانا شروع کیا۔ بچہ سرور میں آکر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ بزرجمہر نے کہا: اس بچے سے مملکت کی خیر و فلاح کی توقع رکھنی چاہئے۔ الغرض نغمات کا تاثر حکماء کے نزدیک ایک مسلمہ چیز ہے اور اس پر کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص نغمات و سرود یا ساز کو دل پذیر نہیں سمجھتا تو یقیناً وہ جھوٹ بولتا ہے اور نفاق سے کام لیتا ہے یا وہ صاحب احساس نہیں اس لئے انسانیت اور تصوف سے خارج ہے کچھ لوگ رعایت حکم حق تعالیٰ کی بناء پر منع کرتے ہیں مگر فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کھیل تماشا مقصود نہ ہو اور الحان فسق و فجور میں مبتلا نہ کرے تو اس کا سننا مباح ہے۔ اس پر کثیر اخبار و آثار موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں: كَانَتْ عِنْدِی جَارِيَةٌ تُغَنِّی فَاسْتَاذَنَ عُمَرُ فَلَمَّا سَمِعَتْ حِسَّهُ فَرَّتْ فَلَمَّا دَخَلَ عُمَرُ تَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَا أَضْحَكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كَانَتْ عِنْدَنَا جَارِيَةٌ تُغَنِّی فَلَمَّا سَمِعَتْ حِسَّكَ فَرَّتْ فَقَالَ عُمَرُ لَا أَبْرَحُ حَتّٰى أَسْمَعُ مَا كَانَ سَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجَارِيَةَ فَاَخَذَتْ تُغَنِّی وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَمِعُ ''میرے پاس ایک کنیز گا رہی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اندر آنے کی

اجازت طلب کی جب کنیز کو علم ہوا اور ان کی آہٹ سنی تو بھاگ گئی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسکرانے کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا ایک کنیز گا رہی تھی۔ تمہارے پاؤں کی آہٹ سن کر بھاگ گئی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک وہ چیز نہ سن لوں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنیز کو بلایا وہ گانے لگی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنتے رہے۔''

اسی قسم کی اور بہت سی روایتیں ہیں۔ شیخ عبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ نے سب کو اپنی کتاب ''السماع'' میں جمع کر دیا ہے اور سماع کے مباح ہونے کا فیصلہ دیا ہے۔ مشائخ کرام کا مقصود جداگانہ ہے۔ فقیہانہ اباحت عوام کا کام ہے۔ صوفیاء کے لئے اباحت وہ ہے جو اعمال کے لئے سودمند ہو۔ اہل ہوش کو لازم ہے کہ ایسے امور کے درپے ہوں جو سودمند ہوں۔

میں مرو میں تھا۔ محدثین کے آئمہ میں سے ایک مشہور امام نے مجھ سے کہا کہ اس نے سماع کی اباحت پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے کہا یہ تو دین میں ایک بڑی مصیبت پیدا ہو گئی۔ ایک امام نے ایسی چیز کو مباح قرار دے دیا جو تمام برائیوں کی اصل ہے۔ امام نے پوچھا اگر مباح نہیں تو تم کیوں سنتے ہو؟ میں نے کہا اس کے لئے متعدد وجوہ ہیں یک طرفہ قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر سماع کی تاثیر دل پر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔ اگر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے۔ الغرض ہر وہ چیز جو بظاہر فسق آلودہ ہے اور باطن پر اس کا تاثر مختلف شکلوں میں رونما ہوتا ہے ایک قطعی فیصلے کے تحت نہیں آسکتی۔ واللہ اعلم بالصواب

تینتیسواں باب

احکام سماع

معلوم ہونا چاہئے کہ اصول سماع مختلف طبائع کے لئے ایک نہیں ہو سکتے۔ طبیعتوں کے رجحان مختلف ہوتے ہیں اور یہ ظلم ہے کہ ہر شخص کے لئے سماع ایک ہی اصول کے تابع فرمان سمجھا جائے۔ سماع سننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں اول وہ لوگ جو معانی پر کان رکھتے ہیں اور دوم وہ جو صرف آواز پر جھومتے ہیں۔ دونوں کے اچھے اور برے پہلو ہیں۔ خوش الحانی طبیعت میں خروش پیدا کرتی ہے۔ اگر طبیعت حق آشنا ہے تو خروش بھی حق ہوگا اور اگر باطل پرست ہے تو خروش بھی باطل ہوگا۔ لہٰذا اگر طبیعت میں فساد ہے تو سماع کا اثر بھی فساد ہی ہوگا۔ اس کی مثال حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایت ہے۔ جب باری تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا تو خوش الحانی عطا فرمائی اور آپ کے گلے کو ساز بنا دیا۔ پہاڑ جھومنے لگتے تھے۔ جنگلی جانور اور پرندے کوہ و بیابان میں آپ کے نغمات سے مسحور ہو جاتے تھے۔ چلتے ہوئے دریا تھم جاتے تھے۔ اڑتے ہوئے پرند گر پڑتے تھے۔ جس جنگل میں آپ نغمہ سرا ہوتے تھے وہاں مہینہ بھر جاندار کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے۔ بچے دودھ نہیں مانگتے تھے۔ رونا چھوڑ دیتے تھے لوگ سن کر پلٹتے تو سننے والوں میں سے کئی لوگ کلام، آواز اور الحان کی شدت کیفیت کی وجہ سے مردہ پائے جاتے۔ ایک دفعہ تو سات سو کنیزیں جاں بحق ہو گئیں اور بارہ ہزار بوڑھے مر گئے۔ مشیت ایزدی ہوئی کہ ہوس پرست سماع کرنے والوں اور حق آشناؤں میں امتیاز قائم ہو۔ ابلیس کا طبعی اضطراب روبہ کار آیا اور اس نے انسانوں کو وسوسوں میں مبتلا کرنے کا ارادہ کیا۔ اپنی حیلہ سازیوں کے لئے اجازت طلب کی۔ اجازت مل گئی۔ اس نے بنسری اور طنبور کو شکل دی اور داؤد علیہ السلام کے مقابل مجلس آراستہ کر لی۔ اہل سماع دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ اہل شقاوت شیطانی مزامیر پر لٹو ہو گئے اور اہل سعادت حضرت داؤد علیہ السلام کے

حضور سرنگوں رہے۔ اہل معنی کے سامنے نہ حضرت داؤد علیہ السلام کا الحان تھا اور نہ دوسری جماعت کے مزامیر۔ وہ رو بہ حق تھے۔ الحان داؤدی ان کے لئے سرچشمہ ہدایت تھا اور مزامیر ابلیسی سراسر فتنہ و شر۔ وہ سب سے الگ ہو گئے اور تعلقات سے اعراض کیا۔ ان کی نظر نے غلط کو غلط اور درست کو درست دیکھ لیا۔ جس کسی کو سماع اس منہاج پر میسر آئے مباح ہے۔

مدعیوں کی ایک جماعت کہتی ہے کہ ہمارے لئے سماع اس کی ظاہری صورت سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ قطعاً محال ہے۔ کمال ولایت یہی ہے کہ ہر چیز وہی کچھ نظر آئے جو وہ اصل میں ہے۔ ہرگز ایسا نہیں تو نظر کا قصور ہے کیا معلوم نہیں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ کُلِّ الْأَشْیَاءِ کَمَاھِیَ(1) اے اللہ! تو جملہ اشیاء کی وہی حقیقت دکھا جو ہے۔"

جب صحیح نظری یہی ہے کہ ہر چیز اپنے اصلی روپ میں نظر آئے تو درست سماع بھی یہی ہے کہ جو کچھ سنا جائے وہ وہی ہو جو سنایا جا رہا ہے۔ مزامیر پر فدا ہونے والے ہوائے نفس اور ہوس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ اصلیت سے دور ہٹ کر سنتے ہیں ورنہ وہ سماع کی جملہ برائیوں سے نجات پاتے۔ گمراہی میں مبتلا لوگوں نے کلام حق سنا تو گمراہ تر ہو گئے۔ نضر بن حارث نے کلام پاک سن کر کہا: اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۶۸﴾ (النمل) "یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔" عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب وحی تھے۔ انہوں نے کہا: فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾ (المومنون) "ایک جماعت نے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (الانعام:103) کو رویت باری کی نفی کی دلیل بنا لیا۔ ایک دوسری جماعت نے ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الاعراف:56) کو جہت و مکان کا ثبوت سمجھ لیا۔ ایک تیسری جماعت نے وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ (الفجر) کو حق تعالیٰ کی آمد پر عائد سمجھا۔ چونکہ ان کی جبلت میں گمراہی تھی اس لیے ان کے لئے کلام حق کا سننا سودمند نہ ہوا۔ توحید پرست کسی شاعر کے شعر پر نظر کرتا ہوا شاعر کی طبیعت کو آراستہ کرنے والے خالق اکبر کو دیکھتا ہے۔ فعل کی بلندی فاعل کی طرف دلیل راہ بنتی ہے۔ اہل ضلالت قرآن

1۔ اتحاف السادۃ المتقین

حکیم سن کر بھی بھٹک گئے اور اہل حق کلام باطل سن کر راہ ہدایت پر گامزن رہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس کا انکار کھلا مکابرہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

فصل: اقوال مشائخ

سماع سے متعلق مشائخ کبار کے بے شمار لطیف مقالات ہیں جو اس کتاب کے احاطہ تحریر میں نہیں آسکتے۔ تاہم میں ان میں سے کچھ معرض بیان میں لاتا ہوں تاکہ تو مکمل طور پر مستفید ہو سکے توفیق اللہ تعالیٰ کے قبضہ اختیار میں ہے۔

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، السماع وارد الحق یزعج القلوب إلی الحق فمن أصغی إلیه بحقّ تحقّق ومن أصغی إلیه بنفس تزندق ''سماع فیضان حق ہے جو دلوں کو روبہ حق کرتا ہے۔ جس نے حقیقت کو مدنظر رکھا وہ حق کی طرف گامزن ہوا جس کے سامنے ہوائے نفس رہی وہ بھٹک گیا۔'' مراد یہ نہیں کہ سماع وصل حق کا سبب بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سننے والا صرف حقیقت پر نظر رکھے۔ آواز میں الجھ کر نہ رہ جائے تاکہ فیضان حق سے بہرہ ور ہو۔ ذکر حق دل کو ابھارتا ہے اس لئے تابع حق کو مشاہدہ حاصل ہوگا اور نفس کا پرستار حجاب میں رہ جائے گا اور تاویلوں میں پھنس جائے گا۔

زندقہ فارسی کا لفظ ہے۔ معرب شکل میں۔ فارسی زبان میں زندقہ کا مطلب تاویل ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی مذہبی کتاب کی تفسیر کو زند و پاژند کہتے ہیں۔ اہل لغت نے آتش پرستوں کو زندیق کا نام دے دیا۔ کیونکہ بقول ان کے مسلمانوں کے ہر قول کی تاویل ہو سکتی ہے جو قول کی ظاہری صورت سے مختلف ہوتی ہے۔ تنزیل دیانت میں داخل ہونے کا نام ہے اور تاویل باہر نکلنے کو کہتے ہیں۔ آج کل مصر میں شیعہ فرقہ کے لوگ جو انہی آتش پرستوں کے پس ماندگان ہیں یہی کچھ کہتے ہیں اور لفظ زندیق ان کے لئے اسم علم ہو گیا ہے۔ القصہ مطلب ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ہے کہ اہل حقیقت سماع میں روبہ حق ہوتے ہیں اور اہل ہوس دور دراز کی تاویلوں میں الجھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، السماع ظاهره فتنة و باطنه عبرة فمن عرف

الإشارة حل له استماع العبرة وإلافقد استدعى الفتنة و تعرض للبلية ''سماع بظاہر فتنہ ہے اور باطناً عبرت۔ جو اداشناس ہے اس کے لئے عبرت کا سننا مباح ہے ورنہ سراسر طلب فتنہ ہے اور مصیبت کو دعوت دینا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اگر دل گرویدۂ حق نہیں تو سماع بلا اور آفت کا موجب ہے۔

ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ سے سماع سے متعلق کسی نے سوال کیا تو آپ نے جواباً فرمایا، لیتنا نخلصنا منه رأسا برأس کاش ہم سماع سے سر بسر بچ نکلیں۔ کیونکہ انسان ہر چیز کا حق ادا نہیں کرسکتا اور جب وہ کوئی حق ادا نہیں کرتا تو اسے اپنی خطا کا احساس ہوتا ہے اور وہ پھر سمجھتا ہے کہ کاش اسے کلی رہائی نصیب ہوتی۔

ایک شیخ بزرگ فرماتے ہیں ''سماع باطن میں پوشیدہ چیزوں کو دیکھنے کے لئے باطن کو ابھارتا ہے۔'' تاکہ پیوستہ حاضر حق رہے۔ مریدوں کے لئے غیبت اسرار سخت قابل ملامت چیز ہے۔ دوست غائب ہونے کے باوجود دل میں حاضر ہونا چاہئے۔ اگر دل سے بھی غائب ہے تو دوستی کا کوئی وجود نہیں۔

میرے شیخ طریقت نے فرمایا السماع زاد المضطرين فمن وصل استغنى عن السماع ''سماع اہل عجز کا زاد سفر ہے جو منزل پر پہنچ گیا اسے سماع کی ضرورت نہیں۔'' کیونکہ مقام وصل پر سننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب سے متعلق ہوتی ہے۔ عالم مشاہدہ میں سننے کا کوئی مقام ہی نہیں رہتا۔

حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ايش أعمل بالسماع ينقطع إذا قط ممن سمع منه ينبغي أن يكون سماعك متصلا غير منقطع ''اس سماع کا کوئی کیا کرے جو منقطع ہو جانے والا ہو جسے گانے والا ختم کرے تو اس کا اثر بھی زائل ہو جائے سماع تو متصل اور غیر منقطع ہونا چاہئے۔''

یہ گلشن محبت میں اجتماع ہمت کی طرف اشارہ ہے اس مقام پر ساری کائنات عارف کے لئے سماع مہیا کرتی ہے اور یہ بہت بڑا درجہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

چونتیسواں باب

سماع سے متعلق اختلافات

سماع سے متعلق مشائخ اور اہل حقیقت میں اختلاف ہے۔ایک جماعت کا خیال ہے کہ سماع غیبت کا سبب ہے کیونکہ عالم مشاہدہ میں سماع ممکن نہیں۔وصل دوست میں دوست کی نظر دوست پر ہوتی ہے اور اسے سماع کی پروانہیں ہوتی۔سماع خبر کا ہوتا ہے اور خبر عالم مشاہدہ میں دوری اور پردہ کے برابر ہوتی ہے۔سماع مبتدی لوگوں کا ذریعہ ہے جس کے ساتھ وہ غفلت اور پراگندگی کو چھوڑ کر جمعیت خاطر حاصل کرتے ہیں۔جنہیں پہلے ہی سے جمعیت خاطر حاصل ہو وہ سماع سے پراگندہ خاطر ہو جاتے ہیں۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ سماع حاضری کا ذریعہ ہے کیونکہ محبت فنائے کل اور محویت کا تقاضا کرتی ہے۔جب تک دوست کلی طور پر دوست میں مستغرق نہ ہو جائے اس کی محبت ناقص ہوتی ہے۔دل کیلئے مقام وصل محبت ہے۔باطن کے لئے مشاہدہ، روح کا وصل اور جسم کی خدمت۔اسی طرح ضروری ہے کہ کان کے لئے بھی کچھ ہو جیسا کہ دیدار آنکھ کا مقدر ہے کسی شاعر نے ہزلیہ انداز میں شراب کی طلب میں کیا خوب کہا ہے ؎

ألا فاسقني خمرا وقل لي هي الخمر

ولا تسقني سرا إذا أمكن الجهر

"اے دوست! مجھے شراب پلا اور منہ سے کہہ کہ یہ شراب ہے مجھے چھپ کر نہ پلا ظاہر پلانا بھی تو ممکن ہے۔"

یعنی مجھے شراب دے جسے میری آنکھ دیکھ لے۔میرا ہاتھ چھو لے۔میری زبان چکھ لے۔میری ناک سونگھ لے ہاں ایک حس بے نصیب رہ جائے گی یعنی سماع تو منہ سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے تا کہ کان کو بھی اس کا حصہ مل جائے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ سماع حضوری کا ذریعہ ہے کیونکہ غائب منکر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انکار کرنے والے اس کے اہل نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ سماع بالواسطہ بھی ہوتا ہے اور بلاواسطہ بھی جو کچھ قاری سے سنا جائے وہ وجہ غیبت ہوتا ہے اور جو باری تعالیٰ سے سنا جائے وہ ذریعہ حضوری۔ اسی بناء پر کسی بزرگ نے کہا ہے کہ مجھے مخلوقات سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کی بات سنوں یا ان کے متعلق کوئی بات کروں بجز کلام اہل حق کے۔ واللہ اعلم بالصواب

پینتیسواں باب

سماع میں صوفیاء کے مقامات

معلوم ہونا چاہئے کہ صوفیوں کے لئے درجہ بدرجہ سماع کے مقام ہیں جن کے مطابق وہ سماع سے مستفید ہوتے ہیں۔ چنانچہ طالب کے لئے سماع ندامت حاصل کرنے کے لئے مدد دیتا ہے اہل شوق کے لئے شوق دیدار کا سبب بنتا ہے۔ اہل یقین کے لئے یقین کی تائید کرتا ہے۔ مرید کے لئے تحقیق بیان، محبّ کے لئے تعلقات سے بیزاری اور فقیر کے لئے کلی ناامیدی کا باعث ہوتا ہے۔ دراصل سماع آفتاب کی مانند ہے کہ وہ تمام چیزوں پر چمکتا ہے مگر ہر چیز کو اپنے ظرف کے مطابق حرارت، ذوق اور مشروب حاصل ہوتا ہے۔ ایک چیز جل جاتی ہے۔ دوسری روشن ہو جاتی ہے۔ کوئی تپش سے پگھل جاتی ہے۔ کسی پر صرف نوازش کرم ہوتی ہے۔ از روئے تحقیق اہل سماع کو تین درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک مبتدی دوسرا متوسط اور تیسرے کامل۔ میں اب ہر ایک کے بارے میں شرح حال کے لئے ایک فصل تحریر کرتا ہوں تاکہ بات قاری کے فہم کے قریب تر ہو جائے۔

فصل: سماع کا اثر

جاننا چاہئے کہ سماع فیض حق ہے اور انسانی نفس کو ہزل اور لہو سے پاک کرتا ہے۔ مبتدی کی طبیعت کسی عالم میں بھی فیضان حق کے قابل نہیں ہوتی ورود فیض سے طبیعت میں سوز و گداز اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں کچھ ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جو کم و بیش حد اعتدال سے نہ گزر جائے۔ یہ چیز عین مشاہدہ ہے۔

مشہور ہے کہ روم کے کسی شفا خانہ میں لوگوں نے ایک عجیب چیز ایجاد کی تھی وہ اسے انگلیوں کہتے ہیں۔ بلکہ یونانی ہر عجیب چیز کو اسی کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا اک تارا ساز ہے۔ ہفتے میں دو مرتبہ مریضوں کو اس کے پاس لے جا کر بجانا شروع کر دے اور

بیماری کے مطابق اس کی آواز کان میں پہنچاتے اور جب کسی کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا تو زیادہ دیر تک سناتے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ موت کا وقت مقرر ہے مگر بہر حال اس کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ طبیب لوگ اسے ہمیشہ سنتے ہیں اور ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ان کی طبیعت کے موافق نہیں ہوتا۔ اسی طرح سماع بھی مبتدیوں کی طبیعت کو موافق نہیں آتا۔

میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ زہر قاتل میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی وہی زہر ہوتا ہے کیونکہ اس کی اصلیت ہی زہر ہے اور ترکستان میں میں نے اسلام کی سرحد پر ایک شہر میں دیکھا۔ ایک پہاڑ میں آگ لگ گئی وہ جل رہا تھا اور اس کے پتھروں سے نوشادر ابل رہا تھا۔ اس میں ایک چوہا تھا جب وہ آگ سے باہر نکلا تو مر گیا۔ مطلب یہ ہے کہ مبتدی لوگوں کا اضطراب ورود فیضان کے عالم میں اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کی جسمانی ترکیب بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جب یہ بار بار ہو تو مبتدی کو سکون مل جاتا ہے۔

چنانچہ جب حضرت جبریل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی لے کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاب دیدار نہ ہوئی۔ جب آپ کامل ہو گئے تو اگر ایک ساعت بھی حضرت جبریل علیہ السلام نہ آتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے چین ہو جاتے۔ اس کے بے شمار شواہد ہیں جو سماع میں مبتدیوں کے اضطراب اور منتہی لوگوں کے سکون کی دلیل ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید سماع میں بہت مضطرب رہتا تھا اور دوسرے درویشوں کو اسے سہارا دینا پڑتا تھا۔ دوسرے درویشوں نے حضرت جنید کے پاس شکایت کی تو حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اگر اس کے بعد سماع میں اضطراب کا مرتکب ہوا تو اسے ہم نشینی سے خارج کر دیا جائے گا۔

ابو محمد جریری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سماع میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے لب بند تھے اور اس کے جسم کے ہر بال سے چشمہ ابل رہا تھا۔ دوسرے دن دیکھا تو اسی طرح بے ہوش تھا۔ جب بھی میں اسے دیکھتا تو وہ لب بند کیے خاموش بیٹھا ہوتا۔ لیکن اس کے جسم

کے ہر بال سے چشمہ ابل رہا ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سماع کا اثر تھا یا اپنے پیر کی توقیر اس کے دل میں غالب تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سماع کا نعرہ لگایا پیر نے خاموش رہنے کا حکم دیا وہ سر بہ زانو ہو گیا جب غور سے دیکھا تو وہ مرا ہوا تھا۔ میں نے شیخ ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک درویش سماع میں بہت مضطرب ہوتا تھا کسی شخص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹھ جاؤ وہ بیٹھتے ہی مر گیا۔

جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ سماع میں جاں بحق ہو گیا۔ دراج سے روایت ہے کہ وہ ابن فوطی کے ساتھ دجلہ کے کنارے کنارے بصرہ اور ابلہ کے درمیان جا رہے تھے۔ کسی جگہ ایک محل کی چھت پر کوئی شخص بیٹھا تھا اور ایک لونڈی اس کے سامنے گا رہی تھی اور یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

فی سبیل اللہ ود كان منی لک اقبل
کل یوم تنکون غیر هذا بک اجمل

''میں تجھے فی سبیل اللہ محبت کرتا تھا۔ میرا یہ عمل تجھے پسند تھا لیکن اس کے علاوہ تیرا ہر روز نیا روپ کیا بھلا معلوم ہوتا تھا''۔

ایک جوان محل کے نیچے گدڑی پہنے ہوئے لوٹا لئے کھڑا تھا۔ اس نے کہا اے کنیز! خدا کے لئے یہ بیت دوبارہ گا میری زندگی ایک سانس کے برابر باقی ہے۔ شاید بیت سننے سے ختم ہو جائے۔ لونڈی نے شعر دوبارہ پڑھا۔ جوان نے ایک نعرہ مارا اور جاں بحق ہو گیا۔ مالک نے لونڈی کو کہا کہ تو آزاد ہے۔ خود نیچے اترا اور اس جوان کے کفن و دفن میں مصروف ہو گیا اور تمام اہل بصرہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد اس شخص نے اعلان کیا کہ میں فلاں خاندان کا فرد ہوں اپنی تمام ملکیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کرتا ہوں اور اپنے تمام غلاموں کو آزاد کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا اور اس کے متعلق کسی کو کوئی خبر نہ مل سکی۔

مطلب یہ ہے کہ سماع کے عالم میں غلبہ حال ایسا ہونا چاہئے جو بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے۔ اس زمانے میں تو ایسے گمراہ موجود ہیں جو بدکاروں کے سماع میں شامل ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم راہ حق میں سماع کرتے ہیں۔ فاسق اور فاجر لوگ ان کے ہم خیال ہو کر زیادہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہی ان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ اگر حصول عبرت کے لئے گرجا میں چلے جائیں اور مراد صرف اہل شرک کی ذلت کو دیکھنا ہو اور اسلام کی نعمت پر شکر ادا کرنا ہو تو کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تم گرجے میں جا کر کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ بارگاہ حق میں لا سکتے ہو تو کوئی حرج نہیں ورنہ جانا جائز نہیں۔

مختصر یہ کہ اگر مرد عبادت خانے سے خرافات میں چلا جائے تو خرافات بھی اس کے لئے عبادت خانہ ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی خرافات سے نکل کر صومعہ میں آ جائے تو صومعہ بھی اس کے لئے خرافات بن جاتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں بغداد میں ایک درویش کے ساتھ جا رہا تھا ہم نے ایک مغنی کو یہ گاتے ہوئے سنا ؎

منی ان تکن حقا تکن احسن المنی

وإلافقد عشنا بها زمنا رغدا

"آرزو اگر حق ہے تو خوب ہے ورنہ آرزو میں ہم نے ایک زمانہ بسر کیا جو گزر گیا۔"

درویش نے ایک نعرہ مارا اور جاں بحق ہو گیا۔ اسی طرح ابوعلی رودباری فرماتے ہیں میں نے ایک درویش کو دیکھا جو ایک گانے والی کی آواز میں محو تھا۔ میں نے بھی سنا تو وہ ایک سوز و گداز سے لبریز آواز میں گا رہا تھا۔

أمدّ کفی بالخضوع إلی الذی جاد بالصنیح

"میں اس کی طرف عاجزی سے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں جو مجھ پر احسان کرنا چاہے۔"

اس درویش نے ایک نعرہ مارا اور گر گیا جب میں اس کی طرف بڑھا تو وہ مر گیا تھا۔

ایک شخص کہتا ہے کہ میں ابراہیم خواص کے ساتھ جا رہا تھا۔ ایک وادی میں میرے دل

میں موج طرب اٹھی اور میں نے پڑھا۔

صح عند الناس أنی عاشق غیر أن لم یعرفوا عشقی لمن
مافی فی الإنسان شیء حسن إلا وأحسن منه صوت حسن

"یہ تو معلوم ہے کہ میں عاشق ہوں مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ میں کس پر عاشق ہوں۔ انسان میں حسین آواز سے زیادہ کوئی چیز حسین نہیں۔"

حضرت ابراہیم نے کہا کہ یہ شعر پھر پڑھوں۔ میں نے پھر پڑھا تو آپ نے وجدانی کیفیت میں پتھر پر پاؤں مارے میں نے دیکھا کہ قدم اس طرح گڑ گئے جیسے موم میں۔ آپ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو کہا کہ میں ابھی ابھی باغ بہشت میں تھا مگر تو نہیں دیکھ سکتا۔

ایسی اور بہت سی حکائتیں ہیں جن کی یہ کتاب متحمل نہیں ہوسکتی۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک درویش آذربائیجان کی پہاڑیوں میں چلا جا رہا تھا اور یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔

واللہ ما طلعت شمس ولا غربت إلا وأنت منی قلبی ووسواسی
ولا جلست إلی قوم أحدثهم إلا وأنت حدیثی بین جلاسی
ولا ذکرتک محزونا ولا طربا إلا وحبک مقرون بأنفاسی
ولا هممت بشرب الماء من عطش إلا رأیت خیا لا منک فی الکاسی
فلو قدرت علی الإیتان زرتکم مجیئا علی الوجه و مشیا علی الرأسی

"بخدا کوئی صبح اور شام نہیں ہوتی جب تو میرے دل اور میرے خیالوں میں نہ ہو۔ میں کسی کے پاس گفتگو کرنے کو نہیں بیٹھتا جب تک میرے ہم نشینوں میں تیرا ذکر نہ ہو۔ میں نے کبھی تیرا ذکر رنج وخوشی کے عالم میں نہیں کیا۔ مگر اس وقت جب تیری محبت میری سانس میں ملی ہوئی ہو۔ میں نے پیاس میں کبھی پانی نہیں پیا جب تک تیرا خیال پیالے میں نہ ہو۔ اگر مجھے طاقت ہوتی تو میں منہ کے بل گھسٹتے ہوئے اور سر کے بل تیرے دیدار کو آتا۔"

اس کے بعد اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھا اور پھر پتھر سے پیٹھ لگا کر جاں بحق

ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کرے۔

فصل: لحان سے پڑھنے کے بارے

مشائخ کبار کا ایک گروہ قصائد اور قرآن کو ایسے الحان کے ساتھ پڑھنے کو کہ اس کے حروف اپنے مخرج سے خارج ہو جائیں قابل اکراہ سمجھتا ہے اپنے مریدوں کو پرہیز کا حکم دیا ہے خود پرہیز کیا ہے اور پرہیز میں مبالغہ کیا ہے ان لوگوں کی کئی جماعتیں ہیں اور ہر جماعت اپنے اپنے خیال کے مطابق اسے مکروہ سمجھتی ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو روایات کی بناء پر اور سلف کی متابعت کے طور پر حرام سمجھتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیز کو گانے پر تنبیہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے ایک صحابی کو درے لگائے کیونکہ وہ گاتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اعتراض امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس وجہ سے تھا کیونکہ انہوں نے گانے والی لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنے صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ کو اس حبشی عورت کو دیکھنے سے منع کیا جو گا رہی تھی اور آپ نے فرمایا کہ وہ شیطان کی رفیقہ ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں جو اشعار و قصائد کے گانے کی تحریم پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گانے کو مکروہ سمجھنے کے لئے سب سے بڑی دلیل اجماع امت ہے ایک گروہ نے تو اس کو مطلق حرام کہا ہے۔

اسی بارے میں ابوالحارث سے روایت ہے کہ وہ سماع کے متعلق بہت زور دیا کرتے تھے ایک رات کوئی شخص ان کے عبادت خانے پر آیا اور کہا کہ اللہ والوں کی ایک جماعت جمع ہے اور شیخ کے دیدار کے مشتاق ہیں اگر تشریف لائیں تو کرم ہو گا۔ شیخ نے کہا میں آ رہا ہوں اور باہر نکل کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ تھوڑی دور جا کر کچھ لوگ ملے جو حلقہ باندھے ہوئے تھے اور ایک بوڑھا آدمی ان کے درمیان تھا۔ انہوں نے بے حد تعظیم کی اور بوڑھے نے کہا اگر اجازت ہو تو کچھ شعر سناؤں شیخ نے یہ بات مان لی اور وہ لوگ نہایت خوش الحانی میں اشعار پڑھنے لگے ایسے اشعار جو شعراء فراق و ہجر میں لکھا کرتے تھے۔ سب لوگ وجد کی حالت میں کھڑے ہو گئے نعرہ مارنے لگے اور اشارے کرنے لگے۔ ابوالحارث کو ان کے

حال پر بہت تعجب ہوا مگر یہ مجلس نشاط گرم رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اس وقت اس بوڑھے نے کہا اے شیخ! آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہ گروہ کن لوگوں کا ہے۔ شیخ نے کہا کہ میں تیرے رعب کے باعث سوال نہیں کر سکا۔ اس نے کہا میں عزازیل (ابلیس) ہوں اور سب لوگ میرے فرزند ہیں۔ اس طرح بیٹھنے اور گانے میں مجھے دو فائدے ہیں: ایک تو میں اپنے فراق کی مصیبت میں روتا ہوں اور اپنی عزت و توقیر کے دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ عابد لوگوں کو راہ حق سے دور کرتا ہوں اور غلط راستے پر ڈالتا ہوں۔ ابو الحارث فرماتے ہیں کہ سماع کا شوق اسی وقت میرے دل سے ختم ہو گیا۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے شیخ ابو العباس اشقانی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا آپ نے فرمایا کہ میں ایک دن ایک مجمع میں تھا کچھ لوگ سماع کر رہے تھے میں نے دیکھا کہ کچھ جن برہنہ ناچ رہے ہیں۔ سب لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور جوش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ایک اور جماعت سماع کی اس وجہ سے قائل نہیں مبادا ان کے مرید مصیبت اور بیکاری میں مبتلا ہو جائیں ان کی تقلید سے روگرداں ہوں توبہ کا خیال چھوڑ دیں۔ گناہوں میں مشغول ہو جائیں۔ خواہشات نفسانی ان کے ارادوں کو توڑ دے یہ لوگ سماع کے قائل نہیں نہ اہل سماع میں بیٹھتے ہیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرید کو اس کی توبہ کی ابتدا میں فرمایا، اگر سلامتی چاہتے ہو تو توبہ کی پاسداری کرو اور سماع سے جو صوفی لوگ کرتے ہیں نفرت کرو اور اپنے آپ کو وقت شباب اس کا اہل نہ سمجھو۔ بڑھاپے میں اپنی وجہ سے لوگوں کو گنہگار نہ کرو۔

ایک اور جماعت کے خیال میں سماع کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں: ایک لہو و لعب کرنے والے اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے۔ پہلی قسم کے لوگ یعنی لاہی مکمل فتنہ ہوتے ہیں اور خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے یعنی الٰہی اپنے مجاہدہ اپنی ریاضت اور قطع تعلقات کی بناء پر فتنوں سے بچے رہتے ہیں انہیں کوئی خوف نہیں

ہوتا۔ ہم الٰہی ہیں لاہی نہیں۔ لہٰذا سماع کا ترک ہمارے لئے بہتر ہے اور ہم اسی چیز میں مشغول رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے وقت کے موافق ہو۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جب عام لوگوں کے لئے سماع میں فتنہ ہے اور ہمارے سماع کی وجہ سے لوگ بے دین اور محجوب ہوتے ہیں تو ہم عوام الناس کو نصیحت کرتے ہیں اور ازراہ غیرت خود کنارہ کرتے ہیں یہ طریق بھی بہت خوب ہے ایک اور جماعت نے کہا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُ مَالَا یَعْنِیْهِ(1) ''آدمی کا اچھا اسلام یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو چھوڑ دے جن کی اس کو ضرورت نہیں'' یعنی اس چیز سے روکش ہو جائے جس سے روکش ہونا لازم ہے کیونکہ غیر ضروری اور بے سود باتوں میں مشغول ہونا وقت کو ضائع کرنا ہے اپنے احباب کا قیمتی وقت ان کے ساتھ مل کر برباد نہ کرو کچھ خاص صوفیاء نے کہا ہے کہ سماع کی حیثیت خبر کی ہے اور اس کی لذت حصول مراد یہ بچوں کا کھیل ہے مشاہدہ میں خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی صرف مشاہدہ سے کام رکھنا چاہئے یہ مشاہدہ سے متعلق احکام ہیں جو مختصراً بیان کر دیئے ہیں اب صوفیوں کے وجد، وجود اور تواجد سے متعلق کچھ بیان ہوگا۔ وباللہ التوفیق

1۔ سنن ترمذی، ابن ماجہ

چھتیسواں باب

وجد، وجود، تواجد

وجد اور وجود مصدر ہیں ایک کا مطلب غم اور دوسرے کا پالینا۔ فاعل دونوں کا ایک ہوتا ہے اور بصورت مصدر ان میں فرق نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: "وجد یجد وجودا ووجدانا" جب پالیا تو "وجد یجدوجدا" جب مغموم ہوتو پھر وہی "وجد یجد جدۃ" جب امیر ہوگیا: "وجد یجد موجدۃ" جب غصہ میں آگیا۔ ان میں فرق مصادر کی وجہ سے ہے افعال کی وجہ سے نہیں۔ صوفیاء کے نزدیک وجد اور وجود سے دو حالتوں کا اثبات ہے جو سماع میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ایک حال غم سے قریب ہوتا ہے اور دوسرا تحصیل غم کے قریب۔ غم کی حقیقت محبوب سے دوری اور مراد کا گم ہو جانا اور حصول مراد کا حاصل کرنا ہے۔ حزن اور وجد میں فرق یہ ہے کہ حزن اس غم کو کہتے ہیں جو اپنے مقدر کا ہو اور وجد اس غم کو جو غیر کی جانب سے محبت کے طور پر ملے۔ یہ سب تغیر طالب سے نسبت رکھتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی ذات اقدس ہر تغیر سے بالاتر ہے وجد کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ بظاہر غم ہوتا ہے اور غم کو قلم بیان نہیں کرسکتا۔

الغرض وجد طالب اور مطلوب کے درمیان ایک راز ہے جسے بیان کرنا مکاشفہ میں غیبت کے برابر ہے کیفیت وجود کی طرف اشارہ یا اس کی نشاندہی درست نہیں کیونکہ یہ مشاہدہ میں طرب کے برابر ہے اور طرب کو طلب کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ وجود محبوب کی طرف سے محبّ کے حق میں ایک فیض ہے جسے اشارتاً بتانا ناممکن ہے۔ میرے نزدیک وجد کی ایک غم ناک کیفیت ہے جو فرحت یا سنجیدگی سے یا غم سے یا خوشی سے رونما ہوتی ہے، اور وجود دل سے غم کا دفع ہونا اور مقصود پالینا ہے اہل وجد یا تو غلبہ شوق سے مضطرب ہوتا ہے یا مشاہدہ سے سکون حاصل کر کے کیفیت کشف حاصل کرتا ہے یعنی یا تو

رنج یا نالہ وگریہ سے مضطرب ہوتا ہے یا خوشی اور سرور سے سکون پذیر ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام میں اس بات پر اختلاف ہے کہ وجد کامل تر ہے یا وجود، ایک گروہ کا خیال ہے کہ وجود مریدوں کی اور وجد عارفوں کی صفت ہے چونکہ عارفوں کا مقام مریدوں سے بلند تر ہوتا ہے۔ اس لئے عارفوں کی صفت بھی مریدوں سے بلندتر اور کامل تر ہوتی ہے۔ جو چیز معرض حصول میں آسکتی ہے وہ دائرہ ادراک میں آسکتی ہے اور جنسی صفت سے موصوف ہوتی ہے ادراک موجود ہوتا ہے اور خدا کی ذات کی کوئی حد نہیں۔ الغرض جو کچھ طالب نے پالیا وہ بجز مشرب کے کچھ بھی نہیں جو کچھ نہیں پایا طالب کو اس سے کچھ تعلق نہیں وہ اس کی طلب سے عاجز ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ وجد مریدوں کا سوز ہے اور وجود محبوں کا تحفہ۔ محبوں کا مقام مریدوں سے بالاتر ہے۔ اس لئے تحفے کا سکون سوز سے کامل تر ہے۔

اسے ایک حکایت سے واضح کیا جا سکتا ہے حکایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے آپ کو غمگین دیکھ کر پوچھا اے شیخ کیا بات ہے؟ حضرت جنید نے فرمایا من طلب وجد "جس نے طلب کیا وہ مغموم ہوا۔" حضرت شبلی نے فرمایا بل من وجد طلب نہیں بلکہ جو مغموم ہوا اس نے طلب کیا۔" مشائخ نے اس سے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ جنید کا اشارہ وجد کی طرف تھا اور شبلی کا وجود کی طرف۔ میرے نزدیک جنید کا قول زیادہ ثقہ ہے۔ کیونکہ جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ خالق اس کی جنس سے نہیں ہے تو اسکا غم والم اور دراز ہو جاتا ہے۔

اس موضوع پر اس کتاب میں اور جگہ ذکر ہو چکا ہے۔ مشائخ کا اتفاق ہے کہ علم کا غلبہ وجد کے غلبہ سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے کیونکہ وجد کے عالم میں واجد خطرہ میں ہوتا ہے مگر علم کی قوت ہو تو عالم امن کے مقام پر ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں سے مراد یہ ہے کہ تمام حالات میں طالب کو علم اور شریعت کا تابع ہونا چاہئے کیونکہ اگر وہ وجد سے مغلوب ہو جائے گا تو وہ قابل خطاب نہیں رہے گا اور جب وہ قابل خطاب نہیں رہے گا تو عذاب وثواب سے بھی آزاد ہوگا۔ اس عالم میں اس کی شکل ایک دیوانہ کی سی ہو جائے گی اور اولیاء اللہ اور

مقربین سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ جب علم کا غلبہ ہوتو بندہ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی پناہ میں ہوتا ہے اور عزت و عظمت سے بہرہ ور۔ جب حال کی قوت علم پر غالب ہوتو بندہ حدود خداوندی سے خارج ہو کر رہ جاتا ہے اور قابل خطاب نہیں رہتا یا معذور ہوتا ہے یا مغرور اور بالکل یہی چیز حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ راستے دو ہیں، یا علم و عمل یا ایسی روش جو بغیر علم کے ہو۔ علم بے عمل بھی ہو تو عزت و شرف ہوتا ہے اور عمل نیک بھی ہو تو جہالت کی وجہ سے ناقص ہوتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت بایزید نے فرمایا کفر أهل الهمة أشرف من إسلام أهل المنية ''اہل ہمت کا کفر اہل آرزو کے اسلام سے بلند تر ہے۔'' یعنی اہل ہمت کے لئے کفران اور ناشکری ممکن نہیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت فرمایا: ''شبلی رحمۃ اللہ علیہ مست ہیں اگر ہوش میں آجائیں تو ایک ایسا امام بن جائیں جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

حکایت ہے کہ حضرت جنید، محمد بن مسروق اور ابوالعباس بن عطار حمہم اللہ تعالیٰ ایک جگہ جمع تھے۔ قوال ایک شعر پڑھ رہا تھا اور تمام افراد سرگرم تواجد تھے حضرت جنید بالکل ساکن بیٹھے تھے پوچھا اے شیخ! تیرے نصیب میں سماع میں سے کچھ نہیں انہوں نے یہ آیت پڑھی تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل: 88) ''تو پہاڑوں کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ وہ منجمد ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح تیزی سے چل رہے ہیں۔''

تواجد وجد لانے میں ایک تکلف ہوتا ہے اور یہ انعامات وشواہد حق کو دل کے حضور پیش کرنا ہے اور وصل کا خیال اور انسانی آرزوؤں کا موجزن ہونا ہے۔ ایک گروہ اس معاملے میں پابند رسوم ہے وہ صوفیاء کی ظاہری حرکات اور ان کے رقص کی ترتیب اور ان کے اشارات کی تقلید کرتے ہیں اور یہ حرام محض ہے۔ ایک اہل حقیقت کا گروہ ہے کہ وہ ان حرکات اور رسوم سے صوفیاء کے احوال اور ان کے مقام کی طلب کرتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ تَشَبَّهَ(1) ''جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ

1۔ سنن ابی داؤد

اسی میں سے ہوتا ہے۔" نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ "جب تم قرآن پڑھو تو روؤ اگر خود بخود رونا نہ آئے تو تکلف سے روؤ۔" اور یہ حدیث تواجد کے مباح ہونے پر گواہ ہے۔ اسی بناء پر کسی بزرگ نے کہا ہے کہ ہزار میل جھوٹ کے ساتھ چلو تو ایک قدم صداقت کا آتا ہے۔ اس معاملہ میں بہت کچھ مواد ہے۔ لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

سینتیسواں باب

رقص اور متعلقات

شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ دانش مندوں کے نزدیک باتفاق رائے جب اچھی طرح بھی کیا جائے تو کھیل تماشا ہوتا ہے اور جب بیہودہ طور پر کیا جائے تو بجز لغویت کے کچھ بھی نہیں۔ مشائخ کرام میں سے کسی بھی بزرگ نے بھی رقص کو قابل تعریف نہیں سمجھا اور کسی طرح کا مبالغہ نہیں کیا اور جو دلائل اہل حشو معرض بیان میں لاتے ہیں وہ بالکل باطل ہیں اور چونکہ اہل وجد کی حرکات اور ان کا عمل برابر ہوتے ہیں اس لئے اکثر بے ہودہ لوگ اس رقص کی تقلید کرتے ہیں اور مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور رقص کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ میں نے ایک جماعت کو دیکھا جن کے نزدیک تصوف بجز رقص کے کچھ بھی نہیں وہ اسی پر کاربند ہو گئے۔ ایک اور گروہ اس کی حقیقت سے منکر ہے۔

الغرض ناچنا اور رقص کرنا شرعاً اور عقلاً قابل مذمت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ لوگوں پر افضلیت کے دعویدار ایسی حرکات کے مرتکب ہوں۔ جب سبک سری کا غلبہ ہوتا ہے تو ایک قسم کا خفقان رونما ہوتا ہے اور پابندی رسوم اٹھ جاتی ہے۔ وہ اضطرابی کیفیت وہ رقص اور وہ ناچنا کسی صورت میں بھی طبع پرور نہیں ہوتا۔ درحقیقت وہ صرف جانگدازی ہے اور جو اسے رقص کہتا ہے وہ حقیقت سے بہت دور ہے اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ من لم یذق لا یدری "جس نے چکھا نہیں وہ سمجھ نہیں سکتا۔"

نوجوانوں کی طرف دیکھنا

نوجوانوں کو دیکھنا اور ان کے ساتھ مجالست کرنا منع ہے اور اس کو جائز سمجھنے والا کافر ہے اور جو کچھ اس بارے میں بطور دلائل لایا جائے اس کی بنیاد باطل اور جہالت پر ہے۔ میں نے جہلاء کی ایک جماعت کو دیکھا جو اسی تہمت کی بناء پر اہل طریقت سے روگرداں ہو گئی۔ اس نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا۔ مشائخ کرام ان سب باتوں کو آفت سمجھتے ہیں۔ یہ حلولی لوگوں کا مذہب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے۔ واللہ اعلم

اڑتیسواں باب

جامہ دری

معلوم ہونا چاہیے کہ کپڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا صوفیاء کی عادت ہے اور بڑی بڑی مجلسوں میں جہاں بزرگ مشائخ تشریف فرما ہوں یہ لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے علماء کے گروہ کو دیکھا جو اس کے قطعاً منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ درست کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا جائز نہیں۔ یہ فساد ہے اور ناممکن ہے کہ فساد سے درستی حاصل ہو۔ بلاوجہ کیوں لوگ اپنے درست کپڑوں کو پھاڑیں اور پھر ان کو سی کر خرقے بنالیں۔ کرتے کی آستین، آگا پیچھا، تریز اور جیب پھاڑ کر علیحدہ علیحدہ کرلیں اور پھر ان کو درست کریں اگر ایک شخص کپڑے کے سو ٹکڑے کر کے جوڑتا ہے اور دوسرا پانچ ٹکڑے کر کے جوڑتا ہے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر ٹکڑے میں مومن کے دل کی راحت کا سامان ہوتا ہے جو ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑنے سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ جامہ دری کے لیے تصوف میں کوئی جواز موجود نہیں۔ سماع کے وقت صحت حال کی صورت میں جامہ دری نہیں کرنی چاہئے کیونکہ وہ صرف بیجا کے برابر ہوگی لیکن اگر سننے والا مغلوب ہو جائے وہ قابل خطاب نہ رہے اور بے خبر ہو جائے تو اسے معذور سمجھنا چاہیے۔ جب کسی پر ایسی حالت طاری ہو جائے اور کوئی جماعت اس کی موافقت میں جامہ دری کرے تو وہ جائز ہے۔

اہل طریقت کے خرقے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جس کو سماع کے دوران درویش خود پھاڑے دوسرے وہ کہ کچھ لوگ اپنے پیر اور مقتدا کے حکم سے کسی کے کپڑے پھاڑیں کسی جرم سے استغفار کی حالت میں یا وجد میں بے خوابی کے عالم میں۔ ان سب خرقوں میں مشکل ترین خرقہ سماعی ہوتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک مجروح اور دوسرے درست، جامہ مجروح کے لیے دو چیزیں شرط ہیں یا تو اسے سی کر واپس کیا جائے یا کسی اور

درویش کی نذر کر دیا جائے یا تبرکاً ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ دیا جائے۔ اگر درست ہو تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ سماع کرنے والے درویش کی مراد کیا تھی اگر اس کی مراد قوال کو دینا ہے تو اس کو ملے اگر مراد جماعت کو دینا ہے تو اس کو ملے اگر بغیر کسی مقصد کے گرا ہے تو یہ فیصلہ پیر پر موقوف ہے کہ وہ کیا حکم دیتا ہے۔ جماعت کو دیا جائے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا قوال کو دیا جائے۔ اگر قوال کو دینا مقصود ہے تو باقیوں کی موافقت کی شرط نہیں کیونکہ خرقہ اس کے اہل کی طرف نہیں جا رہا۔ درویش نے اختیار سے یا مجبوری سے دیا ہے اور دوسروں کی موافقت ضروری نہیں۔ اگر جماعت کو دینے کی غرض ہو تو باقی رفقاء کی موافقت ضروری ہے۔ پیر کو نہیں چاہیے کہ درویشوں کا کپڑا قوالوں کو دے دے لیکن یہ روا ہے کہ کوئی دوست خرقہ میں سے کوئی چیز اس قوال کو دے دے اور باقی کپڑا اس درویش کو واپس کر دے یا سب ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دے۔ اگر خرقہ غلبہ کی حالت میں پھینکا ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس حدیث کے مطابق قوال کو ملنا چاہیے۔

مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلَبُه "جس مسلمان سپاہی نے جنگ میں کسی کافر کو قتل کیا تو مقتول کا سامان قاتل سپاہی کو ملے گا"۔

اگر خرقہ قوال کو نہ دیا جائے تو طریقت کی شرط ٹوٹ جائے گی۔ ایک گروہ کہتا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے کہ جس طرح قاتل کے متعلق بعض فقہاء کے نزدیک امام کے حکم کے بغیر مقتول کا کپڑا قاتل کو نہیں دیتے۔ اسی طرح یہاں بھی پیر کے حکم کے بغیر کپڑا قوال کو نہیں دینا چاہیے اگر پیر کسی کو بھی نہ دینا چاہے تو یہ قابل اعتراض نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

انتالیسواں باب

آدابِ سماع

سماع کی چند شرائط ہیں جب تک ضرورت نہ ہو، نہ کیا جائے اور اس کو عادت میں شامل نہ کرلیا جائے۔ سماع دیر کے بعد کرنا چاہیے تاکہ اس کی عظمت کم نہ ہو جائے۔ سماع کے وقت پیر کا موجود ہونا ضروری ہے۔ سماع کی جگہ عوام سے خالی ہونی چاہئے۔ قوال بھی شریعت کا احترام کرنے والے ہوں۔ دل دنیا کے مشاغل سے خالی ہو اور طبیعت لہو اور لعب اور تکلف سے متنفر ہو۔ دل میں جب تک سماع کی طاقت نہ ہو اس کا سننا اور اس میں مبالغہ کرنا ضروری نہیں۔ جب قوت رونما ہو تو اس کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ اسی قوت کی متابعت میں رہنا چاہیے۔ اگر وہ حرکت کا تقاضا کرے تو حرکت کرنی چاہیے اور اگر حرکت کا اقتضا نہ کرے تو ساکن رہنا چاہیے یہ بھی ضروری ہے کہ حرکت، وجد اور قوت طبع میں فرق برقرار رکھا جائے۔ سننے والے کو قبول حق کے ظرف کے مطابق فیضان ہوتا ہے اور وہ اسی قدر داد دے سکتا ہے جب اس کا غلبہ دل پر طاری ہو تو تکلفاً اس کو دور کرنے کی کوششیں نہ کرے جب غلبہ کم ہو رہا ہو تو تکلفاً جذب کرنے کی کوشش نہ کرے اور حرکت کی حالت میں کسی سے سہارے کی توقع نہ رکھے اگر کوئی سہارا دے تو منع نہ کرے۔ سماع میں کسی کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیے اور صاحب وجد کی کیفیت کو شوریدہ نہیں کرنا چاہیے اور اس کی حالت میں تصرف جائز نہیں رکھنا چاہیے صاحب وجد کی نیت کو نہیں تولنا چاہیے کیونکہ اس میں آزمانے والے کے لیے بہت پراگندگی اور بے برکتی ہے اگر قوال اچھا گا رہا ہے تو اسے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ تو اچھا گا رہا ہے۔ اگر وہ برا گا رہا ہے یا ناموزوں شعر سنا رہا ہے تو طبیعت کو پراگندہ نہیں کرنا چاہیے اور اسے نہیں کہنا چاہیے کہ اس سے بہتر گاؤ۔ طبیعت میں اس کی نسبت خصومت نہیں پیدا ہونی چاہئے اس کو درمیان، میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ بہ حوالہ حق چھوڑ دینا چاہیے اور اچھی طرح

سے سننا چاہیے۔ اگر ایک جماعت پر سماع طاری ہو جائے اور کسی ایک کو اس سے کچھ حصہ نہ ملے تو محروم رہنے والے کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کی کیفیت سکر کو اپنے صحو کے انداز سے دیکھے اسے اپنے وقت پر مطمئن رہنا چاہیے تا کہ اسے بھی حصہ ملے اور وہ بھی برکات سے فیض اٹھائے۔

(علی بن عثمان جلابی) اس بات کو عزیز رکھتا ہوں کہ مبتدی سماع نہ سنے تا کہ اس کی طبیعت پراگندہ نہ ہو جائے۔ سماع میں بہت بڑے خطرے اور خرابیاں بھی ہیں۔ عورتیں چھتوں کے اوپر سے اور مکانوں سے درویشوں کو سماع کی حالت میں دیکھتی ہیں اور اس سے اہل سماع پر سخت حجابات پڑ جاتے ہیں چاہیے کہ جوانوں میں کسی کو وہاں نہ بٹھائیں۔ کیونکہ جاہل صوفیاء نے ان تمام باتوں کا طریق بنالیا ہے اور صداقت سے دستبردار ہو گئے ہیں میں ان جملہ باتوں سے جو اس قسم کی خرابیوں سے مجھ پر گزری ہیں استغفار کرتا ہوں اور باری تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے ظاہر اور باطن کو خرابیوں سے محفوظ رکھے۔ تمہیں اور پڑھنے والوں کو اس کتاب کے حقوق کی رعایت کی وصیت کرتا ہوں وباللہ التوفیق الاعلی والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ و أصحابہ أجمعین وسلم تسلیما کثیرا کثیرا

وکتبہ الراجی إلی رحمۃ اللہ المتین اضعف المساکین بہاؤ الدین زکریا عفی اللہ عنہ و عن سائر المسلمین وجعل یومہ خیرا من أمسہ إلی یوم الدین من أمر اللہ